

دھرتی پر رہ کر ستاروں میں رہنے والوں کی کہانی، جن کے ہاتھ آسمان کے ستارے تو کیا زمین کے جگنو بھی نہیں آتے۔۔۔

pdf by M Jawad Ali attari511@hotmail

+971-50-2737867

میرے خواب ریزہ ریزہ

ماہا ملک

pdf by M Jawad Ali attari511@hotmail

+971-50-2737867

علم و عرفان پبلشرز

34- اردو بازار لاہور

فون: 042-7352332-7232336

نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنفہ اور پبلشرز (علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

pdf by M Jawad Ali attari511@hotmail

+971-50-2737867

نام کتاب	میرے خواب ریزہ ریزہ
مصنف	ماہا ملک
ناشر	گل فراز احمد
سرورق	علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور
پروف ریڈنگ	حاشی
سن اشاعت	راانا عبدالحجید
مطبع	مئی 2007ء
قیمت	جوہر حمانیہ پرنٹرز، لاہور
	240/- روپے

سیونٹھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ

40- اردو بازار، لاہور۔ فون: 7223584



علم و عرفان پبلشرز

34- اردو بازار لاہور

فون: 7232336-7352332-042

pdf by M Jawad Ali attari511@hotmail

+971-50-2737867

میرے خواب ریزہ ریزہ

”میرے خواب ریزہ ریزہ“ خواتین ڈائجسٹ میں چھپنے والے اس سلسلے وار ناول کو تعریف کے ساتھ ساتھ مسلسل تنقید کا سامنا رہا۔ قارئین کو میری سوچ سے اختلاف تو نہیں تھا لیکن وہ زہن کے کردار کو قبول نہیں کر پارہے تھے۔

میں ان قارئین سے کہنا چاہوں گی کہ ہمیں اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی خامیوں کو تسلیم کرنے اور ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ میرے اس ناول کا موضوع دولت کی ہوس نہیں تھا۔ ساری بات محض اپنے ”حال“ سے غیر مطمئن ہونے اور ”شکر“ کی نعمت سے محروم ہونے کی ہے۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

زہن ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا لیکن منزل پر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ:

ہیں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اور جب منزل پر پہنچ کر رستوں کے غلط ہونے کا انکشاف ہو تو پھر وہی ہوتا ہے جو زہن کے ساتھ ہوا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔ میں نے اپنے قارئین سے محض یہی کہنے کی کوشش کی تھی۔

میں اپنے اللہ کی شکر گزار ہوں اور میری خوش قسمتی ہے کہ ناول کے انجام سے کسی کو بھی اختلاف نہ تھا۔

میری دعا ہے کہ جس طرح میں اپنے قارئین کی آراء کو سو فیصد بدلنے میں کامیاب ہوئی اسی طرح اپنے معاشرے میں موجود زہن جیسی لڑکیوں کی سوچ بھی بدل سکوں۔

ایک قلم کا یہی امتحان ہے اور یہی انعام۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابیں یہ بلبلیں یہ تتلیاں، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، اک دیا جلائے رکھنا، کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد علم و عرفان پبلشر نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

آپ کی دعاؤں کی طالب

ماہا ملک

وہ مٹی کی ایک چلچلاتی ہوئی دوپہر تھی۔ کالج سے نکل کر قریبی دکان تک پہنچتے پہنچتے وہ دونوں پسینے سے شرابور ہو گئی تھیں۔ پیاس کی شدت حلق میں کانٹوں کی صورت محسوس ہو رہی تھی۔

”تو بس اتنا قدرگرمی اور پروفیسر نظامانی کی تیز، نوکیلی، آواز“ فارحہ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں اور جرنلز کا ڈنٹر پر ٹکائے ”کل ہر حال میں یہ نوٹس ہر لڑکی کے پاس موجود ہونے چاہئیں۔“ اس نے ساتھ ساتھ پروفیسر نظامانی کی آواز بنا کر نقل بھی اتاری۔ زینب کو ہنسی آ گئی۔

”باسط بھائی کہاں ہیں آپ؟“ فارحہ نے دکان دار کو آواز لگائی تھی۔ ”میرے جسم کا سارا پانی ہوا میں تحلیل ہو چکا ہے۔ اب ماس کی باری ہے ایسا نہ ہو صرف میرے جرنلز ہی اس کا ڈنٹر پر رکھے رہ جائیں۔“

پردہ ہٹا کر، دکان کے اندرونی حصے سے باسط بھائی نکل کر مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف چلے آئے وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

”باسط بھائی! فنانٹ و وعدہ دھنڈی بتائیں دیں اور یہ کچھ نوٹس فوٹو اسٹیٹ کرنے ہیں۔ پاؤڈر کا پی چاہیے۔ ایک دم فرسٹ کلاس جو صفحہ بھی دھندلا ہوا وہ دوبارہ کاپی کروائیں گے۔ اس لئے ذرا دھیان اور ایمانداری سے کام کیجئے گا۔“

”کتنا بولتی ہو فارحہ تم!“ زینب نے زج ہو کر کہا تھا۔

وہ دراصل اس شخص کی موجودگی کا خیال کر رہی تھی جواب ایک کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے میں مشغول ہو چکا تھا۔ عجیب نگاہیں تھیں۔ ان میں شناسائی کی چمک بھی تھی، نرمی اور خلوص بھی تھا اور ایک جوان، حسین لڑکی پر مرکوز ہونے کا دلچسپ احساس بھی۔

ایسے میں زینب کو فارحہ کی نان اسٹاپ بولتی پر غصہ آنے لگا۔

”گرمی کا اثر ہے۔ ویک سیل بھی طاقت پکڑ لیتے ہیں یہ تو پھر طاقتور سیل ہیں۔“ فارحہ نے اسے سمجھایا۔

باسط بھائی ہنس دیے۔ اجنبی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”باسط بھائی! ذرا جلدی کام کر دیں۔ وقت پر گھر نہ پہنچو تو اماں بے کل ہو جاتی ہیں۔“ زینب نے کولڈ ڈرنک تھامتے ہوئے انہیں تاکید کی تھی۔

”بس پندرہ بیس منٹ کا کام ہے۔“ انہوں نے کاغذات پر نظر دوڑائی۔ ”تم دونوں چاہو تو اندرونی حصے میں بیٹھ جاؤ آرام سے۔“

”نہیں، یہیں ٹھیک ہے۔“

فارحہ کے بولنے سے بیشتر یہ وہ تیزی سے بول گئی۔ فارحہ اسے گھور کر رہ گئی۔ ویسے تو وہ دونوں اکثر و بیشتر مختلف کاموں کے سلسلے میں یہاں آتی رہتی تھیں۔ ڈپارٹمنٹل ٹائپ اسٹور تھا۔ فوٹو اسٹیٹ مشین بھی تھی اور ساتھ ہی سی او بھی، دونوں تقریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی کام سے چلی آتی تھیں۔ اس طرح باسط بھائی سے کافی جان پہچان ہو گئی تھی۔ یوں بھی وہ فارحہ کے بھائی کے واقف کار بھی تھے۔ دونوں لڑکیوں سے ان کی کافی بے تکلفی تھی۔ کام زیادہ ہوتا تو وہ دونوں دکان کے اندرونی حصے میں بنے ہوئے پی سی او میں جا بیٹھتیں۔ باسط بھائی کاغذات فوٹو اسٹیٹ کرتے اور وہ دونوں آپ میں گپیں لڑتی رہتیں۔ لیکن آج اس نووارد کی موجودگی میں زینب اندر جانے سے کترا گئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں موجود شناسائی کی ایک نا محسوس دعوت اسے مسلسل بے چین کر رہی تھی۔

فارحہ اپنے ازلی لالہ ابالی پن کی بنا پر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت دیر سے محسوس کرتی تھیں۔

”یار احسان! تمہیں دوں کولڈ ڈرنک“ باسط بھائی کو اچانک خیال آیا تھا۔ ”یارو! لیکن شرط وہی ہے۔ ادائیگی کروں گا۔“ ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ سجا کر اس نے جواب دیا تھا۔

اس کے بولنے کا انداز بہت اچھا تھا۔ آواز نرم تھی اور لہجہ سے اس کے سہجے ہوئے ہونے کا پتا چلتا تھا۔ زینب کو مزید گہرا ہٹ ہونے لگی۔
نجانے ذہن کیوں اس اجنبی شخص کی جانب متوجہ تھا۔ شاید اس کی مہربان نگاہوں کا اثر تھا۔
اپنی بوتل ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا باسط بھائی! پھر ہوگی ملاقات۔“ اس نے بڑے میں سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔
”بیٹھتے پار۔ گپ شپ رہتی۔“ باسط بھائی ان لوگوں کے کاغذات خاکی لفافے میں ڈال رہے تھے۔
”پھر سہی!“

اس نے پیسے انہیں تھماتے ہوئے مزید کچھ کہا تھا۔ لیکن آواز بے حد دھیمی تھی۔ زینب سن نہ سکی وہ ان کے قریب سے گزر گیا۔ ایک بڑی گہری اندر تک اتر جانے والی نگاہ پھر زینب پر ڈالی تھی۔ گری سے سرخ ہوا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
”بد تیز۔“ وہ زیر لب بڑبڑاٹھی۔

”یہ لیجئے۔“ فارحہ حساب کر رہی تھی۔ ”یہ کاپی کروانے کے اور یہ بوتلوں کے۔“

”بوتلوں کی ادا انگلی ہو چکی ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”ہیں؟“ فارحہ نے ہلنق پن سے انہیں دیکھا ”کس نے کی؟“

”احسن نے ابھی جو یہاں بیٹھا تھا“

”لیکن کیوں ہم اس کے کیا لگتے ہیں؟“ زینب کو طیش آ گیا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا دیکھو، وہ کھڑا ہے۔“

انہوں نے ان دونوں کی توجہ پیچھے کی طرف دلائی۔ دونوں نے ساتھ مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ دوکان سے قدرے فاصلے پر کھڑی اپنی بائیک اسٹاٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

فارحہ دوکان سے اتر کر لپکتی ہوئی اس تک پہنچی۔ زینب بھی اس کے پیچھے دوڑی۔

”اے مسٹر!“ فارحہ نے بڑے رعب سے اسے مخاطب کیا تھا ”یہ کیا بد تیزی ہے؟“

”جی؟“ اس نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیا ”مجھے احسن کہتے ہیں۔ احسن ایاز!“

”کہتے ہوں گے۔“ وہ جھنجھلائی ”یہ بتائیے“ اس مان نہ مان، میں تیرا مہمان، والی حرکت کا کیا مقصد ہے؟“

”آپ کچھ غلط کہہ گئیں۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔

”یہ مان نہ مان، میں تیرا میزبان والی حرکت ہے۔“ بات وہ فارحہ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نگاہوں کے حصار میں زینب تھی۔ فارحہ اس بات سے اور تپ گئی۔

”مجھ سے بات کیجئے۔ کس سلسلے میں کوئلہ ڈنکس کی پے منٹ کی گئی ہے؟“

”آپ ہی سے بات کر رہا ہوں محترمہ!“ وہ مسکرا دیا ”ہو جاتے ہیں کچھ“ ایسے“ سلسلے بھی زینب شاہ!“

آخر میں اس نے زینب کے سینے سے لگے جڑل پر چلی حروف سے لکھا گیا اس کا نام زیر لب پڑھا تھا۔

”میں کہتی ہوں آپ شرافت سے اپنے پیسے واپس لے لیں ورنہ، ورنہ سنگین نتائج بھگتے پڑیں گے۔“

فارحہ کا غصے سے حشر برا ہو گیا۔

جبکہ وہ اس ”سنگین نتائج“ والی دھمکی پر بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

”اب تو میں دے چکا ہوں، واپس لے کر کیا کروں گا؟“ اس نے بایک کو پھر کک لگائی تھی۔

”موٹر سائیکل بھالیں گے گا پنی۔“ فارحہ طنز ابولی۔

”مشورے کا شکریہ! میں پیسوں کی نہیں ”دل“ کی بات کر رہا تھا۔“

بانک اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ وہ ”دوں“ کی ایک زوردار آواز کے ساتھ چلتا بنا۔

”بدلتیز، بے ہودہ، آوارہ“ فارحہ نے دانت پیسے۔

”مکیہ کہیں کا“ زینب نے بھی ساتھ دیا۔

”آیا بڑا دل والا۔“

دونوں بڑبڑاتی ہوئی واپس دکان پر پہنچیں۔

”باسط بھائی کون تھا یہ؟“

”حسن نام ہے اس کا۔ اکثر آتا جاتا ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔“

”لو فرے ایک نمبر کا۔“ زینب کو اس کی نگاہیں یاد آئیں۔

”یہ پیسے رکھیں باسط بھائی۔“ فارحہ نے کاؤنٹر پر روپے بٹخے۔ ”اب آئے تو منہ پر ماریے گا اس کے۔ ہم اس طرح ایروں غیروں کے

پیسوں سے کھانے پینے والی لڑکیاں نہیں ہیں۔ سمجھا کیا اس کینے نے۔“

”ارے فارحہ تم تو بہت ناراض ہو گئیں۔“ باسط بھائی شرمندہ ہوئے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے فارحہ۔“ زینب رکھائی سے بولی تھی ”آپ کو بھی اس سے اس طرح پیسے نہیں لینے چاہیے تھے۔“

”سوری، بھئی، ویسے معاملہ اتنا بھی سیریس ہونے والا نہیں ہے۔“ وہ بے حد شرمندہ ہو رہے تھے، دونوں دکان سے نکل آئیں۔

بس اسٹاپ تک وہی ”بدلتیز“ نوجوان زیر بحث رہا تھا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو الوداع کہہ کر اپنے اپنے رستوں کو ہو لیں۔



شام کو اس کی آنکھ قدرے دیر سے کھلی تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے نظر اٹھا کر گھڑی کی سمت دیکھا۔ سوئیاں چھ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ کھڑکی

پر لٹکے پردے بھی دھوپ اتر جانے کے باعث بجھے بجھے سے لگ رہے تھے۔

”حیرت ہے!“ اس نے سوچا ”اماں نے آج اٹھایا نہیں۔ ورنہ تو وہ پانچ بجنے کا انتظار بھی بڑی مشکلوں سے کرتی ہیں اور ان کے چکر لگنے

شروع ہو جاتے ہیں۔“

پھر اس کا دھیان باہر سے آتی باتوں کی آوازوں پر گیا۔ اماں کسی خاتون سے جو گفتگو تھیں۔

”نسرین خالہ! اس نے خاتون کی آواز پہچانی ”اوہ نوٹ آگین!“ وہ اٹھ کر کمرے کے دروازے تک چلی آئی۔

”میں تو بہتی ہوں چھوٹی بیگم! بس ہاں کہو اور لڑکی کو گھر کا کرنے کی تیاریاں پکڑو۔ اس سے بہتر رشتہ اب نہیں ملنے کا، ساڑھے چار ہزار

روپے ماہوار کماتا ہے لڑکا۔“

”ساڑھے چار ہزار روپے ماہوار۔“ زینب نے مصنوعی حیرت سے بھنویں اچکا کیں ”اوہ میرے خدا! اتنے سارے روپے؟ خرچ کیسے

ہوتے ہوں گے۔“

”لیکن نسرین! چھ جوان کنواری بہنیں پھر ماں باپ حیات یہ بھی تو سوچو!“ اماں قدرے ترڈ سے کہہ رہی تھیں۔ ”اتنی ذمہ داریاں بھی تو

ہیں اس کے کاندھے پر۔ بیوی کے لیے کیا بچائے گا اور کیا کھلائے پہنائے گا؟“

”ارے چھوٹی بیگم! ہر لڑکی اپنا نصیب خود لے کر جاتی ہے سسرال۔“ نسرین خالہ نے پاندان کا ڈھکنا بند کر کے کتھے میں ڈوبی چنگلی بالوں سے صاف کی ”اپنی زینب کے جاتے ہی ہریالی ہی ہریالی ہوگی وہاں دیکھنا!“

”ہاں نسرین خالہ! سچ کہتی ہو۔“ زینب ہنستی ہوئی گھن میں چلی آئی۔ ”یہی تو سبز قدم ہوں میں۔ کیوں اماں؟“

”تم بند کرو اپنی بکواس۔“ اماں کو اس کی بات پر غصہ آ گیا۔ ”اور کتنی مرتبہ منع کیا ہے میں نے تمہیں، اپنی عمر سے بڑی باتوں میں ناگ مٹا دیا کرو۔“

”لہجے اماں! یہ بھی عجب کہی۔“ وہ سستی سے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے بولی ”میری باتیں ہو رہی ہیں اور میری عمر سے بڑی بھی ہو گئیں۔ اب رشتے کم از کم نسرین خالہ کی عمر میں تو آنے سے رہے۔ کیوں نسرین خالہ؟“

”ارے بیٹی! خدا عمر دراز کرے تمہاری۔ تمہیں ہر خوشی دکھائے ایسے ہی ہنستا مسکراتا رکھے۔“

نسرین خالہ نے اپنا اپو گرین راگ الاپنا شروع کیا۔

”لیکن خالہ! رشتے تو آپ ایسے لاتی ہیں کہ آپ کی تمام دعاؤں کی از خود نفی ہوتی ہے ان سے، ارے جب مجھے کھانے کو ہی نہیں ملے گا تو میری عمر کیسے دراز ہوگی؟ پہننا اوڑھنا ڈھنک کاندھ تو ہر خوشی کیسے دیکھ پاؤں گی۔ ہونٹوں کو دائیں بائیں کھینچ کر ٹیپ لگا لوں تب ہی ہر وقت مسکراتی نظر آ سکتی ہوں ورنہ تو حالات تو ایسے نہیں کہ ہونٹ خود بخود پھیلیں!“ اماں اس کی بکواس پر جل کر باورچی خانے کی سمت چل دیں۔

”میں ذرا شام کی ہانڈی کا کروں نسرین! تم ہی سنو اس کی یہ لڑائیاں۔“

”میں تو کہتی ہوں بیٹی! سوچ کچھ کر دینا جواب۔“ نسرین خالہ سنجیدہ ہوئیں ”اچھے رشتے بار بار دستک نہیں دیتے ہیں۔ لڑکا پڑھا کھا ہے، اچھی شکل و صورت کا ہے، اچھے کردار کا مالک ہے اور بھلا کیا چاہیے؟“

”اور بھی ایک بہت ضروری چیز ہوتی ہے زندگی میں خالہ! پیسہ کہتے ہیں اسے لڑکے کی پڑھائیوں اور شکل و صورت کا شمار چند روزہ ہوتا ہے۔ پھر عورت دیکھتی ہے اپنا سکون اور آرام، اسے طلب ہوتی ہے آسائش و راحت کی، اچھے کپڑے، زیور، گہنا، خوب صورت لکڑی گھران سب چیزوں کی خواہش اس طرح دل و دماغ پر حملہ کرتی ہے کہ پھر تمام عمر مردے سکتے، اپنی خواہشات کا ماتم کرتے گزر جاتی ہے شوہر گھر آتا ہے تو نگاہ اس کی شکل پر پڑتی ہی نہیں۔ سیدھی جا کر جیب ٹوٹتی ہے۔“

”سچ کہتی ہو بیٹی!“ نسرین خالہ ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑی ہوئیں ”یہ ہمارا ہی دور تھا جب عورت شوہر کی ایک میٹھی نگاہ کی خاطر ساری عمر کانٹوں پر گزر اور جیتی تھی اور ”اف“ نہ کہتی تھی۔ یہ زمانہ دور ہے۔ پیار کا نہیں پیسے کا دور ہے۔“

وہ اطمینان سے بیٹھی اپنے ناخنوں کا جائزہ لیتی رہی۔

”اچھا چھوٹی بیگم! چلتی ہوں۔“ نسرین خالہ باورچی خانے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئیں ”پھر کہہ آؤں انکارا نہیں؟ زینب بیٹی تو۔“

”ہاں نسرین!“ اماں نے آہستہ سے کہا تھا ”کہہ دو انکار کوئی اور اچھا رشتہ ہو تو بتانا۔“

”جی چھوٹی بیگم ضرور!“

نسرین خالہ کے جانے کے بعد اس نے اٹھ کر دروازے کی کنڈی لگائی اور باورچی خانے کے دروازے کے پاس موڑ حالا کر بیٹھ گئی۔

اماں کا موڑ سخت آف تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔

”اماں!“ اس نے بالا خرہ نہیں پکارا۔

”ہوں کہو؟“ انہوں نے بظاہر سارا دھیان ہانڈی بھوننے پر لگا دیا۔

آپ کو پسند تھا یہ رشتہ؟ جو کو ایٹر خالہ بیان کر رہی تھیں قابل قبول لگتا تھا آپ کو اپنی اکلوتی لاڈلی، خوبصورت بیٹی کے لیے۔“

”بس ان ہی خوش فہمیوں نے دماغ خراب کیا ہے تمہارا۔“ اماں چڑ کر بولیں ”بہت حسن آرا سمجھتی ہو خود کو۔“

”تو غلط کیا ہے؟“ وہ اترائی۔ ”کبھی میرے ساتھ چل کر دیکھیں کانچ۔ لڑکیاں آگے پیچھے پھرتی ہیں میرے، کوئی لیڈی ڈیانا سے ملاتی ہے تو کوئی ساڑہ بانوسے بس آپ کو ہی قدر نہیں ہے میری۔“

”تمہیں خود کو قدر نہیں ہے اپنی ضائع کر رہی ہو خود کو، ایک وقت آنے گا ایسا جب یاد کرو گی اس وقت کو جب لوگ آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ چند سال گزر جائے دو پھر پچھتاؤ گی۔“

”کمال ہے اماں۔“ وہ چڑ گئی۔ ”مائیں اپنی بیٹیوں کے اچھے نصیبوں کی دعا کرتی ہیں اور آپ ہیں کہ بد دعائیں دے رہی ہیں۔“

”بد دعائیں نہیں دے رہی ہوں میری بچی۔ سمجھا رہی ہوں۔ بچے کی بات بتا رہی ہوں تجھے۔ نصیب میں جو کچھ خدا نے اتارا ہوتا ہے وہ تو موت کی طرح پیچھا کرتا ہے آدمی کا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ انسان کو نہ ملے جو خدا نے اس کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔ اس کے انتظار میں اس طرح عرض نہیں کرنی چاہیے۔ یہ روپے پیسے کی خواہش کہاں سے سا گئی ہے۔ تیرے من میں؟ اور کوئی اچھائی تیری نگاہ میں لسمتی ہی نہیں!“

”اماں اماں۔“ وہ کھڑ گئی۔ ”میں ویسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی جیسی آپ نے گزاری۔“

”بڑی اچھی گزاری ہے۔ شکر ہے اس رب کا۔“ اماں نظریں چرا گئیں۔

”اچھی؟ اچھی؟ یا اچھی زندگی گزاری ہے آپ نے؟ مجھ سے یہ بات کہہ سکتی ہیں آپ؟

جس نے شعور کی دنیا میں پہلا قدم رکھے کے ساتھ ہی آپ کو بھائیوں کے در پر سر جھکائے کھڑے دیکھا ہے۔ ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے تھے۔ میری فیس بھرنی ہو تب بھائی کے ہاں حاضری، گھر کا راشن ختم ہو گیا تب شرمندگی، بجلی کا بل زیادہ آگیا تو جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی کیسے سامنا ہو گا بھائی کا۔ بھائی کے طعنے الگ۔“

”یہ سب باتیں کیوں کر رہی ہونہیں؟“ اماں دکھ سے بولیں۔ ”خدا ہر عورت کے سر پر اس کے سہاگ کا سایہ سلامت رکھے۔ تمہارے ابا ہوتے تو۔“

”بات یہ نہیں اماں! کہ آپ شوہر کے سائے سے محروم ہو گئی تھیں۔ بات اصل یہ ہے کہ میرے ابا دو وقت کی روٹی بڑی مشکلوں سے کمانے والے شخص تھے۔ میرے اور آپ کے تحفظ کے لئے چھوڑنے کو ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا کسی امیر و کبیر شخص کی بیوہ بھی کسی غریب کی سہاگن سے زیادہ مطمئن اور مضبوط ہوتی ہے۔“

”خدا کا کچھ خوف کرو۔“ اماں دہل گئیں۔ ”کیسے برے بول منہ سے نکال رہی ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے عزتیں محفوظ رکھی ہیں۔ اچھے خاندان میں پیدا کیا ہے۔ یہ روپے پیسے کی مشکلات کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔“

”میرے لئے رکھتی ہیں اماں!“ وہ پر زور انداز میں بولی۔ ”میں ماضی میں اپنے شوق کی ہر شے کو ترسی ہوں اور اب اپنے مستقبل میں زندہ ہوں۔ مجھے ایک خوب صورت گھر چاہیے۔ ایک بے فکر زندگی کی خواہش ہے جس میں میں اگلے وقت کی روٹی کے خیال سے پریشان نہ ہوں۔ اپنی پسند کا کپڑا خرید سکوں۔ بھرے بازار سے سر جھکا کر نہ گزروں بلکہ جہاں جو شے پسند آئے کھڑے کھڑے خرید لوں۔“

”میری بچی! یہ نصیبوں کی باتیں ہیں!“ اماں کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ ”میں ماں ہوں تیری کیا کیا نہ سوچتی ہوں گی تیرے لئے، دنیا کی ہر نعمت تیرے قدموں میں ڈھیر کر دینے کا ارمان میرے دل میں پچائیں بن کر انکار ہوتا ہے۔“

”پھر..... پھر..... اماں؟ یہ ہمارے غیرے کے رشتے پر اتنے انہماک سے کیا سوچنے لگ جاتی ہیں آپ؟ میری بات سن لیں اماں میں ایک دو کروں کے گھر سے اٹھ کر دوسرے دو کروں کے گھر جانے سے بہتر سمجھتی ہوں کہ پہلے گھر میں ہی ساری زندگی گزار دوں۔ معیار زندگی ایک

انج بھی اوپر کو نہ جائے، ذمہ داریوں کا بوجھ الگ شانوں کو جھکا دے، کیا فائدہ ایسی شادی کا اماں؟“ اماں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

”لیکن زنب! نصیبوں سے کون لڑ سکتا ہے۔ خواہش تو میری بھی یہی ہے کہ تجھے ایسے بیاہوں کہ تیرا چہرہ غاڑے سے، خوشیوں سے دمکتا ہو۔ لیکن میری بچی! کسی کا ہاتھ پکڑ کر تو نہیں لاسکتی اس گھر میں۔“

”میں نے کب کہا اماں ایسا کرنے کو؟ بس مجھے سکون سے انتظار کر لینے دو۔ مجھے یقین ہے۔ پورا یقین ہے کہ خدا نے میری قسمت میں یہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو میں چاہتی ہوں۔ بس تھوڑی دیر ہے۔“

اماں ہنس دی۔

”بھولی! قسمتوں کا حال پڑھنے کا دعویٰ کر رہی ہے؟“

”نہیں۔ خدا پر اپنے یقین کا اظہار کر رہی ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی تھی۔

”اور کیوں نہ یقین ہو مجھے اپنے خدا پر۔“

پھر رات کو گھنٹن میں بچے ٹھنڈے سفید بستر پر آرام سے لیٹ کر اس نے سوچا تھا۔

”میری قسمت میں اس نے دولت نہ لکھی ہوئی تو کیوں مجھے دولت حسن سے آراستہ کرتا۔۔۔ سر سے پیر کے انگوٹھے تک ایک ایک انگ کیوں ہیرے کی کئی کی مانند دمکتا اگر جو اس جسم نے پرانے، پیوند زدہ کپڑوں میں ہی ملبوس رہنا تھا تو..... اور فارحہ کہتی ہے۔ زنب! تجھے دیکھ کر صرف یہ سوچتی ہوں، حسن اس قدر مکمل بھی ہوتا ہے۔“



pdf by M Jawad Ali attari511@hotmail

+971-50-2737867

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

اس روز کالج کی چھٹی تھی۔

گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ آمنہ کے ہاں جانے کے خیال سے نہانے گھس گئی۔

آمنہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دہلی پتلی، سانولی، لیکن جہاں بھر کا خلوص دل میں سیٹھ وہ لڑکی زینب کی بہت اچھی دوست تھی۔ دونوں کی دوستی بچپن سے چلی آ رہی تھی۔ گھر کے کاموں کی وجہ سے آمنہ اسکول سے آگے نہ پڑھ سکتی تھی اور زینب کو اکیلے ہی کالج میں داخلہ لینا پڑ گیا تھا۔ لیکن اب بھی ذرا سی فرصت ملے پر وہ آمنہ کے ہاں دوڑی جاتی تھی۔

گیلے بال دوپٹے سے ڈھانپ کر اماں کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر وہ آمنہ کے ہاں چلی آئی۔ آمنہ کپڑوں کی آخری بالٹی لے کر چھت کی سمت جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رک گئی۔

”ملکہ عالیہ کو آگیا دھیان؟ پورے پندرہ روز بعد آئی ہو۔“ اس نے بالٹی پہلی میز پر رکھ کر مصنوعی خشکی کا اظہار کیا۔

”جنتا تمہارا گھر میرے گھر سے دور ہے اتنا ہی میرا گھر بھی تمہارے گھر سے دور ہے آفس آمنہ پروین!“ وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

”دھل گئے کپڑے؟ یا ابھی باقی ہیں؟“

وہ اس کے قریب آ کر بیٹھی تو زینب نے دریافت کیا۔

”دھل گئے۔“ اس نے سانس بھرا۔ ”صبح چھ بجے سے مشین لگائی تھی۔ اب گیارہ بج رہے ہیں۔“

”چھ بجے؟“ زینب نے حیرت سے کہا۔ ”کھانا پھر خالہ نے بنایا ہے؟“

”نہیں کھانا بھی میں نے ہی بنایا ہے۔ صفائی بھی کی۔“

”توبہ ہے آمنہ! اتنا کام کیسے کر لیتی ہو؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ ”مجھے دیکھو۔ آٹھ بجے اٹھی تھی۔ تھوڑے سے برتن دھوئے اور دو یا تین روٹیاں پکائیں۔ پھر بھی تھک گئی ہوں۔“

آمنہ کو ہنسی آگئی۔

”تم تو بہن نواب زادی ہو۔ اماں نے شہزادیوں کی طرح پالا ہے تمہیں۔ ہمارے ہاں ایسا دستور نہیں ہے۔ یہاں الف سے بے تک ہر

کام کرنا پڑتا ہے۔ وقت نکالنا پڑتا ہے۔ چاہے صبح کے چار بجے اٹھنا پڑ جائے۔“

زینب تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ دہلی پتلی سی آمنہ پر اسے ترس آنے لگا۔ اس نے واقعی اسے بے حد پیار سے پالا تھا۔ خود خواہ وہ سارا دن کام میں جتی رہتیں اسے نہیں اٹھاتی تھیں۔ وہ گھر کے کاموں سے بے نیاز محض اپنے ذاتی کاموں میں لگ رہتی۔

کبھی کالج کے لئے یونیفارم تیار کرتی۔ کپڑوں کو کلف لگا کر گھنٹہ بھر استری کرتی رہتی، بالوں کو خوب صورت بنانے کے ٹونکے آزماتی۔ کبھی ناخن صاف کر کے کیوٹس سے سجانے میں پورا پورا نکال دیتی۔ کبھی اپنی پرانی ڈائریاں نکال کر شعر منتخب کرتی رہتی۔

گھر کے کاموں سے اسے کبھی دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ اماں کر ہی لیتی تھیں سب کچھ۔ سودا سلف تک لے آتی تھیں قریبی بازار سے۔ فارغ وقت میں بیٹھ کر سبزی بنا لیتی تھیں۔ وہ کالج میں ہوتی تو پیچھے سے گھر کا تمام کام نہایتیں۔ اسے گھر آ کر ہاتھ بلانے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑتی تھی۔

کھانا تک اماں ہی نکال کر دیتی تھیں۔ وہ اماں کی خوشیوں کا مرکز تھی۔ ان کی ہر ترنا کا عنوان تھی۔ ان کی ساری عمر کا حاصل تھی۔

”کن خیالوں میں کوئی ہوئی ہو؟“ آمنہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں سوچ رہی تھی، کتنی سلیقہ مند ہو تم۔ ایک میں ہوں پھوہڑ، بد سلیقہ۔“

”نکرنہ کرو۔ سرال جاؤ گی تو ہر کام کرنا آ جائے گا۔“ آمنہ دھلے کپڑوں کی تہہ لگانے لگی۔

”نا بابا!“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”بدعائیں تو نہ دو۔ دعا کرو ایسا سرسرا لے کہ وہاں جا کر باقی کے کام کرنا بھی بھول جاؤں۔ کچھ کرنے کی ہوتی تھی عیش۔“ آمنہ ہنس دی۔

”بڑے اونچے خیالات ہیں بھئی!“

”ہاں آمنہ!“ اس نے گہرا سانس بھرا۔ ”اور کچھ نہیں تو کم از کم آدمی کے خیالات تو اونچے ہوں۔“
 ”اور کچھ کیوں نہیں۔“ آمنہ نے شوشی سے اسے گھورا۔ ”تبی خوب صورت ہو۔ مل ہی جائے گا تمہیں تمہارے خوابوں کا شیش محل، یہ تو ہم جیسے عام شکل و صورت والے لوگ ہیں جنہیں ”جہاں ہو جیسا ہو کی شرائط پر آئے رشتے قبول کرنے پڑتے ہیں۔“
 ”کہتی تو فارحہ بھی یہی ہے۔“ زینب مسکرا دی۔

”کیا کہتی ہے فارحہ؟“

”کہتی ہے، زینب! کسی ایورٹک سے رشتے پر سر ہلا دینے کی بے وقوفی کبھی مت کرنا۔ خدا نے تجھے اتنا حسن دیا ہے۔ تیرے مقدر کا محل بھی بنایا ہوگا۔ ٹھیک کہتی ہے نا آمنہ وہ؟“

”نہیں زینب!“ آمنہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”غلط کہتی ہے۔ میری ایک بات پلو سے باندھ لو۔ طبعیت میں کبھی بھی ہوس اور مادہ پرستی پیدا مت ہونے دینا۔ کیونکہ ایک مرتبہ نفس ہاتھ سے نکل جائے تو پھر آدمی محل تو کیا پوری دنیا پا کر بھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔ نفس کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھنا چاہیے۔ قناعت پسندی بڑی نعمت ہے۔ بڑا پرسکون رکھتی ہے انسان کو اور نہ تو دنیا پا کر انسان چاند ستاروں کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ یاد رکھو زینب! خدا نے چیزوں کی تقسیم بڑے انصاف سے کی ہے۔ تمہیں حسن کی دولت سے نوازا ہے تو کہیں کسی کو دوسری نعمتیں عطا کی ہے۔ کسی کو کچھ نہیں دیا تو قناعت پسندی اور شکرگزاری کی عظیم نعمتوں سے آراستہ کر دیا تاکہ کسی شے کی طلب دل میں پھانس کی مانند ابھی نہ رہے۔ ضروری نہیں کہ ہر حسین عورت کے مقدر میں خدا نے ایک عالی شان محل بھی لکھا ہو۔“

زینب چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔

”ہاں آمنہ!“ پھر وہ بولی ”تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن، لیکن ان خوابوں سے چھپا کیسے چھڑائے انسان؟ یہ تو وہ ضدی بچے ہیں جو اگر ایک مرتبہ ضد پر آجائیں تو پھر کسی نہ کسی طور پر انہیں بہلانا ہی پڑتا ہے۔ اپنی نیندیں، اپنی ساری امیدیں کھلونوں کی صورت انہیں دینی ہی پڑتی ہیں۔“
 ”یہ خواب نہیں سراب ہوتے ہیں زینب! ان کے دھوکے میں کبھی مت پڑنا۔ یہ مسافر کو کہیں کا نہیں چھوڑتے نہ منزل پر پہنچنے دیتے ہیں، نہ ہی پیاس بجھاتے ہیں۔ خوابوں کے ان صحراؤں میں امیدوں اور تنہائوں کی لاشیں پڑی سکتی ہی رہتی ہیں۔“

زینب سر جھٹک کر کھڑی ہوئی تھی۔ ”میں چلتی ہوں آمنہ!“

”بیٹھو زینب! کھانا تیار ہے۔ کھا کر جانا!“ آمنہ نے بڑے خلوص سے اسکا ہاتھ تھاما۔

”نہیں۔ کھانا تو اماں نے تیار کر لیا ہوگا۔ میرا انتظار کر رہی ہوں گی وہ!“ آہستہ سے ہاتھ چھڑا کر وہ باہر نکل گئی تھی۔



گرمی سے وہ سخت بیزار ہوا کرتی تھی۔ سخت جس اور آگ برساتے سورج کی موجودگی میں گھر سے نکلنے کا تصور اسے بھیاں تک لگتا تھا۔ گھر آتے ہی سب سے پہلا کام وہ چہرے پر کوئی چیز لگانے کا کام کرتی تھی۔ اپنی سفید، بے داغ جلد اسے بہت پیاری تھی۔ کالج کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی ایسے حسن کے دشمن موسم میں باہر نہ نکلتی۔ لیکن کالج ابھی گرمی کی چھٹیوں کے سلسلے میں بند نہ ہوئے تھے اور ٹیچرز زور و شور سے پڑھائی کر رہی تھیں۔ اس دن بھی وہ کالج سے لوٹتے ہی حسن کی نگہداشت میں مشغول ہو گئی تھی۔

”نہیں!“ وہ بیسن سے چہرہ صاف کر رہی تھی۔ اماں وہیں واٹش بیسن کے پاس چلی آئیں۔

”جی اماں؟ آتی ہوں ابھی۔ نکال لیں کھانا۔“

”کھانا تو میں نے نکال ہی لیا ہے۔ وہ میں کہہ رہی تھی اب پڑھ کر سوت جانا، کوئی ڈھنگ کے کپڑے نکال کر استری کر لینا پھر سونا۔“

”کیوں؟“ وہ منہ پر پانی کے چھپکے مارنے لگی۔ ”کہیں جانا ہے؟“

”جانا نہیں ہے۔ شام کو کوئی آئے گا!“ وہ کہہ کر مڑ گئی تھیں۔ نہیں کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ تویہ سے ہولے ہولے چہرہ تھپکتے ہوئے

سوچنے لگی۔

”یہ بہم انداز تو اماں اسی وقت اپناتی ہیں جب کسی رشتے وغیرہ کا چکر ہو۔ صاف کہتے بھی نہیں اور چھپاتے بھی نہیں۔ کی تفسیر بن جاتی ہیں۔ کون لوگ ہیں؟ یقیناً نسرین خالدا اماں سے ضد کر کے ان ہی لوگوں کو لارہی ہیں۔ جھگڑا ہی نہیں، ماں باپ حیات اور چار ہزار روپے ماہوار، یا خدا! میری ماں کو عقل سلیم عطا فرما۔“

وہ پریشان سا چہرہ بنا کر کمرے میں بچے دسترخوان پر آ بیٹھی تھی۔

”جینڈیاں بنائی ہیں مسالہ بھر کر، پسندیدہ ڈش تمہاری۔“ اماں نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”جی!“ وہ چپ چاپ لقمے لینے لگی۔

”وہ باسط آیا تھا صبح۔“ اماں اس کی خاموشی محسوس کر کے بول پڑیں۔

”باسط؟“ اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”ہاں وہی لڑکا۔ تمہاری دوست فارحہ کا عزیز جس کی دکان ہے تمہارے کالج کے قریب۔“

”باسط بھائی؟“ اسے حد درجہ حیرت ہوئی۔

”کیوں؟ وہ کیوں آئے تھے؟“

”وہ کسی رشتے کا ذکر کر رہا تھا۔ تمہارے لیے کوئی خاتون آئیں گی شام کو۔“ اماں کہہ کر باہر چلی گئیں۔ جب کہ وہ لقمہ ہاتھ میں پکڑے

گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ باسط بھائی سے اس کی تھوڑی بہت جان پہچان ضرور تھی لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ وہ یوں کسی خاتون کو لے کر اس کے گھر آدھکتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ اور فارحہ ٹوٹس یا کوئی کتاب وغیرہ ان کی دکان پر چھوڑ آئی تھیں اور وہ شام کو گھر پہنچا گئے تھے۔ لیکن اس سے آگے کسی قسم کی کوئی بے تکلفی نہ تھی۔

”اور فارحہ؟“ اس نے سوچا ”فارحہ کے علم میں یہ بات ہوتی تو وہ ضرور کالج میں مجھ سے ڈسکس کرتی۔ اس کا مطلب ہے باسط بھائی نے

اس سے ذکر نہیں کیا۔ اگر ان کے علم میں ایسا کوئی رشتہ ہے تو انہوں نے فارحہ کے لیے کیوں نہ سوچا۔ میرے لیے ہی کیوں؟“ تب اچانک ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دو مہران، شاسا، دل تک اتنی آنکھیں اس کے تصور میں درآئیں۔

”اوہ کہیں وہ اجنبی، کیا نام تھا بھلا اس کا۔“

ایک مسکراتا چہرہ اس کے تصور میں گردش کرنے لگا۔

”لیکن نہیں۔“ پھر اس نے سر جھٹک دیا ”میں بلاوجہ خوش فہیوں کا شکار ہو رہی ہوں۔ کوئی اجنبی بھلا ایک ادھوری سی ملاقات میں کیوں میرے لیے رشتہ بھیجے گا۔ خیر دیکھا جائے گا۔“ اس کیلئے یہی اطمینان بہت تھا کہ یہ سرین خالہ کا بتایا ہوا رشتہ نہیں ہے۔ وہ سکون سے کھانا کھانے لگی۔



شام کو حسب توقع اماں نے اسے پانچ بجے ہی جگا دیا تھا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ برا سامنے بنائے بستر میں پڑی رہی۔ ”نہب! میں کہتی ہوں اٹھ کر نہالو۔ بیزار کر دیتی ہے تمہاری یہ ڈھٹائی مجھے۔“ بلاشبہ اماں کا آٹھواں یا نوواں چکر تھا۔

”اماں! اماں! یہاں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ گرمیوں میں چار پانچ بجے کسی کے گھر جا کر بیٹھ جائے۔ لوگ موسم کی تپش ختم ہونے پر نکلنے ہوں گے۔

”باسط مجھ سے خود چھ بجے کا کہہ کر گیا ہے۔“

”کہتے سب ایسا ہی ہیں۔“

”مرضی ہے تمہاری۔ عین قت پر دوڑیں لگاؤ گی۔ کبھی غسل خانے کی تو کبھی باورچی خانے کی جانتی ہوں تمہیں میں۔“ وہ جل کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

”توبہ توبہ! کتنا ارمان ہے اماں کو مجھے گھر سے نکال پھینکنے کا۔ بس نہیں چلتا، گھر آئے پہلے شخص کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا کہ مجھے چلتا کریں۔“

وہ اماں کے خراب موڈ کے پیش نظر فوراً ہی بستر سے نکل آئی تھی۔ ایک ہاتھ سے چوٹی کی بل کھولتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے تولیہ تھامے وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ نہا کر گلابی کاشن کا سوٹ پہن کر، گیلے بال شانوں پر بکھرائے جس وقت وہ باہر نکلی، اماں مہمانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں اندر لار رہی تھیں۔

نہب ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔

اماں کے پیچھے باسط بھائی تھے۔ ایک درمیانی عمر کی خاتون اور ان سے ذرا پیچھے وہی کھڑا تھا احسن ایاز! سفید شلوار سوٹ میں ملبوس، سلیپے سے بال جمائے وہ بڑا دھلا دھلا، کھرا کھرا لگ رہا تھا۔ اس سے نگاہیں ٹکرائیں تو نہب کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں ان نظروں میں وہی شرارت بلکھوڑے لے رہی تھی۔

گلابی سوٹ پر سفید بڑا سا تولیہ شانوں پر بکھرائے، سیاہ گیلے بالوں سے نیچلتا پانی لے لے وہ عجب خجل سی کھڑی تھی۔

”یہ ہے میری بیٹی، نہب!“ اماں نے خاتون سے اس کا تعارف کرایا۔

”اسلام علیکم۔“ اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔

علیکم السلام جتنی رہو ماشاء اللہ! بے حد پیاری بچی ہے۔ گلابی گڑیوں سی۔“ انہوں نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”آئیں، آپ لوگ اندر آ جائیں۔“ اماں کرے تک ان کی رہنمائی کرنے لگیں۔ وہ قریب سے گزرتی ہوئی ان کی جھکی نظریں اٹھ

گئی تھیں۔ لیوں پر بڑی گہری، خوب صورت مسکراہٹ لے لے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

نہب کے دل کو پر لگ گئے۔ بڑی مشکلوں سے وہ باورچی خانے تک آئی تھی۔

”عجیب آدمی ہے۔“ وہ بلاوجہ ہی مصنوعی خفگی کا اظہار خود سے کرنے لگی۔ ”نظروں میں ذرا لحاظ نہیں۔ ایسے دیکھتا ہے جیسے میں اسکی

اسکی۔“

اس کے گال اپنی ہی سوچ کی تپش سے سگ اٹھے۔

’نہنب!‘ اماں باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوئی تھیں۔ چائے کا پانی رکھو۔ میں نے پڑوس کے بچے کو بھیجا ہے سمو سے اور بسکٹ لینے کے لئے۔ سب چیزیں سلیقے سے رکھ کر اندر لے آنا۔“

”اماں!“ اس نے بے چین ہو کر انہیں پکارا۔ میں، میں اندر نہیں آؤں گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہ لوگ اچھے اور شریف ہیں۔ چائے دے جاؤ پھر بے شک مت بیٹھنا۔“

اماں سنی ان سنی کر کے چلی گئی تھیں۔

اور نہنب کا دل اس کے سامنے جانے کے تصور سے گھبرانے لگا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا جب کسی کی نظروں نے برملا پسندیدگی کا اظہار کیا تھا، پیغام بھیجے تھے، جواب مانگا تھا۔ نہنب کی نظریں جواب دینے کے قابل نہ تھیں، حیا کے بوجھ سے جھک جھک جاتی تھیں۔

”کیسا شخص ہے۔ ایک نظر دیکھا اور زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر کے اتنے رعب سے چلا آیا۔ جیسے میں تو تیار ہی بیٹھی ہوں ناں اٹھ کر ساتھ چل دوں گی اور نہہی سستی تو نہیں میں، ایسے ہتھلی پر دل لے کر پھرنے والوں کا کیا بھروسہ۔ آج اس کے پیچھے تو کل اس کے اور پھر ایسا ہی ہے۔ ایسے سا، پھٹپھٹا ہوا ٹیکہ ہے جو اشارت ہونے میں برسوں لگا دیتی ہے۔ میں تو ہاں کہوں گی کسی گاڑی والے کو، عالی شان کوٹھی ہو جس کی۔ جسے دیکھتے ہی دل کہے، ہاں یہی تو ہے۔“ وہ چائے کا پانی چو لے پر رکھ کر نجانے کن خیالوں میں کھو گئی تھی۔

”باجی! یہ سمو سے اور بسکٹ۔“ پڑوسیوں کا لڑکا اس کے سر پر آن پہنچا تب وہ چونکی۔

”ہاں، ہاں لاؤ۔“

اسے خیال آیا مہمانوں کو اندر بیٹھے بہت دیر گزر گئی تھی۔

”اماں، اماں تو مغز پلپلا کر دیں گی باتیں سنا سنا کر۔“ وہ جلدی جلدی پلٹیں نکال کر صاف کرنے لگی۔ ”پہلے ہی خوار ہوتی ہیں میرے سلیقے

اور ہنرمندی سے۔“

ساری چیزیں بڑی سی ٹرے میں سجا کر وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی۔ اندر جانے کا اور احسن ایاز کا سامنا کرنے کا اس کا ارادہ نہ

تھا۔

”اماں! اماں چائے۔“ اس نے دھیرے سے پکارا تھا۔

”نہنب! بیٹا! اندر آ جاؤ۔“ اماں نے اس کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔

ناچار اسے اندر داخل ہونا پڑا۔ سیاہ آبتار سے بال پشت پر نکھرے، لبوں کو دانتوں سے کاٹتی وہ خفا خفا سی، گھبرائی گھبرائی سی براہ راست اس کی نگاہوں کی زد میں تھی۔

”آپا! چائے آپ نکالیں۔“

اس کے ہاتھوں کی لرزش شاید اس سے چھپی نہ رہی تھی۔ اس کی اندرونی کیفیت سمجھ گیا تھا۔ اُس نے بڑی نرم آواز میں اپنے ساتھ آئی خاتون سے کہا تھا۔

”بیٹھ جائیں بیٹا! آپ۔“ خاتون نے کیتلی اس کے ہاتھوں سے لے لی۔

نہنب بیٹھنے کے بجائے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو چھت پر چلی آئی۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ بے مقصد ادھر ادھر ہلتی رہی تا وقتیکہ نیچے سے اماں نے پکار لیا۔

”نہنب! نیچے آ جاؤ بیٹا! مغرب ہو گئی ہے۔“

وہ دھیرے دھیرے میز حیاں اترتی نیچے چلی آئی۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔

”چائے کے برتن سمیت لو بیٹا! میں ذرا نماز سے فارغ ہو لوں تو رات کی روٹی ڈالوں گی!“ زینب نے اماں کا چہرہ دیکھا۔ اماں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ ان کا رد کردہ چہرہ اندرونی خوشی کے احساس سے چمک اٹھا تھا۔ ان کی چال میں تیزی سی آگئی تھی۔ اس کے..... دل کو عجیب سے احساس نے آگھیرا۔

”نجانے کیسے لوگ ہیں۔ کیا کہہ کر گئے ہیں۔ اماں نے کیا جواب دیا ہے۔ اماں کے انداز تو بہت مختلف ہیں۔ دیکھنے میں تو عام، بالکل عام لگ رہے تھے۔ خاتون کے کپڑے تو بالکل سادہ سے تھے۔ شاید اس کی بہن تھیں۔ شکل کا تو اچھا ہے بلکہ بہت اچھا ہے لیکن شکل سے کیا ہوتا ہے امیر ذرا بھی نہیں۔ امیر لوگ تو الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہائے! کہیں اماں پوچھے بنا ہاں نہ کہہ دیں اور یہ باسط بھائی انہیں کس نے مشورہ دیا ہے رفاہ عامہ کے کام سرانجام دینے کا۔ اس روز اس سے بوتلوں کے پیسے لے لیے تھے۔ آج اسے لے کر گھر چلے آئے۔ پوچھوں گی ان سے تو۔ فارحہ کو کچھ خبر نہیں، کل کالج میں بات کروں گی۔“

جب تک اماں نماز سے فارغ نہ ہو گئیں۔ اس کا ذہن عجیب منتشر، بے ربط سوچوں کی آماجگاہ بن رہا۔ اماں روٹی پکانے بیٹھیں تو وہ صحن میں بستر لگانے لگی۔ کھانا کھا کر دونوں ماں بیٹی برابر برابر لیٹ گئیں۔

”زینب!“ اماں نے بڑی محبت سے اسے پکارا۔

”جی اماں!“ وہ آہستگی سے بولی۔

”بیٹی! خوش قسمتی بار بار پلٹ کر نہیں آتی۔ احسن بہت اچھا لڑکا ہے۔ نیک، شریف، برسر روزگار، پھر بڑی امیدوں سے، تمناؤں سے آیا ہے۔ ہتھیلی کا اچھا ہالہ بنا کر رکھے گا۔ مجھے بھی اس کی صورت میں ایک جوان، مضبوط بینا مل جائے گا۔“

وہ خاموش لیٹی ستاروں سے بھر آسمان دیکھتی رہی۔

”کسی ٹل میں ملازم ہے آٹھ ہزار تنخواہ پر۔“

”آٹھ ہزار۔“ زینب کا دل ٹوٹ گیا۔ بس آٹھ ہزار؟ اتنے سے پیسوں میں تو آج کل سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی مشکل ہے۔“

”اکیلا ہے نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔“ اماں اس کی کیفیات سے بے خبر بولتی رہیں۔ ”جس عورت کو ساتھ لایا تھا، وہ مالک مکان کی بیوی ہے۔ بہن بنارکھا ہے اسے۔“

”مالک مکان؟“ اسے پھر دھچکا لگا۔ ”تو اپنا گھر بھی نہیں، آدھی تنخواہ سے تو کرایہ ادا کر دیتا ہو گا مکان کا۔“

”باسط کا پرانا شاسا ہے۔ باسط تو اس کے علی کردار کی قسمیں کھا رہا تھا۔ وہ عورت بھی بڑی تعریفیں کر رہی تھی۔ کہتی تھی خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جو احسن کی بیوی بنے گی۔“

”تعریفوں کے لئے ہی تو لایا تھا ان دونوں کو۔“ اس نے جل کر سوچا۔ ”انہوں نے تو تعریفیں کرنی ہی تھیں۔“

”میں کہتی ہوں زینب! ہر لحاظ سے بہترین رشتہ ہے۔ سلجھا ہوا، باکر دار لڑکا ہے۔ اچھا کماتا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، بہت ترقی کرے گا خدا نے چاہا تو۔ شکل کیسی بھلی ہے، دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔“

”آپ کا دل ہی اتنا سادہ اور معصوم ہے۔ اماں! میرا دل تو کہیں گہرائیوں میں ڈوبا جاتا ہے۔“ وہ اماں کی خوشیاں دیکھ کر اداس ہو گئی تھی۔ ”پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ دو دن بعد جواب مانگا ہے انہوں نے۔“

”نیندا آ رہی ہے اماں۔“ اس نے کروٹ لے لی۔ ”صبح کالج بھی جانا ہے۔“

اماں نے گہری سانس بھری تھی۔



”ہوں! تو محترم گھر تک پہنچ گئے۔“ فارحہ نے ساری بات سن کر ماتھے پر شکنیں ڈالی تھیں۔

”اور یہ باسط بھائی! ان کی عقل کیا گھاس چرنے لگی ہے جو یہ حرکتیں کرتے پھر رہے ہیں۔“

”اصل بات تو یہ ہے فارحہ! کہ اماں خوش ہیں۔ بہت خوش، ایک دن میں ان کا چہرہ چمک اٹھا ہے۔ احسن نے انہیں بے حد متاثر کیا ہے!“

”کہیں تمہیں تو نہیں متاثر کر دیا اس نے؟“ فارحہ نے اسے گھورا۔

”مجھے؟“ وہ نظریں چرا لگی۔ ”نہیں، بھلا میں تمہیں اتنے کمزور دل کی لگتی ہوں؟ اتنی جلدی مجھے کوئی متاثر نہیں کر سکتا۔ ہاں، یہ ہے کہ وہ لگتا

مخلص ہے۔ ورنہ آج کل کون لڑکا نظربازی سے آگے کی بات کرتا ہے۔“

”ہونہہ! ملتی نہیں ہوگی محترم کو کوئی۔ بھلا یہ کوئی رشتہ ہے جس پر اماں اتنا خوش ہو رہی ہیں۔ آٹھ ہزار میں کوئی کیا کیا کرے؟ گھر کا کرایہ

بھرے، راشن خریدے، بل جمع کرائے، پٹرول جلائے پھر بیماری میں دوا دارو ہے، آنا جانا، دینا دلانا، کیا خرچ کرو گی کیا بچاؤ گی۔ آج تو لان کا ایک

سوٹ خرید کر لاؤ تو ہزار کے نوٹ کا پتا نہیں لگتا۔ بقیہ شوق تو بہت دور کی بات ہیں۔“

”لیکن فارحہ! اماں کہتی ہیں، انسان کو وہی ملتا ہے جو اس کے نصیبوں کی کتاب میں درج ہے۔“ وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ ”کیا خبر میرے

نصیبوں میں یونہی ذرا ذرا سی شے کے لئے ترسنا لکھ دیا ہو خدا نے۔ ساری عمر ایک چیز کے لئے مبینوں مبینوں انتظار کیا ہے۔ ماموؤں کا منہ دیکھنا

پڑا ہے۔ ممانیوں کے طعنے سہے ہیں۔ شاید آگے بھی یہی کچھ کرنا ہو۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو زینب!“ فارحہ نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”اللہ تعالیٰ یہ بھی کہتا ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے

جس کی وہ سچی کرتا ہے۔ امید کے دیے کو کچھ مدت دو یہ چھوٹے موٹے رشتے تو عام سے عام لڑکی کے بھی آتے رہتے ہیں۔ تم ذرا غور سے آئینہ تو

دیکھو، کیا اصول بنایا ہے خدا نے تمہیں۔ عمر گزر جاتی ہوگی لوگوں کی تب کہیں ایک آدھ چہرہ ایسا دکھائی دیتا ہوگا۔ ایسی شہد رنگت تو کسی کسی کو دیتا ہے

خدا۔ اس پر یہ غرالی آنکھیں، ایسا مناسب سراپا۔“

زینب بے اختیار ہنسنے لگی۔

”تو بہ ہے فارحہ! جوش جذبات میں تم اتنی مبالغہ آرائی بھی کر سکتی ہو۔“

”مبالغہ آرائی؟ یعنی کہ حد ہو گئی۔ میں غلط کہہ رہی ہوں کیا؟“

”اب میں ایسی بھی حسین نہیں۔“ زینب نے چھینپ کر سر جھکا لیا۔

”پوچھنا ذرا احسن ایاز صاحب سے، کیوں پہلی نظر میں دیوانے ہو گئے وہ۔ پوچھو ذرا کسی لڑکی کو روک کر، کیا کیا قصے مشہور ہیں پورے کالج

میں تمہارے حسن کے۔ لڑکیاں ایسے رشک بھرے انداز میں ایک دوسرے سے تمہارا ذکر کرتی ہیں کہ کیا کسی ہونہر کا ہوتا ہوگا۔ ارے زینب! قدر کرو

اپنی۔ ذرا سا صبر سے کام لو، دیکھنا کوئی نہ کوئی بزنس مین لینڈ لاؤ، کوئی نہ کوئی وڈیو کے کا پتر ضرور نکلے گا تم سے عیش کرو گی عمر بھر احسن صاحب کے

پلے بندھ کر تو ساری عمر برتن ہی مانجھتی رہنا۔“ آخر میں وہ جل کر بولی تھی۔

”لیکن فارحہ! اماں، اماں! کو اب مزید دکھ نہیں دینا چاہتی۔ کب سے وہ اپنے دل میں مجھے میرے گھر کا کر دینے کا ارمان لیے بیٹھی ہیں۔

پھر وہ خوف زدہ ہیں۔ ان کے سوا بے کون میرا۔ بھائیوں سے انہیں کوئی اچھی امید ہے نہیں۔“

”میں ملوں گی اماں سے۔ سمجھاؤں گی انہیں۔ یہ ظلم نہ کریں تمہارے ساتھ وہ۔ اتنے لاڈلوں سے پالا ہے۔ کچھ تو خیال کریں۔ خود ساری

عمر باورچی خانے میں گزار رہی ہے سیاہ برتنوں سے لڑتے ہوئے تمہارے لیے تو اچھے ماحول کی امید رکھیں۔ کچھ نہیں دے گا زینب! وہ آدمی تمہیں

سوائے بچوں کی لائن کے۔ ابھی جو حسن کا خمار اس کی آنکھوں پہ چھایا ہے۔ وہ بھی اتر جائے گا پہلے بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی۔ پھر ساری عمر تم

دونوں پیسوں کے لئے لڑو گے۔ وہ تو صبح اٹھ کر گھر سے نکل جائے گا۔ پیچھے تم ہوگی، بچوں سے بھرا گھر ہوگا، نا آسودہ تنہائیں ہوں گی اور کبھی نہ ختم



ازم دولازمانیں تو انورڈر سکوں۔ روکے بالوں کا جوڑا لپیٹے ہر وقت باورچی خانے میں کھسی رہوں گی۔“
چپلیں پہن کر وہ سپر سپر کرتی باہر چلی گئی تھی اماں شہنشاہی آہ بھر کر بستر پر بے سدھ ہو کر لیٹ گئیں۔



اماں نے اس سے اگلے روز ہی باسط بھائی کو انکار کھلا بھیجا تھا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ وقتی طور پر وہ اس سے ناراض ضرور ہو جایا کرتی تھیں لیکن ان کی ناراضی پانی کا بلبل ثابت ہوتی تھی۔ وہ اس کی خواہشات کو بیک جنبش قلم رد کر دینے کا حوصلہ بھی خود میں نہ پاتی تھیں اور وہی کیا کرتی تھیں جو وہ کہتی تھی۔

اس واقعے کے تین چار دن کے بعد ایک روز جب وہ کالج سے واپسی پر فارحہ کے ساتھ سڑک پار کر رہی تھی کسی نے پیچھے سے اسے پکار لیا۔

”من زنب! اذرا رکیے“

زنب نے مڑ کر دیکھا سامنے احسن ایاز کھڑا تھا۔

”آپ؟“ اس کے بجائے فارحہ بولی تھی۔

”فرمائیے؟ جواب نہیں پہنچا آپ کو؟“

”زنب! میں آپ سے مخاطب ہوں“ اس نے فارحہ کی بات سنی ان سنی کر دی۔ بے حد پناہیت بھرا انداز تھا۔ حکم کا ہلکا سا احساس لیے ہوئے۔

”آپ چند لمحوں کے لیے میری بات سن سکتی ہیں؟ باسط بھائی کے اسٹوڈیو تک چلتے ہیں۔“

”پلیز!“ زنب کی کچھ سمجھ میں نہ آیا، وہ ہونٹوں کی مانند ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس شخص کی نگاہوں میں کوئی طلسم تھا۔ اس کا دل کسی وحشی پرندے کی مانند سینے کی دیواروں سے ٹکراتا تھا۔

”کیا تمنا ہمارے ہیں سسر آپ؟“ فارحہ ایسی صورت حال سے نمٹنے کی صلاحیتیں رکھتی تھی۔ نہایت سخت لہجے میں بولی۔

”ہم شریف لڑکیاں ہیں، یوں اجنبی مردوں کی دعوت پر منہ اٹھا کر نہیں چل دیتیں۔ براہ مہربانی اپنا راستہ ٹاپے چلو زنب!“

زنب کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کے الفاظ سن کر زنب کا بھی حوصلہ نہ پڑا کہ وہ اس کو کوئی رسائیت بھرا جواب دیتی۔

چپ چاپ سر جھکائے وہ فارحہ کے پیچھے چلتی چلی گئی۔ احسن ان کے پیچھے نہ آیا تھا۔

گھر آ کر وہ بڑی خاموشی سے سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ اماں نے دو تین مرتبہ پوچھا بھی تو اس نے سر درد کا بہانا کر دیا۔ اس کا دل اداس ہو رہا تھا۔ اندر سے بے کل ہو چکی تھی وہ شاید کہیں کوئی چنگاری سی جل اٹھی تھی۔

”زنب! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

”زنب! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

”زنب! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

وہی نرم لہجہ شناسا نظریں اس کی سوچوں میں در آئیں۔ شور مچانے لگیں۔

”زنب!“ اس نے خود اپنا نام زیر لب لیا۔

”زنب! کتنے پیار سے، پناہیت سے پکارتا ہے۔ اسے نام پر پیارا آنے لگتا ہے۔ میں انکار کر چکی ہوں لیکن یہ دل؟ جب اسے مقابل پاتا ہے اس کے حضور جھکتا ہی چلا جاتا ہے۔ اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں کیسا بھلا شخص ہے۔ سلجھا ہوا، نرم مزاج، باکر دار کتنی حلاوت ہے اس کے لہجے میں، کیسی

محبت ہے اس کی آنکھوں میں۔ کاش کہ میں نے کچھ خواب یوں نہ بجائے ہوتے یا کاش کہ تم بہت امیر بہت دولت مند ہوتے تب میں خود کو اس دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی سمجھتی۔ اے کاش!



اداسی دوسرے روز تک برقرار تھی۔ وہ کالج بھی نہ گئی۔ موڈ سخت آف تھا۔ مستزاد یہ کہ اماں نے مختلف باتوں پر دو تین مرتبہ جھاڑ پلا دی۔ وہ بکھر بکھر گئی۔

”میں جا رہی ہوں ذرا آمنہ کی طرف!“ منہ پھلائے وہ کمرے میں آئی تھی۔
 ”جاؤ، تمہیں اور کام ہی کیا ہے۔“ نہ جانے کیوں اماں بھی صبح سے تپی بیٹھی تھیں۔ ”جلدی آ جانا۔“ وہ آمنہ کے ہاں چلی آئی۔
 آمنہ دوپہر کا کھانا پکا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔
 ”کوئی اور دعا مانگتی خدا سے تو وہ بھی پوری ہو جاتی۔ سچ! تم سے ملنے کو دل کر رہا تھا۔“
 ”تمہاری دعائیں قبول ہوتی ہیں آمنہ؟“ وہ اداسی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”پھر میرے لئے بھی دعا کیا کرو۔“
 ”اللہ سب کی دعائیں سنتا ہے نہ سنا ہے! یہ ضرور ہے کہ ایک بندے کی دعا دوسرے کے حق میں جلدی قبول ہوتی ہے۔ میں ضرور دعا کروں گی تمہارے لئے۔ ویسے کیا معاملہ ہے؟“ پھر وہ شرارت سے مسکرائی ”کس سلسلے میں دعائیں منگوائی جا رہی ہیں؟ کسی مغرور صنم پر دل تو نہیں آ گیا میری پیاری دوست کا؟“

”معاملہ کچھ اس کے برعکس ہے۔“ زینب بھی ہنس دی۔
 ”اچھا! چلو ذرا روٹی پکالوں، پھر اندر چل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ جلدی جلدی پیڑا بنانے لگی۔ دونوں کھانے سے فارغ ہوئیں تو زینب نے مختصر اسے ساری روداد سنا ڈالی۔

”زینب!“ آمنہ حیرت زدہ ہو گئی تھی۔ ”کیسی بے عقل لڑکی ہو تم؟ ارے کسی کے غلوں اور محبت سے بڑھائے گئے ہاتھ کو ایسے بھی جھینکتے ہیں؟“

”فارحہ کہتی ہے۔“ وہ نظریں جھکا کر کہنے لگی۔
 ”بے وقوف ہے فارحہ۔ بلکہ نرمی جاہل ہے۔ زندگی میں دولت کی اہمیت ہے، میں مانتی ہوں۔ لیکن اس کے لئے یوں دیوانگی کی حدود کو چھو لینا کہاں کی دانائی ہے۔ خدا نے تمہاری قسمت میں روپیہ لکھا ہوگا تو اسی شخص سے بہت کچھ ملے گا تمہیں۔ عورتوں کا نصیب تو مرد کو مالا مال کر دیتا ہے۔ کیا خبر اگر مجھ چل کر کتنی ترقی کرے گا یہی شخص پھر ابھی اس کا ساتھ دوگی تو ساری عمر پکوں پر بٹھا کر رکھے گا تمہیں۔
 اپنی ترقیوں، کامیابیوں کا سہرا تمہارے سر باندھے گا۔ امیر آدمیوں کے تو اپنے ہزار خرچے ہوتے ہیں۔ بیوی کو روپیہ کھلا دیتے ہیں تو محبت میں ڈنڈی مارتے ہیں۔ وفا کیں ادھوری رکھتے ہیں اور ایک وفا شعار عورت کے لئے یہ سب سے بڑا عذاب ہے۔ نا سنجھی سے کام نہ لو زینب! مجھے لگتا ہے یہ آدی تم سے بے حد محبت کرنے لگا ہے۔ تمہارا ساتھ پا کر تو پوچھا کرے گا۔ تمہاری۔ اسے یوں مایوس نہ کرو زینب!“

آمنہ نہ جانے کیوں اس قدر جذباتی ہو گئی تھی۔
 ”مجھے کسی نے ایسے چاہا ہوتا، اسنے پیار سے مانگا ہوتا تو میں خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ ہاتھوں کو نہ دیکھو زینب! دل کو دیکھو ہاتھ خواہ خالی ہوں۔ دل بھرا ہوا ہونا چاہیے۔“



”وہ بیٹھی کچھ نوٹس مکمل کر رہی تھی جب باہر دروازہ بجا۔“

”اماں! کوئی ہے باہر۔“

اس نے باورچی خانے میں مصروف اماں کو آواز لگائی۔

اماں دروازہ کھولنے چل دیں۔

کام میں مصروف زینب کے اچانک ہی کان کھڑے ہوئے تھے۔ باہر سے آتی مردانہ آواز کو اس نے پہچاننے کی کوشش کی پھر وہ اچھل ہی

پڑی۔

”اچھا! یا ز!“

”زینب! اماں کمرے میں آئی تھیں۔“ تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ بھیج دوں اندر؟“

اسے اماں سے یہ امید نہ تھی۔ ”آ جاؤ بیٹا،“ اماں نے اسے پکار لیا وہ ہوتی بنی انہیں دیکھتی رہی۔

”اسلام علیکم۔“ اس نے اندر آ کر، لبوں پر مسکراہٹ سجا کر سلام کیا تھا۔

”بیٹھو بیٹا! میں آتی ہوں!“ اماں کمرے سے نکل گئی تھیں۔

”بیٹھ سکتا ہوں؟“

زینب نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ اسے ان ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ بڑے کمزور لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے مقابل رکھی ہوئی کرسی پر آ بیٹھا اور

اس پر نظر جما کر بولا۔

”چند وضاحت طلب، دل و دماغ میں کھلبلاتے ہوئے سوالوں کے جواب۔ میں وعدہ کرتا ہوں زینب! آپ کو پریشان نہیں کروں گا اگر

ایک بار آپ میری تسلی کر دیں تو دیکھیں زینب! بات دراصل یہ ہے کہ مسٹر دکر دینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن مسٹر دکر دیا جانا کسی قیامت سے کم نہیں اور

پھر اسکے ہاتھوں جو شوق کا مرکز بن چکا ہو۔ ایک عجب بے کلی سی لگی ہے۔ دل کو جب سے یہ علم ہوا ہے کہ۔۔“ وہ لمحہ بھر کے لئے رکا تھا۔

”کہ آپ نے زندگی کے سفر میں، میری ہم سفری سے انکار کر دیا ہے۔“

وہ خاموش ہو کر اسے سنانے لگا تھا۔ زینب سختی سے لب بھیجنے ایک تنک اپنی گود میں دھرے ہاتھوں کو تک رہی تھی۔

جذام (معاشرتی رومانی ناول)

جذام ایک معاشرتی رومانی ناول ہے جس میں بشری سعید نے ہمارے اس عقیدے کو بہت خوبصورتی سے کہانی کے تانے بانے میں

بنا ہے کہ جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی آزمائش لیتا ہے اور اس آزمائش میں پورا اترنے والوں کے درجات بلند کرتا

ہے، وہیں دوسری طرف وہ اپنے گناہ گار اور صراطِ مستقیم سے ہٹنے والے بندوں سے بھی منہ نہیں پھیرتا بلکہ انھیں بھی سنبھالنے کا ایک موقع

ضرور دیتا ہے۔ شرط صرف صدقِ دل سے اُسے پکارنے کی ہے پھر چاہے معصومِ فطرت ”عائشہ“ ہو یا فطنی طور پر کوڑھی ”جائشہ“ وہ سب

کی پکار سنتا ہے۔ سب پر رحم کرتا ہے۔ اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ **جذام** کتاب گھر بردستیاب۔ جسے **ناول**

سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”زینب! میرے ایک سوال کا جواب اگر آپ نے ہاں میں دے دیا تو وعدہ کرتا ہوں۔ نہایت خاموشی سے اٹھ کر میں آپ کے کمرے، آپ کے گھر اور آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گا اور پھر، کبھی بھی، کہیں بھی آپ سے دانستہ ٹکرانے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

زینب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا پھر فوراً چپکلیں دوبارہ گرالیں۔

”آپ، آپ کسی دوسرے شخص میں انٹرسٹڈ ہیں۔؟“

”جی نہیں۔“ وہ بنا کر کسی تردید کے فوراً ہی بول اٹھی تھی۔

احسن کے لبوں پر بڑی خوبصورت، مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اسے جیسے کسی نے نئی زندگی کی نوید سنا دی ہو۔

”پھر؟ وجہ جان سکتا ہوں آپ کے انکار کی؟“ اب کی بار بڑے دھیسے لہجے میں بڑی رسائیت سے اس نے پوچھا۔

زینب نے خشک ہوتے ہوئے حلق کو محسوس کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ اماں کا کہیں پتا نہ تھا۔ اور وہ کھلے ہوئے دروازے کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ فرار کے تمام رستے مسدود تھے۔

”اگر آپ میرے سوالوں کو لکھی بخش کر جانا چاہتی ہیں تو بے شک جائیں۔ میں رستے میں بیٹھا ضرور ہوں لیکن آپ کا دامن نہیں پکڑوں گا۔“ وہ مسکرا دیا۔

بڑی ذومعنی بات تھی۔ زینب کے لبوں پر بھی کمزوری مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

”لیکن کیا ہی اچھا ہو زینب! اگر آپ سائل کو کچھ دے کر جائیں۔“

”باتیں بنانا تو بہت آتی ہیں آپ کو۔“ وہ آہستگی سے کہہ گئی۔

”جی ہاں! اعتراف ہے۔ لیکن میں باتیں نہیں زندگی بنانا چاہتا ہوں، زندگی! ایسا لگتا ہے زینب ایک..... فریم ہے جس میں ایک سادہ، سفید کاغذ لگا ہے۔ فی الحال زندگی میرے لئے اسی سادہ، بے رنگ کاغذ کا نام ہے۔ آپ کو دیکھا تو یاد آیا یہ کاغذ ہمیشہ یونی نہیں رہتا۔ اس پر ایک تصویر ابھرتی ہے۔ اس میں رنگ بھرنے ہیں، پھول کھلے ہیں۔ جس لمحے آپ نظر آئیں زندگی کے کاغذ پر تصویر ابھر گئی۔ نقش بیدار ہو گئے۔ لیکن جب میں نے رنگ بھرنے چاہے، پھول کھلانے چاہے تو.....“ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

”میری تمناؤں کو یوں لا حاصل نہ کرو زینب۔!“ وہ بڑبڑایا تھا۔

زینب نے پریشانی سے اس کی سمت دیکھا۔ اسے لگا وہ اسے قید کر رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے پردوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ رہا تھا۔ وہ بے بس ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان سے زمین پر آ رہی تھی۔

”مجھے، مجھے مجبور نہ کریں احسن صاحب۔!“ وہ دفعتاً بستر سے اتر کر دوسری جانب کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

”کوئی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا زینب! جب تک کہ درمیان میں یہ نامراد محبت نہ چلی آئے۔“ وہ کھڑے ہو کر آہستگی سے بولا۔ ”میں آپ کو

مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ مجھ سے محبت کریں مگر آپ مجھے مجبور کر چکی ہیں کہ میں آپ کو چاہنے لگا ہوں۔“

زینب کا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا کہ وہ سارے بدن میں اسے دھڑکتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ وہ اس کی طرف سے بالکل پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔

”میں بہت سیدھا، کھرا، بے ریا انسان ہوں۔ جو نظر آتا ہوں، وہی ہوں۔ جو سوتا ہوں، دھڑک کہہ دیتا ہوں۔ تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو دل نے لمحہ بھر میں فیصلہ کر لیا کہ یہی ہے وہ جسے اب تک لاشعوری طور پر کھوجتا چلا آ رہا تھا۔ سو اسی لمحے تمہیں بتا دیا کہ دل نے کیا فیصلہ کر ڈالا ہے۔ گھر تک پہنچا تو ٹھان چکا تھا کہ جو ہو، جہاں رہتی ہو، تمہیں ڈھونڈنا ہے، تم تک پہنچنا ہے، اپنا بنانا ہے۔ اتنی ہی ایمانداری اور تقدس سے جتنی مقدس تم دکھائی دیتی ہو۔ گواہ ہو زینب تم بھی اس بات کی کہ میں نے سب سے راست رستہ اختیار کیا اور بڑی ایمانداری سے اپنا آپ تمہاری والدہ کے سامنے رکھ کر ان سے تمہارا ہاتھ طلب کیا۔ میں نے کوئی بہم اہم از نہیں اپنایا۔ کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی۔ کیا یہ میرا حق نہیں ہے زینب کہ مجھ سے بھی یہی رویہ

روا رکھا جائے۔ مجھے بھی اتنی ہی صفائی سے میری اس خامی سے آگاہ کر دیا جائے جس کی بنا پر مجھے مسترد کیا جا رہا ہے۔ کیا خرابی ہے مجھ میں؟ جاننا چاہتا ہوں اسی لئے تمہاری والدہ کی اجازت سے یہاں کھڑا ہوں۔“

نہب نے مڑ کر اسے دیکھا۔ کرسی کی پشت اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھامے وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔
”بعض باتوں کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ احسن صاحب!“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔

”ایسا تو نہیں۔“ اس نے نہب کی بودی دلیل مسترد کر دی ”تم بالغ، شادی کے قابل ہو۔ آج میرا نہیں کل کسی دوسرے کا رشتہ قبول کرو گی۔ کیا فرق ہوگا اس میں اور مجھ میں، مجھے یہ بتادو۔“

”کوئی زبردستی ہے“ وہ زچ ہو گئی۔ ”جوابدہ ہوں آپ کے آگے میں؟“
”نہیں۔!“ اس کا لہجہ ٹوٹ گیا۔

وہ یک دم اداس نظر آنے لگا۔

”مجھے اعتراف ہے۔ میرے اور تمہارے بیچ زبردستی کا کوئی حق، کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو.....“
”تو میں بتا دیتی ہوں۔“ اماں کی آواز پردنوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا تھا۔

”اماں!“ نہب کی آواز میں شکایت تھی، احتجاج تھا۔ ”اماں آپ.....“

”بات اصل میں یہ ہے احسن میاں کہ میری بیٹی پیدا تو دو کروں کے گھر میں ہوئی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں خواب محلوں کے سجے ہیں۔ جب اس کے ابا کا انتقال ہوا تو ان کی تنخواہ چند سو روپے ماہوار تھی اور اب اسے آٹھ ہزار بھی گزارا کر کے لے کر تھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بیاہ کر کسی ایسے عالیشان جگہ میں جانا چاہتی ہے جہاں آٹھ ہزار یہ ہر ماہ اپنے نوکروں کو دے دیا کرے۔ اسکے لئے یہ ساری عمر اس گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر انتظار کرنے کے لئے تیار ہے جس کا کرایہ ہر ماہ اس کے ماموں دیا کرتے ہیں۔ یہ چاہتی ہے کہ جب میں مروں تو ایسے ہی بے سکون مروں جیسے زندگی بھر بے سکون رہی ہوں۔“ اماں کی آواز بھیگ گئی۔

نہب میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ باہر آ کر اس نے میزبھوں کا رخ کیا اور چھت پر چلی آئی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے۔

”کیوں یہ شخص میرے پیچھے پڑ گیا ہے کیوں۔“ اس نے دوپٹے سے آنکھوں کو رگڑا۔ ”اس کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ پیچھے کیوں نہیں ہٹ جاتا۔ چند روز میں میری ماں کو میرے خلاف کر دیا ہے اس نے مجھے کہاں سے آسیب بن کر چلا آیا ہے۔“

وہ وہاں بیٹھی روتی رہی۔ رات کا اندھیرا پھیلنا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ آہستگی سے میزبھیاں اتر کر وہ نیچے آئی تو اماں اپنے وقت سے بہت پہلے ہی لیٹ کر سو چکی تھیں۔

وہ بھی آرزوگی سے ان کے برابر لیٹ کر زندگی میں اچانک ہی درآئے والے اس واقعہ پر غور کرنے لگی۔



اگلے روز کالج کی چھٹی تھی سواس روز بھی وہ گھر پر ہی تھی۔ صبح وہ جان بوجھ کر دیر سے اٹھی۔ اماں بڑی خاموشی سے اپنے روزمرہ کاموں میں مشغول تھیں۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر وہیں برآمدے میں بیٹھ گئی۔

اماں نے دیر تک اس کی سست کوئی توجہ نہ کی اور ادھر سے ادھر پھرتی چھوٹے چھوٹے کام پھرتی رہیں۔ زینب کو پھر رونا آنے لگا۔ کیسی دیوار سی کھڑی ہو گئی تھی دونوں کے بیچ چند دنوں میں ورنہ عام طور پر اس کی چھٹی ہوتی تو اماں قدرے خوش نظر آتی تھیں۔ اس کے لئے خاص طور پر ناشتے کا اہتمام کرتیں۔ کوئی اچھی سی میٹھی چیز بناتیں کہ وہ میٹھا بڑے شوق سے کھاتی تھیں۔ وہ دیر تک سوتی رہتی تو بار بار اسے جگاتیں، ناشتہ کرنے پر اصرار کرتیں۔ لیکن آج اماں کا رویہ ویسا نہ تھا۔ انہوں نے اس سے چائے بنانے کو بھی نہ کہا۔ زینب کچھ دیر بیٹھی رہی پھر کمرے میں آ کر اپنی کتابیں اور نوٹس دیکھنے لگی۔

”زینب!“ اماں سے رہانہ گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ چلی آئی۔ ”ناشتا کر لو پراٹھا بنا رکھا ہے۔“

”دل نہیں چاہ رہا اماں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کیوں؟ آج دل کیوں نہیں چاہ رہا؟ چائے بھی نہیں پی تم نے۔؟“

وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئیں تو اس سے رہانہ گیا۔ وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”اماں، اماں آپ کیوں ناراض ہیں مجھ سے۔؟ ایسا کیا کیا ہے میں نے۔“

”نہیں زینب! میری بچی۔! میں ناراض نہیں تجھ سے۔“ ماں کی آواز بھی بھیگ گئی۔ وہ اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگی ”میں

ناراض ہو ہی نہیں سکتی تجھ سے۔ زندگی سے روٹھ کر کہاں جاؤں گی؟ کون جان کر روٹھ سکتا ہے اپنی زندگی سے۔“

”اماں اماں! خواب دیکھنا جرم ہے کیا؟ خوشیوں کی تمنا کرنا گناہ ہے۔؟ امید کے چند دیے جلا کر بیٹھنا اتنی بڑی خطا ہے کہ ماں بھی روٹھ

روٹھ جاتی ہے۔ اماں آپ اپنی بیٹی کے دل کی بات کیوں نہیں سمجھتیں؟ میں احسن ایاز کو ناپسند نہیں کرتی، اسے ٹھکرا نہیں رہی لیکن مجھے ایسا لگتا ہے

اماں، جس کا مجھے انتظار ہے وہ یہ شخص نہیں۔“

”ایسا ہی لگتا ہے بیٹی، ایسا ہی لگتا ہے۔“ اماں نے گہری سانس بھری۔ ”یہ دل ایسے ہی دھوکے دیتا ہے۔ یہ نفس ایک شیطان ہے۔ ایسے

ایسے سبز باغ دکھاتا ہے کہ آدمی کو پتا بھی نہیں لگتا عمر تمام ہوتی ہے اور ہاتھ کیا آتا ہے۔؟ پچھتاوے، روگ، ناقابل تلافی نقصان۔ میں تیری ماں

ہوں، میری عمر کا حاصل ہے تو۔ کیا میں تیرے لئے برا سوچ سکتی ہوں؟ کوئی غلط فیصلہ کر سکتی ہوں؟ جلد بازی میں کیا میں تجھے کسی اندھے کنویں

میں دھکیل دوں گی۔؟“

”میں نے ایسا کب کہا اماں۔“ وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ ”آپ میرا اور میں آپ کا سب کچھ ہوں۔ میں جانتی ہوں۔“

”پھر تو میری بات کا یقین کیوں نہیں کر لیتی؟ میرے سینے میں ایک ماں کا دل ہے۔ حساس اور تیز بین اور میرا یہ دل کہتا ہے یہ شخص

تیرے لئے خوشیوں کا بیاہر بن کر آیا ہے۔ اس کی جھٹیلی پر جو دیا دھرا ہے زینب! وہ اسکی آس اور امید ہے۔ لیکن یہی دیا تیری زندگی میں روشنیاں بکھیر

دے گا۔ ساری عمر تیرے چہرے کو منور رکھے گا اور اگر اپنی عاقبت نااندیشی میں تو نے اس دے کو پھونک مار کر بھجا دیا تو.....“

ان کے چہرے پر ایک تاریک سایہ سالبرہا گیا۔

”تو نبجانے کتنا لمبا انتظار تیرا مقدر ہو جائے گا۔ دلوں کو یوں بے وجہ نہیں توڑتے میری بیٹی۔ خدا بھی ناراض ہو جاتا ہے۔ اور انسان دنیا

میں کچھ نہ پائے، کچھ نہ کرے پر خدا کو تو منائے رکھے۔“

اسے یوں لگا اماں اسے مجبور کر کے ہی دم لیں گی۔ کچھ وقت اور گزرے گا اور وہ سر تسلیم خم کرے گی اس احساس نے یکا یک لبو اس کی رگوں

میں نحمد کرنا شروع کر دیا۔

”اماں اماں! مجھے کچھ وقت تو دو۔ فیصلہ کرنے کے لئے چند دن تو.....“

”وہ کہہ گیا ہے کہ وہ ساری عمر تیرا انتظار کر سکتا ہے۔ لیکن میری بچی وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ انسان کے کہے کا کیا اعتبار۔ تو فیصلہ کر لیکن ذرا جلدی۔ نجانے ہم میں سے کس کے پاس کتنی مہلت ہو۔“

ان کی آواز بھرا گئی تو وہ کمرے سے نکل گئیں۔ زینب پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی۔



اگلے روز اس کا اترا ہوا چہرہ فارحہ کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ پیرٹ کے دوران وہ بار بار اس کی جانب دیکھتی۔ اس کی غائب دماغی نوٹ کرتی رہی۔

پیرٹ ختم ہوا تو وہ دونوں اٹھ کر باہر چلی آئیں۔

”کیا ہوا ہے؟ پھر کوئی نیا جھگڑا؟“ کالج کے لان کی ہری گھاس پر بیٹھے ہوئے فارحہ نے بغور اسے دیکھا۔

”نہیں، جھگڑا کیا اور کس سے؟“ وہ تنکا چبانے لگی۔

”پھر؟ یہ چہرہ تو کسی اندرونی کشش کی کہانی سنار ہے۔“

”وہی، پتا تو ہے تمہیں۔ مسٹر احسن ایاز۔“ اس کے لہجے میں تنخی سی آگئی۔

”انکے ہوئے ہیں اب تک حلق میں؟“ فارحہ نے ماتھا پٹا۔ ”ارے زینب! تم بھی عجیب ہی لڑکی ہو۔ یا تو نگلاؤ نہیں یا باہر نکال پیچو۔“

کیوں اس اذیت میں مبتلا ہو۔

”کیسے نکال پیچو؟“ وہ جھلا گئی۔ ”سب سے مضبوط دوٹ جو اس نے اپنے حق میں کر لیا ہے۔ اماں کا بس نہیں چلتا مجھے اٹھا کر اس

کے گھر رکھ آئیں۔ وہ ہر دوسرے روز آدھمکتا ہے۔ انکار کی وجہ پوچھتا ہے۔“

”سو اتا؟ بتا دو اسے۔ اسے کہہ دو کہ وہ تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔“

”کیسے کہہ دوں؟ ایسے کوئی کسی کو کہہ سکتا ہے۔ کتنا دکھ ہو گا اسے۔“ وہ جھلا گئی۔

”ہوں!“ فارحہ نے ایک لمبی ”ہوں“ کی اور اسے دیکھا۔ ”اور تم اسے دکھ دینا نہیں چاہتیں۔“

”میں، میں کسی کو بھی دکھ نہیں دے سکتی۔“ وہ نظریں چرا گئی۔

”جھوٹ بولتی ہو تم! اگر ایسا ہی ہے تو پھر کیوں اپنی عزیز از جان اماں کو دکھ دے رہی ہو۔ مان کیوں نہیں لیتیں ان کا کہنا؟ بات یہ ہے

زینب! کہ تم اپنے بنائے ہوئے معیار سے نیچے آنے پر تیار بھی نہیں ہو اور وہ شخص تمہیں بھانجی گیا ہے۔ ہے نا یہی بات؟“

”فارحہ۔“ اس نے سر تھام لیا۔ ”تنگ آگئی ہوں۔ اس لا حاصل بحث سے میں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں۔ کبھی سوچتی

ہوں، اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ کون حسین شہزادہ مجھے لے جانے کو اس کو وارٹ میں آئے گا۔ کر دوں ہاں اور چلی جاؤں احسن ایاز کے ساتھ اس کے

دو کروں اس کے گھر میں جو اس کا اپنا بھی نہیں ہے۔ لیکن پھر، پھر تمہاری باتیں ایک ایک کر کے میرے ذہن میں گونجتی ہیں۔ میں خود کو تلکے

کپڑوں میں ملبوس سیاہ برتنوں سے لڑتے ذرا ذرا سی بات پر شوہرا و بچوں سے الجھتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ خواہشات کا ماتم کرنے سے مجھے بڑا ڈر لگتا

ہے۔ فارحہ! نجانے کیوں میری پلکوں پر ایسے خواب آجے جو میری سکون بھری نیندیں تک اڑالے گئے ہیں۔ کتنی عورتیں ہیں جو دنیا میں آتی ہیں،

عمر گزارتی ہیں اور پھر ایسے فن ہوتی ہیں کہ خود ان کا اپنا وجود ہزار ہا نامراد خواہشوں، سسکتے خوابوں کا مدفن ہوتا ہے۔ کتنی عورتیں فارحہ! پھر میں خود کو اتنا

الگ، اتنا منفرد کیوں سمجھ بیٹھی ہوں۔؟“

”اس لئے میری جان کہ خدا نے تمہیں الگ اور منفرد بنایا ہے۔“ فارحہ نے ہمدردی سے اس کا شانہ تھپکا۔ اور پھر کیا ناممکنات میں سے ہیں۔ تمہاری خواہشات۔ ذرا سا بہتر طرز زندگی چاہتی ہو اور بس! دنیا کی شہنشاہی تو نہیں مانگی ہے تم نے۔ کیا اس دنیا میں خوشحال لوگ نہیں بستے؟“

کیا وہ شادیاں نہیں کرتے؟ گھر نہیں بساتے؟ کیا ان کی بیویاں ڈائریکٹ جنت سے اترتی ہیں۔؟ کم آن زینب! ذرا سی بات کو دل کا روگ بنا کر بیٹھی ہو۔ ذرا سا مسئلہ ہے اسے اتنا سیریس بناری ہو۔ دیکھو، دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں وہ شخص پسند ہے اور تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔ تو ٹھیک ہے، پہلی فرصت میں اسے ”لیں“ کہو، دوسری یہ کہ تم اسے اپنے لئے بہتر نہیں سمجھتیں۔ تم اس سے بہتر کا انتظار کر سکتی ہو۔ اگر ایسا ہے تو دو ٹوک انداز میں اماں کو آگاہ کر دو۔“

زینب اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کاش کہ یہ بر ملا انداز میرا خاصا ہوتے۔“ اس نے سوچا تھا۔ ”میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں خود نہیں جانتی کہ میرے لئے کیا ٹھیک ہے۔؟“



جس دن کالج گرمیوں کی تعطیل کے سلسلے میں بند ہوئے اس سے اگلے روز اس کی سالگرہ تھی۔ ہر سال وہ یہ دن خاص اہتمام سے ضرور مناتی تھی۔ نیا جوڑا اس مقصد کے لیے اس نے دو ماہ پیشتر ہی تیار رکھا ہوتا تھا۔ میچنگ جیولری اور نئے سینڈل بھی ضروری ہوتے تھے۔ یہ دن وہ عید بقر عید کی طرح منایا کرتی۔ اماں کی تو واحد خوشی ہی اس کی ذات تھی۔ وہ بھی بنانے کب کے جمع شدہ پیسے نکال کر کھانے پینے کی چیزیں منگواتیں۔ بڑے اہتمام سے رات کا کھانا تیار کرتیں۔ مہمانوں کی لسٹ البتہ نہایت مختصر تھی۔ فارحہ اور آمنہ اس کے دو ہی مہمان ہوتے تھے کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ بھولے بیٹکے اس کے کسی ماموں کو کبھی خیال آیا تو اسکے تحفوں میں ایک تحفے کا اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس روز بھی وہ صبح سے تیاریوں میں لگ گئی تھی۔ گھر کی صفائی اس نے دل لگا کر کی۔ جالے اتارے، بستروں کی چادریں تبدیل کیں، گملوں کی صفائی کی۔ پودوں کی کانٹ چھانٹ کی، صحن دھویا۔ پھر وہ نہادھو کر ستانے کے خیال سے کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔ آمنہ اور فارحہ شام ڈھلے ہی آیا کرتی تھیں۔ آمنہ کا گھر نزدیک ہی تھا فارحہ کو اس کا کوئی بھائی چھوڑ جاتا تھا۔

”زینب! کھانا نہیں کھاؤ گی۔؟“ اماں کمرے میں آئیں تو وہ آنکھیں موندھے لیٹی تھی۔

”ناشتا اتنا ہیوی کیا تھا اماں! اب بھوک نہیں ویسے بھی شام کو کیا کچھ والا کھانا ہے۔ کتنا کچھ منگا کر رکھ لیا ہے آپ نے اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔“

”ضرورت تھی۔ آج میں نے بھی کسی کو بلایا ہے۔“

اماں کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے پر مجبور ہوئی۔

”کس کو۔؟“ اسے کچھ کچھ اندازہ تھا۔ ”احسن کو۔“ اماں نے ذرا سارخ موز لیا۔

”کیوں۔؟“ وہ پریشانی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”اسے کیوں بلایا ہے آپ نے میری سالگرہ میں؟ وہ لڑکیوں میں بیٹھ کر کیا کرے گا۔؟“

اماں کو ہنسی آگئی۔

”تم نہ بٹھانا اسے پاس۔ وہ میرے پاس بیٹھے گا۔“

”لیکن اماں کیوں؟ وہ کون سا ہمارا رشتے دار لگتا ہے۔“

”لگ بھی سکتا ہے۔!“ اماں مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

اس نے سر ہام لیا، یہ شخص اس کے اعصاب پر مستقل سوار تھا۔

”اماں نے آج کا دن بھی خراب ہی کرنا تھا۔ اسے بلالیا ہے، فارحہ بھی ہوگی۔ کیا سوچے گی وہ۔ کتنا ڈھیٹ شخص ہے۔ پھر گھر نے بیٹھ جائے گا مجھے۔ اس کی آنکھیں، وہ نظریں۔“

اس کے دل کی سطح پر پھر پھونڈ سے پڑنے لگے۔ ہاتھ پیروں میں سنناٹہ ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا، وہ کہیں چلی جائے۔ اسے اس شخص کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن وہ جا بھی کہاں سکتی تھی؟ بے چین ہو کر وہ بستر سے اتر آئی۔ الماری تک آ کر اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔ نہا کر وہ نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ سیاہ بال شانوں پر پڑے شعاعیں نکھیر رہے تھے۔

الماری کا پتہ داکر کے اس نے اپنا سوٹ نکالا۔ اسے تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔

سفید شیون کا سوٹ تھا جس پر سفید موتیوں کا بڑا نازک سا کام تھا۔ پورے تین ماہ کی پاکٹ منی جمع کر کے اس نے یہ سوٹ بخوایا تھا۔ سفید موتیوں کا ہار اور ٹاپس وہ پورا دن خوار کی کر کے ڈھونڈ کر لائی تھی۔

سفید ہی سینڈل تھے۔

”کیسی لگوں گی یہ کپڑے پہن کر میں۔؟“ اس نے قمیض ساتھ لگا کر آئینے پر نظر دوڑائی۔

سفید رنگ اس پر بڑا اٹھتا تھا۔ وہ جب بھی سفید رنگ کا لباس پہنتی۔ اماں اس کی نظر اتارتی تھیں۔

”تو ویسے ہی پری لگتی ہے۔ اس پر سفید لباس اور پہن لیتی ہے۔“ آمنہ کہتی، ”گلتا ہے سیدھی پرستان سے چلی آ رہی ہے۔“

اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آج کے دن کے لئے اس نے بڑے صبح رنگ کا انتخاب کیا تھا۔ پھر بھی خجائے کیا بات ہوئی۔ وہ مطمئن نہ ہو پائی تھی۔

اس نے بمشکل چار بجے کا انتظار کیا تھا۔ چار بجتے ہی وہ تیار یوں میں لگ گئی۔ برا آمدے میں ٹیبل رکھ کر ساری چیزیں اس پر رکھ دیں۔ برتن نکال کر صاف کئے۔ ایک پر موم بتیاں لگائیں۔ پھر وہ اپنے ہاتھ پیروں کو سجانے بیٹھ گئی۔ لوٹن لگا کر صفائی کی۔ ناخن فائل کیے۔ گھنٹہ بھر بیٹھ کر گلابی نیل پالش لگائی۔ گلابی رنگ کی نیل پالش اس کے ہاتھ پیروں پر گلاب کھلا دیتی تھی۔ اچھی طرح جائزہ لے کر جب مطمئن ہوئی تو لباس تبدیل کر کے چہرہ سجانے لگی۔ آج اس نے خوب دل لگا کر تیاری کی تھی۔ بس یہی دھڑکا تھا، کوئی کمی نہ رہ جائے۔ آج وہ حسین سے حسین تر نظر آئے۔

”لیکن کیوں؟“

پوری طرح تیار ہو کر جب وہ اپنا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی، کسی نے اس کے اندر سر گوشی کی۔

”کیوں اور کس کے لئے ہے یہ خاص تیاریاں؟ یہ دن تو ہر سال ہی آتا ہے۔ ہر سال تو نظر نے اس انداز میں اپنا جائزہ نہیں لیا کہ دل نے اسے پرانی نظر محسوس کیا ہو۔ کسی کی نظروں سے جانچ رہی ہو نہ بن خود کو؟ آج کیوں محض حسین نظر آئے پر مطمئن نہیں، حسین ترین، بلکہ دنیا کی سب سے حسین لڑکی نظر آنا چاہتی ہو؟ تمہیں فارحہ اور آمنہ کا تو انتظار نہیں، تمہیں تو کسی اور کا انتظار ہے کہ کب وہ آئے، کب تمہیں دیکھے، سراپے اور تمہاری محنت وصول پائے۔ یہی بات ہے نا؟“

وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آئی۔

”اماں، اماں۔“

”ہاں بچی، کیا بات ہوئی۔ کیوں گھبرا گھبرا کر پکار رہی ہو۔؟“ اماں ڈونگا اٹھائے کچن سے نکل آئیں۔

”اماں وہ اب تک تو آئی نہیں۔“

”کون۔؟“ اماں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”فارحہ، نہیں وہ، آمنہ۔!“

پھر وہ نہایت جھینپ کر دوبارہ کمرے میں چلی آئی۔ کیسا جذبات کا تلاطم سا برپا تھا دل میں۔ منہ سے ٹھیک بات بھی نکل نہیں پاری تھی۔
چھ سے سات اور پھر ساڑھے سات بج گئے۔ فارحہ اور آمنہ اور ”اس“ کا کچھ پتا نہ تھا۔
زینب جو کتنی دیر سے ٹہل ٹہل کر انتظار کر رہی تھی، اس انتظار سے اکتا گئی۔

”پتا نہیں ان لوگوں نے آنا بھی ہے یا نہیں۔ بے وجہی اتنا اہتمام کر ڈالا۔ کیا پتا ان دونوں کو یہ یاد ہی نہ ہو۔“ وہ اداسی سے اماں کے قریب آ بیٹھی۔

”کیوں یاد نہ ہوگا۔ ہر سال آتی ہیں بچیاں۔“ اماں اطمینان سے بولیں۔ ”ہاں، وہ احسن ہو سکتا ہے نہ ہی آئے۔ کہہ تو رہا تھا اسے کوئی ضروری کام ہے۔“

زینب نے اپنے تمام خوبصورت احساسات پر اوس گرتی ہوئی محسوس کی اور اپنی اس تبدیلی کو واضح طور پر محسوس کیا۔
”اچھا ہے وہ تو نہ ہی آئے۔“

وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ لیکن لہجے کا کھوکھلا پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اماں محن میں بیٹھی سلا دینا ہی تھیں وہ کمرے میں چلی آئی۔
سامنے الماری میں لگا آئینہ اس پر ہنسنے لگا۔ اس کا جی چاہا پل بھر میں ساری تیاری کا ستیاناس کر دے۔ کوئی میلے، ٹکے پزیرے نکال کر پہنے اور منہ رگڑ رگڑ کر دھو ڈالے۔

دروازہ بجا تو اماں نے اسے پکارا۔

”زینب، چلو بھیجی۔ آگئیں تمہاری سہیلیاں۔“

زینب بے دلی سے کمرے سے نکلی تھی۔

”کون۔؟“ وہ دروازے کے قریب پہنچی۔

”میں ہوں زینب باجی فرحان۔!“ باہر سے فارحہ کے بھائی کی آواز آئی تھی۔

زینب نے دروازہ کھولا باہر وہ اکیلا ہی کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

”السلام علیکم۔ یہ آپ کا گفٹ بھیجا ہے فارحہ باجی نے۔“ اس نے پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔ ”انہیں آج صبح ارجنٹ کام سے لاہور جانا پڑ گیا۔ پچھو کے پاس مجھے تاکید کر گئی تھیں کہ آپ کا گفٹ شام تک ضرور پہنچاؤں۔“

وہ پیکٹ لے کر اندر آئی تو اس کا اترا ہوا منہ مزید اتر چکا تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھا ہوا پیکٹ اماں کے پاس رکھ دیا۔

”کیا ہے اس میں۔؟“ اماں نے اس کی صورت ملاحظہ کی۔

”تھکے ہے۔“ وہ بے دلی سے ناخن سے کیونکس اتارنے لگی۔ ”فارحہ نے بھیجا ہے۔ خود وہ لاہور گئی ہے۔ کسی کام سے.....“

”اچھا، چلو پڑ گیا ہو گا کوئی ضروری کام، ورنہ بچی ہر سال ضرور آتی ہے۔ یوں بھی کیا یہ کانی نہیں کہ اس نے یہ دن یاد رکھا۔“

اماں یقیناً اس کا دل رکھنے کو کہہ رہی تھیں۔

”السلام علیکم، سالگرہ مبارک۔“

اچانک ہی آمنہ کی چہکتی ہوئی آواز پر ماحول یک دم تبدیل ہوا تھا۔

زینب اٹھ کے اس کے گلے لگ گئی۔

”شکر ہے تم تو آئیں۔ میرا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔“

”کیوں۔ اتنا اچھا لگنے پر بھی۔؟“ آمنہ نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ ”اور کیا چاہیے تمہیں۔؟“

”نہ تو فارحہ آئی نہ۔۔۔“ وہ اچانک ہی زبان دانتوں کے بیچ دبائی۔ کن اکھیوں سے اماں کی طرف دیکھا وہ ان دونوں کی جانب متوجہ نہ

تھیں۔ باورچی خانے کی سمت جانے کے لئے اپنی چپل ٹٹول رہی تھیں۔

”کسی اور کو بھی بلایا تھا کیا؟“ آمنہ پوچھ رہی تھی۔

”نہیں نہیں، بس تم دونوں ہی چلو ایک کانتے ہیں۔ آئیں اماں! آپ بھی۔ سخت بھوک لگی ہے۔“ وہ بات کا اثر زائل کرنے کے لئے تیز تیز بولتی ہوئی آمنہ کا ہاتھ پکڑے ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔

”گفٹ تو دیکھ لو اپنا۔“ آمنہ اس کی جلد بازی پر ہنسی۔

وہ موم بتیاں جلانے لگی۔

”آئیں ناں اماں اب۔“ وہ ساری موم بتیاں جلا کر ایک پرچکی ہوئی تھی۔

پل کی پل جو نگاہ اشٹا کر دیکھا تو ایک لمحے کو اسے لگا، اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی ہے۔ سامنے ہی وہ کھڑا مسکرا ہوا تھا۔

”ساگر مبارک۔“ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ بولا۔ ”اس وقت اگر کیرہ ہوتا تو.....“

وہ جلدی سے سیدھی ہو کر کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم، آپ کب آئے؟“

”علیکم السلام بس ابھی جب آپ چیخ چیخ کر ایک کٹنے کا اعلان کر رہی تھیں۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔

آمنہ قدرے تجسس سے باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”وہی ہیں نا۔“ پھر اس نے زینب کے کان میں سرگوشی کی۔ ”احسن ایاز۔؟“

اس نے ٹیبل کے نیچے ہوئے سے آمنہ کا ہاتھ دبایا۔ ہر چند کہ آمنہ کی ”سرگوشی“ پر سامنے کھڑے احسن کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ آمنہ کی سرگوشیاں ایسے ہی ہر کسی کے گوش تک با آسانی سفر کر جایا کرتی تھیں۔

اس نے ایک کاٹا تو اماں نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔ آمنہ نے اس کا گل چوما۔ اس نے بے اختیار ہی اس کی جانب دیکھا۔ وہ اس

طرح مسکرا ہوا تھا جیسے نظروں ہی نظروں میں پوچھ رہا ہو۔ ”میں بھی؟“ زینب کو ہنسی آ گئی۔

کھانا بواؤ خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ احسن کو واقعی باتیں بنانے کا فن آتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ کوئی چٹکلا چھوڑتا اور ماحول گنزار ہو جاتا۔ آمنہ اور زینب ہنس ہنس کر پاگل ہو گئیں۔

اماں کے چہرے پر ایک الوہی خوشی کی چمک تھی۔ وہ کبھی احسن کو دیکھتیں کبھی زینب کو جیسے دل ہی دل میں ان دونوں کی بلائیں اتار رہی

ہوں۔

اور زینب وہ جیسے اماں سے، احسن سے، اپنی قسمت سے اور اپنے دل سے ہار مانتی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ پوری طرح سے آمادہ

ہے۔ بس زبان سے کہنے کی دیر ہے۔

آمنہ جانے کے لئے ابھی تو زینب سے اے چھوڑنے دروازے تک آئی۔

”زینب تیری قسمت کو نظر نہ لگے، ماشاء اللہ کہہ دوں۔؟“ وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

زینب ہولے سے ہنس دی۔

”میں نے ابھی ”ہاں“ نہیں کہی۔“

”میں کچھ کورنگال دوں گی زینب تمہارا۔“ آمنہ نے اسے مکا دکھا کر دانت کچکپائے۔ ”یہ شخص ایسا نہیں ہے کہ اسے مایوس اور نامراد لوٹا دیا

جائے۔ زینب، زینب کتنا چاہتا ہے تجھے، اس کی نگاہیں تک بولتی ہیں۔ ہر خوف دل سے نکال کر ”ہاں“ کہہ دو۔ یہ تو تمہیں دل میں چھپا کر رکھے گا۔

اس کا ہر انداز کہتا ہے۔“

نہیں اسے خدا حافظ کہہ کر اندر آئی اس کا روالاں رواں آمنہ کی کمی ہوئی باتوں کا زیر اثر تھا۔ احسن بیٹھا اماں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بھی اماں کے قریب بیٹھ گئی۔

”کیوں اماں، آپ کی صاحبزادی اب تک خفا ہیں مجھ سے؟“ وہ مسکین سی صورت بنا کر اماں سے پوچھنے لگا۔

”میری بیٹی بہت پیارے دل کی ہے۔“ اماں نے اسے خود سے لگایا۔ ”بس ذرا سی اجتناب ہے۔“

”ذرا سی؟“ اس نے آنکھیں پھیل کر حیرت کا اظہار کیا۔

نہیں اسے خفگی سے گھورنے لگی۔ اماں ہنسنے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں ذرا نماز پڑھ لوں۔ نون بجے ہیں پھر ہمت نہیں رہتی۔“

احسن نے تشکر بھری نظروں سے اماں کو دیکھا تھا۔ اماں اس پر بے پناہ اعتماد کا اظہار کر رہی تھیں۔

”ہاں بھئی۔“ اماں کے چلے جانے کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ذرا سی اجتناب لڑکی۔“

”خود تو نہایت عقل مند ہیں ناں آپ، بلکہ واقعی ہیں۔ دو دن میں میری اماں کو اپنا اتنا گرویدہ کر لیا کہ میں بیس سال میں نہ کر پائی۔“

وہ خفا خفا بول رہی تھی، احسن دلچسپی سے اسے دیکھے گیا۔ نہ نہیں اسے یوں اپنی جانب دیکھتا پایا تو جھینپ گئی۔

”تو اس بات کا بھی گلہ ہے محترمہ، یعنی آپ ناپسند کرتی ہیں سو کرتی ہیں، دوسروں کی پسندیدگی بھی برداشت نہیں ہو پارہی۔ آخر ایسا کیا

بگاڑا ہے میں نے آپ کا؟“

”میں نے کب کہا کہ میں آپ کو ناپسند کرتی ہوں؟“ اس نے فوراً احتجاج کیا۔

”پھر؟ یہ کب کہا کہ پسند کرتی ہوں؟“ وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ ”بھلا نہ نہیں! میں آج یہاں صرف اماں کے اصرار سے مجبور ہو کر آیا ہوں۔

وہ مجھے بالکل ایک ماں کی طرح چاہنے لگی ہیں اور میرے دل میں انکے لیے جو جذبات ہیں وہ میں زبان پہ لانے سے ڈرتا ہوں، کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ

تمہاری رضا حاصل کرنے کے لیے میں کوئی ناک کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے اور اماں کے بیچ تمہارا حوالہ کہیں نہیں ہے۔“

نہیں کو اس کے لہجے میں بولتی سچائیوں کا اعتراف تھا۔

”میرا خیال ہے، مجھے چلنا چاہیے“

دونوں کے درمیان خاموشی آئی اور تمہائی کا احساس واضح ہوا تو وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

نہیں اسے چھوڑنے دروازے تک چلی آئی۔

”اور ہاں“ اس نے جب سے ایک چھوٹی سی ڈیبا نکالی تھی۔ ”یہ تمہاری سالگرہ پر ایک معمولی سا تحفہ چاہو تو پہن لینا، نہ پہننا چاہو تو کسی

ڈسٹ بن میں ڈال دینا۔ آئندہ ملاقات پر اسے تمہاری انگلی میں نہ پایا تو پھر یقین رکھنا۔ میں دوبارہ کبھی دست سوال دراز نہ کروں گا۔ ہاں، اماں سے

جود لی تعلق قائم ہوا ہے اس کے ناتے یہاں آتے رہنے سے انکار نہیں کروں گا۔“

نہیں نے ڈیبا تھا تو وہ ”خدا حافظ“ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”خدا حافظ“ اس کے لب بھی دیر سے سے ہلے تھے۔

اسے رخصت کر کے اندر آئی تو دل کی کیفیت عجیب تھی۔ نہ نہیں اپنے تمام خوابوں کو پس پشت ڈال کر احسن ایاز کے منہ زور جذباتوں سے

ہار مان چکی تھی۔

اس نے ڈیبا کھول کر دیکھا۔ سرخ رنگ سے مزین نازک سی انگوٹھی تھی۔ اس نے انگوٹھی نکال کر انگلی میں پہن لی۔

”میں تمہارے ساتھ خوش رہوں گی، احسن، بہت خوش، کہ ابھی ابھی دل کو علم ہوا ہے کہ تم نظروں سے اوجھل ہوتے ہو تو ساری روشنیاں

گل ہو جاتی ہیں۔ میں تم سے کتر آکر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آگے اندھیرا نظر آتا ہے۔“

اماں نماز پڑھ کر آچکی تھیں۔

”زینب! کیا کر رہی ہو بیٹی؟“

”اماں.....!“ وہ مڑی ”احسن نے سا لگرہ پر یہ انگوٹھی دی ہے۔ میں نے پہن لی۔“ اس نے ہاتھ اٹھ گئے کر دیا۔ اماں کا چہرہ منور ہو گیا۔

”ماشاء اللہ!!“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

پھر انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”زینب! میں خوش ہوں بیٹی بہت خوش ہوں“

”میں بھی خوش ہوں اماں“ اس نے سرگوشی کی۔

اماں کمرے سے نکلیں تو وہ بڑی دیر تک بیٹھی نجانے کیا کیا سوچتی رہی۔ آمنہ اور فارحہ کے دیئے گئے کفٹس کی جانب متوجہ ہوئی۔

دونوں ہی نے سوٹ دیئے تھے۔ فارحہ کے پیکٹ سے ایک خط بھی برآمد ہوا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”پیاری زینب!“

سا لگرہ مبارک“

سدا خوش رہو۔ ایک بے حد ضروری کام سے آج ہی لاہور جانا پڑ گیا ہے ورنہ تم سے ملنے ضرور آتی۔ تحفہ بھیج رہی ہوں تمہیں یقیناً پسند آئے گا کہ میں تمہاری پسند سے خوب واقف ہوں۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔ واپسی میں شاید میرے پاس تمہیں سنانے کو ایک بڑی خوشخبری ہو۔ میرا انتظار کرنا۔

تمہاری دوست

فارحہ

”میرے پاس بھی تمہیں سنانے کو ایک خبر ہے“ وہ مسکرا دی ”پتا نہیں تم کس رد عمل کا اظہار کرو گی“



عشق کا قاف

عشق کا قاف سرفراز راہی کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ عشق..... ازل سے انسان کی فطرت میں

ودیعت کیا گیا ہے جب جب اپنے رخ سے حجاب سر کاٹا ہے، انہو نیاں جنم لیتی ہیں۔ مثالیں تخلیق ہوتی ہیں۔ داستانیں بنتی ہیں۔ ”عشق“ کی اس کہانی میں بھی اسکے یہ تینوں حروف دمک رہے ہیں۔ ”عشق کا قاف“ میں آپ کو عشق کے عین، شین اور قاف سے آشنا کرانے کے لئے سرفراز راہی نے اپنی راتوں کا دامن جن آنسوؤں سے بھگوا ہے۔ اپنے احساس کے جس الاؤ میں پل پل جلتے ہیں، ان انگارہ لحوں اور شبنم گھڑیوں کی داستان لکھنے کے لئے خونِ جگر میں مومے بیان کیے ڈھویا ہے، آپ بھی اس سے واقف ہو جائیے کہ یہی عشق کے قاف کی سب سے بڑی دین ہے۔ **عشق کا قاف** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

چند دن بڑے خوشگوار انداز میں گزرے تھے۔ صبح سے شام اور شام سے رات ہو جاتی، نینب کو وقت گزرنے کا پتا نہ چلتا۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن تھی۔ احسن ایاز کا تصور اسے وقت گزرنے کا احساس نہ ہونے دیتا تھا۔

”نینب بیٹی! اس روز وہ پودوں کو پانی دے رہی تھی جب اماں نے اسے کمرے سے پکارا۔

”آتی ہوں اماں“ وہ مصروف سے انداز میں جواب دے کر پھر سے کوئی نغمہ گنگنا نے لگی۔ اماں نے کچھ دیر بعد دوبارہ آواز دی تو وہ اپنے خیالات سے جھوکی۔

ہاتھ دھو کر دوپٹے کے پلوے پونچھتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئی تو اماں بڑے صندوق سے نجانے کیا کچھ نکالے بیٹھی تھیں۔

”یہ سوٹ دیکھو“ انہوں نے ہاتھ میں تھا ہوا ایک مردانہ شلوار سوٹ کا کپڑا آگے کیا۔

”کیا ہے.....؟“ اس نے سوٹ میں تھا مایا لیا۔ ”اچھا ہے، کس کا ہے؟“

”اچھا یہ دیکھو؟“

انہوں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ایک ریٹھی سوٹ آگے کیا۔

”یہ بھی اچھا ہے۔ لیکن کس کے لیے اماں؟“

”کل احسن اور اس کی منہ بولی بہن آ رہے ہیں۔ کیا بھلا سا نام ہے اس عورت کا، ہاں فرخندہ! میں نے احسن سے بات کی تھی۔ دیکھو بیٹی! وہ تمہیں انگوٹھی تنہا گیا تم نے پہن لی۔ ایسے کہیں رشتے طے ہوتے ہیں“ انسان چار لوگوں کو بلائے“ رشتے داروں عزیزوں کو علم ہو، کوئی باقاعدہ رسم ہوا صل دستور تو یہ ہے اور اور یہی باتیں اچھی بھی لگتی ہیں۔ انسان بھاری رہتا ہے چار لوگوں میں عزت رشتی ہے کل کلاں کو تمہاری کسی ممانی نے ہاتھ تھام کر انگوٹھی کے بارے میں کچھ پوچھ پچھا لیا تو کیا جواب دو گی؟ اور میں کیا منہ دکھاؤں گی بھائیوں کو، کہ ساری عمران کا دیا کھایا اور جب اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو ان سے صلاح تک نہیں کی۔“

”پھر اماں؟“ وہ عجیبی گدی سے انہیں دیکھ گئی۔

”پھر یہ کہ میں نے احسن سے بات کی، اسے تمہاری رضا مندی کا بتایا۔ اس سے کہا کہ اپنی بہن کو چار عزیزوں، دوستوں کو لے آؤ، ہم یہاں اپنے عزیزوں کو بلاتے ہیں۔ اور ایک چھوٹی موٹی رسم ہو جائے تو لوگوں کو کبھی علم ہو جائے اور کل کو کوئی بات نہ ہو۔“

”پھر.....؟“ وہ آہستگی سے بولی ”کیا کہا انہوں نے؟“

”اس کو کیا اعتراض وہ تو دل جان سے راضی ہے کل وہ لوگ شام کو آئیں گے بعد نماز مغرب میں نے تمہارے ماموں کو بھی مطلع کر دیا ہے کہ میں نینب کی بات ٹھہرا رہی ہوں۔ وہ لوگ بھی ہوں گے۔ یہ جوڑے میں نے اسی مقصد کے لیے نکالے ہیں۔ ایک احسن کو دوں گی ایک اس کی بہن کو۔ یہ گھڑی تمہارے بڑے ماموں عمر سے سے واپسی پر لائے تھے کب سے سنبال کر رکھی ہے میں نے۔ یہ دوں گی احسن کو“

اولڈ فیشن گھڑی دیکھ کر نینب کو کھسی آگئی۔ لیکن اس نے اماں کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔

”جیسے آپ کی خوشی اماں“ وہ دھیرے سے یہی بول سکی۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔

”اور یہ احسن صاحب سے رابطہ کیسے کر لیتی ہیں آپ؟ ایسے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی ہے، مجھے بھی نہیں، سا لگہر پر انہیں انوائسٹ بھی کر لیا اور مجھے علم بھی نہ ہوا اور آج صبح سے گھر پر ہیں اور ان سے بات ہو گئی۔“

اماں بڑی پراسراریت سے مسکرا دیں۔

”اب ہر بات بتانے کو تھوڑا ہی ہوتی ہے“

”کوئی بات نہیں میں ان ہی سے پوچھ لوں گی۔“

وہ کہنے کو تو کہہ گئی لیکن پھر اسے اماں سے بے پناہ شرم آئی، وہ کچھ زیادہ ہی کھلتی جا رہی تھی۔ اماں نے اس کا جھکا ہوا سر دیکھا تو ہنس دیں۔
 ”فون نمبر ہے اس کے آفس کا میرے پاس، پہلی ملاقات میں ہی دے گیا تھا وہ، کوئی کام ہو تو سامنے کی دکان سے فون کر آتی ہوں جب سودا سلف لینے جاتی ہوں تو“

”اچھا اچھا“ وہ جلدی سے بولی۔

”اور ہاں بیٹی! یہ انگوٹھی بھی اتار کر مجھے دے دو۔“

”کیوں اماں؟“ اس نے تعجب سے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

”ارے کل سب کے سامنے پہنا دے گی اس کی بہن تمہیں۔ اب وہ بے چارہ بار بار انگوٹھیاں خریدنے سے تو رہا۔ کل کیا پھر بنی انگوٹھی

لائے گا؟“

انگوٹھی تو زینب نے اتار کر اماں کو تھما دی لیکن پھر اسے عجیب سے احساس نے آگھیرا۔

”کیا تھا جو کل وہ بنی انگوٹھی خرید لاتا تو، ایسے اچھا لگتا ہے اپنی ہوئی چیز دوبارہ پہنانا۔ کتنے کی آجاتی بھلا دوسری انگوٹھی، کیا وہ میری خوشی

کے لیے دو چار ہزار بھی خرچ نہیں کر سکتا۔“

’شام تک وہ بے چارہ الجھتی رہی۔ اسے اپنی ہر بات کا منفی پہلو دیکھنے والی عادت سے خوف آتا تھا۔

رات کو اماں کے برابر ٹھنڈے، سفید بستر پر لیٹی تو احسن مسکراتا ہوا اس کی پلکوں میں درآیا۔

کل احسن کے ساتھ اس کی مگنی تھی۔ اس احساس کی خوبصورتی نے اس کا سارا اضمحلال ساری پریشانی دور کر دی۔ وہ گہری پرسکون نیند سو

گئی۔



اسے فارحہ کے نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا اگر وہ ہوتی تو زینب خود کو اتنا گھبرا ہوا محسوس نہ کرتی۔ اسے ہر جگہ فارحہ کے سہارے کی عادت پڑ چکی تھی۔ فارحہ کی تیزی اور طراری اسے اپنی ذہال محسوس ہوتی تھی۔ آمنہ بے چاری تو اسی کی طرح تھی سیدی سادھی، خاموش خاموش سی۔ محفل میں آکر چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جایا کرتی تھی۔ اس کا ہاتھ بھی نہ چلتا تھا۔

زینب کو آج کے دن فارحہ کے بے حد کی محسوس ہو رہی تھی۔ فارحہ نے یونٹیشن کورس بھی کیا ہوا تھا۔ وہ ہوتی تو منٹوں میں اسے سجا سناور

دیتی۔

اس نے پڑوس کی ہی ایک لڑکی کو بلایا تھا جو اس کے چہرے پر اپنا ہنر آزمائی تھی۔ زینب مطمئن نہ تھی۔

”اچھی تو لگ رہی ہو زینب اور بھلا کیسے اچھی لگے گی؟“ آمنہ دسویں مرتبہ اسے یقین دلارہی تھی۔

”صرف اچھی نا؟ میں آج بہت زیادہ اچھی نظر آنا چاہتی ہوں آمنہ! آخر میری مگنی ہے“

آمنہ ہنس کر رہ گئی۔

مگنی کی رسم ادا کی گئی۔ فرخندہ باجی نے اسے انگوٹھی پہنائی تو زینب چونک اٹھی یہ وہ انگوٹھی نہ تھی جو احسن نے اسے سا لگرہ پر دی تھی۔ یہ نئی

انگوٹھی تھی۔ زینب کو خوشی کا احساس ہوا۔ احسن نے اس کے جذبات کا از خود خیال رکھا تھا وہ دوسری انگوٹھی لایا تھا۔

زینب کے رشتہ دار بیٹیوں ماموں، ممانیاں احسن سے مل کر خوش ہوئے تھے۔ سب ہی نے اماں کو مبارکباد دی تھی ان کی پسند کو سراہا تھا۔

اماں کا چہرہ خوشی کے اندرونی احساس سے جگمگا رہا تھا۔

مگنی کی رسم کے بعد مل بیٹھ کر شادی کی تاریخ بھی طے کر لی گئی اماں اس سلسلے میں علیحدہ سے کوئی تقریب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ دو ماہ بعد کی

تاریخ ظہرادی گئی۔

”احسن صاحب کے دانت محفل میں سب سے نمایاں ہیں۔“ آمنہ نے باہر سے آکر اسے چھیڑا تھا۔

خود نہ بے بھی خوش تھی۔ بے پناہ خوش۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

محفل ختم ہوئی۔ سب لوگ چلے گئے تو وہ پھر سابقہ جلیے میں لوٹنے کی تیاری کرنے لگی۔ کپڑے تبدیل کئے۔ منہ دھویا پھر بیٹھ کر بال سلجھانے لگی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے توجہ نہ کی۔ اماں باہر ہی تھیں۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی کمرے کے دروازے پر دستک دی گئی تو وہ چونک

اٹھی۔

”کون۔؟“ اس نے کٹڈی گرانے کے ساتھ ساتھ پوچھا۔

”احسن۔!“ وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ دروازہ کے پٹ اس سے دانہ کیے گئے۔

”یہ محترم اچانک کس سلسلے میں پہنچ گئے۔“ وہ سوچ رہی تھی۔

”کیا لوٹ جاؤں واپس۔؟“ باہر سے قدرے شوقی سے پوچھا گیا۔

نہ ب نے دروازہ کھول دیا۔

”ہائے ری قسمت۔“ مگر اسانس لے کر اس نے نگڑوں میں کہا تھا۔

”کیا ہوا۔؟“ نہ ب اسے گھور رہی تھی۔ ”واپس کیوں آئے ہیں۔؟“

”ایک نظر آپ کے دیکھنے کے لیے۔“ احسن نے اسے گھورا۔ ”اماں سے اجازت لے کر گیا تھا کہ فرخندہ باجی کو گھر پہنچا کرتا ہوں اور تم ہو کہ سابقہ کسی بھی تیاری کا کوئی نام و نشان نہیں چھوڑا تم نے۔“

نہ ب ہولے سے ہنس دی۔

”مجھے کیا خبر تھی، اماں نے بتایا ہی نہیں۔“

”اب کیا دونوں اسی طرح کھڑے رہیں گے؟ یا تو باہر آ جاؤ یا مجھے اندر آنے دو۔“

”آ جاؤ۔“ نہ ب نے اسے راستہ دیا اور خود اندر نکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔

”اماں کہاں ہیں؟“ پھر دفعتاً اس نے مڑ کر احسن سے پوچھا۔

”کچن صاف کر رہی ہیں۔ بے چاری اماں، تم ان کا بالکل ہاتھ نہیں بتاتیں۔“

”بھائی کیوں نہیں؟ بھائی ہوں۔ اماں کچن صاف کر رہی ہیں تو باقی صفائی مجھے کرنی ہے۔“

”بس یہ ذرا سی چیزیں سمیٹ دو گی اور تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔“

”اچھا بابا! یہ ہم ماں بیٹی کا معاملہ ہے۔ آپ یہ فرمائیں کہ آمد کس سلسلے میں ہوئی۔؟“ وہ اس سے کافی فاصلے پر رکھے مونڈے پر بیٹھتے

ہوئے بولی۔

”بتایا تو ہے۔ تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ دلہن بن کر کسی لگ رہی ہو۔“

نہ ب کو شرم آ گئی۔

”میں، میں دلہن تو نہیں بنی تھی۔ بس ایسے ہی ذرا سا تیار ہوئی تھی۔“

”اچھا۔؟ سنا تو ہے کہ منگنی میں بھی لڑکیاں دلہن بنتی ہیں۔ چلو خیر کوئی بات نہیں، میں دوسرے بعد۔“

”آپ چائے پیئیں گے۔“ اس نے گھبرا کر اس کی بات کاٹ دی۔

خوشی کی ترنگ میں آکر وہ نجانے کیا کچھ بولے جا رہا تھا۔ اس نے غور سے زینب کو دیکھا اور ہنس دیا۔
 ”چلو، بناؤ گی تو ضرور پیوں گا۔“

”میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

وہ کچن میں آئی تو اماں چائے بنا چکی تھی۔

”لو۔“ انہوں نے اسے دیکھ کر کڑے اس کی سمت بڑھائی۔ ”میں چائے لا رہی تھی۔ اب آگئی ہو تو لے جاؤ اندر۔“

زینب بڑے تھانے کے بجائے اماں کو دیکھتی رہ گئی۔

وہ صبح سے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ خود تو مہارانی بنی ایسے کمرے میں تھکی رہی تھی جیسے مایوں بیٹھ گئی ہو۔ اس وقت بھی وہ کچن سمیٹ کر نماز پڑھنے کے لیے جا رہی تھیں۔ لیکن احسن کو دیکھ کر چائے بنانے لگی تھیں۔ زینب کو اپنی ماں پر بے ساختہ ٹوٹ کر پیار آیا۔

کس قدر چاہتی تھیں وہ اسے۔

”کیا دیکھ رہی ہو تھامو۔“

”اماں!۔“ اس نے جھک کر ان کا گال چوم لیا۔

”کتی اچھی ہیں آپ۔“

اماں سادگی سے مسکرائیں۔

”اچھا!“ میں ذرا نماز پڑھ لوں تو آتی ہوں۔ احسن میاں سے کہنا بیٹھیں۔“

”جی۔“

وہ بڑے اٹھا کر اندر چلی آئی۔ احسن کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔

آہٹ سن کر سیدھا ہو گیا۔

”اماں کو بھی بلا لو۔“ وہ کپ تھامتے ہوئے بولا۔

”اماں آ رہی ہیں، نماز پڑھ کر۔“

”تم نماز نہیں پڑھتیں۔؟“

”پڑھتی ہوں۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”کبھی کبھی۔“

”پابندی سے پڑھا کرو۔“

پھر وہ اسے دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔

”عبادت گزار عورتوں کے شوہر کو خدا خوب نوازتا ہے۔ جس گھر میں قدم رکھتی ہیں وہاں پھول کھل جاتے ہیں۔“

”میری اماں بچپن سے نماز روزے کی پابند ہیں۔“

اس نے چند لمحے احسن کی بات پر غور کر کے کہا۔ ”اور میرے ابا بے چارے! ساری عمر لگا دی انہوں نے، ایک گھر تک نہ بنائے اور وہ عورتیں جو فرعون بنی بازاروں میں گھومتی ہیں۔ موٹی موٹی سیٹھانیاں، جن کی کلانیاں کہنیوں تک سونے سے پیلے ہو رہی ہوتی ہیں۔ گہرا میک اپ تھوپے یوں روپے بے دریغ لٹا رہی ہوتی ہیں۔ جیسے گھر سے قسم کھا کر نکلی ہوں وہ کتنی عبادت گزار ہوتی ہیں؟“

احسن اسے یوں جذباتی انداز میں بولتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”ہاں۔ تو خدا تو اس کو بھی نوازتا ہے جو اس کے وجود سے ہی منکر ہوتا ہے۔ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اللہ صرف ان کو ہی دیتا ہے جو

اس کی عبادت کرتے ہیں بلکہ اس غرض سے کہ گئی عبادت تو مشکوک ہی رہتی ہے۔ آیا مقبول ہوگی بھی یا نہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ.....

زنبد۔! اس روز اماں نے بتایا تھا کہ تم پیسے کی اہمیت پر بہت زور دیتی ہو۔ لیکن تم اس قدر جذباتی ہو، مجھے اندازہ نہ تھا۔“ وہ بے حد حیران تھا۔

”میں واقعی اس سلسلے میں پاگل پن کی حد تک جذباتی ہوں احسن۔!“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”اس روز آپ پوچھ رہے تھے میرے انکار کرنے کی وجہ۔ آج میں آپ کو بتا دوں وجہ یہی تھی۔ میں کسی ایسے شخص سے شادی کی خواہش

مندھتی جو میری ہر خواہش پوری کر سکتا ہو۔ میں بچپن سے لے کر اب تک اپنے شوق کی چیزوں کو ترستی ہوں۔ میں چاہتی ہوں.....“

وہ گہرا سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔ اب یہ سب کچھ کہنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی تھی۔ اپنے خواب چلتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی۔ اب پلٹ کر ان کرچیوں کو دیکھنے اور انہیں چھنے کی کوشش لا حاصل تھی۔

احسن بغور اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔

”تم ہم بچتار ہی ہونے زنب؟“ اس کے خاموش ہونے پر وہ بڑے عجیب لہجے میں بولا تھا۔

”نہیں تو۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں نے بہت سوچ کچھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

”چھیر میرا اعتبار بھی کرو زنب!“ وہ یکا یک جو شیلے انداز میں بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ دنیا کی ہر خوشی تمہارے قدموں میں ڈھیر

کر دوں گا۔ چاند تارے توڑ لانے کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن جس شے کی تمہیں خواہش ہوگی، وہ اپنا آپ بیچ کر بھی لاؤں گا۔“

زنبد کی آنکھوں میں نم سے ستارے چمکنے لگے۔

”تمہارا ساتھ پانے کی تمنا میری زندگی بن گئی تھی۔ تم نے مجھے اپنانے کا فیصلہ کر کے مجھ کو میری زندگی لوٹا دی ہے۔“ وہ بے حد جذباتی ہو

رہا تھا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں زنب! تمہیں زندگی کی ہر خوشی دینے کی کوشش کروں گا۔“



چند دن بعد وہ ایک شام چائے کا چائے ہی چلا آیا۔ بنا کسی پیشگی اطلاع کے۔

”پہلیے!“ اس نے اماں سے کہا۔ ”تیار ہو جائیں ٹافٹ۔ رات کا کھانا ہماری طرف ہے۔“

اماں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”ہماری طرف؟“

”جی ہاں۔ میری طرف اس لیے نہیں کہا کہ تمام تیاریاں فرخندہ آپانے کی ہے۔ صبح سے لگی ہوئی ہیں دعوت کرنے میں ان کا برابر کا حصہ

ہے۔ ویسے میں اپنے گھر لے جانے آیا ہوں اماں۔ میں چاہتا ہوں، آپ اور زنب بھی شادی سے قبل ایک مرتبہ میرا گھر دیکھ لیں۔ اصل میں اماں

زنبد کی آنکھوں میں نجانے کیا کیا خواب سجے ہیں۔ میں وہ خواب پورے ضرور کروں گا۔ لیکن اس میں وقت لگے گا۔ اسی لیے میں نے سوچا اس کے

خیالات کو کوئی دھچکا نہ لگے۔ اسے پوری طرح سے علم ہوا، اسے بیاہ کر کہاں جانا ہے۔ وہ ذہنی طور پر تیار ہو۔“

اماں خاموشی سے اٹھ کر تیاری کرنے لگیں۔ اسے بھی تیار ہونے کو کہا۔

زنبد کو یقین نہ تھا کہ اماں شادی سے پہلے اسے وہاں جانے کی اجازت دے دیں گی۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی۔

”ہر کسی کو بڑی جلدی شے میں اتار لیتے ہیں آپ!“

اماں کسی کام سے باہر گئیں تو اس نے شرارت سے سرگوشی کی۔

”بتاتا ہوں اماں کو۔“ وہ خطرناک حد تک سنجیدگی سے بولا۔

زنبد شرارت سے ہنستی باہر بھاگ گئی۔

وہ دونوں تیار ہو گئیں تو احسن رکشہ لے آیا۔ اماں اور وہ رکشہ میں بیٹھ گئیں۔ احسن بائیک پر سوار ہو گیا۔

جس علاقے میں اس کا گھر تھا۔ اسے دیکھ کر زنب کو حقیقتاً یادی ہوئی تھی۔ اس علاقے میں جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر تھے۔ گندی گلیاں تھیں۔

میلے بچوں کا ہجوم تھا۔

احسن نے بائیک ایک نسبتاً صاف گلی میں، ایک نسبتاً صاف گھر کے سامنے روکی تو اس کا نبجانے کب کا رکا ہوا سانس خارج ہوا۔

”شکر ہے! کچھ تو صاف جگہ ہے۔ پچھلی گلی تو گندگی کا ڈھیر تھی۔“ وہ اتر کر سوچ رہی تھی۔

گھر میں وہ جس قدر خوش تھی۔ اب قدرے بھی بھی نظر آ رہی تھی۔ احسن اس کی ہر تبدیلی کو بغور نوٹ کر رہا تھا۔

”آئیں اماں۔“ رکشے والے کو کرایہ دے کر وہ ان کی راہنمائی کرتا آگے بڑھا۔

دونوں اس کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہو گئیں۔

”نیچے فرخندہ باجی رہتی ہیں۔“ وہ بظنی راستے سے میڑھوں کی سمت جاتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”میں اوپر رہتا ہوں، فرخندہ باجی اور ان کے شوہر

دونوں ہی عادت کے بہت اچھے ہیں۔ مجھے بالکل سگے بھائیوں کی طرح چاہنے لگے ہیں۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں مجھے یہاں رہتے ہوئے۔ اس سے

پہلے میں رشتے کی خالہ کے پاس رہا ہوں۔ ماں باپ تو بہت بچپن میں ہی میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔“ وہ میڑھیاں چڑھتا ہوا بتاتا جا رہا تھا۔

میڑھیاں طے کر کے ایک چھوٹا سا محن پڑتا تھا۔ جس میں گلاب اور موتیا کے چند گلمے ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک کونے میں کپڑے

دھونے کے لیے چھوٹا سا چوڑا تھا۔ محن پار کر کے ایک مختصر سالاؤنچ تھا۔ جس میں ایک صوفہ، ایک میز اور کونے میں چھوٹائی وی رکھا تھا۔ سامنے دو

کمرے اور سائیڈ میں چھوٹا سا کچن تھا۔

پورا گھر ایک ہی نگاہ ڈالنے میں تمام ہوتا تھا۔ لیکن گھر بہت اچھا اور صاف ستھرا بنا ہوا تھا۔ ہوا دار اور روشن روشن سا۔ گرمیوں کے دن تھے

لیکن گرمی کا نشان تک نہ تھا۔

”بھینس آپ لوگ۔“ اس نے لاؤنچ میں بیٹھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ ”میں فرخندہ آپا کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ کھانا پکا کر نیچے گئی ہیں۔

صبح سے یہیں تھیں۔“

اماں صوفے پر بیٹھ گئیں جبکہ وہ کھڑی رہی۔ احسن باہر نکل گیا تو وہ کچن کے دروازے پر آکھڑی ہوئی۔ چولہوں کی فٹنگ اور کونے میں بنی

برتنوں کی الماری کے بعد بمشکل ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی محاجاش تھی۔

کھانے کے برتن نکلے ہوئے تھے۔ یقیناً فرخندہ آپا کے تھے۔ احسن نے اتنے برتنوں کا کیا کرنا تھا۔ وہ جائزہ لیتی ہوئی کمرے میں چلی

گئی۔

ایک کونے میں سنگل بیڈ تھا۔ جس پر صاف ستھری بیڈیٹ بھی تھی۔ ایک کونے میں رائیگ ٹیبل اور کرسی رکھی تھی۔ ایک تپائی پر پانی کا

جگ اور گلاس رکھا تھا۔ بیڈ کے مقابل دیوار میں کپڑوں کی الماری تھی۔ بس یہی کل کائنات تھی کمرے کی۔

وہ دوسرے کمرے میں آئی۔ یہاں فرش پر ایک دری بھی تھی اور چند گاؤں کیے دھرے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر بڑی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔

گھر نہایت مختصر لیکن بے حد صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز نہایت صفائی سے اپنی جگہ بالکل درست نظر آ رہی تھی۔ کسی قسم کی کوئی افرا تفری نہ تھی۔

جیسا کہ ایک اکیلے، جوان لڑکے کے گھر میں نظر آ سکتی تھی۔

”ہمیں دکھانے کو کیا ہو گا سب کچھ۔“ اس نے یقین سے سوچا۔ ”تھے صفائی پسند لگتے تو نہیں۔ باہر محن میں رکھے گلمے تک صاف

ستھرے ہیں۔“

فرخندہ آپا آ کر نہایت محبت اور خلوص سے ملیں زنب کی ان سے تیسری ملاقات تھی لیکن وہ برسوں کی سی شناسائی کا رویہ اپناتے ہوئے

تھیں۔

نہب نے ان کے ساتھ مل کر کھانا نکالا۔ لاؤنج میں پڑی سینئر میبل بنا کر دیوار سے لگا دی گئی۔ بیچ میں دری بچھا کر وہ لوگ وہیں بیٹھ گئے۔
 ”اندر کروں میں اس وقت جس سا ہوتا ہے۔“

فرخندہ آپابولی تھیں۔ ”یہاں کھانا کھا لیتے ہیں۔“

”نہیں نہیں۔ جس تو نہیں۔“ اماں فوراً بولیں۔

”بڑا اچھا، روشن گھر ہے۔ عمدہ طرز پر بنا ہوا۔ ہاں، یہاں ہوا کچھ زیادہ آتی ہے۔“

نہب نے کوئی رائے دینا مناسب نہ سمجھا۔ اسے اتنا چھوٹا گھر اور مختصر سا زو سامان دیکھ کر کچھ خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔ اماں البتہ حسب عادت نہایت خوش تھیں۔

کھانا بھی نہایت لذیذ تھا۔ اماں، آپا اور احسن مسلسل بول رہے تھے جبکہ وہ چپ چاپ لقمے لے رہی تھی۔

”کیا بات ہے نہب! تم ٹھیک سے کھا نہیں رہیں۔“ فرخندہ آپا نے اس کی جانب توجہ کی۔ ”کھانا پسند نہیں آیا۔؟“

”کھانا تو بہت اچھا بنا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تمہارا جو دماغی اس گھر میں ایک نعمت ہے فرخندہ۔“ اماں بولی تھیں۔ ”مجھے اس کی طرف سے پریشانی نہ ہوگی۔ یہ تو ابھی بہت نا سمجھ اور نا

تجربہ کار ہے۔ سخت پریشانی ہوتی تھی مجھے سوچ سوچ کر۔ یہ کب اور کیسے سیکھے گی۔“

”سب آ جاتا ہے اماں۔“ فرخندہ آپا نس کر بولیں۔

”ہماری شادی ہوئی تو ہمیں کیا آتا تھا۔ چائے تک بنانا بعد میں سیکھی ہے۔“

”تم نے سیکھ لی چائے بنانا۔؟“ احسن شرارتاً اس سے مخاطب تھا۔

وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

واپسی میں بھی وہ انہیں چھوڑنے آیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اندر بھی چلا آیا۔

”مطمئن ہو۔؟“

اماں کردوں کے دروازوں میں پڑے تالے کھولنے لگیں تو وہ ہولے سے پوچھنے لگا۔

”کس بات سے۔؟“ وہ انجان بن گئی۔

”اپنے خوابوں کے محل سے۔“ وہ ہنسا۔

نہب نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا پھر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

”نہب!“

”جی۔؟“

”ایک بات کا یقین کر لو۔ خوشی کا کوئی سائز نہیں ہوتا جو اسے بڑے بڑے گھروں اور اونچی اونچی دیواروں والے محلوں میں ہی ڈھونڈا

جائے۔“

”میں نے کب کہا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تمہارا رویہ کہہ رہا ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”زنب! ہم دونوں اس چھوٹے سے گھر میں بھی خوش رہیں گے تم دیکھنا۔ مجھے یقین ہے اپنی محبتوں پر۔“
 ”اُوَ احسن۔“ اماں دروازہ کھول کر اسے بلاری تھیں۔ ”اندر آ جاؤ۔“
 ”میں چلتا ہوں اماں۔ پھر آؤں گا، خدا حافظ!“ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر باہر نکل گیا۔
 زنب کی گہری سوچ میں گم تھی۔



فارحہ اچانک ہی چلی آئی تھی۔ زنب کو دیکھتے ہی وہ پر جوش انداز میں اس سے لپٹ گئی۔
 ”زنب! قسم خدا کی بے حد مس کیا میں نے تمہیں۔ مجھے یقین ہے پورا تم نے بھی یاد کیا ہوگا۔ مجھے۔“
 ”ایسا دیر!“ زنب کلکھلا کر ہنس دی۔

”اور ایسی کمین ہو تم، پورے نوٹس بنا کر بیٹھی ہوگی، اکیلے اکیلے تیاری کپلیٹ ہوگی تمہاری تو۔“
 ”قسم لے لو ایک لفظ بھی پڑھا ہو تو۔“ زنب شرارت سے ہنسی۔

”میں تو سخت ٹینس ہوں زنب! کیا کیا کروں گی میں۔“ وہ جوش جذبات میں اس کی سنے بغیر بولے جارہی تھی۔ ”خبر ہے میری معگنی ہوگئی ہے میری شادی ہے مینیے بھر میں۔“

زنب کا منہ کھلا رہ گیا۔

”پھوپھی اماں نے اچانک ہی بلایا اور ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنا دی۔“ وہ ہنس رہی تھی۔ ”فیصل ابھی ابھی لوٹے ہیں لندن سے۔ اپنا بزنس کرتے ہیں۔ اب یہاں بھی رائج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن پھوپھی اماں نے کہا پہلے شادی، پھر کوئی دوسرا کام۔ انہوں نے جھٹ میرا نام لے دیا۔ بچپن سے لائک کرتے ہیں۔ مجھے، یقین کرو زنب؟ مجھے خبر ہی نہیں وہ نجانے کب سے سنے دیکھ رہے ہیں۔“
 وہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

”میں تو چند دنوں میں خوشی سے پھول کر کپا ہوگئی ہوں۔ ایمان سے کپڑے ٹائٹ ہو گئے ہیں۔ اتنی موٹی ہو کر آئی ہوں مہینہ بھر میں، اچھا سنو۔“

پھر وہ راز داری سے گویا ہوئی۔

”ان سے چھوٹا بھائی ہے احمر! پھوپھی اماں نے مجھ سے پوچھا، کوئی لڑکی نظر میں ہو تو بتاؤ۔ میں نے جھٹ تمہارا نام لے دیا۔ اگلے مینیے آ رہی ہیں پھوپھی، تم سے ملانے لاؤں گی انہیں۔ ایسے ہونٹوں کی طرح منہ کھولے کیا دیکھ رہی ہو۔ باہر سے لاء پڑھ آیا ہے۔ یہاں اپنی پریکٹس کرے گا۔ بہت ٹیلنٹڈ ہے، لاکھوں میں کھیلا کر دگی۔“
 وہ شرارت سے ہنسی۔

”فارحہ! میری معگنی ہوگئی ہے۔“ وہ بمشکل بول سکی تھی۔ ”احسن ایاز سے۔“

”کیا۔؟“ فارحہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔



”زنب! زنب! کاش تم تھوڑا سا انتظار کر لیتیں۔“ فارحہ کے لہجے میں بے پناہ تاسف تھا۔

”آخر تمہیں اس قدر جلدی کس بات کی تھی؟ تمہارا حسن و حل رہا تھا، تمہاری عمر نکلی جا رہی تھی۔ تمہارے حوصلے جواب دے رہے تھے۔ کیا ہو گیا تھا زینب؟“

اس کے انداز میں قدرے برہمی اور جھجھلاہٹ درآئی۔

”کس قدر خوش تھی میں، کتنی جلدی تھی، مجھے تم سے ملنے کی کسی طرح اڑ کر تم تک پہنچوں اور تمہیں یہ سر پرانزدوں، میں نے تو اپنے طور پر پورا پورا یقین کر لیا تھا کہ پھر بھی تمہیں پہلی نگاہ میں پسند کر لیں گی اور ہم دونوں کی دوستی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوٹ ہو جائے گی۔ لیکن تم زینب اور اماں اور وہ احسن صاحب۔“

آخر میں وہ جل کر بولی تھی۔

زینب سر جھکائے مجرموں کی طرح بیٹھی تھی جیسے فرد جرم سن رہی ہو۔

”اب کچھ پھوٹو بھی منہ سے، منگنی کر ہی لی ہے تو اب چہرے پر برستی اس اداسی کا کیا سبب؟

کیا اماں نے زبردستی کر ڈالی منگنی؟ پوچھتے بغیر؟“

”نہیں!“ اس نے نفی میں سر ہلایا، ”اماں نے تو انکار کیا تھا تم تو جانتی ہی ہو۔“

”پھر؟ پھر یوں اچانک؟“

”بس فارحہ!“ اس نے ایک شندھی سانس بھری ”یوں سمجھو، یہ نصیبوں کا کھیل ہے اپنے مقدر سے کوئی لڑ نہیں آ سکتا۔ آنکھ کی پتلی میں کتنے

ہی خواب جڑے ہوں۔ نظرسائے کھڑا مقدر ہی آتا ہے، خدا نے میری ہتھیلیوں میں اسی شخص کا نام تحریر کیا ہے احسن، احسن ایاز۔“

اس نے ہتھیلی سامنے پھیلا کر یوں کہا۔ جیسے واقعی ہاتھ پر اس کا نام لکھا ہے۔

”مجھے یقین ہے اس نے تمہیں مجبور کیا ہوگا۔“

فارحہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”چنانچہ شاید اس کو مجبور کرنا کہتے ہیں۔ وہ ہر دوسرے دن آتا تھا اماں سے ملنے، میرے حوالے کے بغیر، پھر مجھے بھی اچھا لگنے لگا اس کا

آنا۔ میں لاشعوری طور پر اس کی منتظر رہنے لگی۔ پھر اماں نے سمجھایا، کچھ دل نے سمجھایا اور بس یہی کل فسانہ ہے۔“

”چلو!“ فارحہ نے سانس بھری ”یوں ہی سہی، ظاہر ہے، اگر تمہارے دل نے بھی تمہیں یہ سمجھایا ہے تو پھر تو کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں

ہے ورنہ۔“

”ورنہ؟“ اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”ورنہ ہونے کو ابھی بھی بہت کچھ ممکن ہے۔“

فارحہ نے جیسے اس کا چہرہ جانچا تھا، ”اماں سے بات کرتی کہ.....“

”نہیں نہیں فارحہ.....“ وہ جلدی سے بول اٹھی۔

”جو ہو گیا بس اب وہی بہتر ہے۔ میں، میں اماں کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ فارحہ نے کندھے اچکائے ”خدا کرے یہ فیصلہ تمہارے حق میں بہتر ثابت ہو۔“

”اور تم سناؤ۔“ اس نے قصداً اس کا دھیان اس موضوع پر سے ہٹانے کے لیے کہا ”تم خوش ہو؟ وہ کیسے ہیں فیصل صاحب۔“

”وہ۔“ فارحہ بے ساختہ ہنس دی تھی۔ ”بہت اچھے ہیں۔ تم لوگ تو یہی کہو گی۔ تھوڑے سے بزنس مائنڈ ڈھن۔ ایک کے دو بنانے کے چکر

میں رہتے ہیں۔ جذباتیت سے قدرے گریز کرتے ہیں محبت تو فرما چکے ہیں۔ لیکن اظہار و ظہار بقول ان کے، انہیں آتا نہیں پھر بھی آئی ایم پی سی

دیکھو ناں یہ رنگ۔“

”انہوں نے ہی گفت کی ہے۔ ڈائمنڈ لگا ہے اس میں پچیس ہزار کی ہے۔“

”پچیس ہزار؟“ زینب ہونٹوں کی طرح اس نازک سی انگوٹھی کو دیکھنے لگی ”صرف یہ انگوٹھی؟“

”ہاں تو اور کیا۔“ فارحہ ہنس دی ”میں خود ان کے ساتھ گئی تھی پسند کرنے۔ ڈائمنڈ ہے بلی کوئی عام سا گیند نہیں۔“

اس کے کہنے پر زینب کی نگاہ اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی انگوٹھی پر گئی اس نے مٹھی بند کر لی اس کی انگوٹھی میں سرخ رنگ کا عام سا گیند

تھا۔

”ڈائمنڈ سے کم کی تو فیصل بات ہی نہیں کرتے۔“

فارحہ اپنی دھن میں مگن بول رہی تھی۔ ”پتا ہے زینب! میں تو منہ دکھائی کا گفت بھی وہیں پسند کر آئی ہوں۔ اتنا حسین، دیدہ زیب سیٹ

ہے۔ نگاہیں خیرہ کر دینے والا۔ فیصل بولے، تمہیں پسند ہے تو میں اسی کا آرڈر دے دیتا ہوں۔ چیز تمہیں پہننی ہے، پسند تمہاری ہی ہونی چاہیے، میں

یہ سر پر انزور پرانہ نہیں مانتا۔ وہیں آرڈر کر دیا انہوں نے میرے سامنے ہی۔“

”بہت امیر ہیں؟“ زینب کے لیے میں اس کی تمام حسرتیں بول رہی تھیں۔

”ہاں، بہت! دولت باندی ہے ان کے گھر کی۔“ فارحہ نے بال جھٹکے۔

کتنے تھوڑے دن گزرے تھے۔ اس کا ہر انداز بدل چکا تھا۔ اس نے ابھی سے خود کو مسز فارحہ فیصل کے روپ میں دیکھا اور سوچنا شروع

کر دیا تھا۔

زینب ایک تحیر کے عالم میں گھری اس کو دیکھ رہی تھی۔

”جج زینب میں نے تمہارے لیے فیصل سے بھی اچھا شخص پسند کیا تھا۔ فیصل اتنے پیڑم نہیں جتنا کہ احمر لیکن خیر۔“ اس نے پھر سانس بھر

کر کہا ”جیسا کہ تم نے کہا وہی قسمت۔“



”زینب! اماں تیسری مرتبہ کرے میں آئی تھیں۔“

”بیٹا! کیا بات ہے؟ طبیعت تو تھیک ہے تمہاری؟ دو پہر ہو گئی ہے تم ابھی تک بستر میں پڑی ہو۔“

”ٹھیک ہوں اماں۔“ وہ بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سستی سے ہاتھ اٹھا کر انگریزی کی ”بس دل چاہ رہا تھا دیر تک سونے کا۔“

”ارے بیٹا! اب یہ رواج بدلو اپنے۔“ اماں چڑ کر بولیں۔ ”مہینہ، دو مہینہ میں تمام عادتیں سدھا کر لو۔ کل کو سسرال جاؤ گی تو کون تمہیں

یوں بارہ بارہ بجے تک سونے دے گا۔“

”سسرال میں کون ہے ایسا۔ آپ نے تو بڑا جن کر گھر اور بڑھوٹا ہے میرے لیے۔“

”ساس سسر نہ سہی، اپنے گھر کے ہزار دھندے تو ہوتے ہیں عورت کو۔“ اماں اس کے لہجے کا طنز قطعاً محسوس نہ کر پائی تھیں۔ ”اور پھر وہ

جس کے دم سے سسرال ہے۔ شوہر تو ہو گا۔ اس کی ہانڈی روٹی تو کرو گی۔ یا بھوکا پیاسا ہی روانہ کر دیا کرو گی یا اسے کہو گی میرا دل آج دیر تک سونے

کا ہے۔ گھر میں دس نوکر ہوں پھر بھی سویرے اٹھ کر شوہر کو چائے پانی کا پوچھنا پڑتا ہے۔ تمہیں صبح اٹھ کر یہ خبر نہیں ہوتی کہ تم خود کس شے سے ناشتہ

کر دو گی۔ میں سامنے لا کر چائے رکھ دوں تو چہینے کا احسان کر دیتی ہو نہیں تو اللہ اللہ خیر صلا۔“

اماں نجانے کیوں غصے میں تھیں۔ وہ بے دلی سے گھٹنوں پر سر ٹکائے ان کی تقریر سنتی رہی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری تھی۔ فارحہ کی

آمد، اس کی باتیں، اس کے دل کا جینن آنکھوں کی نیند چھین کر لے گئی تھیں۔ ساری رات اس نے محض یہ جاننے کی آرزو میں گزاری تھی کہ آیا اس کا فیصلہ درست تھا یا غلط کیا اس نے جلد بازی میں ایک غلط قدم اٹھالیا تھا۔ اور ساری رات جاگ کر بھی یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی تھی اور اب اماں کی باتیں اس کی طبیعت اور مکدر کر رہی تھیں۔

”صبح اٹھنا، شوہر کو ناشتہ کرانا، گھر کے ہزار دھندے، روز کی ہانڈی روٹی۔“ اس کے ذہن میں ان ہی باتوں کی گردان ہونے لگی۔

”فیصل تو ڈائنڈ ہے کم پر بات یہی نہیں کرتے یہ رنگ دیکھو بچیس ہزار کی ہے وہ بولے، چیز تمہیں پہننی ہے، پسند تمہاری ہی ہونی چاہیے دولت باندی ہے ان کے گھر کی۔“ فارحہ کی وہی باتیں جن پر وہ ساری رات غور و خوض کر چکی تھی۔ پھر ذہن میں پلچل چائے لگیں۔

”وہ شخص تمہیں کچھ نہیں دے گا زینب! سوائے بچوں کی لائن کے ساری عمر روپے پیسے کے لیے لڑتے جھگڑتے گزر جائے گی۔“

”میں نے تو تمہارے لیے فیصل سے بھی اچھا شخص پسند کیا تھا۔ لیکن وہی قسمت۔“ اس نے ایک گہری سانس بھری۔

”ہاں قسمت۔“ پھر وہ بڑبڑائی ”ضروری نہیں کہ ہر حسین عورت کے مقدر میں خدا نے ایک عالیشان محل بھی لکھ دیا ہو۔ آمنہ ٹھیک کہتی ہے لیکن اگر چہ وہ دیکھنے کے لیے ایک بدمرگ سا آئینہ ہی ملتا ہے تو پھر حسن کا کرنا کیا ہے؟ کیوں دیتا ہے خدا حسن جی سی جی میں جلتے اور کڑھنے کے لیے، حسرتوں کا ماتم کرنے کے لیے، ایسے حسن کا فائدہ کیا جسے رونمائی میں ایک نفی نگینہ جڑی انگوٹھی ملے۔“

وہ اپنے خیالوں سے چوکی اماں سامنے کھڑی فکر مندی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

”جی..... جی اماں۔“

”کیا بات ہے چندا، تیری طبیعت تو واقعی خراب لگ رہی ہے ایسا اترا اترا چہرہ، تھکی تھکی آنکھیں، میں بھی بس جو منہ میں آئے، بولے چلی جاتی ہوں۔“

اماں نے اس کا سر سینے سے لگایا۔

”اٹھ کر منہ دھو لے۔ میں اپنی رانی کو چائے بنا دیتی ہوں۔“

”میں ٹھیک ہوں اماں۔“ بچھے اپنی عادتیں درست کر لینی چاہیں۔ کل کلاں کو کون میرے اتنے نخرے اٹھائے گا۔“

وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ اماں پیچھے کسی گہری سوچ میں گم کھڑی تھیں۔



شام کو حیرت انگیز طور پر وہ چلا آیا تھا۔

”السلام علیکم۔ نصیب دشمنان۔ سنا ہے طبیعت نا ساز ہے۔“ وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ ”یوں بستر میں گھس کر

کس بات پر جی جلا یا جا رہا ہے؟“

زینب حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ یہ یقیناً اماں کے فون کا کرشمہ تھا۔ اس نے ایک گہری سانس

بھری۔

”اماں نے فون کیا تھا آپ کو؟“

”یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں اور پھر اتنی سی بات تو کوئی بے وقوف بھی با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں بے وقوف ہی ہوں۔“ وہ جلی بٹھکی تھی۔

”جی نہیں۔ آپ مہا بے وقوف ہیں۔“ وہ ہنس دیا۔

زینب نے برہمی سے نگاہ اٹھائی۔ بلیک لائٹنگ کی شرٹ اور بلیک جینز میں لمبوس وہ بڑا اسارٹ لگ رہا تھا۔ سلیقے سے جتے ہوئے سیاہ بال ہلکی ہلکی چمک دیتے معلوم ہو رہے تھے اور سیاہ آنکھوں میں وہی اپنائیت تھی۔ وہی خلوص تھا۔ وہی محبت تھی۔ اسے یوں محویت سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے دیکھ کر اس کے لب شرارت سے مسکرا اٹھے۔

”اچھا لگتا ہوں ناں؟“ بڑی معصومیت سے اس نے پوچھا تھا۔

خجالت سے زینب کا ہواشہ ہو گیا۔ گالوں پر دوڑتی سرخی اس نے خود ہی محسوس کر لی تھی۔

”چائے بنا لاؤں؟“ اسے فوری طور پر یہی بات سو گئی۔

”جی نہیں۔“ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

”میں لاتی ہوں چائے بنا کر۔“

اسے وہاں سے اٹھنے کا بہانا چاہیے تھا۔ اس کی نظروں کی پیش برداشت سے باہر تھی۔ بڑی تیزی سے وہ باہر نکل آئی تھی۔

اماں برآمدے میں عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ وہ کچن میں چلی آئی۔ چائے کا پانی رکھتے ہوئے اس کے لمبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ رقصاں تھی۔ کل سے طبیعت سخت اداس تھی۔ جی بے حد ملول تھا اور اب جیسے اچانک ہی مطلع صاف ہوا تھا اور چمکتا ہوا سورج اس کے روبرو چلا آیا تھا۔ دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ چائے بنانے کے دوران وہ ہاتھ میں بڑی انگوٹھی دیکھتی رہی۔ اب وہ خوب صورت اور قیمتی معلوم ہو رہی تھی۔

چائے بنا کر وہ اندر آئی تو اماں ہنوز نیت کی حالت میں تھیں۔ وہ برآمدہ عبور کرتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔ وہ کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر غالباً غنودگی میں چلا گیا تھا۔

”چائے۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”اچھا جناب!“ وہ سیدھا ہو کر پیالی پکڑتے ہوئے بولا۔

”سو گئے تھے؟“ وہ سامنے آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اردو ادب کے مشہور افسانے

کتاب اردو ادب کے مشہور افسانے بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل

ہیں۔ (آخری آدمی، پس ماندگان، انتظار حسین)؛ (آپا، ممتاز مفتی)؛ (آنندی، غلام عباس)؛ (اپنے دکھ مجھے دے دو، وہ بڑھا، راجندر سنگھ بیدی)؛ (بلاؤز، کالی شلوار، سعادت حسن منٹو)؛ (عید گاہ، کنسن، شکوہ شکایت، ششی پریم چند)؛ (گڈ ریا، اشفاق احمد)؛ (توپر شکر، بانو قدسیہ)؛ (گنڈا سا، احمد ندیم قاسمی)؛ (حرام جادی، محمد حسن عسکری)؛ (جینی، شفیق الرحمن)؛ (لحاف، عصمت چغتائی)؛ (لوہے کا کر بند، رام لعل)؛ (ماں جی، قدرت اللہ شہاب)؛ (مٹی کی مونا لیزا، اے۔ حمید)؛ (اور کوٹ، غلام عباس)؛ (مہا لکشی کا پل، کرشن چندر)؛ (ٹیلی گرام، جو گنڈر پال)؛ (تیسرا آدمی، شوکت صدیقی) اور (ستاروں سے آگے، قراۃ العین حیدر)۔

یہ کتاب افسانے سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

”تھکے ہوئے ہیں؟“

”ہاں! تھکا ہوا تو ہوں۔ لیکن سویا نہیں تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔“ اس نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔

”کیا سوچ رہے تھے؟“

”بتا دیا تو تم پھر بھاگ جاؤ گی۔“ وہ پھر شرارت سے مسکرایا۔

”یا اللہ! زنب کا چہرہ پھر سرخ ہو گیا۔“ آپ تو بہت ہی بدتمیز ہیں۔“ اس نے بمشکل کہا تھا۔

”ہائے!“ احسن نے بناوٹ سے آہ بھری۔ ”ابھی سے ہی بدتمیزی کے طعنے مل رہے ہیں بعد میں تو نجانے کیا کچھ کہا جائے گا۔“

”احسن میں باہر چلی جاؤں گی۔“ اس نے زج ہو کر دھکی دی۔

”اوکے، اوکے۔“ اس نے مصالحت بھرے انداز میں ہاتھ اٹھایا ”آج کی بدتمیزیاں یہیں ختم کی جاتی ہیں اور میں تو یونہی جان کر تھیں

تنگ کر رہا تھا۔ آخر تمہارے لٹکے ہوئے منہ کا بھی تو کچھ علاج کرنا ہی تھا۔ اب دیکھو ناں ان ہی ”بدتمیزیوں“ سے کیسی چمک آگئی ہے چہرے پر۔

آنکھیں روشن ہو گئی ہیں۔ ہونٹ یہاں سے وہاں تک اس کان سے اس کان تک۔“

زنب کو بڑے زور سے ہنسی آئی۔

”دیکھا بدتمیزیوں کا اعجاز؟ وہ اطمینان سے چائے پینے لگا تھا۔

”میں اماں سے شکایت کروں گی آپ کی۔“ انہیں کہہ دوں گی کہ آپ کو منع کر دیں یہاں آنے سے۔“ وہ شرمندگی و دور کرنے کی غرض سے

قدرے خفگی سے بولی۔

”تم خود کیوں نہیں کہہ دیتیں؟ اماں کے کاغذ پر بندوق رکھنے کی کیا ضرورت۔ ایک مرتبہ کہہ کر دیکھ لو، اگر تمہاری نگلی سے بھی گزر جاؤں

تو جو سزا چور کی وہ میری۔“

زنب خاموش رہی۔

”میرا مطلب تھا شادی سے پہلے۔“ پھر وہ سر جھکا کر وضاحت کرنے لگی۔

”سوچا تو میں نے بھی یہی تھا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ”کہ رخ روشن کا دیدار اب اپنے گھر لے جا کر ہی کریں گے دل کو مارنا مجھے بھی پسند

نہیں، لیکن اماں نے فون پر بتایا کہ تم گم دم دیواروں کو تنگ رہی ہو۔ کھانے پینے سے ہاتھ اٹھا رکھا ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ سوچا، ایک نظر دیکھتا چلوں۔

میں آفس سے گھر جا رہا تھا۔“

”ارے بیٹا! کھڑے بھی ہو گئے۔“ اماں اندر داخل ہوئی تھیں ”بیٹھو، بھئی کھانا کھا کر جانا۔“

”جی اماں! بھوک تو لگی تھی سخت قسم کی۔“ اس نے شرارت سے زنب کو دیکھا۔ ”لیکن آپ کی لاڈلی بیٹی نے کھانے کو پوچھا ہی نہیں۔ خالی

پیٹ بڑی اسرونگ سی چائے پینی پڑی۔“ اماں نے اسے گھورا۔

”ارے بچی! تم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ساتھ سکٹ ہی رکھ دیتیں کھانے کو پوچھنا تو ایک طرف ٹھہرا۔“

”اماں! انہوں نے کہا ہی نہیں۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”اب میں اپنے منہ سے کہتا ہوا اچھا لگتا؟“ وہ اماں کے پیچھے کھڑا شرارت سے بول رہا تھا۔

”اب بھی تو اپنے ہی منہ سے کہہ رہے ہیں۔“ وہ جل کر بولی تھی۔

صاف ظاہر تھا۔ وہ مجھ سے اماں سے ڈانٹ پڑوانے کے کام کر رہا تھا۔ زنب کو اس پر سخت غصہ آیا۔

پھر اماں نے بے حد اصرار کیا لیکن وہ کھانے پر نہیں رکا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اماں خواہ مخواہ کے تکلف میں پڑیں گی۔ وہ ویسے ہی اماں

کے باورچی خانے میں گھسے رہنے سے چڑتا تھا۔

”اچھا نہیں لگتا اماں۔“ اماں کے بے حد اصرار پر اس نے کہا تھا ”تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ پھر تو انشاء اللہ ہمیشہ اکٹھے ہی کھانا کھایا کریں گے۔“

”نہنب! میری بچی اب کچھ عقل تیز سیکھ چنڈا!“

اماں نے اسے رساں سے سمجھایا ”آدی گھر آئے تو سب سے پہلے اسے چائے پانی کا، روٹی کا پوچھتے ہیں۔ ایسے بڑا حراموں کی طرح آلتی پالتی مارے نہیں بیٹھے رہتے۔ باہر سے آیا ہوا بندہ کبیدہ خاطر ہوتا ہے۔“

”اماں۔“ وہ چڑگئی ”چائے بنا کر دی تو تھی۔“

”میری بچی وہ کام کر کے، دن بھر کا تھکا ہار لوٹا تھا۔ تو نے یہ نہ سوچا کہ اسے بھوک لگی ہوگی۔“

”بھوک لگی تھی تو کہہ دیتے زبان دیسے تو بہت چلتی ہے۔“



جب بھی دل و دماغ کسی مسئلے پر الجھ پڑتا وہ آمنہ کی طرف چلی آتی تھی۔

”زہے نصیب۔“ آمنہ اسے دیکھ کر مسکرائی ”ملکہ عالیہ تشریف لائی ہیں۔“

”اب تو مجھے اس خطاب سے پکارنا چھوڑ دو آمنہ!“

وہ ہچڑھی پر بیٹھتے ہوئے بولی ”ملکہ بننے کے جتنے خواب تھے، اپنے ہاتھوں سے جلا کر ان کی راکھ دریا برد کر دی ہے میں نے۔“

”ایسا کیا ہو گیا اب؟ پھر سوچنے لگی ہو؟“

آمنہ روٹیاں دسترخوان میں لپیٹنے لگی۔

”آمنہ! کیا انسان کو اپنی سوچوں پر اختیار ہوتا ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان وہی کچھ سوچے جو وہ سوچنا چاہتا ہے۔“

”سوچیں۔ دو طرح کی ہوتی ہیں نہنب!“ آمنہ کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ مرکوز کر کے بولی ”ایک قسم تو ان جملہ آدمیوں کے بے لگام سوچوں کی ہوتی

ہے، جن پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ کوئی زور نہیں چلا۔ جب ان کا جی کرتا ہے، آکر پریشان کرتی ہیں۔ ستاتی ہیں۔ زنج کر دیتی ہیں۔ دوسری

قسم کی سوچیں وہ ہوتی ہیں نہنب جو انسان اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر آپ پیدا کرتا ہے۔ فیصلہ کن سوچ! دوسروں کا حال دیکھ کر عبرت پکڑنے

کی سوچ، توبہ کرنے کی سوچ، اپنی اصلاح کرنے کی سوچ، اپنا آپ بہتر بنانے کی سوچ۔ بس اس سوچ کا مضبوط اور اچھا ہونا چاہیے نہنب! منشی، جملہ

آدمی، بے اختیار سوچیں تو ہر انسان کو پکڑتی ہیں۔ کسی کو نہیں چھوڑتیں۔ لیکن مطمئن، پرسکون اور بااعتماد لوگ اس لیے نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی قوت ارادی

سے مثبت سوچ پیدا کرتے ہیں۔ جو منفی سوچوں کو شکست دیتی ہے اور بعض کوتاہ اندیش، بد قسمت لوگ خود سے سوچیں تب بھی منفی رخ پر ہی سوچتے

ہیں ہاں ایسے لوگوں کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔“

”تب ہی تم اتنی مطمئن رہتی ہو آمنہ؟ تم منفی سوچوں کو اتنی آسانی سے شکست دے لیتی ہو؟“

”ہاں نہنب! کبھی کبھار حالات بھی انسان کو مطمئن رہنا سکھا دیتے ہیں۔ چوری کا کلکانہ ہو تو آدمی سکون سے ہی سوتا ہے۔ خیر چھوڑو! تم

سناؤ۔ کیسی ہو۔ کیا کرتی رہتی ہو۔ امتحان دینے کا ارادہ ہے یا شادی کی تیاریوں میں مگن ہو۔“

”امتحان کی کس کو فکر ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرا دی ”فارحہ کی اگلے مہینے شادی ہے۔ میں اکیلی کہاں نوٹس اور کتابوں کے چکر میں بھاگی

بھروں گی۔ بس خیر باد کہہ دیا پڑھائی کو۔ پھر اماں بھی کہنے لگیں، سکون سے گھر میں بیٹھو۔ امتحان دینا ہو تو اگلے سال دینا۔ احسن مدد کر دیں گے۔“

”اور احسن بھائی وہ کیا کہتے ہیں؟“

”پتا نہیں۔ میری اس موضوع پر ان سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاید اماں نے بات کی ہو۔ ویسے مجھے یقین ہے، انہیں علم ہوا بھی تو وہ میری

مرضی پر چھوڑ دیں گے۔“

”فارحہ کی شادی اگلے ماہ ہے؟“ آمنہ پوچھنے لگی ”اس قدر اچانک؟“

”ہاں۔ وہ لاہور گئی تھی ناں پھوپھی کے پاس۔ وہیں معنی طے ہو گئی پھوپھی زاد بھائی سے۔ آمنہ! لوگ اتنے خوش قسمت بھی ہوتے ہیں

کیا؟ کچ مجھے تو رشک آ رہا ہے فارحہ پر۔“

”کیوں۔“ آمنہ مسکرا دی ”اس میں فارحہ پر رشک کرنے والی کون سی بات ہے؟ معنی اور شادی طے پانا۔ ہر لڑکی کی زندگی میں یہ مرحلے

آتے ہی ہیں۔ اور پھر تمہارے اپنے ساتھ بھی تو یہی سب ہوا۔ فارحہ پر کیوں رشک کر رہی ہو؟“

”بہت فرق ہے آمنہ!“ اس نے مصنوعی ہنسی ہنس کر سر ہلایا۔ ”فارحہ کی شادی تو لکھ پٹی آدمی سے ہو رہی ہے۔ صرف معنی میں اسے ڈائنڈ

رنگ ملی ہے، پکیس ہزار کی۔ منہ دکھائی پر جو سیٹ طے گا اس کی قیمت میرے تصورات سے تو باہر ہی ہے۔ فارحہ کی خوشی تو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اور کیوں نہ خوش ہووے۔“

آخر میں وہ سر جھکا کر انگلی سے فرش پر لکیریں کھینچنے لگی۔

”تم خوش نہیں ہو زنب؟“ آمنہ نے بغور اسے دیکھا تھا۔

زنب بہت دیر تک کے لئے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ وہ کم از کم آمنہ کے سامنے بالکل جھوٹ نہیں بول پاتی تھی۔

”پتا نہیں آمنہ۔“ بہت دیر بعد وہ بولی۔ ”میری سمجھ سے باہر ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں خوش ہوں۔ بے حد خوش، احسن آتے ہیں تو

میرا دل میرے قابو میں نہیں رہتا۔ ان کی آنکھوں سے چھلکتی شرارت، ان کے چھوٹے چھوٹے جملے ایسا لگتا ہے، زندگی کا سارا احسن ان ہی چھوٹی

چھوٹی باتوں میں ہے۔ میری ہر پریشانی، ہر غمی سوچ کہیں پس منظر میں چلی جاتی ہے اور..... اور..... میرا دل کہتا ہے، آمنہ! کب وقت گزرے اور

کب ہمارا ساتھ ہمیشہ کے لئے امر ہو جائے۔ لیکن جب احسن سامنے نہیں ہوتے یادیں کچھ ماند پڑتی ہیں تو عجب لا حاصل خواہشات میرا دامن قحط

لتی ہیں۔ ایک عالیشان گھر، گاڑی اور بے حد قیمتی چیزوں کی خواہش میرے اعصاب پر سوار ہونے لگتی ہے۔ میں سوچتی ہوں، کیا کبھی احسن مجھے وہ

سب کچھ دے پائیں گے جو میں چاہتی ہوں۔ جس کی میں نے خواہش کی، جو میں نے خدا سے مانگا۔ آمنہ! آمنہ! خدا نے وہ سب کچھ بن مانگے

فارحہ کو کیوں بخش دیا؟ آمنہ! خدا کی قسم جب فارحہ مجھ سے اپنے منگیتے کا ذکر کر رہی تھی میرے اندر احساس کمتری کا سناٹا گونجنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا،

اسی لمحے احسن کی محبتوں سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اپنی جلد بازی حماقت لگ رہی تھی۔ پھر کل احسن ملنے آگئے اور میرا من ایسے شانت ہو گیا جیسے کچھ

ہوا ہی نہ تھا۔ جیسے مجھے فارحہ سے، اس کے منگیتے کی دولت سے، اس کی قسمت سے کچھ سروکار نہیں بتاؤ! آمنہ! میرے اندر جاری اس ”جنگ“ کا انجام

کیا ہوگا؟“

آمنہ بغور اس کی باتیں سن رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ زنب کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”اسی لئے تو خدا نے حکم دیا ہے زنب! کہ اپنے سے اوپر والوں کو نہیں، نیچے والوں کو دیکھو۔ آج کے بعد جب تمہیں فارحہ پر رشک آئے

تو تو میرے بارے میں سوچنا اور خدا کا شکر بجالانا کہ اس نے تمہیں کتنی اچھی قسمت سے نوازا ہے۔“

”تمہارے بارے میں؟“ زنب کو اچنبھا ہوا۔

”ہاں زنب! یہ کوئی شکوہ شکایت نہیں اپنے حالات کا عام سا اظہار ہے۔ وہ بھی اسلئے کہ یہ سب کچھ نہ کر شاید تم ثابت رخ پر زیادہ آسانی

سے سوچنے لگو۔ پتا ہے زنب! انسان امیدوں کے بل پر جیتا ہے۔ لیکن ان خواہشوں اور امیدوں کو جی روگ بنانا عقل مندی نہیں، حماقت ہے۔“

”میرے اندر ہمیشہ سے یہ خواہش دفن ہے نہ بکھڑے ہو کر چاہنے والا شوہر ملے۔ جس کی آنکھوں میں، دل میں، بس میں ہی میں ہوں جو مجھے سامنے پا کر گرد و پیش سے یوں بے نیاز ہو جائے جیسے احسن بھائی تمہاری موجودگی میں ہوتے ہیں۔ بہت کم عمری سے ہی یہ خیال میں نے اپنے دل میں بسالیا تھا۔ ایسے کہ اب اس خواہش سے دستبردار ہونا بہت اذیت ناک محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اب علم ہوا ہے نہ بکھڑے ہو کر چاہنے والی عورت کا کتنا قیمتی زیور ہے۔ یہ حسن جس کی مرد کو آرزو ہوتی ہے جسے وہ اپنی پسند عورت میں ہر حال، ہر قیمت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اتنا ٹوٹ کر نہیں چاہتا جیسا کہ چاہے جانے کا حق ہے۔ یہ حسن، جس سے خدا نے تمہیں نوازا ہے، میرے پاس نہیں اس لئے مجھے آج تک کسی نظر نے نہیں سراہا، کس دل نے نہ چاہے کا دعوا نہیں کیا۔ کسی نے یہ غور نہیں بخشا۔ میرے لئے جو رشتے آتے ہیں، تم تو ان کا سوچ کر خود کشتی کر لو۔ کبھی کسی رند و دیکار شہ، کبھی کسی ایسے شخص کا جو اولاد کے لئے دوسری شادی کا خواہشمند ہو۔ کبھی بھی نسرین خاں آتی تھی۔ پینتالیس سالہ آدمی کا رشتہ لے کر جس نے حال ہی میں اپنی بیوی کو اس لئے طلاق دی ہے کہ وہ کردار کی اچھی نہ تھی۔ امی بخجیدگی سے اس رشتے پر غور کر رہی ہیں۔“

”کیوں کیوں آمنہ؟“ نہ بکھڑے ہو کر اس کے دکھ پر پانی ہو گیا۔

”پھر اور کیا کریں امی۔“ آمنہ ہولے مسکرائیں۔ ”خالہ تو صاف کہہ گئی ہیں کہ یہ زمانہ میرے جیسی دہلی پتلی، سانولی لڑکیوں کا نہیں جو دیکھنے آتا ہے، ناک بھوں چڑھا جاتا ہے ایک عرصہ ہو گیا لوگوں کے سامنے اپنی نمائش کرتے کرتے اب دل کہتا ہے، جو ہے، جیسا ہے، اور جہاں ہے..... بس پلک جھپکتے اس ذہنی بوجھ سے نجات مل جائے۔“

نہ بکھڑے ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس پر سکون سی آمنہ کے اندر کیسی ہلچل تھی۔ کتنا تلاطم تھا۔ وہ اس کی اتنی قریبی دوست آج تک نہ جان سکی تھی۔ کس قدر بردبار تھی۔ یہ دہلی پتلی، سانولی لڑکی۔ جس کا خوب صورت، نازک دل کسی کو آج تک نظر نہ آ سکا تھا۔

”اور تم نہ بکھڑے ہو کر کتنا خوش قسمت بنایا ہے تمہیں خدا نے۔ ایک شخص ہے۔ مکمل شخص جس نے اپنا آپ تمہارے نام کر دیا ہے۔ جس کی آنکھوں میں تمہارے حوالے سے اتنے خواب سجے ہیں۔ جس کے دل میں تمہارے لئے نہ جانے کیا کچھ کرنے کی تمنا ہے۔ اور پھر بھی تمہیں تسلی نہیں ہو پاتی۔ زندگی بہت چھوٹی بہت مختصر ہوتی ہے۔ نہ بکھڑے! انسان کو پتا بھی نہیں چلتا اور پلک جھپکتے میں تمام ہوتی ہے۔ اتنی چھوٹی سی زندگی کے لئے خواہشات کا لاتنا ہی سلسلہ بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔“

”تم تم آمنہ! اراضی ہو اس آدمی سے شادی کرنے پر؟ نہ بکھڑے ہو کر کا دماغ فی الوقت محض اسی نکتے پر مرکوز تھا وہ جو ایک بیوی بھگت چکا ہے جو اس قدر شگنی ہے۔“ آمنہ ہنس دی۔

”میری بات چھوڑو۔ یہ ذکر تو میں نے تمہیں سمجھانے کے لئے نکالا تھا۔ اپنا معاملہ تو میں نے خدا اور پھر اپنی اماں پر چھوڑا ہوا ہے۔ اسی لئے مجھے پورا یقین ہے کہ میرے ساتھ کچھ برائیاں ہوگا۔ تم یہ بتاؤ عقل شریف میں کچھ آیا۔“

نہ بکھڑے ہو کر مسکرائی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”فارعہ پر نہیں خود پر رشک کرو نہ بکھڑے!“ آمنہ آہستگی سے بولی تھی ”اس خدا نے تمہیں بے حساب نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ حسن کی حقیقی دولت اور بے لوث محبت کی جتنی خوشی سے نوازا ہے۔“



دن پر لاگ کر اڑ رہے تھے۔ وقت اس قدر تیزی سے گزر رہا تھا کہ نہ بکھڑے ہو کر کبھی بھی گھبراہٹ محسوس ہونے لگتی تھی۔

اماں کی مصروفیات تو اس سے سواتھیں۔ سارا سارا دن وہ کیا نکالتی اور کیا رکھتی تھیں، نہ بکھڑے ہو کر کبھی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ کبھی وہ سلائی مشین پر جھکی نظر آتیں، کبھی اسے دروازہ لگانے کا کہہ کر بازار کو نکل کھڑی ہوتیں۔ نہ بکھڑے ہو کر کبھی قسم کا صلاح مشورہ وہ غیر ضروری خیال کرتی تھیں ان

کے خیال میں یہ سراسر ان کا اپنا سر درد تھا۔ زینب کو پریشان ہونے یا انہیں پریشان کرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

”شادی سے کچھ دن پہلے ہی سارے انتظامات مکمل ہوں گے انشاء اللہ۔“ انہوں نے زینب سے کہا تھا ”خدا نے چاہا تو اپنی بساط سے بڑھ کر دوں گی۔ تم فکر مند مت ہونا۔“

زینب نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ خود وہ سارا سارا دن فارغ بیٹھی نجانے کیا کچھ سوچا کرتی تھی۔ کبھی جی چاہتا تو کام کر لیتی ورنہ بونہی اماں کے آسرے پر بیٹھی رہتی۔ نجانے کیسے دن تھے وہ۔ بوجھل بوجھل سے اداس اداس سے۔

پھر انہی دنوں فارحہ کی شادی کا بلاوا آ گیا۔ فارحہ کا بھائی ایک خوب صورت، چمکتا ہوا کارڈ اور ساتھ ہی فارحہ کا رتھہ دے گیا۔ اس میں زینب کو پورا ہفتہ گاناؤں میں آنے کی تاکید تھی۔ ساتھ ہی مایوں، مہندی کی تقریبات کا کارڈ بھی تھا۔

”شادی میں چلی جانا۔ یا زیادہ سے زیادہ مہندی میں۔“

اماں نے کارڈ دیکھ کر کہا تھا۔

”اگلے مہینے تمہاری اپنی شادی ہے۔ گھر سے زیادہ ٹکٹا اور ہار سنگھار کرنا مناسب نہیں۔ روپ نہیں چڑھتا لڑکی پر۔ پھر اتنی تقریبات میں شرکت کے لیے کپڑے کہاں سے لاؤ گی؟“

زینب بھی یہی سوچ کر خاموش ہو رہی۔

”اگر فارحہ سے پہلے میری شادی ہو جاتی تب تو میں ضرور ہفتہ بھر پہلے شرکت کرتی“ اس نے سوچا ”پہننے کے لیے کپڑے بھی ڈھیر دن ہوتے اور آنے جانے کا مسئلہ بھی نہ ہوتا۔ احسن کے ساتھ مزے سے جایا کرتی۔“

اپنی سوچ پر اسے خود ہی بڑے زور کی ہنسی آئی۔ وہ بہت دیر تک اسی سوچ سے لطف لیتی رہی۔



فارحہ کی مہندی میں شرکت کرنے کے لیے اس نے اپنا سفید شیٹون کا سوٹ منتخب کیا تھا۔ اور شادی کے لیے اپنا سرخ بناری غرارہ، جو دو سال قبل اپنی ماموں زاد کی شادی میں پہننے کے لیے بھداصرار بنوایا تھا۔

”دیکھیں ناں اماں۔ کالا کالا سا ہو رہا ہے۔“ غرارہ اب اس کی نظروں میں پہلے جیسا مقام بنانے سے قاصر تھا ”صاف لگ رہا ہے برسوں پرانا ہے۔ پھر یہ ٹشو کا دوپٹہ۔ جگہ جگہ چرے لگے ہیں۔“

”غرارہ اب تمہیں کالا لگے یا پیلا۔ پہننا یہی ہے۔ ایک دفعہ کا پہننا ہوا جوڑا بھی نظروں میں نہیں سارہا۔ پائی پائی کر کے بنوایا تھا یہ میں نے۔ وہ بھی تمہاری ضد سے مجبور ہو کر۔ اب کم از کم میں تمہارے جینز کے لیے رکھے ہوئے جوڑوں میں سے کوئی جوڑا نکال کر دینے سے رہی جو کہ تمہاری منشاء ہے۔“ اماں نے بے حد صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ زبان دانستوں تلے دبا کر رہ گئی۔ اماں نے دل کا چور خوب بکڑا تھا۔ اس کی نگاہ اس گہرے جامنی رنگ کے جوڑے پر تھی جس پر اماں نے شیشوں کی خوب صورت کڑھائی کروائی تھی۔

”ایک مرتبہ پہن کر رکھ دیتی اماں۔“ وہ منمنائی۔ ”کون سا میلا ہو جائے گا۔“

”نہیں۔“ اماں کا انداز دو ٹوک تھا۔ وہ گہرے سانس لے کر رہ گئی۔

پھر وہ دل پر جبر کر کے اپنے پانے پڑوں میں تقریبات میں شریک ہوئی۔

مہندی والے روز وہ آمنہ کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ اکیلی کس طرح آتی۔ فارحہ اس سے ناراض تھی لیکن پھر اس کی مجبوری کو سمجھ گئی۔

”احمر بھی ہوں گے کل بارات میں۔“ اس نے شرارت سے زنبب کے کان میں سرگوشی کی تھی۔
 ”دیکھو گی تو کف افسوس ملو گی قسم سے۔“

زنبب نے اس کے بازو پر زور سے چٹکی کاٹی۔ وہ ”سی“ کر کے اسے گھورنے لگی۔

بڑے سے لاؤنج میں فارحہ کے جہیز کا سامان سجایا گیا تھا۔ عالی شان فرنیچر، قیمتی ترین، ایک سے ایک مہنگا جوڑا زنبب غور غور سے ایک ایک چیز کو کئی کئی بار دیکھتی رہی۔ ہر شے وہی تھی۔ ویسے ہی تھی جیسا کہ زنبب کے خوابوں میں تھی۔ اس کی تمام تمنائیں اس کے سامنے تھیں لیکن کسی اور کے لیے تھیں۔

”تمہارا سامان بہت اچھا ہے فارحہ!“ اس نے بڑے خلوص سے تعریف کی تھی۔

”چل ہٹ۔“ اس نے سر جھکا ”فیصل کی چوائس پر یہ چیزیں کہاں پوری اترتی ہیں۔ ان کے بیڈروم میں ڈھائی لاکھ کا فرنیچر ہے۔ یہ سیٹ تو امی ابونے یونہی خانہ پری کے طور پر دے دیا ہے۔ ڈال دوں گی وہاں کسی خالی کمرے میں اور کپڑے تو وہ ہوں گے جو کل بری میں آئیں گے۔ تم دیکھنا زنبب! کام پر نظر نہیں ٹھہرے گی۔ میری پھوپھی کی چوائس تو بڑی شاندار ہے۔“

زنبب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سارے ساز و سامان کو دوبارہ دیکھا تھا۔ یہ چیزیں بھی فارحہ کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی تھیں۔ وہ دل تھام کر رہ گئی۔

”کتنا قیمتی سامان تھا نا فارحہ کا۔“ اس نے واپسی پر آمنہ سے کہا تھا۔ ”اور فارحہ کہہ رہی تھی، کل بری میں اس سے بھی شاندار چیزیں آئیں گی۔“

”چیزوں سے کیا ہوتا ہے زنبب!“ آمنہ نے کسی گہری سوچ سے باہر آ کر کہا تھا ”اصل میں صرف ایک ہستی کو اچھا اور شاندار ہونا چاہیے باقی ہر شے ثانوی ہے۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں۔“ وہ بڑا کر باہر دیکھنے لگی تھی۔ ”یہ آمنہ تو بالکل ہی عقل سے پیدل ہے۔“



فارحہ بیاہ کر لاہور چلی گئی۔ زنبب اس کی شادی کے بعد کتنے ہی دن گم صدمہ ہی تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں فارحہ کا خوشی سے چمکتا چہرہ آ جاتا۔

”فارحہ کس قدر خوش تھی۔“ وہ سوچتی ”بقول اماں کے وہ چہرہ جو عازے سے نہیں اندرونی خوشی کے احساس سے چمک رہا تھا اور پھر کیوں خوش نہ ہوتی وہ کیا کی تھی اسے جس کا احساس اسے ستا تا یا پریشان کرتا۔ اتنا سونا لائے تھے اس کے سسرال والے۔“

پہلی ہو رہی تھی۔ پھر کپڑے ایک سے ایک کیا شاندار بری آئی تھی فارحہ کی۔ میری پگلیں تو جھپکنا بھول گئی تھیں۔ منہائیوں اور میوؤں کا ڈھیر لگا دیا تھا ان لوگوں نے اور عروسی لباس کی تو کیا یہ بات تھی۔ اسے پہن کر تو کوئی بہادر بن بھی پڑیوں کے دیس کی رانی لگنے لگے۔ فارحہ خوب صورت نظر آ رہی تھی تو کیا کمال کی بات تھی۔ کتنا شوق تھا مجھے، کس قدر جنون تھا، کسی دیوانی تھی۔ میں ایسے خوب صورت کپڑوں کی ایسے بھاری گہنوں کی۔“ وہ گہری سانس بھر کر سوچتی۔

”زنبب!“ اماں اس کے سر پر کھڑی اسے پکار رہی تھیں۔

”جی..... جی اماں؟“ وہ بڑبڑاٹھی۔

”احسن کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا فرخندہ آج دوپہر آئے گی۔ اس کے ساتھ بازار چلی جانا۔“

”کون میں؟“

”ہاں تو اور کون۔“ اماں بھنائیں ”نجانے کن حواسوں میں رہتی ہو۔ فرخندہ کے ساتھ جا کر اپنی پسند کی چار چیزیں لے کر آنا۔ وہ لوگ بری تیار کر رہے ہیں۔ تمہاری پسند کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔“ نجانے کیوں اس کا دل جل کر رہ گیا۔

”اونہ میری پسند۔“ اس نے سر جھٹک دیا ”میری پسند کو تو وہ لوگ رہنے ہی دیں اماں تو بہتر ہے۔ میں چیز پسند کروں ہزار کی اور وہ کہیں سوکی۔ اچھا لگے گا؟“

اماں رک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”تو بیٹی! تم اپنی اوقات میں رہ کر شے پسند کرنا۔ اپنی اوقات یاد رکھو گی تو کبھی بھی ہزار یا لاکھ کی بات نہیں کرو گی۔“

اماں کا جواب ان کی اندرونی کھولن کا مظہر تھا۔ انہیں یقیناً زنب کی بات سخت بری لگی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر۔ مجھے اور میری اوقات کو ایک طرف پڑا رہنے دیں۔ جا کر فون کر دیں انہیں میں نہیں جاؤں گی ساتھ۔ جو خریدنا ہو خود پسند کر کے خریدیں۔“

وہ چپلیں پہنٹی تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

”یہ اماں بھی بس میرا ہی دل جلانے کی قسم کھا کر بیٹھی ہیں، بات بے بات مجھے میری اوقات یاد دلاتی رہتی ہیں۔ کون سا میں اپنے ہاتھوں سے اپنا نصیب لکھ کر لائی ہوں۔“ وہ کچن میں آ کر چیزوں کی اٹھانچ کرتی رہی۔ بڑبڑاتی رہی۔

”ایسا لگتا ہے میں سو تیلی ہوں اور وہ چند دن کا شاسا ان کا۔ گا ہو گیا ہے۔ ہونہ بیٹا بن کر کبھی بہت چاند لگا دے گا۔“

نجانے اماں نے باہر سے اس کی بڑبڑاہٹ سنی یا نہیں۔ لیکن اس دن فرخندہ باجی اسے لینے نہ آئیں۔ وہ لاشعوری طور پر ان کی آمد کی منتظر رہی۔

”اماں نے نجانے کیا جواب دیا ہوگا انہیں۔“

رات جب غصہ پوری طور پر اتر گیا اس نے ٹھنڈے بستر پر لیٹ کر سیاہ آسمان کو تکتے ہوئے سوچا ”کہیں میرے غصے کی بابت نہ بتا دیا ہو۔ کیا سوچیں گے وہ مجھے کیوں غصہ آ جاتا ہے، میں کیوں مکمل سمجھوتہ نہیں کر پاتی؟ کیا شے ہے جو مجھے اکسا تی رہتی ہے؟“

وہ نیند نہ آنے تک پریشان، متضمل سوچوں کا شکار رہی۔



محبتوں کے ہی درمیاں

خواتین کی مقبول مصنفہ نگہت عبداللہ کے خوبصورت ناولوں کا مجموعہ، محبتوں کے ہی درمیاں، جلد کتاب گھر پر آ رہا ہے۔ اس مجموعہ میں انکے چار ناول (تمہارے لیے تمہاری وہ، جلاتے چلو چراغ، ایسی بھی قربتیں رہیں اور محبتوں کے ہی درمیاں) شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کتاب گھر پر ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

دوسرے دن وہ چلا آیا۔ وہ اماں کی خفگی کے خیال سے اندر بیٹھی ایک دوپٹے کو کرن ٹانگ رہی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے اندر آکر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”اوہ آپ!“ اسے مقابل پا کر وہ لہجہ بھر کو سخت کنفیوز ہو گئی۔ ”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام۔ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ سنجیدہ تھا۔

”کچھ بھی نہیں یہ ذرا سلائی وغیرہ کا کام۔“ اس نے دوپٹے کا گولہ سا بنا کر ایک کونے میں ٹھونس دیا ”آپ کب آئے؟“

”بس ابھی۔“

زینب نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اماں نے یقیناً اس کے خیالات کی ترسیل کا کام سرانجام دے دیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاؤ تھا۔ وہ نچلا ہونٹ چباتا کسی سوچ میں گم تھا۔

”کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے سر جھکا ”پریشانی کس بات کی۔ پریشانی تو اسے ہوتی ہے جو کچھ چھپاتا ہے۔ پوشیدہ رکھتا ہے۔ خائف تو وہ ہو جس

نے کسی بات کی پردہ پوشی کی ہو۔ میں نے تو تم سے کچھ نہیں چھپایا تھا زینب! جو ہوں، جیسا ہوں صاف صاف خود کو تمہارے سامنے رکھ دیا تھا۔“

”جی، جی۔“

”پھر تمہارے رویہ کا یہ مدوجز میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک فیصلہ کر لو زینب پھر اس پر قائم رہنا بھی سیکھو۔ ابھی بھی وقت ہے تمہارے

پاس۔“

اس کی خفگی سے زینب کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ کل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی تو میں نے اماں سے کہا۔“

”اب کم از کم جھوٹ تو مت بولو۔“ وہ یکایک ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا۔ ”غلطی کر کے اسے تسلیم کر لینا بھی بڑی بات ہے۔ اماں نے کل

فون کر کے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ سب کچھ جو تم نے کہا۔ جس کی بنا پر تم نے فرخندہ آپا کے ساتھ جانے سے انکار کیا۔“

وہ نظریں جھکائے ہتھیلیاں آپس میں مسلتی رہی۔

”دوسروں کے روشن محل دیکھ کر اپنی جھونپڑی میں آگ نہیں لگا لیتے زینب!“ پھر وہ بڑی نرمی سے بولا ”دوسروں کی خوشیاں دیکھ کر ان پر

خوش ہونا سیکھو۔ رنجیدہ ہو گئی تو اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی غارت کر لو گئی۔“

”میں کس کی خوشیوں پر رنجیدہ ہوں؟“ اسے یہ بات سخت بری لگی ”آپ خدا جانے کیا سمجھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میں بالکل ٹھیک ٹھیک سمجھ رہا ہوں اور جو کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں تم تجاہل عارفانہ سے کام لو تو اور بات ہے۔“

”اچھا بابا!“ اس نے رخ موڑ لیا۔ ”مجھے پریشان نہ کریں۔“

”تمہارا یہ رویہ مجھے پریشان کر رہا ہے زینب!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی ”اس قدر بچکانہ سوچ کے ساتھ تم زندگی کو کیسے برت پاؤ

گی۔“

زینب چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بے حد مضطرب اور الجھا الجھا لگ رہا تھا۔ زینب کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ واقعی وہ بے حد بچکانہ

سوچ کی حامل تھی۔ یوں پل پل بدلنے والے خیالات کسی بالغ، باشعور انسان کے تو نہیں ہو سکتے تھے۔

”آئی ایم سوری احسن۔“ وہ بالآخر بولی تھی ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو دکھ دیا مجھے نبھانے کیا ہو جاتا ہے، میں خود سمجھ نہیں پاتی کون

سانفنیاتی پرائلم ہے میرے ساتھ، کون سی تشنگی ہے میرے اندر۔“

وہ چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ احسن مزید پریشان ہو گیا۔

”نہنہ..... نہنہ..... چلیز! کیا حرکت ہے یہ؟ خاموش ہو جاؤ چلیز اب بس بھی کرو، وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔“ بناؤ مجھے کیا مسئلہ ہے۔ بتاؤ، دیکھو میں نے وعدہ کیا تھا تا تم سے کہ تمہاری خوشیوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ کچھ عرصہ میرا، میری مجبوریوں کا ساتھ دینا ہوگا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا پھر یہ سب کیا ہے؟“ نہنہ دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرنے لگی۔

”اماں بھی مجھے سمجھ نہیں پاتیں، ناراض ہو جاتی ہے مجھ سے۔ اگر آپ نے بھی اماں والا رویہ اختیار کیا تو میں مرجاؤں گی۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی تھی۔

”یا اللہ!“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”یعنی چت بھی تمہاری اور پٹ بھی۔“

”جی ہاں! بس جب مجھ پر یہ پاگل پن سوار ہو تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کریں۔ کوئی مجھے نہیں سمجھ سکتا میں خود ہی سمجھاتی ہوں اپنے آپ کو۔“

”اچھا!“ وہ مسکرا دیا ”تو اتر گیا بھوت جو سوار تھا کل ہے؟“

”جی ہاں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی ”اصل میں فارحہ کی شاندار چیزیں دیکھ کر میرے اندر کے خلا چننے لگے تھے۔ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔“

پھر میں ٹھیک ہو جاتی ہوں۔“

”کیا چیزیں تھیں فارحہ کی؟“ وہ بغور سے دیکھنے لگا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”بس وہی کپڑے گبنے۔“

اسے اب واقعی ندامت ہو رہی تھی۔ کیا سوچتا ہوگا وہ اس کے بارے میں۔ کتنی بری نیت تھی اس کی۔ کس قدر مادہ پرست تھی وہ۔ دوسروں کی خوشیوں سے جلنے والی۔ حد کرنے والی۔ سیاہ دل کی مالک۔

”آپ..... آپ دل پر نہ لہجے گا۔“ پھر وہ گہرا کر بولی تھی۔ ”میں کبھی کبھار یونہی پاگوں کی سی باتیں سوچتی ہوں۔ لیکن یہ وقتی کیفیت ہوتی ہے۔ میں فارحہ سے جلیس نہیں ہوں۔ میں کسی سے بھی جلیس نہیں ہوتی وہ تو میری بہت ہی پیاری دوست ہے۔ بس کبھی کبھار ہی۔“

پھر اس نے احسن کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی سے قاصر تھی۔ بس فی الوقت وہ یہ چاہتی تھی کہ احسن اس سے بدگمان نہ ہو جائے۔

احسن نگاہوں میں نرمی اور ہمدردی کے جذبات لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

”احسن، احسن میں۔“

”اٹس آل راث نہنہ!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”شاید میں سمجھ رہا ہوں جو تم کہنا چاہتی ہو ساری عمر تمہارے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا ہے، چند لمحوں کی بات نہیں۔ میں اگر تمہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔“

نہنہ نے تشکر بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کے دل کا بوجھ احسن کی بات سن کر کچھ ہلکا ہوا تھا۔

”چائے بناؤں آپ کے لیے؟ یا..... یا..... کھانا کھائیں گے؟“

وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”نہ چائے، نہ کھانا ابھی چلتا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔“ بڑی آہستگی سے کہہ کر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔



چند دن بڑے دبے پاؤں نکلے تھے۔ کوئی بات خلاف معمول نہ ہوئی تھی۔ زینب ایک بار پھر ساری باتوں کو فراموش کر کے اپنی تیاریوں میں مگن ہو گئی تھی۔

اس روز وہ اماں کے ساتھ بڑے صندوق سے کچھ چیزیں نکلا رہی تھی جب احسن آیا۔

”بڑی مصروفیت ہے ماں بیٹی کی۔“ وہ خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔

زینب کو وہ عام دنوں کی نسبت زیادہ خوش اور تازہ دم نظر آیا۔

”آپ کہاں سے اتنے خوش خوش آرہے ہیں؟“

اس نے قدرے تحس سے پوچھا تھا۔

”بتاؤں گا اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ وہ ہنس دیا ”پہلے چائے کا، روٹی یا پانی کا تو پوچھو۔“

”بیٹھو بیٹا! پہلے آرام سے بیٹھو تو جاؤ۔ آنے والے چاہے ساری عمر کھڑا کھڑا تیں کرتا رہے، یہ لڑکی کسی کو بیٹھنے کا نہیں کہے گی۔“ اماں نے

اسے گھورا تھا۔

آج کل اماں اسے بات بے بات ٹوکتی اور ڈانٹتی تھیں۔ بے جالا ڈیپار کرنے والی ماؤں کی طرح انہوں نے اتنے برس اس کے ناز و نخرے

اٹھانے میں گزار دیے تھے۔ اب آخر وقت گھبرا گھبرا کر اس کو ذرا سی بات پر ٹوکتی تھیں کہ کہیں ان کی تربیت پر کوئی حرف نہ آجائے۔

زینب کا منہ پھول گیا۔ اس کے آتے ہی اماں اس کی سوتیلی ماں کا روپ دھار لیا کرتی تھیں احسن مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں دال بگھار لوں اور چند پھل لے آتا ہوں۔“

زینب اتم جب تک بچے کو پانی پلاؤ۔ کیسا جس ہے۔ نجانے کہاں سے تھکا ہارا لوٹا ہے۔“

اماں کہتی ہوئی کمرے سے نکلی تھیں۔ اماں کے جانے کے بعد وہ شرارتا سے دیکھنے لگا۔ زینب خاموش بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس کے

آتے ہی اماں سے جھجڑاؤ ہو گیا تھی۔ اسے غصہ آ گیا تھا۔

”لڑکی! اماں نے کچھ کہا ہے تم سے۔ پانی پلاؤ۔“ وہ یقیناً اسے مزید غصہ دلانے کے موڈ میں تھا۔

”کھانے کے ساتھ پانی بھی ہوگا۔ پی لیجئے گا۔“ وہ بھی اسے چڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

”لڑکی بڑی بدتمیز ہو تم۔“

”ابھی بھی وقت ہے۔ سوچ لیجئے۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

احسن کو ہنسی آ گئی۔

”میں تمہاری طرح غلط پسند اور متلون مزاج نہیں ہوں۔“ پھر وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔ ”ایک مرتبہ جو فیصلہ کرتا ہوں سوچ سمجھ کر پھر

ساری عمر فیصلے پر قائم رہتا ہوں اور زندگی کوئی کھلوٹا نہیں ہے مس زینب شاہ! اس سے یوں بچوں کی طرح کھیلنا نہیں کرتے۔ جب ایک فیصلہ کر لیتے

ہیں، پھر وقت نہیں رہتا۔ سوچنے کا غور کرنے کا، جانچنے کا وقت فیصلہ کرنے سے پہلے ہوتا ہے۔ کبھی ہاں، کبھی ناں یہ میرا دستور نہیں۔“

”آپ دانستہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ وہ چپ کر بولی تھی ”میں نے تو یونی مڈاک میں ایک بات کہی تھی۔“

”میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہا۔ ایک بچے کی بات بتا رہا ہوں۔ تم اپنی سوچ پر قائم نہیں رہتیں۔ یہ غیر مستقل مزاجی تمہاری سب سے بڑی

خامی ہے۔“

زینب نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ چند لمحے وہ اسے، اس کے تاثرات کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے آگے ڈال

دیا۔ زینب چوکی گئی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“

”کھول کر دیکھ لو۔“

نہیب نے لفافے کے اندر جھانکا۔ ہزار ہزار کے کئی نوٹ تھے۔ وہ بڑی طرح سے حیران ہو گئی۔

”یہ..... یہ کیا ہے؟ کس لیے؟“

”یہ بڑبڑھ لاکھ روپے ہیں۔“ وہ ہر پاس کو دیکھتا تھا اور تمہارے لیے ہیں۔ کل فرخندہ آپا آئیں گی ان کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لینا۔ ان پیسوں میں جتنے کپڑے، زیورات اور دوسری اشیاء آسکیں خرید لینا۔“

نہیب ایک سائے میں رہ گئی۔ بہت دیر تک وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہ رہی تھی۔

”یہ روپے میں نے اپنا گھر خریدنے کے لیے پس انداز کیے تھے۔ سوچا تھا سال دو سال میں مزید رقم کا انتظام کر کے ایک چھوٹا سا گھر خرید لوں گا۔ کم از کم اپنی ملکیت تو ہوگی۔ پھر کرائے سے بھی جان چھوٹے گی۔ لیکن خیر زندگی میں دوسری بہت سی باتیں بھی اہمیت رکھتی ہیں میں نے تم سے وعدہ کیا ہے نہیب تمہاری چھوٹی سے چھوٹی خوشی پوری کرنے کا تمہاری ہر خواہش کا پاس رکھنے کا۔ میں یہ دعوے نہیں کرتا کہ چاند، تارے آسمان سے توڑ لاؤں گا یا کہکشاں تمہارے قدموں تلے بچھا دوں گا..... لیکن..... جہاں تک میری رسائی ہوئی..... وہاں تک تمہاری خاطر ضرور جاؤں گا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان تھوڑے سے روپوں سے تم بہت قیمتی چیزیں خرید لو گی..... لیکن فی الوقت میری بساط یہی ہے جو کچھ پاس تھا، تمہارے آگے لا کر رکھ دیا ہے۔ اب کم از کم تمہیں اپنی سہیلیوں سے شرمندگی نہیں ہوگی۔ اتنا سامان تو آجائے گا نا ان پیسوں سے؟“

نہیب کو اپنے گل گرم ہوتے محسوس ہوئے۔

”میں نے..... میں نے..... ایسا تو نہیں کہا تھا احسن۔“

”چلو۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”تمہاری نہیں اس میں میری ہی خوشی سمجھ لو۔ تم یہ روپے خرچ کر دو گی تو مجھے خوشی ہوگی۔ اب یہ لفافہ اٹھا کر رکھ دو۔ اماں کو میرے جانے کے بعد بتا دورنہ وہ مجھے اور تمہیں دونوں کو ڈانٹیں گی۔“

نہیب نے جلدی سے لفافہ بستر کے نیچے کر دیا۔ اتنے سارے روپے یوں بیٹھے بٹھائے اس کے ہو گئے تھے۔

وہ اپنی پسند کی بہت ساری چیزیں خرید سکتی تھی۔ اس خیال سے اس کا دل بے قابو ہوا جا رہا تھا اور اس کے چہرے کے بدلے رنگ، اس کا جوش، اس کی مسکراہٹ احسن ایاز سے بہت کچھ کہہ رہی تھی۔



دوسرے دن وہ سویرے ہی اٹھ گئی تھی۔ آج اسے اپنی شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ اس تصور نے رات کو کتنی ہی بار اٹھ کر گھڑی دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ کتنا شوق تھا اسے اپنی شادی کی خریداری آپ کرنے کا۔ رات بھر اس نے کتنی ہی چیزوں کی لسٹ ذہن میں تیار کر لی تھی۔ کتنے ہی پرفیومنز تھے جن کے نام سہیلیوں سے سن کر حافظے میں بٹھائے ہوئے تھے کہ شاید کبھی قسمت یاری کرے اور وہ انہیں خرید سکے۔ کتنی طرح کی چیزیں تھیں۔ کیسا کیسا ساز و سامان سجا ہوتا تھا دکانوں پر وہ بازار جاتی تو دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ نجانے کب وہ بھی ان دکانوں میں جا کر وہ سامان خرید سکے گی۔

آج کا دن تو عید کا دن محسوس ہوتا تھا۔ اس کے پاس بہت سے ہزار ہزار کے نوٹ تھے اور ایک لمبی لسٹ تھی۔

بارہا اس نے تصور میں احسن کی تصویر کو ہر آرام کیے تھے۔ اس کی بے پناہ محبتوں پر اظہارِ تشکر کیا تھا۔ اس کے بے پایاں خلوص پر تہمدل سے ممنون ہوئی تھی۔ کتنا اچھا تھا وہ اور کتنی قابلِ ستائش تھی اس کی محبت کی یاد دل پاتا تھا اس نے۔

”نہیں! خیر ہے بیٹی؟“ اماں نے اسے نہادھو کر تیار ہوتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا ”یہ آج سورج کدھر سے نکل آیا ہے؟ سویرے اٹھ بھی گئی ہو۔“ گنگھی چوٹی بھیگی کی ہے۔“

”اماں۔“ وہ جھینپ گئی ”فرخندہ آیا آپ آئیں گی ان کے ساتھ بازار جانا ہے۔ کل احسن کہہ گئے تھے۔“
 ”اچھا! اماں کو مزید تعجب ہوا، لیکن اس روز تو تم صاف انکاری ہو گئی تھیں۔ احسن نے کل مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کی اس سلسلے میں۔ صرف تم سے ہی کہہ گیا؟ خیر وہ تو ایسی کوئی بات نہیں مجھ سے تو وہ پہلے ہی اجازت لے چکا تھا۔ لیکن یہ تمہارا دماغ کیسے ٹھکانے پر آ گیا؟ راضی ہو گئیں تم ”چند سو“ کی چیزیں خریدنے پر؟“

”ابھی بھی بات نہیں۔“ وہ برا مان گئی ”احسن کل مجھے ڈیڑھ لاکھ روپیہ دے کر گئے ہیں“
 ”ہائیں!“ اماں کو سکتہ ہو گیا تھا ”کتنا؟ ڈیڑھ لاکھ؟“
 ”جی ہاں۔“ وہ مزید اتراتی ”آپ نے تو اماں کہی کہ مجھ سے کہ چل کر ایک آدھ جوڑا اپنی پسند کا بھی لے لو۔ کبھی پوچھا نہیں کہ ضرورت کی کیا چیزیں چاہئیں۔ ہر چیز اپنی مرضی سے لائیں۔ وہی برسوں پرانے صدیوں پہلے کے جوڑے کبس سے نکال کر جہیز بنا ڈالا۔ احسن نے اتنا خیال رکھا میری پسند کا..... اپنی پس انداز کی ہوئی رقم لا کر مجھے دی ہے کہ میں اپنی پسند کی چیزیں خرید سکوں۔ حالانکہ یہ رقم انہوں نے گھر بنانے کے لیے جمع کی تھی۔ پھر بھی محض میری خواہش پوری کرنے کے لیے انہوں نے سارے پیسے مجھے لا دیے۔“
 ”اور چلی ہو تم غارت کرنے اس غریب کی برسوں کی کمائی۔“ اماں کا ایک آگ بگولہ ہو گئیں۔ ”ہائے نہن! کہاں گھاس چرنے گئی ہے تمہاری عقل کیا چھٹی لے کر پہنچ گئی تھیں عقل بننے وقت۔“

”اب..... اب اس میں بھی کوئی اعتراض ہے آپ کو۔“ وہ اماں کا شدید رد عمل دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی۔
 ”میں نے تھوڑا ہی کچھ کہا تھا ان سے وہ تو خود ہی دے گئے اپنی مرضی سے۔“
 ”ہاں یہ بے وقوفی میں نے ہی کی۔“ اماں نے سر پکڑ لیا۔ ”میں نے ہی اسے کہہ ڈالا وہ سب کچھ، جو اس روز تم بک رہی تھیں۔ وہ غریب شرمندہ ہو کر اپنی برسوں کی کمائی اٹھا لیا ارے ڈیڑھ لاکھ لے لیے تو نے اس بچے سے جو جہیز لے جا رہی ہے وہ ڈیڑھ سو کا بھی ہے؟ وہ کم وقت بے مصرف سامان۔“

”اماں..... اماں..... خدا کا واسطہ آپ کو ہر وقت کے طعنے نہ دیا کریں مجھے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو کہاں تو جان چپڑکتی تھیں مجھ پر اور اب ذرا ذرا سی بات پر کونے بیٹھ جاتی ہیں۔ میں خود تو نہیں گئی تھی اس سے پیسے مانگنے وہ اپنی خوشی سے دے کر گیا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرائے۔

”نہیں! میری بچی!“ اماں ٹھنڈی سانس بھر کر اسے دیکھنے لگیں، ”میں خدا نخواستہ کیوں کوئے لگی تجھے زبان نہ جلے گی میری۔ میری جان۔ ادھر آ..... پاس آ میرے میری کم عقل بیٹی۔“
 وہ آنسو پونچھتی ان کے قریب چلی آئی۔

”دیکھو میری بیٹی! اماں ہوں میں تمہاری۔ یہ یقین کر لو کہ جو کہوں گی، جو کروں گی، وہ تمہاری بہتری کے لیے ہوگا۔ میری عمر بھر کی کمائی ہو تم۔ میری تو سانس انکی ہے تم میں۔ میں برا سوچ سکتی ہوں تمہارا۔“

”چند دنوں میں سوتیلی ہو گئی ہوں میں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”اور..... اور..... وہ سب کچھ ہو گیا ہے آپ کا جسے کچھ عرصہ پہلے جانتی تھیں آپ۔“

”نہ میری بچی نہ۔“ اماں نے اس کا سر سینے سے لگا لیا ”وہ مجھے عزیز ہے۔ بہت عزیز ہے..... مگر اس لیے کہ وہ میرا ہی مستقبل ہے۔ اس

کے لیے دعائیں کرتی ہوں تو خیالوں میں تو ہوتی ہے۔ اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی؟“

”گھر کیوں بات بے بات ڈالتی ہیں۔ وہ آتے ہیں تو ایک دم سے رویہ بدل جاتا ہے آپ کا۔“

”صرف تیرے بھلے کی خاطر۔ صرف اس لیے کہ دوسرے گھر بھیجنے سے پہلے چند باتیں زندگی گزارنے کی سکھا سکوں تھے۔“ اماں آبدیدہ ہو گئیں۔ ”کچھ گرسنتی آ جائے تھے، یہ خیال بہت دیر سے آیا ہے مجھے۔ عمر بھر ایسا رکھا تھے جیسے مرغی انڈوں سے نکلے بچوں کو پروں تلے دبا کر رکھتی ہے۔ یہ خیال یہ نہ آیا کہ پرانے گھر بھی جائے گی۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ خود سے جدا بھی کرنا ہوگا۔ اب یہ خیال آیا ہے تو کسی مضطرب ہو جاتی ہوں میں، ہر لمحہ گھبراتی ہوئی رہتی ہوں یہی سوچ تنگ کرتی رہتی ہے کہ کل کلاں کو کوئی یہ نہ کہہ دے کہ ماں نے بیٹی کو کچھ سکھایا نہیں۔ حسن، شکل و صورت تو خدا کی دین ہے، طریقہ، سلیقہ سکھانا تو ماں کا کام ہے میری بچی۔ بس یہی فکر کھائے جاتی ہے مجھے اسی الجھن میں تھے سے بھی الجھ پڑتی ہوں اب عقل کسی دکان پر تو بچی نہیں ورنہ خود کو بیچ کر بھی خرید لاتی تیرے لیے۔“

زینب نے بیگنی بیگنی ٹپکیں اٹھا کر قدرے خفگی سے ماں کو دیکھا۔

”اب ایسی بھی بے عقل نہیں ہوں، میں، آپ تو مجھے چند برس کی بچی خیال کرتی ہیں میں بڑی ہو گئی ہوں اماں!“

”کہاں ہوئی ہے بڑی۔“ اماں بڑبڑائیں ”قد نکل آنے سے آدمی بڑا نہیں بن جاتا۔ عقل، شعور، تجربہ بہت سی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہارے پاس تو کچھ نظر نہیں آتا اسے بیٹا۔ اس سے روپے لیتے لاج نہ آئی تمہیں؟ اپنی اماں کی عزت کا خیال نہ آیا۔ کچھ تو بھرم رکھے انسان۔ اس نے دیے، تم نے منہ اٹھا کر لیے۔ کیا وقعت رہ گئی ہوگی اس کی نظروں میں تمہاری اور میری۔ ایسے بدنیت، بے لحاظ لوگ ہیں ہم۔ اسی عقل کی بات کرتی ہو؟“

”اماں! بری لانا تو دنیا کا رواج ہے میں نے نیا تو نہیں نکالا یہ دستور۔ بری تو ان لوگوں نے تیار کر لی ہے۔ روپیہ بھی خرچ ہوتا ہے اس میں۔ وہی روپیہ اگر وہ مجھے دے گئے تو اس میں کیا برائی ہے؟ آخر میری شادی ہے اماں۔ میرے بھی کچھ ارمان ہیں، کچھ شوق ہیں۔ اگر میں چار چیزیں اپنی پسند سے خرید لوں گی تو کن سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟“

وہ ان سے علیحدہ ہو کر قدرے ناراضی سے بولی تھی۔ اماں بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”لیکن یہ روپے اس نے تمہاری خریداری کے لیے جمع نہیں کیے تھے زینب!“ وہ زچ ہو گئی تھیں ”ان سے گھر بنوانا چاہتا تھا وہ اور کس کا ہو گا وہ گھر؟ تمہارا ہو گا پگل لڑکی تمہارا۔ چار فضول چیزیں خرید کر تمہارا شوق پورا ہو جائے گا اور چند روز گزریں گے ان چیزوں کا نام نشان نہ رہے گا۔“

”میں زیور خریدوں گی اماں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”سو نا تو عورت کی شان ہے۔ ساری عمر کا ساتھی ہے۔ سیکو روٹی ہے عورت کی۔ کوئی فضول خرچی نہیں کروں گی۔“

”گھر تو ہر عورت کی اولین ترجیح ہوتا ہے بیٹی۔ ساری عمر کرائے کے گھر میں گزار کر بھی یہ بات تیری سمجھ میں نہ آ سکی؟“ اماں جیسے ہار مان کر بولی تھیں۔

”شادی کے بعد میں سب سے پہلے اپنا گھر بناؤں گی اماں!“ وہ ان کے گلے میں بانٹیں ڈال کر بولی۔ ”بس اس مرتبہ مجھے اپنا شوق پورا کرنے دیں۔“

اماں نے پلکیں جھپکا کر آنکھوں کی نمی چھپائی تھی۔



جس قدر خوش وہ بازار گئی تھی۔ اتنی ہی اداس اور ناخوش لوٹی تھی۔ اتنی مہنگائی کا تو اس نے کبھی تصور ہی نہ کیا تھا۔ ہر شے کی قیمت آسمانوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ہینڈ بیگ میں رکھا لٹاؤ اچانک ہی ہلکا اور بے قیمت ہو گیا تھا۔

اسے احساس ہوا تھا کہ جتنی چیزوں کا ارمان اس کے دل میں تھا، انہیں خریدنے کے لیے تو دس لاکھ بھی ناکافی تھے۔

جیولری دکان پر اسے جو سیٹ پسند آیا وہ پینتالیس ہزار کا تھا۔ زینب کا سانس اس کی قیمت سن کر ہی رکنے لگا تھا۔ بمشکل اس نے ایک نسبتاً ہلکا سیٹ اور چار چوڑیاں پسند کی تھی اور سخت کبیدہ خاطر ہو کر دکان سے نکلی تھی۔

فرخندہ آپا کا موڈ بھی آف تھا۔ ان کے رویے میں ایک تناؤ سا تھا۔

”پرسوں احسن نے مجھے بیس ہزار روپے دیئے تھے کہ میں تمہیں شاپنگ کراؤں۔“ انہوں نے صبح اس سے کہا تھا ”اور آج وہ تمہیں اتنے پیسے دے گیا ہے۔ یہ دونوں کے اندر تم دونوں کے درمیان کیا صلاح مشورے ہو گئے؟“

زینب نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ بلکہ اسے سخت غصہ آیا تھا۔ وہ کون ہوتی تھیں موڈ آف کرنے والی۔ احسن خواہ اسے کتنے ہی پیسے دیتا۔ یا ان دونوں کے درمیان کوئی صلاح مشورہ ہوا ہوتا۔ انہیں اس سے یوں استفسار کرنے کا حق کس نے دیا تھا؟ وہ احسن کی مالک مکان تھیں، پڑوسی تھیں اور ان کے درمیان ایک لحاظ اور مردت کا رشتہ تھا اور بس۔ وہ تو اس طرح منہ بنائے ہوئے تھیں جیسے وہ اس کی ساس ہوں۔

وہ ان سے بے پروا اپنی پسند کی اشیاء کی خریداری کرتی رہی۔ فرخندہ آپا البتہ اس سے یوں بے پروا نہ رہ سکی تھیں۔ ہر جگہ، ہر دکان پر اسے سمجھانے کی ایک آدھ کوشش انہوں نے ضرور کی تھی کئی دکانوں پر انہوں نے لڑجھگڑ کر چیزوں کی تقریباً آدھی قیمت کرواتے تھے ورنہ زینب میں بھاؤ تاؤ کرنے کا اتنا شعور تھا نہ حوصلہ۔

عروسی لباس اس نے بائیس ہزار کا پسند کیا تھا۔

”زینب! ان ناپائیدار چیزوں پر اتنے پیسے نہ اٹھاؤ۔“ فرخندہ آپا نے وہ لفظوں میں کہا تھا ”یہ لباس تو آدمی ایک آدھ مرتبہ ہی پہن پاتا ہے۔ کیا فائدہ یوں خون پسینے کی کمائی ضائع کرنے سے۔ یہ تو ان کے شوق ہیں جن کے پاس حرام کاروبار ہو رہا ہے۔“

زینب کو ان کی بات سخت بری لگی۔ وہ ہر جگہ احسن کی کمائی کا ذکر یوں کر رہی تھیں جیسے وہ ہی احسن کی سب کچھ ہوں۔ حالانکہ چند روز بعد وہ اس کی بیوی بننے والی تھی۔ اس کی کمائی کی بلا شرکت غیرے حقدار ہونے والی تھی۔

اس نے وہی لباس خریدا۔ ہر چند کہ اس کی ضد اور پسند سے مجبور ہو کر فرخندہ آپا نے دکاندار سے نہایت لمبی چوڑی بحث کے بعد اس کی قیمت تقریباً آدھی کر دینی تھی۔

وہ دونوں واپس ہوئیں تو زینب کے پاس نہایت قلیل رقم بچی تھی۔ وہ بھی فرخندہ آپا نے مزید کی خریدنے پر گوا کر بجائے تھے ورنہ زینب کا ارادہ خالی ہاتھ لوٹنے کا لگتا تھا۔

”احسن کے پاس کچھ نہیں بچا ہے۔“ انہوں نے کہا تھا ”اور ابھی کرنے والے تقریباً سارے کام پڑے ہیں۔ یہاں سے کچھ بچا کر لے چلیں گے تو اس کا بوجھ ہلکا ہوگا۔“

بادل خواستہ اس نے کئی چیزوں پر سے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ سب سے زیادہ افسوس اسے اپنی پسند کا فریوم خریدنے پر ہوا تھا۔

”کیا کرو گی اتنا مہنگا فریوم خرید کر۔“ فرخندہ آپا نے شیشی اس کے ہاتھ سے لے کر واپس رکھ دی تھی ”بعد میں احسن دلا دے گا۔“

وہ حسرت سے بار بار شیشی کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ اس کے کالج کی سب سے امیر لڑکی۔ یہی خوشبو روزانہ خود پر انٹیل کر آتی تھی۔ زینب بار بار اس کے قریب سے گزرتی اور اس خوشبو کو اپنے اندر اتارتی۔ اس خوشبو کا نام اس نے کب سے یادداشت میں محفوظ کیا ہوا تھا اور آج بھی وہ نامراد ہی رہ گئی تھی۔ آج، جبکہ اس کے پاس اتنی رقم بھی تھی۔

”احسن خود ہی ساتھ آتے تو اچھا تھا۔“ یہ کفایت شعار بیگم نجما نے کیوں میرے ساتھ کر دی ہیں۔ کھڑی ہو جاتی ہیں ہر جگہ بحث کرنے۔ وہ وہاں لوٹی تو خوش نہ تھی۔ جو چیزیں خرید کر لائی تھی ان کی خوشی رہ جانے والی چیزوں کے افسوس تلے پڑی کر رہی تھی۔

”ہائے۔ آج بھی نامراد ہی لوٹی، کیا کیا سامان خریدنا تھا اور اتنی سی رقم۔“ وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔ ادھر اماں نے سامان دیکھ کر سر پیٹ

لیا تھا۔

”بس؟ یہی چیزیں؟ بس یہی کچھ خریدا؟“

”ہاں تو لاکھ روپے میں پوری مارکیٹ تو اٹھا کر لانے سے رہی۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی تھی۔

”آپ کی بیٹی کی طبیعت میں تو بہت بچپنا ہے۔ اماں!“

فرخندہ آپاد بے لہجے میں بولی تھیں اماں ان سے نظریں چرا کر رہ گئیں۔



پورے محلے میں آج تک کسی لڑکی کی بری اتنی شاندار نہ آئی تھی۔ کسی کا دلہا اتنا جمیلا نہ تھا۔

شادی والے روز ہر کسی کے منہ سے یہی تعریفی کلمات ادا ہو رہے تھے۔ زینب پھولے نہ مار رہی تھی۔ اماں سے ضد کر کے وہ شہر کے ایک مہنگے بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس کا سجا سورا روپ چاند کو مات دے رہا تھا۔ جو دیکھ رہا تھا بس ایک ٹک دیکھے ہی جاتا تھا۔

”زینب! میرے پاس تیری تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ قسم سے جی چاہتا ہے نظر نہ ہٹے احسن بھائی کا کیا حال ہوگا؟“

آمنہ کی تعریف پر وہ قفاخر سے مسکرا دی تھی اور کیوں نہ حسین نظر آتی وہ۔ مہنگا عروسی لباس، چمکتے زیورات اور ایک مہنگے پارلر کی تیاری۔ بھلا کس چیز کی کمی تھی۔ پھر حسرت کی دولت سے وہ یوں بھی مالا مال تھی۔

”تمہاری بری کتنی اچھی آئی ہے۔ تم یونہی فارحہ پر رشک کر رہی تھیں۔“ آمنہ بڑی سادگی سے کہہ رہی تھی۔

زینب خاموش رہی۔ اس نے آمنہ سے ذکر کرنا مناسب نہ جانا کہ یہ سب اسی کی ضد کا کرشمہ تھا۔

فرخندہ آپا گزشتہ دنوں کی کشیدگی فراموش کر کے اس پر سے واری صدفے جاری تھیں۔ ہر نظرا سے سراہ رہی تھی۔

”کاش کہ فارحہ یہاں ہوتی۔ مجھے اس کی کمی بہت محسوس ہو رہی ہے۔“ زینب نے آمنہ سے کہا۔

”حالانکہ میں نے اسے کتنے دن پہلے خط لکھا تھا۔ پھر بھی وہ نہ آئی۔“

”شادی کے بعد زندگی بہت بدل جاتی ہے۔ مصروفیات اور ترجیحات میں فرق آ جاتا ہے۔ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ اب تمہیں اس بات

کا احساس ہوگا۔“

آمنہ نے اسے رسانیت سے سمجھایا۔ زینب اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”تم اتنی سمجھدار کیسے ہو آمنہ! تم بتا تجر بے کے ہر بات کس طرح سمجھ لیتی ہو؟“ اسے کبھی کبھی آمنہ کی سمجھداری اور رسانیت پر رشک آتا

تھا۔

”میں تمہارے لیے بھی دعا گو رہتی ہوں زینب!“ وہ مسکرا دی تھی۔

”خدا تمہیں بھی عقل سلیم عطا فرمائے اور تم زندگی کو بہترین طور پر برت سکو۔“

رخصتی کے وقت اماں کا برا حال تھا۔ وہ بار بار ہوش سے بیگانہ ہو رہی تھیں۔ زینب بھی ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پھر پھولوں

سے سچی ہوئی گاڑی اسے اس کی اصل منزل کی طرف لے آئی۔ اس کے اصل گھر تک فرخندہ آپا نے اس کی سرسراں کا پورا پورا کردار ادا کیا تھا۔ کہیں

ساس بن کر تو کہیں نندن کر انہوں نے اسے احساس نہ ہونے دیا تھا کہ وہ ایک خالی گھر میں آئی ہے۔ انہوں نے ایسے موقعوں پر کی جانے والی ہر رسم ادا کی تھی۔

”حسن میرا بھائی بھی ہے اور بیٹا بھی۔ میں نے ہمیشہ اسے سگے خونری رشتوں کی طرح چاہا ہے۔“ انہوں نے پچکتے چہرے کے ساتھ اسے بتایا تھا۔

”اسی لیے تم بھی مجھے بہت اپنی لگتی ہو۔ بہت عزیز ہو۔“

اسے ایک سچے ہوئے، پچکتے کمرے میں بیٹھا کروہ باہر چلی گئی تھی۔ زینب آنکھیں کھول کر زندگی کے اس نئے مقام کا جائزہ لینے لگی۔



بڑی آہستگی سے آکر وہ اس کے مقابل بیٹھا تھا۔

”السلام علیکم۔“

لہجے میں خوشی، ترمیم، تازگی اور شرارت کے تمام رنگ واضح تھے۔

زینب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

”وعلیکم السلام۔“ بہت دھیمے سے وہ بول سکی تھی۔

”مزاج بخیر ہیں؟“ اس کی ہر، ہر اداسے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

بہت دیر سے زینب کے اعصاب پر سوار تحسک کے لبادے میں شگاف پڑنے لگے۔ اس کے اندر طمانیت اور سکون کی لہریں دوڑنے لگیں۔

میکے سے سسرال تک کا فاصلہ بظاہر کتنا ہی مختصر، ایک نظر نہ آنے والا تھا کہ دینے والا سفر ہے تحسک سے چور ہوتا جسم، چٹختے ہوئے اعصاب،

منزل پر پہنچ کر کس قدر سکون کی کیفیت سے گزرتے ہیں۔ زینب کو یکا یک محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم سے اٹھ کر اپنے گھر میں آگئی ہو۔

یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ اس گھر کی مالک تھی۔ بلا شرکت غیرے۔ کتنا جاندار، طمانیت بھرا احساس تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس بھر کر سر بیٹھ

کی پشت سے لگا دیا۔

”زینبی! حسن نے ہو لے سے اس کا ہاتھ تھما تھا۔“ تھک گئی ہو جانو؟“

زینب نے یکا یک پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ بظاہر ایک نامحسوس ی پیش قدمی اور انداز مخاطب کی حد درجہ تبدیلی۔ اس کے رگ و

پے میں ایک کرنٹ سا دوڑا۔

”نہیں تو۔“ اس نے ہاتھ پھرانے کی ہلکی سی کوشش کی تو احسن نے گرفت قدرے مضبوط کر لی۔

”چھوڑنے کے لیے نہیں تھا ہاں، جناب عالی!“ وہ قدرے شوخی سے بولا تھا۔ ”اور پھر جب کسی کے لیے اتنا سجتے سنورتے ہیں تو پھر

سارے گریز بے معنی لگتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں۔“

زینب بری طرح سے جھینپ گئی۔

”کتنے صادق تھے تا میرے جذبے زینب!“ وہ محبت سے بھرپور لہجے میں بولا۔ ”اب تو تمہیں یقین آگیا ہوگا؟“

زینب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں بے پناہ والہانہ پن تھا۔

”یقین کا دن تو پہلے آچکا ہے۔ جب آپ کے جذبوں سے ہار کر ”ہاں“ کہی تھی۔“ وہ ہو لے سے بولی۔

آج یقین کا دن تو نہیں۔ آج اعتراف کا دن ہے۔“

”پھر کہہ اعتراف!“ وہ کہنی کے سہارے نیم دراز ہو کر اس کے جھکے ہوئے چہرے کے مقابل آگیا۔

”بسا اوقات زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ وہ شرمیلیں لہجے میں بولی۔ ”میرا یہاں آپ کے پاس ہونا ہی میرا اعتراف

ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ میں اگر تمہارے اس حسین روپ کی تعریف نہ کروں تو کیا تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی؟ کیا تم کچھ سننے کی خواہش

مند نہیں ہو؟ ہر چند کہ حسن تعریف کا محتاج نہیں ہوتا لیکن تعریف نہ کرنا کُل تو ہوتا ہے نا۔“

”آپ نہ ہوں گے بخیل، میں تو ہوں۔“ وہ شرارت سے مسکرا دی۔

”اب اتنا بھی جھوٹ نہ بولو۔ مباحرج ہو۔“ وہ اسے پڑانے لگا۔

زینب اسے گھورنے لگی۔

”اب طعنے بھی دیں گے؟“

”میری مجال ہے۔“ اس نے کان پکڑ لیے۔ ”یوں ہی زبان پھسل گئی تھی۔ یوں بھی یہ میرے نہیں فرخندہ آپا کے الفاظ ہیں۔“

”اف، فرخندہ آپا۔“ زینب کا منہ بد مزہ ہو گیا۔

”آخر یہ فرخندہ آپا لگتی کیا ہیں آپ کی؟“

”ارے زینو! یہ بات پوچھنے کی نہیں ہے۔ چند روز میں تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کتنی پیاری چیز ہیں فرخندہ آپا۔ قسم سے، پوچھنے

کے لائق ہیں۔ میرے ماں باپ، بھائی، بہن سب کچھ وہی ہیں۔“

زینب اندر سے چیخ کر رہ گئی تھی۔ فرخندہ آپا کے خلاف کہنے والی بہت سی باتیں تھیں جو اس نے سوچ کر رکھی ہوئی تھیں سب کی سب اس

کے اندر ہی کھولتی رہ گئیں۔ احسن کی بات کے بعد ان باتوں کی کوئی مضائقہ ہی نہ رہی تھی۔

”خیر۔ فی الوقت اپنی بات کرو۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔ ”فی الحال بیچ میں نہ کوئی تیسرا ہے نہ کسی تیسرے کی

بات ہوگی۔“

احسن کی باتیں بہت خوبصورت تھیں۔ لیکن زینب کی سوچ کہیں انکی رہ گئی تھی۔



و ایسے سے فارغ ہو کر وہ دودن کے لیے اماں کے پاس آگئی تھی۔ خوشیوں سے گھٹا ہوتے اس کے چہرے نے اماں سے بہت کچھ کہہ دیا

تھا۔ ”میری بچی! میں نے کہا تھا نہ تجھ سے۔ احسن تیرے لیے خوشیوں کا پیام بر کن کر آیا ہے“ اسے خود سے لپٹا کر انہوں نے کہا تھا۔

”آپ سے کس نے کہا میں خوش ہوں؟“ اس نے منہ بتایا۔

”تیرے چپکتے چہرے نے۔“

زینب ہنس دی۔ وہ واقعی خوش تھی، بے پناہ خوش۔ اس کی شادی کو محض چند روز ہوئے تھے، لیکن اسے احساس ہو چکا تھا کہ احسن اسے دل

کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔ وہ پوچھنے کی حد تک اس کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔

صبح وہ سو کر اٹھتی تھی تو وہ پہلے سے اس کا منتظر ہوتا۔

”آپ کب سے جاگ رہے ہیں؟“ وہ حیران ہو کر پوچھتی۔

”بہت دیر ہوئی۔“ وہ مسکرا کر کہتا۔ ”منہ اندھیرے باہر ایک کول کو کی تھی۔ اس کی مدھر آواز سے جاگا پھر سونے کو جی نہ چاہا۔“
 ”اور تب سے کیا کر رہے ہیں؟“ وہ شونی سے پوچھتی۔

”مجھے کیا کرنا تھا۔“ وہ اس کے قریب ہو کر بالوں میں انگلیاں چلاتا۔ ”نظریں مصروف عبادت تھیں۔ زینبی! اتنا حسین روپ دیا ہے خدا نے تمہیں، تمہیں دیکھتے ہی وہ یاد آتا ہے۔“

ہر صبح کا آغاز اسی قدر خوبصورت ہوا کرتا تھا۔ بس لفظوں میں رد و بدل ہو جایا کرتی تھی اور ہر رات صبح سے زیادہ حسین لگا کرتی تھی۔ دنوں میں عجیب جیسی جیسی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور راتوں کی خشک تازگی میں ایک سرمستی کی سی کیفیت تھی۔

زندگی اتنی پیاری ہوتی ہے؟ زینب کو تعجب ہوتا تھا۔ احسن کے والدہانہ جذبات اور بے اختیارانہ اعترافات نے اس کے سارے وجود کو تقاضا اور سرخوشی کی سنہری چادر میں لپیٹ دیا تھا۔ اس کا وجود سنہری پھولوں کی جھلکی ڈال نظر آتا تھا۔

آمنہ کو اس کا علم ہوا تو وہ دوڑی چلی آئی تھی۔
 ”پہلے کسان ہم روز ملا کرتے تھے۔ لیکن تم چلی گئیں زینب تو ایسا لگا زندگی خالی خالی سی ہو گئی ہے۔ تم میری زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہو مجھے کبھی احساس ہی نہ ہوا تھا۔“

زینب اس کی حیرانی دیکھ کر ہنس دی۔
 ”شادی کے بعد پوچھوں گی اپنی اہمیت کا۔ دو روز میں بھول جاؤ گی مجھے۔“

”اچھا! تم مجھے بھول گئیں؟“ آمنہ نے اسے گھورا۔
 ”میں تو خود کو بھول گئی ہوں آمنہ۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”سمندر کی منہ زور لہروں کو دیکھا ہے آمنہ؟ جب کسی شے کو اپنے اندر سمیٹ لیں تو پھر شے کا وجود نہیں رہتا۔ لہریں ہی لہریں نظر آتی ہیں۔ احسن کی محبت سمندر کی طرح وسیع اور منہ زور ہے۔“

”بہت چاہتے ہیں نا تمہیں؟“
 آمنہ کے لہجے میں سوال کم، تشدد زیادہ تھی اور ایک عجب سی حسرت تھی، جو کہیں چھپی ہوئی تھی مگر محسوس ہوتی تھی۔

”ہاں بہت اے حساب!“ زینب کو اس لئے خود اپنے آپ پر رشک آیا۔ ”سچ آمنہ! مجھے اتنا اندازہ نہ تھا کہ یہ شخص میرے لیے اتنا بے قرار ہے۔ ہائے وہ تو ایک پل کے لیے بھی مجھے خود سے دور نہیں ہونے دیتے۔ صبح جاگتی ہوں تو ان کو اپنی جانب نکلتا ہوا پاتی ہوں۔ رات کس وقت سو جاتی ہوں، خود مجھے خبر نہیں ہوتی اور ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ اتنی باتیں کی ہیں تب کہیں جا کر دو دن یہاں رہنے کی اجازت ملی ہے۔“ وہ بوٹی ہی چلی گئی۔

”اماں اداس ہو گئی ہیں تمہارے بغیر۔“ آمنہ نے شاید دانستہ موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ ”دو تین مرتبہ آئی تھی تمہاری غیر موجودگی میں۔ بے چاری اماں اکیلے بیٹھی تمہیں ہی یاد کرتی رہتی ہیں۔“

”ہاں!“ وہ خود بھی اداس ہو گئی۔ ”اماں کب رہی ہیں میرے بغیر۔ میں تو احسن کی سنگت میں سب ہی کچھ بھلا بیٹھی ہوں لیکن اماں.....“
 اس نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”روز ملنے آیا کرو ان سے۔ کم از کم تمہارے انتظار میں ہی دن گزر جایا کرے ان کا۔“
 ”ہوں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

دو دن بعد وہ اسے لینے آ پہنچا تھا۔ زینب اسے دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھی۔ اسی گھر میں، جہاں اسے اتنے برس ہنسی خوشی گزارے تھے۔ یہ دو دن کا شاعذاب ہو گئے تھے۔ صبح سے شام کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اور شام سے صبح تک کا انتظار کو فٹ سے بھر پور۔ کتاب بدل گئی تھی وہ چند ہی روز

میں۔

”جناب! آج شکل دکھا رہے ہیں۔“ وہ اسے دیکھ کر خفگی کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکی۔ ”یا تو یہ حال تھا کہ مجھے دیکھے بنا آپ کے لیے سورج ہی نہ نکلتا تھا یا دو دن ہو گئے پلٹ کر حال تک نہ پوچھا۔“

وہ بٹاشٹ سے مسکرا دیا۔ دونوں ہاتھ پنٹ کی جیبوں میں ڈالے وہ بڑی شوخی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اب زیادہ اترا آئیں مت۔ ابھی ایسی بھی حالت نہیں ہوئی میری۔“ اس نے مسکراہٹ چھپانے کو منہ پھیرا۔

”اچھا! یار۔ میری حالت تو نجانے کب سے ایسی ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ”تم ساتھ تھیں تو مارے خوشی کے نیند نہ آتی تھی۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ تم میرے اتنے قریب ہو۔ بار بار اٹھ کر دیکھتا تھا تمہیں کہ کہیں میں کوئی پہنا تو نہیں دیکھ رہا۔ سوچا تھا، تمہاری غیر موجودگی میں خوب جی بھر کر سولوں گا لیکن تم تو ویسی ہی نیند بھی پلو میں باندھ کر لے آئیں۔ تمہاری قسم دو راتوں سے جاگ رہا ہوں۔“

زینب ایک نلک اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے گرد پڑے سیاہ حلقے اس کے لفظوں کی گواہی کے لیے کافی تھے۔

ایسا دیوانہ ہوا تھا وہ اس کا۔ اس کے گالوں پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

”گھر چلیں؟“ وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔ پہلے کھانا کھالیں۔ اماں نے بڑے پیار سے مرغ پلاؤ اور کھیر بنائی ہے آپ کے لیے۔“

”یار! کتنا سخ کرتا ہوں میں اماں کو۔“ وہ زچ ہوا۔

”یہ عمر ہے ان کی سارا سارا دن کچن میں گھسے رہنے کی۔“

”معن تو آپ مجھے بھی کرتے ہیں۔“ وہ شوخ ہوئی۔ ”میری عمر بھی نہیں ہے کچن میں گھسنے کی؟“

”تم تو ابھی نئی نوپلی لہن ہونا۔ سوچتا ہوں کچھ دن آرام کر لو پھر یہ گھر کے کام دھندے ہی سنبھالے ہیں۔“ وہ مسکرایا تھا۔

جب سے شادی ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی زینب کو کچن میں نہ گھسنے دیا تھا۔ صبح اس کے جاگنے سے جیستر ہی وہ چائے تیار کر لیتا تھا پھر قریبی دکان سے جا کر حلوہ پوری لے آتا تھا۔ دوپہر کا کھانا فرخندہ آپالے آتی تھیں اور رات میں عمو ماؤہ لوگ باہر کھانا کھاتے یا پھر احسن کے کسی دوست کے گھر دعوت پر مدعو ہوتے تھے پھر رات سونے سے قبل وہ خود ہی اس کے لیے دودھ کا گلاس گرم کر کے لے آتا تھا۔ ان دنوں میں اس نے ایک مرتبہ بھی اسے کسی کام کے لیے نہ کہا تھا۔

اماں نے کھانا لگا دیا تو وہ دونوں باہر کچن میں آ گئے۔

”اماں! یہ تکلفات یوں ہی جاری رہے تو قسم سے میں آنا چھوڑ دوں گا۔“ اس نے دسترخوان پر ایک نگاہ ڈال کر خفگی کا اظہار کیا تھا۔

”کون سے تکلفات بیٹا؟“ اماں مسکرا دیں۔

”سادہ سا کھانا ہی تو ہے۔“

”یہ سادگی ہے؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”یہ مرغ پلاؤ، یہ راستہ، سلاد، کباب، کھیر پوری شام کچن میں گزری ہوگی آپ کی۔“

”ہاں تو کیا ہے۔ اپنے بچوں کے لیے پکا کر ماؤں کو خوشی ہوتی ہے، تحسک نہیں۔“ اماں کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔ ”اور پھر شادی کے بعد پہلی مرتبہ آئے ہو۔ کیا دل پکا کر رکھ لیتی؟“

”آپ کے ہاتھ کی دال میں بھی پوری دعوت کا مزہ ہے۔“

زینب خاموشی سے مسکراتے ہوئے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔

”اچھا میری بات سنیں اماں!“ وہ چاکل ہی بخجیدی سے بولا تھا۔ ”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

”جواب عائی! گھر چل کر پڑھ لیجئے گا۔ میں یہاں بائیک پر بیٹھا ہوا ہوں۔“ احسن نے دہائی دی تھی۔
 نینب نے مسکرا کر خط بیک کی جیب میں ٹھونس لیا۔
 ”اچھا اماں! اللہ حافظ۔“ وہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔
 ”اللہ کی امان میں بیٹی۔“ اماں دیر تک دروازے میں کھڑی رہی تھیں۔



دونوں گھر پہنچے تو احسن کا کوئی دوست اسے ملنے آیا ہوا تھا۔
 ”تم اوپر چلو زنی! میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔“
 احسن نے اسے چایاں تھائیں۔
 ”جی اچھا!“

وہ بیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے سب سے پہلے بیک کی سائڈ جیب سے فارحہ کا خط نکالا تھا۔
 اس نے لکھا تھا۔
 ”بیاری نینب!“

نئی زندگی کے آغاز پر بہت سی دعائیں تمہارے نام۔

تمہاری شادی میں شریک نہ ہو سکی۔ مجھے پورا یقین ہے تم مجھ سے ناراض ہو گئی لیکن میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ وجہ جان کر تمہاری ناراضی دور ہو جائے گی۔ بات یہ ہے میری جان کہ تمہارا کارڈ مجھے ملا ہی نہ تھا۔ میں شادی کے ہفتہ بھر بعد ہی فیصل کے ساتھ بنی مون کے لیے امریکہ چلی گئی تھی پورا مہینہ وہاں گزار کر کوئی ہوں۔ پتا چلا تمہاری شادی کا کارڈ آیا رکھا ہے۔ خیر! بہت بہت مبارک ہو۔ نئی زندگی کی شروعات یقیناً بہت اچھی لگ رہی ہوں گی۔ احسن بھائی کیسے لگے؟ اب تو مجھے بھی ان کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لینی چاہیے۔ آخر کو وہ میرے دولہا بھائی بن گئے ہیں۔ ان سے کہنا وہ بھی میرے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کر لیں۔“

نینب کلکھلا کر ہنس دی تھی۔ احسن کے ساتھ ہونے والی فارحہ کی تمام گفتگو اس کے ذہن میں گونج اٹھی تھی۔ کتنے سخت الفاظ استعمال کرتے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے۔ وہ پھر خط کی جانب متوجہ ہوئی۔
 اس نے آگے لکھا تھا۔

”تم لوگ بھی یقیناً بنی مون پر جانے والے ہو گے۔ ویسے سچ پوچھو تو ملک سے باہر بنی مون منانے کا اپنا مزہ ہے۔ ماحول جتنا زیادہ اجنبی ہوتا ہے اتنا ہی دو افراد ایک دوسرے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ میں تو زندگی کے ان دنوں کو کبھی نہ فراموش کر پاؤں گی۔ فیصل کی سنگت میں گزارے ہوئے یہ دن حقیقتاً ناقابل فراموش ہیں۔ فیصل نے مجھے اتنا گھمایا پھر ایا کہ میں تھک کر چور ہو گئی اور شاپنگ کا تو الگ ہی مزہ رہا۔ ایسی شاندار اور کھلی شاپنگ کا تو میں نے کبھی تصور ہی نہ کیا تھا۔ واپسی پر کسی طور پیکنگ نہ ہوتی تھی۔ فیصل میرے پاگل پن پر ہنس رہے تھے۔ تمہارے لیے بھی میں نے بہت سے چیزیں خریدی ہیں۔ آخر کو تم میری اکلوتی دوست ہو اور تمہاری شادی کا تحفہ بھی ڈیو ہے مجھ پر۔

میری مانو اگر احسن بھائی کے خیالات اجازت دیتے ہوں تو تم دونوں بھی کہیں باہر گھومنے جاؤ۔ اپنا ملک تو آدمی گھوم ہی لیتا ہے۔ بندے کا بنی مون تو ذرا دور دار قسم کا ہونا چاہیے۔

میں مہینہ دو مہینہ رسال میں گزار لوں پھر چکر لگاؤں گی۔ تب تک تم لوگ بھی بنی مون اور دونوں کا سلسلہ بگھٹتا چکے ہوں گے۔ فرصت سے

بیٹھ کر گپیں لڑائیں گے۔ میرے پاس تو باتوں کا زبردست اسٹاک جمع ہے۔ تم بھی بتانے والی ڈھیر ساری باتیں جمع رکھنا۔

احسن بھائی کو میرا بہت بہت سلام اور تمہیں بہت سائیاد۔

تمہاری فارحہ

خط پورا پڑھ کر وہ اس کا کونا منہ میں دبائے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

اچانک ہی احسن نے آکر اسے پیچھے سے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

”کہاں گم ہیں جناب۔“ وہ اس کے کان کے قریب منہ لاکر بولا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا بڑی بے تابی سے انتظار ہو رہا ہوگا۔ جلدی جلدی دوست کو پٹنا کر بھاگا۔ یہاں تو اپنی خبر نہیں ہے، ہمارا پتا کیا ہوتا ہے۔“

وہ مسکرا دی۔

”فارحہ کا خط پڑھ رہی تھی۔“

”اچھا! ایسا کیا لکھ بیجا ہے اس نے۔ بڑی گہری سوچ میں گم تھیں۔“

”آپ کو سلام لکھا ہے۔“

”علیکم السلام۔“ وہ بڑی ترنگ میں تھا۔

”اور لکھا ہے کہ پچھلی تلخیوں کو بھلا دیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”آخر کو آپ اس کے دولہا بھائی اور وہ آپ کی سالی بن گئی ہے۔“

”چلیں جی بھلا دیا اور کچھ۔“

”اور..... اور..... پوچھا ہے کہ ہم لوگ مہنی مون کے لیے کہاں جا رہے ہیں۔“ وہ بظاہر بڑے سادہ سے انداز میں بولی تھی۔ ”وہ لوگ تو

امریکہ سے ہو کر لوٹے ہیں حالانکہ فیصل بھائی کا بزنس لندن میں ہے۔“

اس کے گرد احسن کے بازوؤں کی گرفت قدرے ڈھیلی ہوتی گئی۔

”ہم لوگ کہاں جائیں گے احسن؟“ وہ مڑ کر اس کے مقابل آگئی۔

وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس کا سوال سن کر چونک اٹھا۔ وہ اس پر نظر جمائے بڑی آس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مہنی مون کا ارادہ تو تھا میرا۔“ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد الجھے الجھے سے انداز میں بولا ”اور کچھ رقم پس انداز بھی کی ہوئی تھی میں نے

لیکن تم تو جانتی ہو زین! شادی پر سارے پیسے ہی خرچ ہو گئے۔ آفس سے بھی لون لیا ہوا ہے میں نے، مزید لون نہیں مل سکتا۔ ویسے تم بتاؤ کہاں جانا چاہتی ہو؟“

اس کا اترا ہوا منہ دیکھ کر احسن کا رنگ بدل گیا۔

”اداس کیوں ہوتی ہو جانو۔“ اس نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ ”یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں۔ آفس سے لون نہیں مل سکتا نہ سہی۔

کہیں اور سے تو مل سکتا ہے نا۔ شادی پر فرخندہ آپا نے مجھے پیش کش کی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو میں ان سے ادھار لے سکتا ہوں۔ تب تو ایسی کوئی

خاص ضرورت نہیں پڑی کام چل گیا لیکن اب میں ان سے بیس پچیس ہزار مانگ لیتا ہوں۔ اسلام آباد، مری وغیرہ گھوم آتے ہیں۔ سچ ہی تو ہے

یہی کچھ دن تو ہوتے ہیں گھوٹے پھر نئے کے بعد میں تو ساری عمر کا کام ہی ہوتا ہے۔ کہاں موقع ملتا ہے گھوٹے پھرنے کا۔“

زینب کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ وہ مسکرا دی۔

”پھر کب چلیں گے؟“

”بس ہفتہ بھر میں۔ میں کل ہی فرخندہ آپا سے بات کر لیتا ہوں۔“ وہ اس کی ٹھوڑی چھو کر بولا۔ ”ان آنکھوں کی چمک لوٹانے کے لیے تو

میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اب جلدی سے ہنس کر دکھا دو ورنہ.....“
اس کی دھمکی میں بہت کچھ تھا۔ وہ واقعی جلدی سے ہنس دی۔



اگلے دن سے روٹین لائف شروع ہو گئی تھی۔
احسن صبح ہی صبح اٹھ کر کپڑے استری کرنے لگا تھا۔ زینب کی آنکھ کھلی تو مقابل دیوار پر لگی گھڑی سات بج رہی تھی۔
”آپ اتنے سویرے سویرے کپڑے کیوں استری کر رہے ہیں؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”مزدور آدمی ہیں بھئی۔“ وہ بٹاشت سے مسکرا دیا۔ ”بہت دن آرام کر لیا۔ اب کام پر بھی جانا ہے۔“
”لیکن آپ نے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی نا۔ ابھی تو صرف ہفتہ ہی گزرا ہے شادی کو۔“ اس کی نینداڑ گئی۔
”ہاں، لیکن اب پروگرام بھی تو بن گیا ہے گھومنے کا۔ یہ ہفتہ حاضری لگوا کر اگلے پورے ہفتے کی چھٹی لے لوں گا۔ اب پورا مہینہ تو چھٹی نہیں کر سکتے نا جانم۔“

”اچھا۔“ وہ جلدی سے بستر سے نکل آئی۔ ”ناشتہ بنا دوں آپ کے لیے۔“
”اگر جناب عالی کو زحمت نہ ہو تو۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔
”اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔“ وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

یوں بھی گھومنے کی بات سن کر اس کا موڈ بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ اسنے اپنے شہر کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا شہر بھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے محلے کے علاوہ شہر کا کوئی دوسرا محلہ بھی مشکل سے دیکھا تھا۔ بھلا اماں کے ساتھ وہ جا بھی کہاں سکتی تھی؟ گھر سے نکل کر اسکول، کالج، وہاں سے پھر گھر۔ بے حد محدود دنیا رہی تھی اسکی۔ ایسے میں مری، سوات کا تصور اسکے لیے سویٹزر لینڈ سے کم نہ تھا۔ اس کا تودل ہی اور طرح سے دھڑک رہا تھا۔
چائے کا پانی رکھ کر اس نے آلیٹ تیار کیا، سلاٹس سینکے، ایک انڈا بوائٹل کر کے بھی رکھا پھر چیزیں ٹرے میں بجا کر کمرے میں لے آئی۔
احسن نہا کر نکل چکا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔

”ناشتہ حاضر ہے جناب۔“ وہ ٹرے میز پر رکھ کر مودبانہ انداز میں بولی۔ ”تشریف لے آئیے عالی جاہ۔“
”اور کیا کیا حاضر ہے؟“ وہ شرارت سے اس کا عکس آئینے میں دیکھ کر مسکرایا۔ ”عالی جاہ ناشتے سے زیادہ کینئر میں دلچسپی رکھتے ہیں۔“
”کینئر؟ کون کینئر؟ یہاں تو ملکہ عالیہ خود ناشتہ لے کر آئی ہیں۔“ وہ خفگی سے بولی۔
”اوہ! سوری ملکہ عالیہ۔ عالی جاہ آپ کا ہی ذکر کر رہے تھے۔“ وہ جلدی سے بولا۔
پھر وہ دونوں ہی ہنس دیے۔

وہ ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھا تو زینب اس کے لیے چائے بنانے لگی۔
”تم نہیں کر دگی ناشتہ؟“ اس نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔
”بہند میں۔ ابھی صرف چائے پیوں گی۔ ابھی تو میں نے دانت بھی صاف نہیں کیے۔“ وہ چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔
خلاف معمول وہ چند لقمے لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حالانکہ روزانہ وہ ڈٹ کر ناشتہ کیا کرتا تھا۔
”کیا ہوا؟“ زینب نے چونک کر اسے دیکھا۔
”ٹھیک سے ناشتہ کریں نا۔“

”بس چلتا ہوں۔ دیر ہوگئی ہے، اپنا خیال رکھنا۔“

کھڑے کھڑے چائے کے دو تین گھونٹ بھر کر اس نے کپڑے میں رکھا اور اس کا گال پیار سے چھو کر ہر نکل گیا۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے بیڑھیوں تک گئی تھی۔

”کب تک لوٹیں گے؟“

”چار پانچ بجے تک۔“ اس نے غلت میں جواب دیا تھا۔

وہ چند لمحوں میں بیڑھیوں پر کھڑی رہی۔ اسی اثناء میں اس کی نگاہ سامنے والی چھت پر چلی گئی۔ ایک قدرے سانولی لیکن بے حد پرکشش

لڑکی کھڑی اسے عجیب سے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

نہیں بلکہ اپنی جانب متوجہ پا کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”نہ دعائے سلام۔“ اس نے کانڈھے اچکا دیے۔

”عجیب پڑوسی ہیں۔“

اندرا آ کر وہ کچھ دیر کے لیے پھر سو گئی تھی۔

آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ وہ کچھ دیر سستی سے لیٹی رہی پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی نہادھو کر کالٹن کا ایک خوبصورت سالباں زیب

تن کر کے وہ کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہی پھر جب ہر پہلو سے خود کو سراہ چکی تو ناشتے کی میز پر آ بیٹھی۔

”ہائے!“

اچانک ہی اماں بے طرح یاد آئی تھیں۔ اس نے کب خود سے کبھی چائے گرم کر کے پی تھی۔ اماں اس کی مندی مندی آنکھوں کے پوری

طرح کھلنے کا انتظار کیے بغیر ہی چائے کا گرم گرم کپ تھما دیا کرتی تھیں۔ سردیوں میں تو اس لاڈ کا اپنا الگ ہی مزہ تھا۔

وہ کچھ دیر تک اماں کا لاڈ پیار یاد کرتی رہی۔ ایک گرم آنسو ہتھیلی کی پشت پر پڑا تو وہ چونک اٹھی۔ آنکھیں پونچھ کر وہ ٹھنڈی پڑی چیزیں ہی

کھانے لگی۔ یکا یک اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس پر انکشاف ہوا کہ احسن ٹھیک سے ناشتا کیوں نہ کر کا تھا! ناشتہ انتہائی بد مزہ تھا، سلاٹس پوری طرح

سے سکے ہوئے نہ تھے اور آلیٹ میں نمک کڑواہٹ کی حد تک زیادہ تھا۔ جوائنڈہ اس نے بوائے کیا تھا اس کی زردی پتھر کی مانند سخت تھی اور احسن اسے

بتا چکا تھا کہ وہ صرف ہانف بوائے انڈہ پسند کرتا ہے۔

”انڈے کے ساتھ بہت سوچ سمجھ کر برتاؤ کرتے ہیں۔“ اسے بار بار ایسا ہوا جملہ یاد آیا۔ اماں اسے اکثر سمجھایا کرتی تھیں۔

”نمک ذرا ہاتھ روک کر ڈالا کرو۔ اس میں نمک فوراً گھلتا ہے۔“

لیکن اس نے کب اماں کے ایسے چھوٹے چھوٹے جملے پلو سے باندھے تھے۔ وہ تو اچھی بھلی ٹھیک ٹھاک نصیحتیں بھی ایک کان سے سن کر

دوسرے سے نکال دیا کرتی تھی۔



بے حد خجالت سے وہ بھی بدذائقہ ناشتہ کرتی رہی۔

واحد چیز چائے تھی جو ذرا ڈھنگ سے بنی ہوئی تھی ورنہ تو ہر شے اس کے چھو بھڑ پن کی نمائندہ تھی۔

”کیا سوچتے ہوں گے احسن بھی۔“ اسے حدود شرجہ مندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ”پہلی مرتبہ کچھ بنا کر پیش کیا اور وہ بھی ایسا بد مزہ..... چلو،

ابھی تو ابتدا ہے۔ آہستہ آہستہ پرفیکٹ ہو جاؤں گی آج تو دو پہر کا کھانا بھی بنانا ہے۔“

دل ہی دل میں پروگرام سیٹ کرتی وہ میز سے اٹھتی تھی۔

کیسٹ پلیئر میں نیرہ نور کے گانوں کی کیسٹ لگا کر وہ باہر صحن میں چلی آئی۔ موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ پچھلے دنوں پڑنے والی بے تحاشا گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی نمی برسات کی آمد کا مژدہ سنارہی تھی۔ سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے بھی ادھر سے ادھر تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ دل پہلے ہی خوشیوں سے بھرا ہوا تھا اس پر موسم کے سہانے پن نے چار چاند کا کام کیا۔

وہ صحن میں رکھے گلوں کی ترتیب بدلتے ہوئے ہوئے ہوئے لگتا نہ لگی۔

”گھٹا گھٹا گھور، موہ چائے شور میرے صحن آ جا رہے۔“

”زینب!“ پیچھے سے آنے والی آواز پر بری طرح سے اچھلی تھی۔

”اوہ، آپ!“ سامنے فرخندہ آپا کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ”السلام علیکم۔“

”علیکم السلام“ انہوں نے قریب آ کر اسے خود سے لگایا۔ ”کسی ہو گزرا۔“

”بالکل ٹھیک، فرسٹ کلاس۔“ وہ تازگی سے مسکرا دی۔

”احسن کہاں ہے؟“

”جی وہ آفس گئے ہیں، وہ بکھرے بالوں کا جوڑا بنائے گی۔“

”آفس؟“ انہیں تعجب ہوا تھا۔ ”لیکن اس نے تو چند روز کی چھٹی لی تھی۔ ابھی تو ہفتہ ہی ہوا ہے۔“

”وہ اصل میں ہمارا پروگرام بن گیا ہے مری وغیرہ جانے کا۔ شاید اگلے ہفتے چلے جائیں۔ اس لئے انہوں نے سوچا، یہ ہفتہ حاضری لگوا کر اگلے ہفتے کی چھٹی لے لیں۔“

”اچھا۔“ وہ کچھ سوچنے لگیں۔ ”اندر بیٹھ سکتے ہیں، ہم لوگ؟“

”اوہ!“ اس پر سے منوں پانی گزرا تھا۔ ”آئیے آئیے نا۔ مجھے تو دھیان ہی نہیں رہا۔“ وہ ان کو لے کر اندر چلی آئی۔

”بیٹھیں نا آپ، چائے لاؤں آپ کے لیے۔“ وہ بے حد شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

فرخندہ آپا نے ایک نظر کمرے کی حالت زار پر ڈالی تھی۔

بستر کی چادر اُدھی بستر تھی، آدھی فرش پر لٹک رہی تھی۔ رات کو اُدھی جانے والی چادریں اسی طرح سے پھیلی ہوئی تھیں۔ یوں جیسے کوئی بڑی احتیاط سے اسے ان کے اندر سے نکل کر گیا ہو مبادان کی بھولی ہوئی شیب خراب ہو جائے۔

تپائی پڑنا شے کے جھوٹے برتن جوں کے توں پڑے تھے اور ان پر کھیاں بھینھنا ہی تھیں۔ رات اس نے جو کپڑے تبدیل کیے تھے، وہ بھی اب تک کونے میں پڑی کرسی پر ہی محفوظ تھے۔

ایک ہی نگاہ طائرانہ میں فرخندہ آپا کا جائزہ مکمل ہو گیا تھا۔ پھر وہ ذرا سی چادر ہٹا کر بستر کے کونے پر لٹ گئیں۔

”کھانا کھا لیا تم نے؟“

”کھانا؟ نہیں۔ ابھی تو ناشتہ کیا ہے۔“ وہ بمشکل مسکرائی تھی۔ ”میں چائے بنا لاتی ہوں آپ کے لیے۔“

وہ اٹھنے لگی تھی۔

”ارے نہیں۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر پھر سے بٹھا دیا۔ ”بیٹھو تم۔ میں تو یوں ہی ذرا تمہیں دیکھنے چلی آئی تھی اور ویسے بھی دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ تم نے کچھ پکایا ہے؟“

اس نے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”اچھا چلو کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرائیں۔

”ابھی ہفتہ بھر تو گزرا ہے شادی کو۔ کہاں روٹی ہانڈی کے چکروں میں پڑو گی۔ میں کھانا پکا چکی ہوں۔ نیچے آ کر میرے ساتھ ہی کھا لینا۔“

”جی اچھا!“ اس نے جلدی سے سعادت مندی سے سر ہلادیا۔

”اور رات کو بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج رات کو میری طرف سے دعوت ہے تمہاری اور احسن کی۔“ وہ مسکرائیں۔ ”اصل میں یہی کہنے آئی تھی میں۔ تم بھی سوچتی ہو گی اتنے دن ہو گئے فرخندہ آپا نے تو اپنے ہاں بلایا ہی نہیں۔ دراصل میں چاہتی تھی کچھ دن تم دونوں آرام سکون سے رہو، ڈسٹر ب نہ کروں میں تمہیں۔ اس لیے اتنے دنوں میں ایک آدھ بار ہی اوپر آئی ہوں میں۔ حالانکہ تو صیف کتنی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ میں نے تمہیں پوچھا ہی نہیں۔ کہہ رہے تھے، نئی دہن کیا سوچتی ہو گی۔ میں نے کہا، رہنے دیں آپ۔ ان معاملات کو عورتیں زیادہ بہتر سمجھتی ہیں۔ ہر روز جا کر انہیں ڈسٹر ب کروں، اچھا نہیں لگتا۔ ویسے دونوں سے تو تم بھی مٹی ہوئی تھی۔ اپنی اماں کی طرف؟“

”جی..... جی.....“ بس ذرا اداس ہو گئی ہیں۔“

”خیر، وہ ایک فطری بات ہے۔ دس بیٹیاں ہوں، ماں تو تب بھی ایک کے جانے پر دنوں اداس رہتی ہے۔ تم تو ان کی اکلوتی اولاد ہو۔ بیلنے بیلنے ہی جی پیلے گا ان کا۔ اچھا میں چلوں!“ انہیں کچھ دھیان آیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”شام کے کھانے کا بھی دیکھوں کچھ۔ کوئی خاص ڈش پسند ہو تو بتاؤ مجھے۔ تمہارے لیے بنا کر خوشی ہو گی مجھے۔“

”کچھ بھی بنالیں۔“ وہ تکلف سے مسکرا دی۔

”مجھے تو سب ہی کچھ پسند ہے۔“

”ایک بچ رہا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ کھانا کھا کر آ جانا۔“

”ابھی تو بالکل بھوک نہیں۔ ناشتہ ہی اتنی دیر سے کیا تھا پھر ذرا صفائی وغیرہ بھی کرنی ہے۔“ اس نے معذرت کی۔

”اچھا چلو تمہاری مرضی ہے۔ جس وقت بھوک لگے بلا تکلف چلی آنا یا ادھر کی کھڑکی کھول کر آواز لگا دینا، میں خود دے جاؤں گی۔ آج کڑھی چاول پکائے ہیں میں نے۔ کڑھی پسند ہے تمہیں؟“

”جی۔“ اس نے نیم دلی سے سر ہلایا۔

ان کے جانے کے بعد وہ پھر اندر چلی آئی۔ دیوار پر لگی گھڑی ڈیڑھ بج رہی تھی۔ اس نے ایک نگاہ بکھرے ہوئے گھر پر ڈالی۔ اسے یاد آیا۔ شادی سے پہلے جب وہ اماں کے ساتھ یہاں آئی تھی ہر شے بڑی تک سب سے درست تھی۔ کہیں ایک فالتو تکا بھی نظر نہ آیا تھا۔

”ظاہر ہے۔ بے ترتیبی بھی وہیں ہوتی ہے جہاں ایک سے دو بندے ہوں۔“ اس نے خود کو تسلی دی تھی۔ ”گھر میں کوئی رہتا ہی نہ ہو تو بکھراوا کرے گا کون؟“



شام کو وہ دونوں قدرے دیر سے سوکراٹھے تھے۔ زینب اٹھ کر باہر آئی تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ اندر چلی آئی۔

”احسن!“ لائٹ آن کرتے ہوئے وہ بولی۔ ”اٹھ بھی جائیں، سوا سات بج رہے ہیں فرخندہ آپا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

احسن نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔

”جھوٹی! یہ بولو کہ بھوک بہت لگی ہے ورنہ تمہیں فرخندہ آپا کا اس قدر خیال کب سے ہونے لگا۔“

زینب کو کسی آگئی اور یہ سچ ہی تھا۔ وہ پورا دن تقریباً بھوک ہی رہی تھی۔ صفائی وغیرہ سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ احسن آ گیا تھا پھر دونوں ہی

نے نیچے جا کر کھانا کھانے کا خیال ملتوی کر دیا تھا۔

”مجھے تو ایسی کوئی خاص بھوک نہیں۔“ احسن نے کہا تھا۔ ”آفس میں لکٹ وغیرہ کھالیے تھے تم اگر جانا چاہو تو۔۔۔“

”نہیں۔“ اس نے بھی فوراً ہی انکار کر دیا تھا۔

احسن کے پاس سے اٹھ کر اس کا کہیں بھی جانے کو دل نہ چاہتا تھا اور پھر محض کھانے کے خیال سے نیچے جاتا اسے بُرا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی فرخندہ آپا سے کون سی ایسی برسوں کی شناسائی تھی۔ شام کو دعوت میں تو جانا ہی تھا۔

”شام تک بھوکی رہو گی؟“ احسن نے پوچھا تھا۔

”ناشتہ کیا تھا میں نے۔“

”مزہ آیا؟“

اس کے معصومیت سے پوچھنے پر وہ خفت سے ہنس دی۔

”سوری احسن۔ نمک کچھ زیادہ ہو گیا تھا؟“ وہ شرمندگی سے بولی تھی۔

”تم خود اتنی میٹھی ہو کہ ہر طرح کے نمک کا اثر از خود اُٹل ہو جاتا ہے۔“ وہ لگاؤ سے بولا تھا۔

”اچھا جناب۔ مسک نہیں۔“ وہ اٹھ کر اسے چڑانے کو باہر بھاگ گئی تھی۔

احسن کو چائے بنا کر دینے کے بعد وہ تیار ہونے لگی۔ اس نے وہی پرل شیشوں کے کام والا سوٹ منتخب کیا تھا جو وہ شادی سے قبل پہننے کے لیے بے تاب رہا کرتی تھی۔ ہاتھ، پیروں پر بڑی محنت سے نکل پالش لگا کر انہیں سنوارا۔ لمبے سیاہ بالوں کو دیر تک برش کیا پھر لباس تبدیل کر کے چہرے پر بڑی نفاست سے میک اپ کیا۔

احسن نہا کر نکلا تو وہ تیار ہو چکی تھی۔

”واؤ۔“ وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ ”کون ہو تم؟“

بہت دیر بعد وہ بولا تھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ ٹھکی۔ ”پہچان نہیں پارہے کیا؟“

”اوہ تم واقعی نئے ہو؟ ٹھہرو میں ذرا چھو کر دیکھوں مجھے تو تم ایک سراب نظر آتی ہو۔ اے حسین پری۔“

وہ اس کے قریب آنے لگا۔ نئے نئے ہشتے ہوئے اسے پرے دھکیل دیا۔

دونوں نیچے آئے تو فرخندہ آپا رتن ٹیبل پر لگا چکی تھیں۔ کچن سے چاولوں کی بڑی عمدہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔

”چلو، میں بس آواز دینے ہی والی تھی۔“ انہیں دیکھ کر وہ خوشگوار سے بولی تھی۔

”السلام علیکم۔“ احسن نے بڑی محبت سے انہیں قریب جا کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے اس کا ماتھا چوما۔

”میرا بہرہ و بھائی تو شادی کرتے ہی بھول گیا بہن کو۔ ہفتہ ہو گیا ہے شکل دکھائے ہوئے۔“ احسن شرمندہ ہو گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ شادی کے بعد ان سے ملنے نیچے نہیں آیا تھا۔ ورنہ تقریباً روزیہ سلام دعا کرنے آیا کرتا تھا۔

”چلو۔ یہ دن ہی ایسے ہوتے ہیں۔ خدا تمہاری خوشیاں سلامت رکھے۔“ انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔

نئے نئے کدوہ عجیب۔ میٹھی سی خاتون معلوم ہوئیں۔ بات جتنا بھی دیتی تھیں پھر لپٹا پوتی بھی کرتی جاتی تھیں۔ دو پہر کو بھی ان کا رویہ کچھ ایسا

ہی تھا پھر احسن ان کے آگے کچھ زیادہ ہی مودب بن رہا تھا۔ ایک ناگوار کی لہر اس نے اپنے پورے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

توصیف بھائی اسے قدرے بہتر لگے۔ وہ ایک سنجیدہ، بردبار، لمبے دیے رہنے والے شخص تھے۔

”تم لوگ بیٹھو۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ چاول دم پر رکھے ہیں۔ گرم گرم کھانے کا مزہ ہی اور ہے۔“

”زینو! آپا کے ساتھ ہیلپ کراؤ۔“

احسن نے اسے صوفے پر براجمان ہوتے دیکھ کر آہستگی سے کہا تھا۔ بادل خواست اٹھ کر وہ کچن میں چلی آئی۔

”لائیں آپا! کچھ میرے کرنے کے لائق ہوتو۔“

”ارے نہیں بیٹا! تم بیٹھو اندر چل کر۔ سب ہی کچھ تیار ہے۔ اب تو صرف نکال کر ٹیبل پر ہی رکھنا ہے۔“

زینب کو ایک مرتبہ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسے جتا رہی ہوں۔ وہ اوپر ہی تھی۔ چاہتی تو نیچے آکر ان کا ہاتھ ہانک سکتی تھی۔

”لایئے نا۔ میں رکھتی ہوں۔“ اس نے مجبوراً شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

کھانا واقعی بے حد لذیذ بنا ہوا تھا۔ زینب کو اماں کے ہاتھ کا ذائقہ یاد آگیا۔ خوش رنگ سالن کٹلے کٹلے بھاپ نکلتے چاول، نہایت نفاست

سے سجی ہوئی سلاوا، خوش ذائقہ بیٹھا۔ زینب ان کے ہاتھ کے سوادا دیر لیتے کی معترف ہو گئی تھی۔

”زینب! بیٹا اور لونا۔ یہ کھیر لو۔“

”کھیر پکانے میں آپا لاثانی ہیں۔“ احسن بولا تھا۔

”ان جیسی کھیر کوئی دوسری عورت نہیں بنا سکتی، کیوں تو صیف بھائی؟“

”بھئی یہ تم بھائی، بہن کا معاملہ ہے۔ مجھے بیچ میں نہ ڈالو۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

سب لوگ ہی ہنس پڑے تھے۔

”زینو! فرخندہ آپا کو ہر طرح کا کھانا بنانا آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی اسی خوبی نے مجھے ان سے اتنا قریب کیا ہے۔ تم بھی روزانہ سے

ایک کلاس لیا کرو۔“

زینب کو الجھن ہونے لگی۔ احسن کی تعریفوں نے اسے زچ کر دیا تھا۔ آخر اس قدر مدح سرائی کا بھی کیا جواز تھا؟

کھانے کے بعد چائے کا سلسلہ چلا پھر فرخندہ آپا نے اسے ایک خوبصورت سوٹ اور ہزار روپے دیے۔

”یہ لو، ہو بہو تم میری بیٹی اور بھابھی بھی۔ بڑے چاؤ سے تمہارے لیے خریدا تھا۔ یہ سوٹ میں نے۔“

سوٹ واقعی دیدہ زیب تھا۔ زینب خوش ہو گئی۔

”زینو تم چلو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

احسن نے اسے اوپر بھیج دیا تھا۔

وہ بھی جانتی تھی کہ احسن نے فرخندہ آپا سے رقم کی بات کرنی تھی۔ اس لیے سعادت مندی سے سر ہلا کر وہ اوپر چلی آئی۔ لباس وہ فی الحال

تبدیل کرنا نہ چاہتی تھی۔ اتنی محنت سے وہ تیار ہوئی تھی۔ تعریفوں کی صورت میں کچھ قیمت بھی وصول کرنی تھی۔

کیسٹ پلیئر آن کر کے وہ مونی مون کے بارے میں سوچنے لگی۔ کتنا خوش کن تصور تھا۔ احسن کی ہمراہی اور ایک خوش گوار سفر۔ جس کی

یادیں تصویروں کی صورت میں ساری عمر کے لیے اس کے پاس محفوظ رہیں۔

”ویسے پچ پچھو تو ملک سے باہر مونی مون منانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ ماحول جتنا زیادہ اچھی ہوتا ہے، اتنا ہی دو افراد ایک دوسرے سے

قریب ہوتے جاتے ہیں۔“

اس کے ذہن میں فارحہ کے تحریر کردہ الفاظ آئے تو وہ مسکرا دی۔

”ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آچکے ہیں فارحہ کہ اب درمیان میں کوئی خلا نہیں ہے۔ اب یہ ساتھ امر رہے گا۔ ہماری محبتوں

کیلئے ہر جگہ یکساں ہے۔“

احسن بڑی آہستگی سے آکر اس کے پاس بیٹھا تو وہ چونک اٹھی۔
 ”آگئے آپ!“ وہ بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔ ”پتا ہے میں کہاں پہنچی ہوئی تھی؟“
 ”کہاں؟“ اس نے زنبب کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”فارحہ کے پاس!“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”خیالوں ہی خیالوں میں اس سے باتیں کر رہی تھی۔ پتا ہے احسن! فارحہ کا کیا خیال ہے؟“
 ”کیا!“ وہ خاموش خاموش سا تھا۔

”یہ کہ انسان کو اپنا ہی مون ملک سے باہر منانا چاہیے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”مختصر فارحہ جب سے مسز فارحہ فیصل بنی ہیں ان کے خیالات میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ویسے ٹھیک ہی تو ہے وقت اور ماحول انسان کو کچھ سے کچھ بنادیتے ہیں۔ ہم تو اپنے ملک کو پورا دیکھ لیں، ہمارے لیے یہی بہت ہے۔“

دفعتاً اس نے احسن کے رویے کو محسوس کیا تھا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”کیا بات ہے۔ آپ اتنے چپ چاپ کیوں ہیں؟“

”زنید! وہ آپا کبہر ہی ہیں بی بی الحال ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔“ اس نے نظریں نہر کر کہا تھا۔
 وہ کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔

”لیکن۔“ پھر وہ بولی تھی۔ ”آپ تو کبہر ہے تھے کچھ روز قتل انہوں نے خود یہ پیشکش کی تھی۔“

”ہاں، دراصل آپا بہت صاف گو خاتون ہیں۔ دل میں بات نہیں رکھتیں۔ وہ بولی، احسن! اگر تمہیں کسی شدید ضرورت کے تحت رقم چاہیے ہوتی تو میں ضرور تمہیں یہ پیسے دے دیتی لیکن بیٹا! فضول خرچیوں کی میرے نزدیک کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ابھی تم لوگوں کا ہاتھ تنگ ہے تو کیا ضرورت ہے بیٹی مون جیسی بے کار اور فرسودہ رسموں کو پورا کرنے کی۔ گھومنا پھرنا تو ساری عمر کا شغل ہے۔ آج نہ سبھی، چند سال بعد سبھی۔ مری، سوات کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے جن کو دیکھنے کے لیے آدمی کسی کا قرض دار ہو جائے۔“

اس نے رک کر زنبب کے رنگ بدلنے چہرے کو دیکھا تھا۔

”تو پھر!“ اس نے بڑی برہمی سے پوچھا تھا۔

”پھر، پھر زنبب..... کیا خیال ہے۔ ہم کچھ دن بعد چلے چلیں گے۔“ اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

زنبب سر جھٹک کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

”دیکھو تاجانا! سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ”آپا کے انکار کے بعد اب میں دوبارہ ان سے پیسے مانگنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ مزید ایسا کوئی شخص میری نظر میں ہے نہیں جو مجھے اتنی رقم ادھار دے دے۔“

”تو میں نے کب کہا۔“ وہ گلو گریں لہجے میں بولی۔

”ایسا تو کچھ نہیں کہا میں نے۔“

”تو یہ موڈ کیوں آف کر لیا ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”نہیں تو۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

آنکھوں میں نجانے کیوں اتنا پانی جمع ہونے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ پگلیں جھپک جھپک کر خود کو تاقبو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”بے وقوف لڑکی!“ احسن ہنس دیا۔ ”اتنا دل پر لینے کی کیا بات ہے یار! دیکھو، ادھر دیکھو میری طرف۔“ اس نے اس کا چہرہ ذرا سا اوپر کیا۔ زنبب نے بمشکل نظریں اٹھائی تھیں۔

”دیکھو زینو! میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ چند ماہ صبر کرلو پھر جہاں کہو گی وہاں لے کر چلوں گا تمہیں۔“

”چند ماہ بعد ایسی کون سی تبدیلی آ جائے گی۔“ اس نے قدرے خفگی سے کہا تھا۔

”وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ بس کہا ہے نا، چلیں گے اور ضرور چلیں گے۔ اب مسکرا دو، پلیر۔“

اس کا دل بالکل بچھ کر رہ گیا تھا۔ ایک ہی دن میں کتنے خواب بن لیے تھے اس نے۔ کیا کیا سوچ لیا تھا۔ یہاں تو وہ بات ہی نہ رہی تھی۔ وہ اداسی سے، ہو لے سے مسکرا دی۔

”ایسے نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ زبردستی والی مسکراہٹ نہیں چاہیے۔ وہی تکلف، شگفتہ، دل فریب ہنسی جس نے پہلی مرتبہ ہی اپنا اسیر بنالیا تھا۔ وہی ہنسی چاہیے۔“

”پہلی مرتبہ۔“ وہ مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔

”مجھے کیا خبر کب کی بات کر رہے ہیں۔“

”پہلی مرتبہ.....“ تمہیں یاد نہیں۔“ وہ اشتیاق سے بولا۔ ”مجھے تو ایک ایک لمحہ، ہر ملاقات کا ایک ایک نشان یاد ہے۔ زینو! یاد ہے وہ ملاقات جو باسط بھائی کی دکان پر ہوئی تھی؟“

زینب کو سب کچھ اچھی طرح سے یاد تھا۔ کون سی ایسی بہت پرانی بات تھی، لیکن کچھ سننے کے اشتیاق میں اس نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”باسط بھائی کی دکان پر؟“

”ہاں۔“ اس کی آنکھوں میں عجب خوبصورت جھنجھکنے لگے تھے۔ ”اس روز میں ایک ضروری کام سے وہاں گیا تھا۔ ایک ضروری کال کرنی تھی مجھے۔ باہر سے تمہاری دوست فارحہ کی آواز آئی۔ وہ باسط بھائی کو پکار رہی تھی پھر ایک مدھر ہنسی کی جھجھک رسانی دی۔

جیسے، جیسے کسی پہاڑی مقام پر بے مندر میں نفرتی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ کبھی سنی ہے یہ آواز زینو؟“

”اوں ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”سنو گی؟“ وہ شرارتی ہوا۔ ”مگد گدی کروں؟“

”خبردار۔“ وہ اٹھ کر بھاگی تھی۔

احسن نے ہنستے ہوئے اس کی کلائی تھام لی۔ اس کی بھی پیٹنگی ہنسی چھوٹ گئی۔

”دیکھیں احسن پلیر، آپ کو اللہ کی قسم ہے“

وہ ہنس ہنس کر اسے دونوں ہاتھوں سے روک رہی تھی۔

”بس، یہی آواز سننا چاہ رہا تھا میں۔“ احسن نے اسے تھام لیا۔ ”یہی ہے وہ دل فریب، مدھر جھجھکار۔ سنی زینب تم نے۔“

زینب خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ ہنس ہنس کر اس کی ہلکی سی گیلی ہو گئی تھیں۔

”اس ہنسی کی تازگی برقرار رکھنے کیلئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں زینو۔“ وہ دھیمے سے بولا۔ ”میں نے وعدہ کیا ہے نا تمہاری ہر خوشی کو پورا کرنے کا، ہر خواہش مکمل کرنے کا، تم اس مت ہو اور کون زینو! تکلیف ہوتی ہے مجھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنا وعدہ مکمل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔“



شکوہ تو اس کے دل کی تہوں میں کہیں پڑا رہ ہی گیا تھا، تاہم احسن نے اگلے چند دنوں میں ہر ممکن طور پر اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے ہر شام اماں سے ملوانے لے جاتا۔ وہاں سے واپسی پر کسی تفریحی مقام پر چند گھنٹے گزار کر وہ اسے کسی اچھی سی جگہ پر رات کا کھانا کھلاتا۔ مگر بے دلتا اور بایک پوری اسپینڈ سے سیاہ سرکوں پر دوڑاتے ہوئے گھر لے آتا۔

زینب کا دل بہل گیا تھا۔ البتہ فرخندہ آپا کے لیے اس کے دل میں بے حد کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب تقریباً روز ہی اس کی خیریت دریافت کرنے آتی تھیں۔ زینب اس سے کھینچی کھینچی رہتی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے احسن کو خض اس کی وجہ سے انکار کیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اس سے دل ہی دل میں ایسے خائف ہیں جیسے ایک ساس اپنی بہو سے ہوتی ہے۔

بہر حال۔ وہ اپنی نئی زندگی سے بے حد مطمئن اور بہت خوش تھی۔ احسن کا پیارا ایک سمندر کی مانند اسے اپنی موجوں میں بہا کر لے گیا تھا۔ تقاضا اور اپنے ہونے کا بھرپور احساس ہمہ وقت دھنک رنگوں کی طرح اس پر بکھرا رہتا تھا۔

اس روز چھٹی تھی۔ دوپہر کی بھرپور نیند کے بعد وہ دونوں باہر محن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ تب ہی زینب کی نگاہ سامنے والے گھر کی چھت پر گئی۔

وہی سانولی، پرکشش لڑکی رینگ کے پاس کھڑی تھی۔ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں ایک عجب سوچ کا عالم تھا۔ ”احسن!“ اس نے احسن کو مخاطب کیا۔ ”یہ آپ کی پشت کی طرف جو گھر ہے۔ کن لوگوں کا ہے؟“

”کیوں؟“ وہ چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے رہ گیا۔

”ایک لڑکی کھڑی ہے وہاں چھت پر، خوبصورت سی۔ پہلے بھی ایک آدھ دفعہ میں نے اسے یہاں کھڑے دیکھا ہے۔ اس کا انداز عجیب سا ہوتا ہے۔“

احسن آہستگی سے مسکرایا۔

”ابھی کھڑی ہے؟“

”اچھا!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو ہم بھی اندر چلتے ہیں۔“

وہ دونوں اٹھ کر اندر چلے آئے۔

زینب کچن میں آ کر چائے کے برتن دھو نے لگی۔ ایک پھانس سی اس کی سوچ میں ایک گئی تھی۔ احسن نے جس طرح اس لڑکی کے متعلق استفسار کیا اور پھر بات کو بدل دیا تھا۔ اس سے زینب کو عجیب طرح کے احساس نے آ گھیرا تھا۔

”کیا وہ اس لڑکی کو جانتا تھا؟ اس کی موجودگی کا سن کر وہ اندر کیوں چلا آیا تھا؟ اس نے زینب کے استفسار پر لاطلمی کا اظہار کیوں نہ کیا تھا؟ وہ عجب انداز میں مسکرایا کیوں تھا؟

بہت سے سوالات اس کے اندر ہلچل مچانے لگے۔ احسن باہر کسی گانے کی دھن پر سیٹی بجانے کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔

زینب نے اس سے پھر کوئی سوال نہ کیا لیکن اس کے اندر بہت سے سوالات تھے۔



پورا دن اماں کے ساتھ گزار کر وہ رات کو آمنہ کی طرف چلی آئی۔ آمنہ البتہ اس سے بے حد خفا تھی۔

”تم نے تو حد ہی کر دی ہے زینب! ایسا لگتا ہے بیاہ کرنا نہ کہاں گئی ہو۔ کوسوں دور کسی جگہ اور اماں سے تو پھر بھی آکر مل جاتی ہو۔ میں یہاں پڑوس میں ہوں مجھ سے ملنا گوارا نہیں کرتیں؟“

”ان سارے شکوؤں، شکایتوں کا ایک جواب ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھی۔ ”تمہاری اپنی شادی۔ جب گزر روگی اس تجربے سے تو بہت سے دور کل جائیں گے آگہی کے۔“

”جل شکر الحمد للہ! تم پر بھی کم از کم آگہی کے کچھ در تو کھلے۔“

”کچھ نہیں بہت سارے۔!“ وہ ہلکھلا کر ہنس دی۔ ”جج آمنہ!“

بھروسہ بخیدہ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے تو علم ہی نہ تھا کہ بچی خوشیاں کیا ہوتی ہیں۔ ذرا ذرا سی، چھوٹی چھوٹی باتوں سے سر تن کیسے کشید کی جاتی ہیں۔ احسن نے سب کچھ سکھا دیا ہے مجھے۔ میں گھر کے کاموں سے نابلد تھی۔ تصور سے ہی جی گھبراتا تھا۔ صبح سویرے اٹھنا، ناشتہ تیار کرنا، شوہر کے کپڑے تیار کرنا پھر سارا دن پورے گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں الجھے رہنا۔ قسم سے رونا آتا تھا۔ سوچتی تھی اگر اسی کا نام شادی ہے تو ایسی شادی کو دس کوس دور سے ہی سلام! اگر ممداد ریوں کے اسی عظیم الشان بوجھ کو شادی کہتے ہیں تو اس سے بہتر کوئی چھوٹی موٹی جاب کر لینا ہے۔ جہاں مصروفیت بھی ہو اور جی بھی بہلا رہے۔“

وہ ہنس دی۔

”لیکن آمنہ! قسم خدا کی۔ اس مصروفیت کا، ان ذمہ داریوں کا اپنا ہی مزہ ہے۔ سارا دن خوب صورت سوچوں میں گھرے، مسکراتے، گنگناٹے گزر جاتا ہے۔ نہ اپنی خبر ہوتی ہے، نہ کاموں کا پتا چلتا ہے پھر اپنے شوہر کے چھوٹے چھوٹے کاموں کا جو لطف ہے اس کا تو میں نے کبھی تصور ہی نہ کیا تھا۔ احسن کے کپڑے دھونے میں جو خوشی مجھے ملتی ہے، وہ حیران کن ہے۔ احسن کے لیے کھانا تیار کر کے ان کا انتظار کرنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ ان کے کہنے سے پہلے ہی چائے کا کپ نہیں پکڑا دینا..... اف! آمنہ! زندگی اتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔ میرے تصورات سے کہیں بڑھ کر۔“

آمنہ مسکراتے ہوئے اس کا چمکتا چہرہ دیکھتی رہی۔

”آمنہ.....! آمنہ.....! تم بھی جلدی سے شادی کر لو۔“ وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔

آمنہ ہنس دی۔

”کس سے کر لوں؟ شادی کرنے کے لیے ایک عدد بندے کا ہونا اشد ضروری ہے میری جان۔!“

”ہوں۔“ وہ کچھ سوچنے لگی۔ ”یہ مسئلہ تو ہے۔“

”تمہیں تو خدا نے اتنا خوش قسمت بنایا ہے زینب! کہ رشک آتا ہے تم پر۔ دعا کرتی ہوں کہ تمہاری یہ خوشیاں سلامت رہیں۔ امر ہو جائیں۔ تم ہمیشہ ایسے ہی ہنسی مسکراتی رہو۔“

”خدا ہر کسی کی قسمت میں خوشیاں لکھتا ہے آمنہ۔!“ اس نے آمنہ کا ہاتھ ہولے سے دبایا۔ ”کسی کو جلد ملتی ہیں، کسی کو بدیر۔ کبھی کبھی انتظار

بھی کرنا پڑتا ہے۔ تو کیا ہوا۔ خوشیوں کے انتظار کی لک بھی اچھی لگتی ہے۔ ہے نا؟“

آمنہ پھر پورا انداز میں مسکرائی۔

”شادی ہو جانے سے کیا عقل بھی آ جاتی ہے زینب؟“ وہ شرارتا بولی تھی۔ ”تو اتنی عقل مند کب سے ہو گئی؟“

”ارے کیا کیا اعجاز ہیں اس رشتے کے۔ سب کھلے گاتم پر بھی!“
دونوں کھلکھلا کر ہنس دی تھیں۔



اماں کے ہاں سے واپسی رات کو ہوئی تھی۔ احسن تیزی سے بائیک سیاہ تارکول کی سڑک پر دوڑا رہا تھا۔
”کیا بات ہے جناب!“ وہ اس کے کان کے قریب منہ لاکر چیخی۔ ”ساتھ جیتے جیتے آتا گئے؟ ساتھ مرنا چاہ رہے ہیں؟“ اس نے شرارتا
رفتار مزید بڑھا دی تھی۔

”کوئی خطا ہوئی ہے مجھ سے؟“ اس نے گھبرا کر اس کا کندھا مضبوطی سے تھام لیا تھا۔
”خطائیں خطائیں۔“ وہ چیخا۔ ”ایک تو اتنے دن بعد گھر جا رہی ہو اس پر دو روز دور ہو کر بیٹھی ہو۔“
”اس جرم کی سزا، سزائے موت ہے کیا؟“ وہ ہنس دی۔
”اس جرم کی سزا بہت سی سزائیں ہیں، تم گھر تو چلو۔“ وہ اس سے زیادہ شوخ ہو رہا تھا۔
”پلیز احسن! آہستہ چلائیں نا۔“ وہ بخیدہ ہوئی تھی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“
”زینو! اصل میں مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تمہیں گھر چھوڑ کر کچھ دیر کو آصف کی طرف جاؤں گا۔ اس لیے چاہتا ہوں ذرا جلدی
بچھ جائیں۔“

اس نے اپنی تیز رفتاری کی وضاحت کر دی۔ زینب خاموش ہو کر گزرتے مناظر دیکھنے لگی گھر کے سامنے بائیک روک کر وہ اس کے اترنے
کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے احتیاط سے اتر کر کیریز پر لگا بیگ اتارا تھا۔

”کب تک آئیں گے؟“

”گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔“

”ہائیں۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”میں کیا کروں تب تک؟“

”فرخندہ آپا تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔ تم ان کے پاس بیٹھو۔ میں نو، ساڑھے نو بجے تک آتا ہوں۔“

وہ بد مزہ ہو گئی۔ بھلا وہ فرخندہ آپا کے پاس بیٹھ کر کیا کرتی۔ ان دونوں کے مابین محض عمروں کا بھی نہیں خیالات کا بھی بہت فرق تھا۔ وہ ان
کی کہنی میں خود کو بہت بے آرام محسوس کرتی تھی، اس سے تو بہتر تھا وہ اکیلی بیٹھ کر احسن کا انتظار کر لیتی۔ لیکن اس کے کچھ بولنے سے پیشتر ہی وہ
بائیک اڑا کر لے گیا تھا۔ گھر کی چابی بھی ساتھ لے گیا۔

وہ فرخندہ آپا کے پورشن میں چلی آئی۔

”السلام علیکم آپا!“

فرخندہ آپائی وی لگائے بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔

”ارے، میری زینب آئی ہے بھئی میکے سے آؤ، ادھر آؤ۔ میں پیار کروں تمہیں۔!“

ان کے والہانہ استقبال سے اس کا دل قدرے صاف ہوا۔ وہ ان کے گلے لگ گئی۔

”کیا کر رہی ہیں اکیلے اکیلے۔“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”ہم نے کیا کرنا ہے بیٹا۔“ وہ قدرے اداسی سے مسکرائیں۔ ”بیٹھے ہیں فارغ۔ صوفیہ چائے بنا رہی ہے۔ بتاؤ! مہمان، میزبان کو بیشا

کر خود کچن میں گھس جائے چائے بنانے، اچھا لگتا ہے؟ لیکن یہ لڑکی سنتی کب ہے۔“

”صوفیہ؟“

”ہاں، سامنے رہتی ہے۔ بیک صاحب کی بیٹی لیکن تم کہاں واقف ہوگی ابھی۔ احسن تو خیر بخوبی واقف ہے ان لوگوں سے۔ ٹھہرو! ملو اتنی ہوں۔ صوفیہ، صوفیہ بیٹی!“

کچن میں سے جولا کی برآمد ہوئی تھی، نرنب کے لیے اس کا چہرہ اجنبی نہ تھا۔ یہ وہی چھت والی لڑکی تھی جسے وہ کئی مرتبہ دیکھ چکی تھی۔

”السلام علیکم۔“ وہ قریب آ کر دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ نرنب نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔

ساتھ ساتھ اس کا بھر پور جائزہ بھی لیا۔ بڑی جاندار شخصیت کی مالک تھی وہ۔ رنگت سانولی لیکن حد درجہ پرکشش تھی۔ سیاہ بھونرا آنکھیں، جن پر گھٹی پکڑوں کی باڑھی۔ کمر سے نیچے آتی بل کھاتی، ناگن سی چوٹی، متناسب جسم، سنجیدگی اور متانت کی ایک گہری چھاپ اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

”لو بھی صوفیہ۔ آج مل لو تم بھی۔“ فرخندہ آ پا کھڑی تھیں۔ ”بہت شوق تھا نہ تمہیں نرنب سے ملنے کا۔“

”مجھ سے ملنے کا؟“ نرنب مسکرا دی۔ ”لیکن یہ کب جانتی ہیں مجھے؟“

”اس نے اپنی چھت سے بار بار دیکھا ہے تمہیں۔ دو تین مرتبہ ملنے بھی آئی لیکن تم اپنے میکے لگی ہوئی تھیں۔ پوچھ رہی تھی، احسن بھائی کی بیگم دور سے جس قدر خوبصورت نظر آتی ہیں کیا قریب سے بھی دیکھی ہیں؟“

فرخندہ آ پا زور سے ہنس دیں۔

”میں نے کہا، دور سے تو مجھے خبر نہیں کیسی نظر آتی ہے، ہاں قریب سے دیکھا ہے میں نے۔ شوکیس میں بھی گڑیا لگتی ہے۔ سفید موم سے

بنی۔!“

نرنب کے گال تپ گئے۔ اتنی زیادہ تعریف وہ بھی منہ پر۔ وہ شرماسی گئی۔

”بہت پیاری ہیں آپ، واقعی۔!“ صوفیہ کھڑی تھی۔

اردو ادب کے مشہور افسانے ۲

اردو ادب کے مشہور افسانے (جلد دوم) بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں شامل افسانے ہیں:

(کالی بلا شوکت صدیقی): (قیدی، ابراہیم علیس): (اخروٹ جھپا چوہا بھیس، ممتاز منشی): (سیب کا درخت، بوتل کا جن اے۔ جمید):

(فاصلہ، واجدہ تبسم): (ادھا گلزار): (مجید کا ماضی، پوجا چھٹے باز، سعادت حسن منٹو): (ماروزاد، خولجہ احمد عباس)

(بدام رنگی، بلونت سنگھ): (بیہودہ خاوند، کنہیا لال کپور): (عجیب قتل، شمس۔ جمیل): (اد پر گوری کا مکان، آغا بار): (لاٹری، فشی پریم)

(چند): (صاحبان مرزا، علی حیدر ملک): (دل ہی تو ہے، بھونور، گوندنی، غلام عباس): (مولوی مہرباں علی، ابن انشاء)

(لیمن جوس، چتر سین): (غیر قانونی مشورہ، لوح ہزار، موپاساں): (سوتلی ساگرہ، اشفاق احمد): (ایک تھی فاختہ، محمد منشاء یاد)۔

یہ کتاب افسانے سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

”شکریہ! ویسے یقین جانیں تو میں آپ کے بارے میں یہی سوچ رہی تھی۔“
 ”بھئی۔ بچیاں تم دونوں ہی پیاری ہو اور مجھے تو کچھ زیادہ ہی اچھی لگتی ہو۔“ فرخندہ آپا کھڑی ہوئی تھیں۔
 ”تم لوگ بیٹھ کر باتیں کرو۔ چائے میں نکال لاتی ہوں۔“
 دونوں وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

صوفیہ کوئی بات کرنے کے بجائے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھا کر نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں سے کاٹتے ہوئے وہ کسی اضطراب کا شکار لگتی تھی۔
 زینب بھی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
 فرخندہ آپا بھی ٹرے اٹھا کر چلی آئیں۔
 ”لو بتاؤ! یہاں تو پہلے سے زیادہ خاموشی ہو گئی۔ ارے بھئی کوئی بات دات کرو۔ کچھ پوچھو ایک دوسرے سے، کچھ بتاؤ! تم دونوں سے زیادہ تو میں بول رہی ہوں۔ بچیاں تو بات کرتی، ہنسی سکراتی اچھی لگتی ہیں۔“
 وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دی تھیں۔
 ”دل لگ گیا ہے آپا کیا ہاں؟“ صوفیہ نے رسوا پوچھا تھا۔
 ”ہاں، بالکل۔!“ وہ مسکرا اٹھی تھی۔
 ”دل تو اس کا ایسا لگا ہے کہ یہ نیچے میرے پاس نہیں آتی۔“ فرخندہ آپا ہنسیں۔ ”دونوں میاں بیوی دنیا بھلا کر بس ایک دوسرے کے ہو بیٹھے ہیں۔ کیوں زینب؟“

زینب گفتگو سے مسکرا دی۔ صوفیہ خاموشی سے چائے بنانے لگی تھی۔
 ”السلام علیکم!“ دفعتاً احسن کی آواز پر وہ تینوں چونکی تھیں۔
 ”آسکتا ہوں جی؟“ وہ دروازے پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔
 ”آؤ بھئی! تم کب سے مہمان ہو گئے۔“ فرخندہ آپا نے اسے آواز دی۔
 اور زینب نے واضح طور پر چائے بناتی صوفیہ کے وجود میں لرزش محسوس کی تھی۔ اس کے لرزتے ہاتھ اور جو بھل پلکیں اس کے بھید کھول رہی تھیں۔ زینب ایک لڑکی تھی اور بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ کسی مرد کی آمد پر اگر کوئی لڑکی مضطرب ہو جائے، پلکیں نہ اٹھا سکے، ہونٹ کپکپانے لگے تو ان سب باتوں کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔

”آپا! میں چلتی ہوں۔“ وہ یک بیک اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
 ”بیٹھو صوفیہ، چائے تو پی لو۔“
 ”پھر سہی۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔
 زینب نے احسن کو دیکھا۔ باہر نکلتی صوفیہ کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں سوچ کے کئی رنگ تھے۔ وہ اس کے وجود سے بے خبر نہ تھا۔



وہ زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکی تھی۔ جیسے صوفیہ اپنا تمام اضطراب اس کے اندر انڈیل گئی تھی۔
 نیند آنے کا بہانا کر کے وہ جلد ہی اٹھ آئی۔ ہر چند کہ نیند آنکھوں سے بہت دور جا چکی تھی۔ احسن دوسرے دن کے لیے اپنے کپڑے منتخب

کر رہا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ کر بغور اسے دیکھ رہی تھی شرت اور پینٹ ہنگر کر کے وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”مزاج بخیر جناب عالی؟“ وہ اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔ ”کیا سوچا جا رہا ہے؟“

”احسن!“

”جی احسن کی جان۔“

”ایک بات پوچھوں۔ سچ بتائیں گے۔“

”صوفیہ نہیں دو سو فیصد سچ بتاؤں گا۔ پوچھ کر تو دیکھ۔“ وہ زینب کے بال انگلی کے گرد لپیٹنے لگا تھا۔

”یہ جوڑکی ہے۔ صوفیہ! آپ جانتے ہیں اسے؟“

وہ پوری طرح سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا۔

”ہاں۔“ پھر وہ بولا۔ ”جانتا ہوں۔“



زینب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔

احسن کے انداز کا دھیمپاں اسے ایک خاموش اعتراف کی مانند لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اسے کچھ بتانا بھی چاہتا ہو اور شرمندہ بھی ہو۔

اسے لگا، اس کا سانس رک رہا ہے۔ وہ اسے کیا بتانے جا رہا تھا؟ کسی گذشتہ عشق کی داستان کسی خاموش رومان کا قصہ یا محض ایک چند روزہ دل گلی کی کہانی کچھ بھی ہوتا، اس کا نقصان ہوتا تھا۔ اس کا اعتبار، نگر و غرور، اپنی ذات کا مان، چپ چاپ رخصت ہو جاتا۔ وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ پاتی لیکن خود آپ اپنی نظروں میں ضرور بے وقعت ہو کر رہ جاتی۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو ایک دیوی کا درجہ دے چکی تھی، محض ایک خوب صورت سی مورتی بن کر رہ جاتی۔

چند ہی دنوں میں بہت مان ہو چلا تھا اپنی ذات کا، اسے احسن کی بے تائیاں، بے قراریاں اسے ایک عجب غرور کے جذبے میں مبتلا کر چکی تھیں۔ بھلا کتنی عورتیں ہوتی ہیں ایسی جنہیں اس قدر بے لوث محبت نصیب ہوتی ہے۔ جنہیں اتنے ارمانوں سے چاہا جاتا تھا، جنہیں اتنی منتوں مرادوں کے بعد حاصل کیا جاتا ہے۔ وہ یقیناً خاص تھی۔ اس میں ایسی ہی کوئی بات تھی کہ اس طرح چاہے جانا اس کا حق بن گیا تھا۔

احسن ایاز کی طرح وہ خود بھی اپنے عشق میں مبتلا ہو چکی تھی۔ اب اگر اسے پتا چلتا کہ چاہتے رہنا احسن کی عادت ہے تو اسے شدید قسم کا صدمہ ہوتا۔ صوفیہ اور وہ برابر برابر کھڑی ہوتیں۔ کتنا تکلیف وہ احساس تھا یہ اس کے لیے۔ احسن کو شاید اس کے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ سیدھا لیٹا جھٹ کو گھور رہا تھا۔ شاید وہ لفظ منتخب کر رہا تھا۔ جو وہ زینب سے کہنا چاہتا تھا۔ جب تک اس کے لفظ ترتیب پاتے، زینب کی آدھی جان نکل چکی تھی۔ ”زینی۔“ بالآخر وہ بولا تھا۔ ”مجھے کسی کی ذات پر پڑے پردے ہٹانے کا، یونہی بے وجہ کسی کو بے نقاب کرنے کا قطعی کوئی شوق نہیں، ورنہ یہ بات جو آج تمہیں بتا رہا ہوں، پہلے دن ہی بتا دیتا۔ یہ بھی صرف اس لیے کہ کہیں تم میری جانب سے بدگمان نہ ہو جاؤ۔ تمہارے دل میں میل نہ آجائے۔ صرف اس لیے تمہیں پوری بات، پوری سچائی سے بتا رہا ہوں۔“

اس نے زینب کی جانب کروٹ لی۔ زینب پوری آنکھیں وا کئے، ایک ایک لفظ بغور سن رہی تھی۔

”صوفیہ کو میں گذشتہ سات سالوں سے جانتا ہوں۔ پہلے میرا ان کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ اصل میں جن دنوں میں یہاں فرخندہ آپا کے پاس شفٹ ہوا، میرے حالات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے۔ مجھے ان دنوں اکثر و بیشتر پیسوں کی اشد ضرورت رہتی تھی۔ صوفیہ میٹرک کا انٹر ام دے رہی تھی۔ فرخندہ آپا نے میرے پاس اس کی ٹیوشن رکھوا دی۔ یوں بیگ صاحب کے پاس میرا آنا جانا ہو گیا۔!!“

نہب کے اندر سفید برف گرنے لگی۔ اتنا ہی سن کر اسے پورا یقین ہو چلا تھا کہ احسن اور صوفیہ کے درمیان کوئی ایسی راہ ضرور ہموار ہوئی تھی جو آج بھی صوفیہ کی یادوں میں روشن تھی اس کے اندر کوئی شے آہستہ آہستہ پگھلنے لگی۔ احسن چند لمحوں کے لیے خاموش رہ کر پھر بولا تھا۔

”صوفیہ کے نمبر میٹرک میں بہت اچھے آئے تھے میں نے محنت بھی بہت کی تھی اس پر آدمی آدمی رات تک جاگ کر میں اسے اگلے پیپر کی تیاری کرانا رہتا تھا۔ پڑھنے میں اچھی تھی، محنت بھی خوب ہوئی تو اچھے نمبر لے آئی۔ بس پھر بیک صاحب نے مجھے مستقل طور پر اسے پڑھانے کے لیے کہا اور میں نے بھی انکار نہ کیا۔ تین سال تک میں نے اسے پڑھایا۔ اسے میڈیکل میں جانے کا شوق تھا۔ اس کے والد کی بھی یہی خواہش تھی۔ میں اپنے طور پر یہی کوشش کرتا رہا کہ اسے اس قابل بنادوں کہ وہ عہدگی کے ساتھ پیپر دے اور اتنے نمبر حاصل کر سکے۔ اس دوران مجھے علم ہی نہ ہوسکا کہ کب صوفیہ کے دل میں چپکے سے کچھ نرم و نازک جذبے پرورش پا گئے۔ اس نے پڑھائی سے زیادہ دھیان مجھ پر دینا شروع کر دیا۔ اپنے روشن مستقبل کے بجائے وہ اپنی تہائیوں میں مجھے سوچنے لگی۔ بخدا نہب مجھے علم نہ ہوا۔ میری لگن اور میرے غلوں میں اس طرح کے کسی جذبے کا کوئی حصہ نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنے اور اس کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ سمجھا اور قائم رکھا۔ میرے رویے کا ہی کمال تھا کہ اس کے گھر والے مجھ پر اس حد تک اعتبار کرتے کہ میں اسے رات گئے تک پڑھاتا رہتا اور کوئی شخص آکر ہمیں ڈسٹرب نہ کرتا۔ ایک دن اسے پڑھاتے ہوئے اس کی کتاب میں رکھا ہوا خط میرے ہاتھ لگ گیا جو اس نے میرے تصور کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔ جس دن مجھے اس لڑکی کے جذبوں کا علم ہوا، اس سے اگلے روز سے میں نے اسے پڑھانے سے معذرت کر لی۔ میں فرشتہ ہونے کا دعوٰی نہیں کرتا نا ہی..... لیکن بچپن سے ملی محرومیوں نے اور ستم کش حالات نے مجھے وقت سے پہلے ہی بہت کچھ سیکھا دیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ مجھ پر بے پناہ اعتبار کیا گیا ہے اور مجھے ہر حال میں اس اعتبار کا مان رکھنا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں اپنے دامن پر کسی قسم کا دھبہ اپنے کیرئیر پر کوئی بدنامی کا داغ مول لینے کے قابل نہیں ہوں اور پھر سب سے بڑی، سب سے سچی بات یہ تھی کہ میرے دل میں اس لڑکی کے لیے کوئی جذبہ تھا ہی نہیں۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہ تھا۔“

اس نے ایک گہری سانس بھر کر بات کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔

”پھر؟“ نہب کا دل کسی انجانی قید سے آزاد ہو کر ہواؤں کی جانب چلا تھا ”کیا رد عمل تھا صوفیہ کا؟“

احسن نے مسکرا کر اس کی سمت دیکھا۔

”مجھے کبھی اس لڑکی پر ترس آتا ہے زینبی..... اور جب سے تم مجھے ملی ہو تب سے اس کے جذبوں کی سچائیاں مزید واضح ہوئی ہیں مجھ پر۔ محبت کا روگ کیسے لگتا ہے، انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے، میں نے جانا ہے اور یہ لڑکی ایک طویل عرصے سے مجھ سے محبت کرنے کا تاوان بھر رہی ہے جس محبت کے جواب میں محبت نہ ملے، وہ تاوان، بن کر ہی تو رہ جاتی ہے۔ بے وجہی دل و جان کا نقصان کیے جاؤ۔ اور یہ مسلسل اپنا نقصان کیے جاتی ہے۔ میرے دھیان میں کھوکھور پڑھائی نہ کر سکی۔ انٹر کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہی منقطع کر دیا۔ کتنے رشتے آئے اسکے، میری چاہ میں سب کو ٹھکراتی گئی۔“

”آپ کو یہ کیسے پتا؟“ اس کے اندر کی عکاسی عورت بیدار ہوئی تھی۔

احسن ہنس دیا۔

”ملتا تھا چھپ چھپ کر اس سے تفصیل سے بتاتی تھی ہر بات۔“

نہب نے زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھری تھی۔

”بتائیں سچ سچ ورنہ۔“

”ارے بابا!“ وہ زچ ہوا ”چھاسنو خط لکھتی رہی ہے مجھے، پچھلے تین چار سالوں سے حالاکہ میں نے کبھی اس کے کسی خط کے جواب میں کسی بھی طرح کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔“

”کیا لکھتی رہی وہ اتنے سال تک آپ کو؟“ نہب کو بے حد حیرانی ہوئی۔

”محبت نامے!“ وہ ہنس دیا ”کیا کچھ لکھا جاسکتا ہے محبت ناموں میں؟ اشعار، غزلیں، قصیدیں، وعدے وغیرہ وغیرہ..... پڑے ہیں کچھ خط ابھی تک میرے پاس دیکھ لیتا۔“

”اتنے عرصے تک وہ بے وجہ ہی خط لکھتی رہی؟ کبھی تو کوئی جواب وغیرہ ملا ہوگا اسے۔ کسی طرح کی حوصلہ افزائی کے اتنی بڑی حرکت کس طرح سے کر سکتی ہے؟ وہاں ایسی آگ لگی ہے کہ سب کچھ جل کر خاک ہوا اور یہاں ہلکی سی تپش بھی نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“

”ایک ہلکی سی آج آتی تھی..... تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں..... اتنے عرصے بعد محض ایک ہلکی سی آج آتی تھی۔ محض چند ماہ پیشتر اس رات کے بعد دن طلوع ہوا! وہ میری زندگی کا سب سے روشن دن بن گیا زینو اس دن میں نے تمہیں دیکھا اور پھر تم ہی تم یاد رہ گئیں۔ باقی سب بھول گیا۔ ہاں! اگر تم مجھے ملتیں تو شاید بہت ممکن تھا کہ میں فرخندہ آپا سے صوفیہ کی بات کرتا۔“

”فرخندہ آپا جانتی ہیں یہ سب کچھ؟“ اس نے نجائے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔

”ہاں اندازہ تو ہے انہیں۔ اسی لیے انہوں نے کتنی ہی بار مجھ سے صوفیہ کی حمایت کی۔ میں ہر مرتبہ انکار کرتا گیا۔ شاید اس لیے کہ مجھے تم سے ملنا تھا۔“

وہ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔ زینب مسکرا دی۔ اب اسے اطمینان ہوا تھا۔ سوچ میں ابھی پچاس نکل چکی تھی اور اب سکون ہی سکون تھا۔

احسن سو گیا تو وہ کافی دیر تک صوفیہ کے متعلق سوچتی رہی۔

”بھلا اس طرح بھی کوئی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ صلے کی تمنا کے بغیر۔ ایسی سچی چاہت پھر بھی بے چاری کی خالی ہاتھ ہی رہی..... اچھی بھلی خوب صورت لڑکی اور ایسے والہانہ جذبات دل میں لیے ہوئے..... پھر بھی متاثر نہ کر پائے۔ بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔“

اس نے ایک نگاہ سونے ہوئے احسن پر ڈالی۔

”اور ایسا بلند کردار، مضبوط سوچ کا مالک تجھ پر ایسا مرتازنہ کہ بالکل تیرے قدموں میں جھک گیا۔ تجھے پانے کے لیے یوں مضطرب ہوا کہ اپنی موجوں میں بہا لے گیا۔ تجھے۔ ایسا کیا ہے تجھ میں؟“ صوفیہ کا پرکشش سراپا تصور میں در آیا تو وہ آئینہ دیکھنے کے لیے بے چین ہوا ٹھکی۔

اپنی ذات کے غرور میں اضافہ ہو چلا تھا۔



اگلے روز احسن کے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلے احسن کی الماری کی تلاشی لی تھی۔ وہ خانہ جہاں وہ اپنی کتابیں، فائلیں اور ضروری کاغذات وغیرہ رکھتا تھا۔ تھوڑی سی تلاشی کے بعد ہی اس کے ہاتھ صوفیہ کے خطوط لگ گئے تھے۔ وہ تعداد میں بے شمار تھے۔ نجائے اس لڑکی نے اپنی کتنی راتیں سیاہ کی تھیں۔ خطوط کی تعداد اور طوالت سے صوفیہ کے رجحانوں کا اندازہ ہوتا تھا۔

زینب جو انہیں پڑھنے بیٹھی تھی تو اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہاں تو بے قرار یوں کا جہاں آیا تھا۔ تنہاؤں اور آرزوؤں کی ایک پوری دنیا تھی۔ ان خطوط میں کہیں بھی، کسی بھی منظر میں کوئی نچلا پن کوئی گھٹیا بات نہ تھی۔ بس نثری شاعری کا ایک دیوان تھا۔ اپنے احساسات کا خوب صورت اظہار تھا، زینب حقیقتاً متاثر ہوئی تھی۔ ایک اطمینان اسے یہ بھی حاصل ہوا تھا کہ وہ تمام خطوط احسن کو ہر لحاظ سے بے گناہ ثابت کرتے تھے۔ صوفیہ کے بے شمار اعتراضات تھے جس سے احسن کی بے نیازی اور بے پروائی ثابت ہوتی تھی۔ اس کی لائقیت اور بے حسی کے شکوے کئی جگہوں پر درج تھے۔

اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ جس مرد کا ساتھ پانے کی کسی نے ہر ممکن سعی کی تھی وہ مضبوط مرد اس کا تھا اس کے ہمراہ تھا۔ زندگی بھر کا ساتھی تھا۔



اس روز صبح سے ہی اس کا سن اداس اداس ساتھ۔ نجائے کیا بات تھی۔ نہ اس کا ماشہ کرنے کو جی چاہتا نہ اس نے کسی کام کو ہاتھ لگایا تھا۔ کسمندی سے کافی دیر بستر میں پڑی رہی پھر گیارہ بج گئے تو وہ چائے کا ایک کپ بنا کر آمدے میں آ بیٹھی۔

چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی وہ خالی لڑائی کی سی کیفیت میں تھی جب فرخندہ آپ جلی آئیں۔

”زینی..... بیٹا کیا کر رہی ہو؟“ وہ آہستگی سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ زینب بری طرح چوکی تھی۔

”اوہ..... آپ ہیں، السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔“ وہ بے حد مضطرب اور متذبذب دکھائی دیں ”وہ..... زینب بیٹا..... کپڑے وغیرہ چینج کر لو۔ تمہارے کپڑے ٹکچے ہو رہے ہیں۔ میں کوئی جوڑا نکال دیتی ہوں۔“

زینب حیرانی سے ان کی صورت دیکھنے لگی۔ یہ آج انہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی باتیں انہوں نے پہلے تو کبھی نہ کی تھیں۔

”لیکن کیوں؟“ میں گھر میں ہی ہوں۔ شام کو نہا کر کپڑے بدلوں گی۔ ابھی تو کتنا کام پڑا ہے۔“

”احسن کا فون آیا ہے۔ وہ لینے آ رہا ہے تمہیں۔“

انہوں نے نظریں چرا لیں تھیں ”تمہارے میکے جانا ہے میں بھی چل رہی ہوں۔“

زینب کے احساسات اچانک بیدار ہو گئے۔ کوئی غیر معمولی بات تھی۔ فرخندہ آپا کے انداز بے حد اجنبی تھے۔ ان کی آنکھوں سے جھپکتی بے چینی اور گھبراہٹ کچھ الگ ہی کہانی کہہ رہی تھی۔

”میرے گھر؟ کیوں؟“ اس کے ہاتھ پاؤں یکا یک سرد پڑ گئے تھے ”کیوں آپا؟ کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا؟“

”خیریت نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”تمہارے بڑے ماموں کا فون آیا ہے احسن کے آفس میں اماں..... اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں اسپتال لے کے گئے ہیں۔“

”اماں۔“ اس نے چیخ ماری ”کیا ہوا ہے اماں کو۔ میری اماں کو کیا ہوا ہے آپا..... کیوں لے کر گئے ہیں انہیں اسپتال۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ فرخندہ آپا اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن وہ کسی طور ان کے قابو میں نہ آ رہی تھی۔ خود اس کے اپنے حواس اس کے قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ اس کی بیماری عزیز از جان ماں نجائے اکیلے میں کن مراحل سے گزری تھی کون اسے اسپتال لے گیا تھا نجائے کتنی دیر وہ تہا پڑی اسے یاد کرتی رہی ہوں گی..... سوچ سوچ کر وہ بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ آنسو تھننے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

تھوڑی دیر میں احسن بھی آ گیا تھا۔ وہ جس صدمے سے گزرا تھا وہ اس کے چہرے پر تحریر تھا۔

”احسن..... احسن..... میری اماں کو کیا ہوا ہے؟“

وہ اس کا بازو جھنجھوڑنے لگی ”بتاؤ نا احسن وہ ٹھیک ہیں نا۔“

”صبر زینو! صبر! احسن نے اسے خود سے لگایا“ صبر سے کام لو۔ جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔“

اس کے چند لفظوں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔ ایک چیخ مار کر وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی اس کی بیماری ماں ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ گئی تھی۔



پھر کتنے دن لول اور اداس گزرے تھے۔ اسے ان دنوں کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ خوش ہونا بھول گئی تھی۔ اس کا اندر بالکل خالی، بالکل بے رنگ ہو گیا تھا۔ کسی بھی بات پر کوئی رنگ ابھرتا ہی نہ تھا۔

کتنے ہی لوگ اس کی دل جوئی میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ احسن، فرخندہ آپا کتنی ہی مرتبہ تو صوفیہ بھی بیٹھ کر گئی تھی۔ آمنہ کتنے ہی

چکر لگا گئی تھی۔ اس کا دل اداس ہی رہتا تھا۔

اماں کے جانے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ اماں اس کے لیے کیا تھیں۔ وہ ایسا مہربان سانبان تھیں جس نے کبھی حالات کی تیز دھوپ اس پر نہ پڑنے دی تھی۔ وقت کا ہر وار خود پر سہہ کر انہوں نے اس کی حفاظت کی تھی۔
آمنہ کہتی تھی۔

”نہیں! اماں تجھے شہزادیوں کی طرح رکھتی ہیں۔“

اور وہ ہنس کر خود پر مغرور ہو جایا کرتی تھی۔

اماں کی ہر ہر مہربانی اور عنایت کو اس نے ہمیشہ اپنا حق سمجھا تھا۔ خود اس نے کبھی یہ خیال ہی نہ کیا تھا۔ اماں کے کتنے حق اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ اس نے تو ہمیشہ اپنے حقوق کا خیال کیا تھا۔ فرائض کا احساس تو اسے ہو ہی نہیں پایا تھا نہ ہی کبھی اماں نے اسے احساس ہی دلا یا تھا۔ وہ جیسے از خود اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو گئی تھیں اور اب نہ سب کو ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اپنی تمام کوتاہیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی غفلتوں پر آنسو بہا رہی تھی۔

”ہائے میں نے ساری زندگی میں بمشکل انہیں چند گلاس پانی ہی بلایا ہوگا۔“

کاش میں اماں کی تھوڑی خدمت کر لیتی انہیں یہ احساس تو دلا دیتی کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے بیٹی انجسے رحمت کہا جاتا ہے۔“

”ہائے اماں! ساری عمر تم نے مجھے دان کر دی اور آخر وقت ہی تمہارے پاس نہ تھی..... چند گھونٹ پانی کے بعد بھی حلق سے ناسا کر کی۔“

”جانے اماں! تم نے مجھے بخشا بھی ہو گا کہ.....“

احسن اسے ہر وقت سمجھاتا رہتا تھا۔

”زینو! اماں کی روح بے قرار رہتی ہوگی۔ پیچھے کوئی پیارا یوں دن رات آنسو بہاتا، فریادیں کرتا ہو تو جانے والوں کو قہر اڑ نہیں آتا۔ صبر سے کام لو۔ ان کے لیے دعائیں کیا کرو۔ پڑھا کرو بخشا کرو انہیں زندگی میں کی جانے والی کوتاہیوں اور غفلتوں کا ازالہ بعد میں بھی ممکن ہے۔ جتنی دعائیں کر سکتی ہو مغفرت کی کرو۔“

پھر آہستہ آہستہ وہ سنہلنے لگی۔ زخموں پر وقت کی دھول پڑتی گئی۔ چند ماہ میں وہ نارمل ہو چکی تھی۔



زندگی بڑی سیدی سادی سی ڈگر پر رواں تھی۔ وہ اپنے حالات میں گن ہو چکی تھی۔ احسن کے ساتھ اپنے حالات میں گن ہو چکی تھی۔ احسن کے ساتھ بڑی مطمئن اور پرسکون زندگی گزر رہی تھی جب اس کے حال کی پرسکون جمیل میں اچانک ہی کلکرا کر گر اٹھا۔ اس روز وہ روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہو کر چند لمحوں کے لیے لیٹی تھی۔ سردیوں کا چل چلاؤ تھا۔ موسم میں پھیلی ہلکی سی تپش جسم کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا نہانے کا ارادہ تھا۔ مگر لیٹ کر اسے اتنا سکون محسوس ہوا کہ وہ چند لمحوں میں غافل ہو گئی۔

کسی نے بے حد آہستگی سے اس کا شانہ بلایا۔ نہ سب چونک کر بیٹھ گئی۔ پھر سامنے کھڑی ہوئی، ہستی کو دیکھ کر مارے خودی کے اس کی چیخ ہی نکلی گئی تھی۔

”ارے..... فارحہ تم!“ وہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی ”یوں اچانک..... بنا کسی اطلاع کے۔“

”بس سوچا سر پرانز دوں تمہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی ”محض اس سر پرانز کے لیے کتنی مشکلوں سے گھر ڈھونڈا ہے تمہارا۔ میرا

ڈرائیور بھی زچ ہو گیا تھا کہ رہا تھا بی بی کی کون رہتا ہے آپ کا ان تنگ تنگ گلیوں میں.....“

ننہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔

”کہاں اللہ میاں جی کے پچھوڑے گھر لیا ہے ننہ۔ سچ بہت مشکل ایڈریس ہے۔“

”اچھا تم بیٹھو تسبی ساری باتیں کھڑے کھڑے کر لو گی۔“ اس نے مسکرا کر اسے بیڈ کی جانب دھکیلا۔

”اور یہ جسم کہاں چلا ہے تمہارا؟“ فارحہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی ”پریکٹس ہو؟“

”ہائیں۔“ ننہ کو دھچکا لگا تھا ”میں تمہیں پریکٹس لگ رہی ہوں؟ میں کیا اتنی موٹی ہو گئی ہوں؟ سچ بتاؤ فارحہ قسم کھاؤ۔“

”ہائے گاؤ ننہ! میں تو یہ سمجھی۔ دیکھو ناپٹ کنٹاکٹن آ یا ہے۔ تمہارا۔ کو لے پھیل رہے ہیں اور کوئی کیا سمجھے گا؟“ وہ بے تکلفی سے ہنستے ہوئے بستر پر بیٹھ رہی تھی ”لگتا ہے بالکل توجہ دینا چھوڑ رکھا ہے خود پر۔ مجھے دیکھو، پابندی سے سلنگ سینئر جاتی ہوں، میٹھا بالکل چھوڑ رکھا ہے، کھانے سے زیادہ جوسز وغیرہ پر گزارا کرتی ہوں۔ یاد ہے تمہیں، شادی سے قبل کتنی موٹی ہو گئی تھی میں؟“

”ہاں ہاں۔“ ننہ نے غیر حاضر دماغی سے سر ہلایا۔ ”کافی کنٹرول کر لیا ہے تم نے تو۔“

اصل میں اس کا دماغ فی الوقت کسی اور نچ پر کام کر رہا تھا۔ احسن گھر نہیں تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ فارحہ کی تواضع کیسے اور کس چیز سے کرے کھانے میں اس نے سبزی بنائی ہوئی تھی۔ مینے کا آخر تھا اور فریج میں گوشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

”پہلے تو یہ بتاؤ کتنی دیر کے لیے آئی ہو؟ نیچے ڈرائیور موجود ہے یا چلا گیا ہے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”میں تو دیر تک کے لیے آئی ہوں۔ ڈرائیور کو میں نے بھیج دیا ہے، رات کو ہی آئے گا۔“ وہ ٹیک لگاتے ہوئے بے پروائی سے بولی تھی۔

”نیچے گیٹ کھلا تھا؟“ ننہ کو اپنی بے خبری کا احساس ہوا۔

”ہاں..... کوئی خاتون کھڑی تھیں گیٹ پر۔ ان سے ہی پوچھ کر تو بے دھڑک چلی آئی اوپر بائی داوے ہیں کون موصوفہ؟ پورا انٹرویو لے کر

چھوڑا ہے مجھے جیسے چہرے سے میں ڈاکوؤں کی رانی معلوم ہوتی ہوں۔“

وہ ہنسی۔

”ہاں۔ کچھ ایسی ہی ہیں یہ۔“ ننہ قدر بے مددگی سے بولی۔ ”مالک مکان ہیں۔“

”خدا ریا یہ علاقہ تو بدلو ننہ۔“ فارحہ کو پھر یاد آیا تھا ”اس سے بہتر علاقے میں تو تمہارا میکہ تھا وہاں یاد آیا۔“ پھر وہ دفعتاً بولی ”اماں کا سنا

تھا میں نے۔ بھائی بتا رہا تھا۔ سچ ننہ! دو دن روتی رہی ہوں۔ بہت افسوس ہوا۔ کاش کہ میں یہاں ہوتی۔“

”بس فارحہ۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری ”اللہ میاں نے زیادہ امتحان نہیں لیا ان کا۔ تنہا عمر بسر کرنا ایک امتحان ہی تو ہے۔ پاس کوئی

چاہنے والا نہیں، صبح سے شام تک کوئی پوچھنے والا نہیں میں بھی روز کہاں جا پاتی تھی۔ گھر اگلی تھیں اماں ایک دن خاموشی سے چلی گئیں۔“

اس کی پلکوں پر پھر آنسو۔ چکنے لگے۔

”خدا تمہیں مبر عطا فرمائے۔“ فارحہ نے خلوص سے اس کا ہاتھ تھپکا۔

”اچھا تم ذرا بیٹھو۔ میں آتی ہوں۔“

وہ فارحہ سے معذرت کر کے کمرے سے نکل آئی۔

اس کو کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ شادی کے بعد اتنے عرصے میں ایسا کوئی وقت آیا ہی نہ تھا۔ اس نے بے وجہی فریج

کھول کر جھانکا خالی فریج اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ کچن میں چلی آئی۔ چنگیر میں چند روٹیاں اور پاس پڑی ہانڈی میں آلوکا سالن۔

سب ہی کچھ اس کے علم میں تھا پھر بھی وہ نہ جانے کیا دیکھتی پھر رہی تھی۔

”فارحہ! تم ذرا یہ میرا لہم دیکھو۔ میں تمہارے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرتی ہوں۔“ وہ فارحہ کو اپنی شادی کا لہم تھما کر بولی تھی۔
 ”ہاں، کھانا تو میں ضرور کھاؤں گی۔ صبح کا ناشتہ چھوڑا ہوا ہے ناں۔ اس وقت بڑی بھوک لگتی ہے۔ لیکن دیکھو، زیادہ تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بھی پکا ہے لے آؤ، ہائے! زینب کتنی پیاری لگ رہی ہو۔“
 گفتگو کے دوران ہی اس نے لہم کھول کر چیخ ماری تھی پھر وہ تصویروں میں محو ہو گئی۔

زینب چپ چاپ کمرے سے نکل آئی۔ اس نے نیچے کارخ کیا تھا۔ یہ وقت فرخندہ آپا سے مدد طلب کرنے کا تھا۔
 فرخندہ آپا آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ باہر کا گیٹ بند کر کے انہوں نے تالا ڈال دیا تھا۔ کتنی ہی بار وہ زینب کو گیٹ بند رکھنے کی تاکید کر چکی تھیں۔ آفس جاتے ہوئے احسن بھی تاکید کرنا نہ بھولتا تھا۔ لیکن وہ اپنی بے پرواہ اور بے نیاز طبیعت سے مجبور تھی۔ ہر مرتبہ آپا اور احسن کو گیٹ کھلائی ملتا تھا۔

دو دیدہ نظروں سے ماحول کا جائزہ لیتی وہ فرخندہ آپا کے کمرے میں چلی آئی۔ ہلکا سا پتکھا چلائے، مونا کھیس اوڑھے وہ بے خبر سو رہی تھی۔
 ”آپا!..... آپا!“ زینب نے انہیں ہولے سے پکارا۔
 چند لمحوں میں انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ماتھے پر رکھا بازو ہٹا کر انہوں نے زینب کو دیکھا پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
 ”کیا بات ہے زینب خیر تو ہے؟“ انہوں نے قدرے تشویش سے پوچھا تھا۔
 ”جی ہاں۔ سب خیر ہے۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی ”وہ آپا میری دوست آئی ہے لاہور سے۔“

”ہاں۔ جانتی ہوں۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”ابھی مجھ سے ہی تمہارا پوچھ کر گئی ہے اور پر۔ بیٹا! تم احسن کے جانے کے بعد دروازے وغیرہ بند کیوں نہیں رکھتیں۔ خدانے کرے کوئی رات تو ہو لیکن احتیاط اچھی چیز ہے۔ مجھ بوزھی جان کو تو کوئی مار کر پھینک بھی جائے تو کچھ نہیں۔ تمہارے لیے ہی ڈرتی ہوں۔ جوان جہاں لڑکی بذات خود ایک بڑا خزانہ ہے۔ اپنی حفاظت آپ کرنا سیکھو پگی۔“

”جی، جی۔“ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔
 وقت پہلے ہی تنگ تھا۔ آپا تقریر کرنے بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی وقت بے وقت کی ناصحانہ گفتگو سے وہ بے حد خائف رہا کرتی تھی۔ اسی لیے کم آتی جاتی تھی۔

”آپا! کیا پکایا ہے آپ نے؟“ اتھار آپس میں مسلتے ہوئے وہ عجلت میں بولی تھی ”میں نے تو صرف آلو کا سالن بنا رکھا ہے۔ گوشت وغیرہ بھی نہیں ہے اور فارحہ دوپہر کا کھانا ہمیں کھائے گی شادی کے بعد پہلی مرتبہ ملے ہیں ہم دونوں مجھے تو سخت شرم محسوس ہو رہی ہے۔ اس کی تواضع کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ فریج بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔“
 فرخندہ آپا دھیرے سے ہنس دیں۔

”اچھا چلو اگر مندمت ہو، ہو ہی جائے گا، کچھ نہ کچھ۔“ وہ بستر سے اترتے ہوئے بولیں ”فریزر میں دو تین طرح کے کباب بنا کر رکھتی ہوں میں ایسے ہی کسی آڑے وقت کے لیے دودھ بچتا ہے تو کوئی میٹھا بنا لیتی ہوں۔ احسن تو جب آتا ہے کھیر کی فرمائش کرتا ہے۔ چلو، وہی دیتی ہوں تمہیں۔“

وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی ان کے پیچھے ہوئی۔
 آپا نے ڈیپ فریزر سے چپلی کباب، شامی کباب اور کسبزیوں کے کباب نکال کر پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر اس کے حوالے کیے۔
 ”دوپہر کو قہر کر لے گا سالن بنایا ہے وہ بھی لے جاؤ۔“ وہ کچن کی جانب برہیں ”میں شام کو کچھ اور بنا لوں گی۔ فریج سے کھیر کا ڈونگا نکال لو..... پیسی کی لیٹر بوتل پڑی ہے، وہ بھی لے جاؤ۔“

”شکریہ آپا..... بہت بہت شکریہ۔“ وہ تہہ دل سے ان کی مشکور ہوئی تھی۔

”بہر مندی اسی میں ہے کہ آڑے وقت کے لیے کچھ نہ کچھ بنا کر رکھ دیا جائے۔ اسی کو سلیقہ کہتے ہیں میں تو سارا دن تقریباً فارغ ہی ہوتی ہوں۔ یہی چھوٹے چھوٹے کام کرتے دن نکال لیتی ہوں۔ خدا کا شکر ہے مجھے کبھی کسی مہمان کی بے وقت آمد پر اس طرح سے پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔“

وہ اسے جتانے کے موڑ میں تھیں۔ نہ نوب چپ چاپ بڑے اٹھائے نکلتی چلی گئی۔ فی الوقت ان کا احسان ماننے میں ہی بھلائی تھی۔

”میرے اور آپ کے شوہر کی تنخواہ میں بہت فرق ہے آپا“ میڑھیاں عبور کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

”سلیقہ مندی دکھانے اور جتانے کے لیے بھی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ طرح طرح کے کباب اور پیٹھے ہواؤں سے تو بننے نہیں ہیں۔ پیسہ چاہیے ہوتا ہے فریزر بھر کر رکھنے کے لیے۔“

حقیقت تو یہ تھی کہ انہوں نے مدد کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا جی بھی دل بھر کر جلایا تھا۔

کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ فارحہ اب تک الم دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے جانے اور آنے سے قطعاً بے خبر رہی تھی۔

کھانا نکالنے کا کام بے حد آسان رہا تھا۔ اسے محض کباب تلنے پڑے تھے۔ روٹیاں اس نے پہلے ہی بنائی ہوئی تھیں۔ اس نے کھانا فارحہ کے آگے چنا تو چند لمحوں کے لیے وہ حیران رہ گئی۔

”یہ اتنی چیزیں؟ تمہیں پتا تھا مجھے آج آتا ہے؟“

”دل کو دل کی خبر ہوتی ہے چندا۔“ وہ مسکرا دی۔ ”ویسے یہ سب کچھ فریز تھا۔ نکال کر تس لیا ہے اور بس۔“

”واؤ! اتنی سلیقہ مند ہو گئی ہو تم؟“ فارحہ نے کباب توڑ کر چکھا ”ہوں، مزیدار، ذائقہ بھی آگیا ہے۔ ہاتھ میں یاد ہے نہ نوب! شادی سے پہلے تم چائے تک کتنی بری بناتی تھیں۔“

نوب کلکلا کر نرس دی۔

”یاد ہے۔“

”ویسے متوسط طبقے میں شادی کا یہ فائدہ ہے۔ لڑکی سر سے پاؤں تک ایک ایک انچ سلیقہ بانو ہو جاتی ہے۔ مجھے دیکھو، جو کچھ آتا تھا وہ بھی بھول گئی ہوں۔ اب تو کبھی فیصل کسی چیز کی فرمائش کر دیں تو کچن تک جاتے ڈر لگتا ہے۔ خدا جانے کیا بنا کر رکھ دوں۔“ چپکے سے خانساں کو ہی کہہ آتی ہوں نام اپنا ہو جاتا ہے۔“ وہ کلکلا کر نرس دی۔

نوب کو عجیب سی سبکی کا احساس ہوا۔ نجانے فارحہ انجانے میں، اپنی رو میں بہتے ہوئے اس طرح کی گفتگو کر رہی تھی یا اسے بھی فرخندہ آ یا طرح باتوں ہی باتوں میں ”مطلب کی بات“ جتانے کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش بیٹھی رہ گئی۔

”تم کھانا کھا چکی ہو؟“ فارحہ کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

”اُس..... نہیں تو۔“ وہ چونک اٹھی۔

”پھر کھاؤ تا میں اکیلے اکیلے صاف کر رہی تھی۔“

”انتازمیدار بنا ہوا ہے سب کچھ..... میری ڈانٹنگ کا ستیا ناس ہو کر رہ گیا۔ ورنہ عام طور پر میں یوں ہاتھ روکے بغیر نہیں کھاتی۔ شامی کباب تو غضب کے ہیں۔“ اس نے ہنسا رہا ”اور یہ کرلیہ! مزہ آگیا۔“ مجھے بھی ترکیب بتاؤ تا نوب! میں بھی تو کچھ امپریس کروں فیصل کو۔ احسن بھائی تو والا و شیدا ہو چکے ہوں تمہارے۔ کہتے ہیں مرد کے دل کہاوتیں گھڑنے میں کچھ زیادہ ہوشیار نہیں ہو گئے ہیں؟ دل پہلے آتا ہے یا معدہ؟

ہیں خبر بھی کیا ہے۔ سائنس وغیرہ تو کبھی پڑھی نہیں جو چاہے بے وقوف بنا ڈالے۔“ وہ پھر ہنسی تھی۔

نہیں اس کا بغور جائزہ لینے پر مجبور ہوئی تھی۔ زرد رنگ کا دیدہ زیب لباس زیب تن کیے وہ حقیقتاً بے حد کھری کھری اور شگفتہ دکھائی دے رہی تھی۔ بے پروائی کا رنگ پہلے بھی اس کی شخصیت کا خاصا تھا مگر اب تو یہ رنگ آس پاس کی ہر شے سے زیادہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت پر اعتماد، بے خوف اور متاثر کن شخصیت نظر آ رہی تھی۔ یہ وہی فارحہ تھی جسے نہب کی ہمراہی میں کوئی توجہ سے نہ دیکھتا تھا۔ نہب ہر جگہ اس پر چھا جاتی تھی۔ آج اسی فارحہ کے مقابل بیٹھے ہوئے وہ خود کو کتر محسوس کرنے لگی۔ اسے اپنی شخصیت مجروح اور دبلی ہوئی لگ رہی تھی۔

”پیارے انسان کو کس قدر جلد بدل دیتا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں فارحہ کی متاثر کن شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے سوچا۔

”اوہ..... سو سوری نہب۔“ فارحہ اسے بے حد خاموش محسوس کر کے بولی تھی۔ ”بولتی تو میں پہلے بھی بہت زیادہ تھی، اب تو میرے بریک، بالکل ہی فیل ہو گئے ہیں۔ بولنا شروع کرتی ہوں تو بس بولتی ہی چلی جاتی ہوں فیصل کہتے ہیں، فارحہ! چند دنوں میں بھول جاؤں گا کہ بات کیسے کرتے ہیں منہ سے آواز کیسے نکلتی ہے، میں محض منہ کھول پاتا ہوں اور تم کوئی اور بات شروع کر دیتی ہو۔“

وہ ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔ نہب بھی تقلید میں پیچکی پیچکی ہنس کر رہ گئی۔ ان دونوں کی شادی ساتھ ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن خوشی اور تفاخر کا جو بھرپور احساس فارحہ کے ہر ہر انداز سے جھلک رہا تھا وہ نہب کے انداز میں مفقود تھا۔

پھر جتنی دیر وہ بیٹھی رہی مسلسل وہی بولتی رہی۔ نہب خاموش بیٹھی اس کے لفظ لفظ پر غور کرتی رہی تھی۔

”دیکھو نہب۔“ رات جب اس کا ذرا نیورا اسے لینے آ پہنچا تب وہ جاتے جاتے بطور خاص بولی تھی۔

”کچھ اپنے اوپر دھیان دو۔ یا! احسن کا خزانہ خدا نے چھپر پھاڑ کر دیا پھر بھی اسے سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں۔ پائی پائی کا دھیان رکھتے ہیں ورنہ بہت جلد انسان کو گم ہو جاتا ہے اور علم بھی نہیں ہو پاتا تھوڑی ڈائیٹ کا خیال رکھو اور جو سوز وغیرہ ضرور لو۔ تمہاری رنگت بھی کچھ مدھم لگ رہی ہے اور ہاں پلیز! گھر بدل لو کرائے پر ہی رہنا ہے تو انسان ذرا ڈھنگ کی جگہ کا انتخاب کر لے۔“

نہب اسے چھوڑنے نیچے تنک گئی تھی۔ واپسی پر بیڑھیاں عبور کرتے ہوئے اس کے قدم بھاری ہو رہے تھے۔



چند دن طبیعت بہت مضحل رہی تھی۔ دماغ میں رہ رہ کر فارحہ کی باتیں گونجنی تھیں۔ شادی کے بعد سے اس کی طبیعت میں جس فخر و غرور کا اضافہ ہوا تھا وہ اب دن بدن کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس دن احسن اسے ضد کر کے اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا تھا۔ چند دن سے نمودار ہونے والے چڑے پن کو اس نے اماں کی یاد تصور کر لیا تھا اور ہر ممکن طریقے سے اس کی دل جوئی میں لگا ہوا تھا۔

واپسی قدرے تاخیر سے ہوئی تھی۔ دونوں اپنی دھن میں باتیں کرتے جا رہے تھے جب بانک کی شرابی کی طرح سے لہرانے لگی۔ احسن نے بڑی مہارت سے بانک کو کنٹرول کیا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ نہب اتر کر پوچھنے لگی۔

”ناز پنچر ہو گیا ہے۔“ وہ بغور سرک کا جائزہ لے رہا تھا ”کسی مچلے نے اسپید بریکر کے قریب کلیں بکھیری ہوئی ہیں۔“

”اب کیا کریں؟“ وہ پریشان ہوئی۔

”کرنا کیا ہے جانم! واک کیجئے۔“ وہ خوشدلی سے بولا ”میں کوئی پچاس گز کے فاصلے پر گھر ہے۔ دو گلیوں کا راستہ ہے۔“

”میری تو میل بھی اتنی اونچی ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی ”چلا جائے گا؟“

”کوشش کرو۔ اب تمہاری ہیل پمپن کر اپنے جوتے تو تمہیں دینے سے رہا۔“ وہ ہنسا۔ ”مجھے بھی تو دیکھنی ہے یہ گاڑی۔“

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”ویسے فار کبہ رہی تھی، میں سوٹی ہو گئی ہوں..... واک تو روز کرنی چاہیے۔“ وہ آہستہ آہستہ بولنے لگی۔

”کیا واقعی سوٹی ہو گئی ہوں احسن؟“

”ہائے۔“ اس نے مصنوعی آہ بھری تھی ”جس اندھے کی آنکھوں پر محبت کی عینک لگی ہو، اس سے ایسے سوال نہیں کرنے چاہئیں زینب خاتون! تمہیں دیکھتا ہوں تو بس تم ہی تم نظر آتی ہو..... تمہارا طول و عرض نظر نہیں آتا۔“

”ہونہ..... یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ بری طرح سے چڑ گئی ”بلکہ سب سے زیادہ تو آپ کو احساس ہونا چاہیے اس بات کا کہ بقول آپ کے سب سے زیادہ غور سے آپ مجھے دیکھتے ہیں۔“

”کبھی تم نے محبت کی ہوئی بلکہ میری طرح طوفان میل جیسا برق رفتار عشق کیا ہوتا تو تمہیں میرا نقطہ نظر صحیح طور پر سمجھ میں آتا۔“

”بس رہنے دیں۔“ وہ برا مان گئی ”آپ اپنی الوقت مذاق کے موڈ میں ہیں۔“

”تمہاری جان کی قسم زینو۔“ وہ دھمکے ہوئے لگا ”مجھے صرف تمہاری ذات کا احساس رہتا ہے۔ میرا عشق افلاطونی حدود کو چھونے لگا ہے۔“

”ہاں..... گھر تک پہنچنے پہنچنے افلاطون کو بھی بھول جائیں گے اور اسطوبھی۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔ پھر کچھ فاصلہ دونوں نے بنا بات کیے طے کیا تھا۔ احسن دھیرے دھیرے کچھ مگلتا لے لگا تھا۔ زینب کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ وہ بڑے دھیان سے گلیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ یوں گردو پیش میں منہمک ہو جیسے کوئی بلد یا تی رپورٹ مرتب کرنی چاہتے ہیں۔“ احسن نے اسے چھیڑا۔ زینب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی ہر ہر ادا کا دھیان رکھتا تھا۔

”میں سوچ رہی تھی احسن! یہ علائقہ کتنا پسماندہ نظر آتا ہے۔“ اس نے اچانک ہی محسوس کیا تھا کہ دل کی بات کہہ دینے کا یہ بہترین موقع تھا۔ احسن کا موڈ بھی بہت اچھا تھا اور ماحول اپنی تمام تر خامیوں کے ساتھ بہت واضح ہو رہا تھا۔

”ہاں..... غریب لوگ بستے ہیں یہاں، بے چارے سے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے شامت کے ماروں کا۔“

”میرا دل چاہتا ہے احسن۔ ہم کسی صاف سے علاقے میں گھر لے لیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“ وہ فوراً ہی بولا ”دعا کرو خدا سے جب بھی اپنا گھر لیا، کسی اچھے سے، صاف ستھرے علاقے میں ہی لیں گے۔ کرائے کے گھروں کا کیا ہے۔ ایک شے جب اپنی ہی نہیں ہے تو پھر کہیں بھی رہو کیا فرق پڑتا ہے۔“

زینب خاموش ہو گئی۔ احسن کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ پھر کچھ کہنے کہ ہمت نہ کر سکی تھی۔ گھر پہنچنے تک پھر اس نے احسن سے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ بھی کسی نغمے کی دھن مگلتا ہوتے رستہ طے کرتا رہا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر کولڈ کریم چہرے پر لٹے لگی۔ احسن اگلے روز کا لباس منتخب کر رہا تھا۔

”یار..... یہ میرا ایک مٹن تو ناک دو۔“ اس نے شرٹ اسے دکھائی۔

”اچھا..... رکھ دیں۔ ذرا سا مساج کر لوں۔“

”افوہ۔“ وہ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ ”کسی تیاریاں ہیں عالی جناب؟ کیا ارادے ہیں؟ تیرا خنجر چکائے جا رہے ہیں۔ تیغ کو آب دی جا رہی ہے ہوں؟“

”پیچھے ہٹیں ناں پلیز۔“ وہ منمنائی۔

”لاؤ میں کر دوں مساج..... بہت بہترین مساج کرنا آتا ہے مجھے۔ چہرہ چاند کی طرح چمک اٹھے گا۔“ اس نے فراغ دلانہ پیش کش کی

تھی۔

”بہت شکریہ۔ اپنے منہ کو چکالیں تھوڑا۔“ وہ ہنسنے لگی تھی۔

”ارے اس منہ کو تو ایسے ہی شرف قبولیت بخش دیا گیا ہے اسے کیا چکانا۔ اسے تو ایسا ہی رکھنا ہے ریکارڈ کے طور پر۔“

نہناب آئینے سے قریب ہو کر بغور اپنا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ ایک ایک نقش کا بغور جائزہ لے کر اس نے آئینے میں نظر آتے احسن کے عکس کو دیکھا۔

وہ نگاہوں میں شرارت بھرے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”احسن“ وہ قدرے جھینپ گئی ”ایک بات تو بتائیں۔ میری رنگت کلامی ہے، میرا رنگ پیکا پڑ گیا ہے؟“

”کہنے والی کی ایسی کی تھی۔“ وہ اسے چکارنے کے سے انداز میں بولا، ”چاند سورج شرما جائیں جو میری نہناب کا یہ پیکا چہرہ دیکھیں تو۔“

بائی داوے، یہ ارشاد بھی محترمہ فارحہ فیصل کا ہے؟“

”ہاں..... وہی کہہ رہی تھی۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”اچھا۔“ وہ پلنگ پر بیٹھنے ہوئے بولا ”اور کیا کیا ارشادات ہوئے۔ تفصیل سے بتاؤ مجھے۔“ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”احسن! ہم یہ گھر تبدیل نہیں کر سکتے؟ سچ! مجھے کتنی شرم محسوس ہوئی جب فارحہ نے ایسے کہا کہ اس کا ڈرائیور پوچھ رہا تھا، اتنے گندے علاقے میں کون رہتا ہے۔“

چند لمحوں کے لیے وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ نہناب بھی نگاہوں میں اس بھر کر اسے دیکھنے لگی کہ شاید وہ کہہ ہی دے کہ ہم اگلے ماہ ہی گھر تبدیل کر لیں گے۔

”اور بالفرض وہ نیا علاقہ بھی تمہاری دوست کے معیار پر پورا نہ اترتا تو؟“ وہ بخجندی سے پوچھنے لگا ”پھر ہم کہاں جائیں گے؟“

”کیوں نہیں ہم سوچ کچھ کر انتخاب کریں گے علاقے کا صاف ستھرا، خوب صورت ایریا ہو۔ ترتیب سے بنگلو بنے ہوئے ہوں، چوڑی کشادہ سڑکیں ہوں جینے کا لطف آجائے۔ میں تو روز واک کے لیے نکلا کروں گی شام میں۔ سچ احسن! یہاں تو میٹ پر کھڑے ہوئے شرم آتی ہے، اتنا گندا علاقہ، ایسے گندے سندے لوگ۔“

اس نے برا سامنہ بنایا تھا۔

وہ اس طرح مسکرا دیا جیسے کسی بچے کی بات پر مسکراتے ہیں۔

”زینو۔“ پھر وہ بولا ”ہماری شادی کو کتنے مہینے گزر گئے ہیں۔ تمہیں آج تک یہ علاقہ اور اس کے لوگ گندے نہیں لگے۔ آج تمہیں اچانک ہی یہ سب کچھ گندا لگنے لگا کہ تمہاری دوست کے ڈرائیور کو یہ علاقہ پسند نہیں آیا۔ تمہاری یہ پیچھا نہ سوچ کب بدلے گی یا؟ کب بڑی ہوگی؟ پختہ سوچ کی مالک بنو انسان کو اتنی نازک ذہنیت کا مالک نہیں ہونا چاہیے کہ ہر دوسرے شخص کی سوچ اس پر غالب آجائے اسے شکست دے ڈالے مضبوط ذہن، مضبوط سوچ کی مالک بنو۔“

نہناب منہ بنائے اس کی بات سنتی رہی۔

”مجھے اس علاقے میں رہتے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے ہیں میں یہاں کے ہر فرد کو جانتا ہوں، یہاں کے سب لوگ مجھے جانتے ہیں، میری عزت کرتے ہیں میرا میرے گھر کا خیال رکھتے ہیں، تمہیں چھوڑ کر جاتا ہوں تو یہ فکر نہیں ستاتی کہ پیچھے سارا دن تم اکیلی رہو گی۔ اطمینان رہتا ہے۔ سبھی لوگ بہت اچھے شریف اور نیک ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں ان لوگوں میں کیا گنداپن نظر آ گیا۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا..... میرا یہ مطلب نہیں تھا احسن۔“ وہ شرمندگی سے منمنائی تھی ”میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ انسان کو ہمیشہ اچھے سے اچھے، بہتر سے بہتر کی کوشش کرتے رہنی چاہیے۔ یہاں کے لوگ اچھے ہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ باقی ہر جگہ کے لوگ خراب ہوں گے۔ نظر باز ہوں گے کیا کسی اچھے علاقے کی رہائش کی خواہش میں دل رکھنا کوئی گناہ ہے؟“

”میں نے کب کہا؟ میرے تو اپنے ذہن میں نبھانے کب سے ایک چھوٹے سے، خوب صورت سے بنگلے کا خواب روشن ہے جو ایک پیاری سی، پرسکون سی جگہ پر ہو۔ میرے ذہن میں تو اس جگہ کا اس گھر کا ایک نقش تیار ہے جو ہمارا اپنا ہوگا۔ جہاں میں اور تم رہا کریں گے تمہیں شاید یاد ہو شادی سے پہلے بھی میں نے تم سے اس کا ذکر کیا تھا کہ میں اپنا گھر بنانا چاہتا ہوں۔“

خیر۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

”جو رقم جمع شدہ تھی وہ تو شادی پر خرچ ہو گئی۔ اب پھر سے شروعات کرنی ہیں..... لیکن تھوڑا مبر سے کام لیتا پڑے گا زینو، بھٹی پر سروس نہیں جتنی میں تمہارا ہر خواب پورا کروں گا لیکن میرے قدم مست رفتار ہیں۔ تمہیں میرے ساتھ ساتھ چلنا ہے..... دوڑنے کی کوشش کر دو گی تو دونوں بھٹک جائیں گے۔“

زینب کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ اپنے خواب اسے ایک لامتناہی فاصلے پر نظر آرہے تھے۔ وہاں تک پہنچنا ناممکنات میں سے لگتا تھا۔

اپنا گھر بنانا کس قدر مشکل کام ہے۔ یہ خواہش رکھنا کیسا مہنگا سودا ہے۔ اسے پوری طرح سے علم تھا۔ انسان کی پوری عمر اس ایک کام کے لیے کافی ہے۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ احسن نے موڈ تبدیل کر کے شرارت سے اس کا سر ہلایا ”کہیں اپنے نئے گھر کی سیٹنگ کے بارے میں تو نہیں سوچ رہیں؟“

”انسان کے ہاتھ خالی ہوں اور دل میں اپنے ایک اچھے سے گھر کا ارمان بھی ہو تو پھر وہ گھر بن جانے کے بعد اس گھر کی سیٹنگ آدمی خود نہیں سوچتا اس کے بچے سوچتے ہیں۔“

وہ قدرے سنجیدگی سے بولی تھی۔

”بچے؟“ وہ خوشی سے بولا ”ہاں اس پہلو پر بھی تو غور کرنا ہے۔ چلو، گھر سے پہلے بچوں کے متعلق سوچتے ہیں..... ویسے یہ کام نہ بتا آسان بھی ہے۔ ہوں؟“

زینب بری طرح سے جھینپ گئی۔



آمنہ آئی تھی۔ کتنے دن بعد وہ آمنہ سے ملتی تھی۔ زینب کو بے انتہا خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی بہت اپنے، بہت عزیز سے ملتی تھی۔

”میں بہت دیر کے لیے نہیں آئی ہوں۔“ آمنہ نے اسے کچن کا رخ کرتے دیکھ کر کہا ”بس چائے پلا دو اچھی سی۔ بھائی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔“

زینب نے اسے بری طرح سے گھورا۔

”زیادہ مہمان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھائی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔“ اس نے آمنہ کی نقل اتاری۔ ”جب خبر تھی کہ میرے پاس آ رہی ہو تو اتنی جلدی بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ کتنی ڈھیر دلوں ڈھیر باتیں ہیں تم سے کرنے والی..... اماں کیا گئیں، ہمارا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔“ وہ داد اس ہو گئی۔

”پھر آؤں گی کسی روز آرام سے۔“ آمنہ نے معذرت کی تھی ”نی الوقت تو ایک کام سے آئی ہوں۔“

”کام؟“ زینب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ہاں..... وہ کارڈ دینا تھا تمہیں..... دو تین جگہوں پر اور بھی دینا ہے..... امی کا تو تمہیں پتہ ہے نا، طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ان کی، سوانہ شادی کے کارڈ بانٹنے کا کام مجھے ہی سہا انجام دینا پڑ رہا ہے۔“ اس نے گفتگو کے دوران بیگ میں سے کارڈ نکال کر اس کی سمت بڑھایا تھا۔

زینب چند لمحوں کے لیے تعجب نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ آمنہ کے رویے میں کوئی غیر معمولی پن نہ تھا حد درجہ سنجیدگی اور متانت چہرے پر سجائے وہ اس کے کارڈ دھانسنے کی منتظر تھی۔

”تمہاری شادی کا کارڈ؟ تمہاری شادی ہو رہی ہے؟“ زینب کو اپنی حیرت کو ٹھکانے لگانے کے لیے خود استفسار کرنا پڑا تھا۔

”ہاں..... تو اور کیا۔“ دھیسے سے مسکرا دی ”کیا میری شادی نہیں ہو سکتی؟“

”تو تم اتنے اطمینان اور آرام سے اور دھیسے پن سے بتا رہی ہو جیسے یہ روزمرہ کا کوئی عام سا واقعہ ہو جیسے اتوار کے روز کسی جگہ سستا بازار لگ رہا ہو۔“

آمنہ کو ہنسی آگئی۔

”پھر اور کیسے بتاؤں؟ مجھے تو شاید کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں آتا۔ بس نارٹی لیتی ہوں ہر بات تم ہی بتاؤ کیا طریقہ ہے یہ بات بتانے

کا؟“

زینب کو اس کی سادگی پر پیارا گیا۔ وہ واقعی بہت سادہ طبیعت اور صابر و شاکر رہنے والی لڑکی تھی۔

”اچھا بابا رہنے دو مبارک باد قبول کرو اور یہ بتاؤ کہ موصوف کون ہیں، کیا نام ہے، کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں..... بس چپ چاپ

کارڈ دے رہی ہو جیسے اس پر سارے کوائف درج ہوں گے۔“

”انوار نام ہے، پوسٹ آفس میں ہیڈ کلرک ہیں..... رہتے کہاں ہیں، مجھے بھی علم نہیں۔ امی کو خبر ہوگی یا بھائی کو۔“

زینب کو یہ سب کچھ جان کر کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس نے اپنے تاثرات سے اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا ہاتھ تمام کر

مسکرا دی۔

”چلو جو نام ہو، جیسا کام ہو..... خدا تمہارے حق میں بہتر کرے۔ ویسے ہیں کیسے؟ دیکھا ہے؟“ اس نے قدرے شرارت سے پوچھا تھا۔

”ہوں..... ایک مرتبہ آئے تھے ہمارے گھر کو بونٹی سرسری سادہ دیکھا ہے پہلی بیوی مر چکی ہے، اس سے ایک چھوٹی سی بیٹی بھی ہے..... خیر تم

شادی پر ضرور آنا۔ خود کچھ لیتا۔“

زینب چند لمحوں کے لیے سن ہو کر رہ گئی تھی۔

اس سے کچھ بھی کہنا نہ جا سکا بس وہ بے معنی نگاہوں سے آمنہ کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اچھا زینب! میں چلوں۔“ آمنہ کھڑی ہو گئی ”بھائی نیچے کھڑا ہوگا۔ اسے بس ذرا آگے اپنے دوست کو کارڈ دے کر آنا تھا۔“

”آمنہ! چائے تو پی لو میں بتاتی ہوں۔“ وہ بڑا کرکھڑی ہوئی تھی۔

”میں لگاؤں گی چکر چند روز میں پھر چائے ہی نہیں کھانا بھی کھاؤں گی آج اجازت دو۔“ وہ اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر ہلکل گئی۔

زینب کسی سوچ میں گم کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ آمنہ کو رخصت کرنے کے لیے سیزھیوں تک بھی نہ جا سکی تھی۔ اسے حقیقتاً افسوس ہوا تھا۔ سانولی

سلونی پر کشش ہی آمنہ یقیناً اس سلوک کی مستحق تھی جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یہ آمنہ کی والدہ کی جلد بازی کا کمال تھا۔

”یہ بائیں بھی کبھی کبھار کتنا ظلم کر جاتی ہیں اپنی اولاد کے ساتھ۔“

شام کو احسن آیا تو وہ بھری بیٹھی تھی۔

”کیا انہیں احساس نہیں ہوتا کہ یہ اپنے ظالم فیصلوں کے بھاری قدموں تلے اپنی معصوم بیٹیوں کے نرم و نازک خواب، خوب صورت احساسات چکنا چور کر رہی ہیں۔“

”مائیں کبھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہ سکتیں مجھے اتنی خبر ہے۔“ وہ اطمینان سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ ”ان کی دور رس نگاہ جو دیکھتی ہیں، وہ نا تجربہ کار اولاد نہیں دیکھ سکتی۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔“

”ہاں درست فرمایا۔“ وہ جل ہی تو گئی ”ایک پختہ عمر مندوے ایک معمولی ملازم، ایک بیٹی کے باپ سے انہوں نے اپنی نازک، کوئل سی لڑکی کا رشتہ طے کیا ہے..... تو بہت دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے اچھا رشتہ تو پھر آمنہ کوئل ہی نہیں سلکتا تھا..... ہے نا؟“

”دیکھو یار۔“ اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا ”تم کم از کم یہ دعویٰ نہیں کر سکتیں کہ تمہارے دل میں اس کی ماں سے زیادہ درد ہے آمنہ کا۔ وہ اس کی ماں ہے ماں، آمنہ کو اگر پھانس بھی چبھے گی نا تو اس کی ماں کو زیادہ تکلیف ہوگی۔ وہ اگر چاہے بھی تو بیٹی کا برا نہیں چاہ سکتی۔ اس نے کچھ سوچ کر ہی اتنا برا فیصلہ کیا ہوگا۔ یا پھر وہ بے حد مجبور ہوگی۔“

”ایسا بھی کیا حالات کے آگے جھکنا۔ اس سے تو بہتر تھا، آمنہ ساری عمر کنواری رہ لیتی۔“ وہ شدید تاسف سے سر ہلا کر کہہ رہی تھی۔

”ایک حقیقت اور بھی ہوتی ہے محترمہ تقدیر کہتے ہیں جسے“ وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا ”یہ فیصلہ آمنہ کی ماں کا نہیں، آمنہ کے خدا کا ہے، زندگی، موت، شادی، اولاد، سب چیزیں انسان اپنی پیشانی پر لکھوا کر لایا ہوتا ہے۔ اس تحریر سے فرار ممکن نہیں۔ خدا کی رضا جان کر صبر شکر سے کام لیتا ہی عقل مند ہی ہے۔ خدا بھی خوش ہوتا ہے اور قلب بھی مطمئن رہتا ہے اور پھر تم خواہ نخواستہ نگر میں دہلی ہو رہی ہو آمنہ کی ماں راضی، وہ کیا نام بتایا انوار راضی پھر تمہاری ناراضی کا بیج میں کیا ڈل؟ میاں بی بی راضی ہیں تم بے وجہ ناراض قاضی کا رول ادا کرنے پر تلی ہوئی ہو۔“ وہ اسے خفگی سے گھور کر رہ گئی۔

”ایک یہی خامی ہے تم میں اپنی اور میری فکر چھوڑ کر سارے جہاں کی فکریں مول لے لیتی ہو۔ چلو، یہاں آؤ۔ ذرا میرا سر دبا دو۔“ وہ شرارت سے بولا تھا۔

”مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔“ وہ بشکل مسکراہٹ چھپا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔



آمنہ کہہ کر تو گئی تھی مگر پھر زینب انتظار کرتی ہی رہ گئی اور اس کی شادی کا دن آن پہنچا۔

تیار ہوتے وقت زینب کے دل میں خوشی کا کوئی خاص جذبہ نہ تھا۔ وہ بس رسم دنیا بھانے کی خاطر جاری تھی۔ ورنہ اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا ایسی شادی میں شریک ہونے کو۔

آمنہ نے اس سے کچھ بھی نہ کہا تھا لیکن مجبوری کی داستان اس کے چہرے پر قلم تھی۔ زینب جانتی تھی کہ صابر و شاکر آمنہ کو کبھی بھی اور کسی سے بھی شکوؤں شکایتوں کی عادت نہ رہی تھی۔ وہ ہر حال، ہر موسم میں قانع رہنے والے لوگوں میں سے تھی اور آج بھی اس نے بنا اپنی اداسیوں کا اظہار کئے، چپ چاپ سر جھکائے رخصت ہو جانا تھا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ اس کے دل میں کون سے جذبے ماتم کر رہے ہیں..... کبھی کسی خوش آمد سوجھیں سوگ منا رہی ہیں۔ آمنہ آج ساٹ چہرے اور خشک آنکھوں کے ساتھ اس شخص کے ساتھ ساتھ چل پڑتی جو اس کی تنہاؤں کا حل ہرگز نہ تھا۔

آنکھوں میں کا جل لگاتے لگاتے زینب کی آنکھیں بھر آئیں۔ آمنہ اسے عزیز تھی۔ اس کا دل اس کے دکھ پر پانی ہو رہا تھا۔ اسے یکدم

احساس ہوا کہ وہ کتنی اچھی قسمت لکھوا کر لائی تھی۔ خدا نے اسے ہر شے سے نوازا تھا۔ حسن، چاہت، محنت، اچھا پسندیدہ ساتھی زندگی میں کسی کی کمی نہ تھی۔ خود اس کی اپنی بنائی ہوئی جھوٹی محرمیاں تھیں۔

وہ ایک گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔ احسن نے اندر جھانکا تھا۔ ”رخصتی کے بعد اطمینان سے چلنے کا ارادہ ہے کیا؟“
 ”جیہے۔“ وہ گہرا سانس بھر کر باہر نکل آئی تھی۔

آمنہ لہن بن کر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا لباس بہت قیمتی نہ تھا اور میک اپ بھی برائے نام ہی تھا پھر بھی اس پر روپ بہت آیا تھا۔ اس کے تمام نرم و نازک تصورات اور خوب صورت خیالات آج اس کے چہرے سے جھلکنے لگے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی، پیاری سی مسکراہٹ سجائے وہ کسی گڑیا کی طرح سادگی سے بیٹھی تھی۔

زینب کو اس سے مل کر قدرے اطمینان ہوا۔ وہ آمنہ کے جس سپاٹ اور تاثر سے عاری چہرے کا تصور لے کر گئی تھی وہ آمنہ کو دیکھ کر باطل ثابت ہو گیا تھا۔

آمنہ مطمئن بھی نظر آئی تھی اور خوش بھی تھی۔ زینب کو دیکھ کر وہ بڑی خوش گواریت سے مسکرائی تھی۔
 زینب مطمئن ہو گئی تھی اور پھر آمنہ کے شوہر کو دیکھ کر اس کا اطمینان گہرا اور مستحکم ہو گیا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک باوقار مرد تھا۔ بہت اچھا نہ تھا۔ لیکن آمنہ کے ساتھ بیٹھا بہت مختلف بھی نہ لگتا تھا۔ اس کی بیٹی بہت ہی چھوٹی اور پیاری تھی اور آمنہ سے جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ دو تین مرتبہ اس نے آمنہ کو امی کہہ کر پکارا تھا۔ اور آمنہ مسکرا دی تھی۔

زینب کا موڈ جاتے ہوئے جتنا خراب تھا واپسی پر احسن کے پیچھے بائیک پر سوار ہو کر رہی تھی۔
 ”جب وہ مجھے کارڈ دینے آئی تھی بے حد افسردہ معلوم ہوتی تھی..... لیکن آج خوش تھی۔ ویسے بھی وہ ہر طرح کے حالات سے سمجھوتہ کر لینے والی لڑکی ہے۔“

”لڑکیاں بے چاریاں ایسی ہی ہوتی ہیں..... سیدھی سادی اور معصوم۔“ احسن نے اسے چھیڑا۔ ”بہت جلد سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ یاد نہیں؟“
 شادی سے پہلے تمہاری اپنی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب سجے تھے..... پھر کیا ہوا؟ تم نے بھی مجھ سے سمجھوتا کر لیا۔“
 ”جی نہیں۔ میں سیدھی سادی اور معصوم ہرگز نہیں ہوں۔“ وہ دھمکانے والے انداز میں بولی۔ ”اپنے تمام خواب ادھا ردیے ہیں..... لوٹنا ناہوں گے سو دے۔“

”اوہو..... ہو۔“ وہ ٹکرمند ہوا۔

پھر دونوں ہی ہنس دیے۔ گھر کے سامنے زینب اتری تو دیکھا، صوفیہ اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر چھایا حزن و ملال کا تاثر زینب نے اتنے فاصلے سے بھی واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ سکون و اطمینان اور فخر و غرور کی ایک لہری اس کے وجود کے اندر ابھری۔
 صوفیہ نے جس شخص کی خاطر جوگ لیا ہے، افسردہ اور اس کھڑی ہے، وہ بھرپور مجبوتوں سے لبریز شخص اس کے ہمراہ تھا۔ عمر بھر کے لئے اس کا اپنا تھا۔ اس کے تمام جذبے زینب کے لئے تھے۔ فخر سے گردن تانے کھٹ کھٹ کرتی وہ میڑھیاں چڑھ گئی۔



اس روز چھٹی تھی۔ وہ دونوں ہی قدرے تاخیر سے سو کر اٹھے تھے۔ اٹھے اٹھے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتی وہ کچن کا رخ کر رہی تھی۔ جب برآمدے کا دروازہ ہجا۔ یہ یقیناً فرخندہ آ پائیں۔ زینب کو قدرے کوفت ہوئی۔

گھر بکھرا ہوا ہوتا تو فرخندہ آ پا کا چھاپا اسے بے حد ناگوار گزرتا تھا۔ وہ کچھ نہ کہتی تھیں۔ لیکن ہر ہر شے کا جائزہ لیتی ان کی نگاہیں بہت کچھ

کہہ جاتی تھیں۔ کئی مرتبہ تو نہ نینب نے انہیں چیزوں پر انگلی پھیر کر مٹی کی موجودگی یا غیر موجودگی کا احساس کرتے بھی دیکھا تھا۔ نجانے وہ یہاں ایک تفتیشی افسر کی مانند کیوں آتی تھیں۔ ان کے دل میں نہ نینب کے لئے کون سا جذبہ تھا۔ یہ اس کا گھر تھا، وہ یہاں جس طرح چاہے رہتی۔ انہیں ہر شے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا حق کس نے دیا تھا؟ دستک دوبارہ ہوئی تو بادل خواستہ بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم آپا۔“

”علیکم السلام..... ابھی سو کر اٹھی ہو؟“ ان کے لیے میں حیرت اور نگاہ سامنے لگی گھڑی پر تھی۔

”جی۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شرمندہ ہوئی۔ ”چھٹی کا دن ہے نا..... احسن تو ابھی بھی سو رہے ہیں۔“

”ہاں چھٹی کا دن تو ہوتا ہی مردوں کے لئے ہے، سارا ہفتہ ڈیوٹی پر بھی تو وہی جاتے ہیں عورتوں کے تو وہی روز کے دھندے چھٹی والے دن بھی ہوتے ہیں..... خیر بتانے آئی تھی، تمہاری دوست فارحہ کا فون آیا تھا۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دوبارہ کرے گی فون۔“

”فارحہ کا فون تھا؟“ اسے حیرت ہوئی۔

پھر اسے یاد آیا۔ فارحہ کو اس نے احسن کے آفس اور فرخندہ آپا کا نمبر دیا تھا۔

”اچھا..... چلیں میں چلتی ہوں۔“ بالوں کا جوڑا ہٹا کر، دوپٹا اوڑھ کر وہ ان کے ہمراہ نیچے چلی آئی۔

”ان کا نمبر تمہارے پاس ہو تو تم کر لو۔“ فرخندہ آپا نے پیش کش کی۔

”کسی زمانے میں یاد تھا..... اب تو بھول گئی نمبر بھی۔“

وہ مسکرا دی۔ ”میں انتظار کر لیتی ہوں۔“ اسے نمبر یاد تھا لیکن وہ کال کر کے ان کا احسان لینا نہ چاہتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی ناصحانہ گفتگو نے اس کا موڈ آف کر دیا تھا۔

چند لمحوں میں ہی بیل گنگنا اٹھی۔ نہ نینب نے اٹھ کر ریسپور اٹھا یا دوسری جانب فارحہ ہی تھی۔

”بیلو..... ہاں ابھی کہاں گم ہو؟“ وہ نہ نینب کی آواز پہنچان کر بولی۔ ”کتنے دن سے منتظر ہوں تمہاری کہ شاید تم خود ہی ملنے آ جاؤ..... مگر

نہیں ابھی باقاعدہ دعوت کی ضرورت ہے محترمہ نہ نینب احسن ایذا کو، ہاں؟“

”نہیں، نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی۔ ”وہ دراصل آمنہ کی شادی تھی۔ کچھ مصروفیت رہی..... ورنہ میں تو

سوچ ہی رہی تھی۔“

”اچھا..... شادی ہوگئی آمنہ کی؟ چلو، اچھا ہوا۔ یہ قصہ بھی پاک ہو خراب بتاؤ کیا ارادے ہیں؟ آج کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے؟“

”آج؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”نہیں مصروفیت تو کچھ خاص نہیں ہے، چھٹی کا دن ہے۔“

”بس تو پھر میں ڈرائیور بھیج رہی ہوں۔ آ جاؤ۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”ابھی فوراً؟“ اس نے احسن سے سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہ کیا تھا، گھبرا کر بولی۔ ”میں نے تو احسن سے پوچھا نہیں۔“

”ہائیں؟“ فارحہ بھنا گئی۔ ”بھلا اس میں اجازت طلب بات کون سی ہے؟ مجھ سے ملنے ہی تو آرہی ہو، بتا دو۔ میں پھر لا ہو ر چلی جاؤں

گی ایک آدھ روز میں پتا نہیں نصیب میں پھر کب ملتا ہو۔ ہو سکتا ہے اسی سال مستقل لندن شفٹ ہو جائیں، ہم لوگ..... سن رہی ہونا؟“

”ہاں ہاں۔“

”بس تیار ہو جاؤ آدھے گھنٹے میں۔ میرا ڈرائیور آ رہا ہے۔“

اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ نہ نینب بے بسی سے ریسپور کو دیکھ کر رہ گئی چھٹی کا دن تھا، احسن سارا دن گھر پر ہی رہتا تھا۔ وہ کہیں جانے

کا نام لیتی تو بات اگلے روز پرٹا لے کر کوشش کرتا تھا۔ یہ دن وہ خاص الخاص نینب کے ساتھ ہی گزارنے کا تہی رہتا تھا۔

”یار پورے چھ دنوں کے بعد یہ ایک تہی دن آتا ہے۔ پورے چھ دن! کیسے گزرتے ہیں، تم شاید اندازہ نہ کر سکو۔ اس دن تو کہیں جانے کا نام نہ لیا کرو۔ آدمی گھر پر ہی نہ ہو تو رکنگ ڈے اور ہولی ڈے میں کیا فرق رہ جائے گا؟ تمہیں جہاں جانا ہے، کل شام لے جاؤں گا پر اس۔“ وہ ہمیشہ یہی بات کیا کرتا تھا۔ خود نینب بھی اس بات کا احساس کرتی تھی۔ اس دن ہر مصروفیت بالائے طاق رکھ کر وہ فارغ فارغ سی اس کے آس پاس بچھرا کرتی۔

اب اچانک ہی فارحہ کے فون نے اسے کوفت میں مبتلا کر دیا۔ ابھی تو وہ سو کر ہی ابھی تھی۔ آدھے گھنٹے کے شارٹ نوٹس پر اب بھلا کس طرح سارے کام سے فارغ ہو کر تیار ہو پائی؟ لیکن فارحہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ شادی نے اس کی طبیعت پر کوئی خاص اثر نہ چھوڑا تھا۔ وہی ضدی پن، وہی تکم سے بھرپور انداز!

وہ سوچتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔ احسن ٹی وی آن کئے لیٹا تھا۔ اسے دیکھ کر قدرے سیدھا ہوا۔

”کہاں گم ہیں عالی جناب؟ منہ دھوئے بغیر میٹھے کی سیریں ہو رہی ہیں۔ خالص عورتوں والا کام۔“ نینب مسکرا دی۔ پھر کچھ کہے بنا اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ احسن نے اطمینان سے اپنے پیر اس کی گود میں رکھ دیے۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے یہ اس کا خاص انداز ہوا کرتا تھا۔

”چائے بنا دوں؟“

”اوں ہوں۔ بنا دینا۔ جلدی کیا ہے؟“ وہ بیچ کی جھلکیوں میں گم تھا۔

”وہ..... احسن! بات سننا۔“ اسے عجیب سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

چونکہ وہ ہر بات میں اس کے جذبات کا بھرپور خیال رکھتا تھا، نینب بھی اس کے نازک احساسات کا پاس رکھنے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتی تھی۔ پورے دن کے لئے اسے اکیلے چھوڑ کر جانے کا خیال اسے خود تکلیف دے رہا تھا۔

”ہاں۔ کہو؟“ اس نے ریوٹ سے آواز کی ”کوئی خاص بات؟“

”فارحہ کا فون تھا۔ اس نے آج مجھے انوائٹ کیا ہے اپنے گھر میرا مطلب ہے پورے دن کے لئے۔ پھر وہ چلی جائے گی لاہور اپنے سرال۔“

”اچھا۔“ وہ قدرے سوچ میں پڑا۔ ”تو..... شام کو چلی جانا یار! میں کیا سارا دن کھیاں ماروں گا؟“

”اس نے تو ڈرائیور بھی بھیج دیا ہے۔ بس پہنچتا ہوگا۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ احسن نے بد مزگی سے منہ بنایا تھا۔

”ڈرائیور کی منج ضروری تھی؟ میں چھوڑ آتا۔“ اس کا موڈ قدرے خراب ہوا تھا۔

”میں نے تو نہیں کہا تھا۔ اس نے خود ہی۔“

شوماری ضروری سمجھی۔ احسن نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ ”خیر! جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔“

”اور آپ؟“

”میری بھی دعوت ہے؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

”میرا مطلب ہے..... سارا دن میں نے تو کھا نا بھی نہیں بنایا۔“ وہ سخت الجھن کا شکار تھی۔ احسن نے چند لمبے بخورا سے دیکھا۔ ابھی ابھی، بکھری بکھری، ڈری ڈری، وہ عجیب کنکاش کا شکار تھی۔ محض اس کی ناراضگی کے خیال سے؟

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”ارے بابا جاؤ جا کر تیار ہو جاؤ۔ میری فکر چھوڑو۔ میں کوئی دودھ پیتا پیر تو نہیں ہوں۔“

”اکیسویں لیس گئے؟“ اس نے بھولپن سے پوچھا۔ وہ ہنس دیا۔

”ڈرتو گئے گا..... خیر، رہہ لوں گا۔ ارے محترمہ فکر اندیش! جیسے تیار ہو جائیں۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔“ زینب بے ساختہ مسکرا دی۔ احسن کے انداز نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

”شکریہ احسن! آپ واقعی بہت اچھے ہیں۔“ کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بڑی محبت سے بولی تھی۔

”دیکھو..... مجھے مجبور نہ کرو کہ میں اپنا فیصلہ یکدم بدل لوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”یوں بے ایمان نہ کرو۔“

وہ ہنستی ہوئی اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

فارحہ بھی آخر اس کی ہی دوست تھی۔ سوا بارہ بجے وہ اسے ناشتے کی میز پر ملی۔ بھاپ اڑتی، گرم گرم چائے کی پیالی سامنے رکھے وہ ہاتھ میں تھامے ٹوسٹ کا آخری نوالہ لے رہی تھی۔

”ادھر ہی آ جاؤ زین۔“ وہ نوالہ منہ میں رکھ کر ہاتھ جھاڑنے لگی۔ ”میں چائے منگواتی ہوں۔“ زینب اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

”محترمہ! سب ناشتے سے بھی فارغ نہیں ہوئیں اور مجھے بلوانے کی اس قدر جلدی تھی۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی۔ ”قسم سے احسن کو ایک پیالی چائے بھی بنا کر نہ دے سکی اس قدر غلٹ میں تیار ہو کر آئی ہوں۔“ فارحہ مسکرا دی۔

”تو بابا دے دیتیں، بنا کر چائے کی پیالی اپنے ”سرتاج“ کو۔ اب میں نے یہ تو منع نہیں کیا۔“

”کیسے دیتی؟ تمہارا ڈرائیور جو سر پر سوار ہو گیا تھا۔“

”تو کھڑا ہٹا ڈرائیور۔ تمہیں اس کا اتنا احترام کرنے کو کس نے کہا تھا؟“ فارحہ نے خالی کپ میں چائے ڈال کر اس کے آگے سرکائی۔

”اور سرتاج اتنے نازک ہیں کیا؟ چائے کا ایک کپ بنا کر نہیں پی سکتے؟ منہ تک بھی تم ہی لے جاتی ہو گی کپ۔“

”ارے نہیں۔ احسن تو قسم سے بہت اچھے ہیں۔ آئیڈیل شوہر ہیں۔ چائے کیا وہ تو کھانا تک بنانے پر راضی تھے بلکہ بنا ئیں گے۔“ زینب نے فوراً دکالت کی۔

”اوہ..... مسیوڈ کم کک۔“ فارحہ ہنسی۔ ”چلو پھر تو بہت اچھا ہے۔ بیوی کو آرام رہتا ہے..... فیصل تو مجھ سے ذرا سے کم ہی ہیں پھوہڑ پین

میں..... بھولپن سے پوچھتے ہیں، یہ ٹوٹ تو نہیں جائے گا۔ ڈال دوں؟“

وہ اپنی ہی بات پر بے تحاشا ہنسی تھی۔ زینب بھی مسکرا دی۔

”اور دیکھو ایک بات گرہ سے باندھ لو۔ یہ شوہروں کو زیادہ سر پر چڑھاؤ تو بہت جلد بگنی کا ناچ بچانے لگتے ہیں۔ احسن سے پوچھا نہیں،

احسن سے اجازت نہیں لی، احسن مانڈ نہ کر جائیں فوٹس! ایسی باتیں ابھی سے کرو گی تو احسن گیس کا غبارہ بن جائیں گے جو اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔

ارے بھئی، میں کہتی ہوں ضرورت ہی کیا ہے اتنی ناز بردار یوں کی۔ بس اطلاع دو کہ میں فلاں جگہ جا رہی ہوں، فلاں وقت لوٹوں گی اور بس! شروع

سے ہی یہ رویہ رکھو تو آگے تکلیف نہیں ہوگی۔ ان شوہروں کو اس اطاعت گزاری کی عادت اگر پڑ جائے تو پھر ساری عمر بندر یا بنائے رکھتے ہیں بیوی

کو۔ ڈگڈگی پر نچاتے رہتے ہیں اور شروع میں تو عورت کو بندر یا بنانا بھی اچھا لگتا ہے، سمجھتی ہے میرا شوہر بہت پیار کرنے اور خیال رکھنے والا ہے۔

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے اسے گلے میں بندھی ڈور چبھنے لگتی ہے، تکلیف دیتی ہے۔ شادی سے پہلے کی آزادی یاد آتی ہے۔ اور شوہر کا لوگ اور

کیرنگ ہونا دنیا کا سب سے بڑا مذاق لگتا ہے ایسے ہونفوں کی طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ کچھ عقل شریف میں سامھی رہا ہے یا نہیں؟“

”نہیں فارحہ! تم غلط سمجھ رہی ہو۔“ اس نے فارحہ کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”احسن ایسے نہیں ہیں، وہ تو میرا بڑا خیال کرتے ہیں۔

ہر بات میں میری ہی خوشی کو مقدم جانتے ہیں وہ اجازت لینے والی بات تو میں نے یونہی کہہ دی تھی ورنہ مجھے ان کی جانب سے کھلی آزادی ہے۔ کوئی

روک ٹوک نہیں۔“

”ارے بابا! میں تو نہیں کہتی کہ احسن بھائی ایسے ہیں۔ میں تو عام سی بات کر رہی ہوں۔ سارے شوہروں میں ہمارے اپنے شوہر بھی تو آجی جاتے ہیں۔“

وہ بات ختم کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلو..... میرے کمرے میں چلتے ہیں..... میں ماسی حنیفوں سے کھانے کا کہتی ہوں کیا پکواؤں تمہارے لئے؟ چلو، میں خود ہی مینو تیار کرتی ہوں آج کا تم میرے کمرے میں چلو۔“

فارحہ اتنا زیادہ بولنے لگی تھی کہ اپنے سوالوں کے جواب بھی وہ خود ہی دے لیا کرتی تھی۔ سامنے والا منہ کھول کر رہ جاتا تھا۔

”فیصل بھائی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔“ اس کے کمرے کی سمت جاتے ہوئے زینب نے سوچا، ”اگر وہ بولنا بھول رہے ہیں تو حق بجانب ہیں۔“ اسے اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔



فارحہ کا کمرہ وہی تھا جو شادی سے قبل اس کے زیر استعمال تھا۔ وہاں چند چیزوں کا اضافہ ضرور ہوا تھا۔ لیکن سیٹنگ وہی پرانی تھی۔ زینب بیڈ پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ہر جانب فارحہ کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل اور کارپٹ پر جا بجا چھوٹے اور بڑے ڈبلوں کا ڈبیر تھا۔ شاید فارحہ نے حال ہی میں شاپنگ کی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر فارحہ کی شادی کی تصویر تھی جس میں وہ فیصل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ زینب تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ کسی بہت ماہر فوٹو گرافر نے فارحہ کے عام سے خدوخال والے چہرے ایک حور کا سارو پنشن دیا تھا۔ وہ اپنی شادی والے روز یقیناً اتنی حسین نظر نہ آئی تھی، تصویر میں تو وہ کوئی دوسری ہی لڑکی لگ رہی تھی۔

زینب چند لمحے تصویر کا جائزہ لیتی رہی۔ اسے اپنی تصویریں یاد آ گئیں۔ احسن کے دوست نے عام سے کمرے سے عام سی تصویریں اتاری تھیں جن میں اسے صحیح طرح سے فوکس بھی نہیں کیا تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ وہ اپنی شادی والے دن کس قدر حسین لگتی تھی۔

”سب پیسے کا کھیل ہے۔ ا!“ اس نے گہرا سانس بھر کر تصویر واپس جگہ پر رکھ دی۔ ”احسن، جوانی، بے لگری، شوخی، شرارت، ذہنی سکون و نشاط۔ ہر شے محض پیسے کی بدولت ہے۔ یہ دنیا آخر اتنی بڑی حقیقت کو تسلیم کر کیوں نہیں لیتی! تمام فلاسفر، سارے عالم آخر ایک غلط بات کو صحیح بنا دینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں کہ دنیا محبت ہے، انسان محبت ہے، زندگی محبت ہے۔ اصل شے عزت ہے، وقار ہے، دولت تو ہاتھ کا میل ہے۔ ہونہہ! جن کے پاس دولت نہیں ہوتی شاید وہی دل جلے ایسی کہاوتیں گھڑ لیتے ہیں۔“

”ویسے کام وہی جو انسان اپنے ہاتھ سے کرے۔“ فارحہ ناک چڑھائے تیز تیز بولتے کمرے میں داخل ہوئی۔ ”ان ماسیوں کے بھروسے پر ہو تو کام بھی ڈھنگ سے نہ ہو اور خون بھی جلتا ہے۔ امی نے ہی سر چڑھا رکھا ہے اس حنیفوں کو۔ میں تو ایسا نائٹ رکھوں کہ عقل آجائے محترم کو۔“ زینب نے سوالیہ نگاہیں اس پر دکائی اس کی تقریر ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی کہ شاید کوئی سراہا تھا لگے۔

”محترمہ! اتنی دال چڑھا کر بیٹھی ہیں جیسے اس کی سرالیوں نے آتا ہے۔“ اس نے ہاتھوں کے اشارے سے دال کی مبالغہ آمیز مقدار بتائی۔ ”حالانکہ میں نے بتایا بھی تھا کہ میری فریڈ نے آنا ہے۔ خیر، بریانی اور کھڑے سالہ کا قیہ بنا کر آئی ہوں۔ دیکھو، اب کیا تیار ماری ہیں محترمہ۔ میرا لک تو ایسے ایسے شاندار کھانے بنا تا ہے کہ آدمی اپنی انگلیاں تک کھا جائے۔ کبھی لاہور آؤ تو تمہیں ایسا چائیز نہ کھانا کھلاؤں گی جو تم نے زندگی میں نہیں کھایا ہوگا۔ چائیز ڈشز تو بہت آپریشنل قسم کی بنا تا ہے۔“

”فارحہ کی ساری گفتگو اس کے شوہر، کک اور ڈرائیور تک محدود ہو کر رہ گئی ہے شاید۔“ زینب نے سوچا مگر کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

”تمہاری تصویر بہت اچھی آئی ہے فارحہ۔“ اس نے فارحہ کے لفظ بھر کو خاموش ہونے پر کہا۔ ”باقی کی تصویریں بھی دکھاؤ نا۔“ البم کہاں ہے تمہارا۔؟“

”الم۔؟“ اس نے سوچا۔ شادی کا الم تو نہیں لائی، ہاں مٹی مون کی تصویریں لائی ہوں۔ ٹھہرو، دکھاتی ہوں۔ دراصل امی، ابو اور بہن بھائیوں کے لئے اتنے گفتگو لئے تھے میں نے کہ تین اٹیچی کیس تو ان ہی سے بھر گئے۔ الم وغیرہ کی جگہ ہی نہ تھی پھر فیصل بھی جھنجھلا گئے تھے میرا سامان دیکھ کر۔“ وہ ہنسی۔ ”آخر کو ساری پینٹنگ انہوں نے ہی کی تھی۔“

زینب اس کی تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک چنگاری سی جو کہیں دب گئی تھی پھر سلگ اٹھی۔ اس کے مٹی مون کا پروگرام کیسا ملیا میٹ ہوا تھا۔ اسے پھر یاد آ گیا۔ وہ تصویریں دیکھتی گئی اور ہر تصویر حسرت غبی گئی۔ کیسی کیسی حسین جگہیں تھیں، جہاں ان دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر یادگار تصویریں بنوائی تھیں۔ فارحہ کس قدر خوش نظر آ رہی تھی۔ ہر تصویر میں اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ وہ اداس سی ہو گئی۔

”تم لوگ کہاں گئے تھے؟“ فارحہ نے تصویریں سمیٹ کر لفافے میں ڈالتے ہوئے یوں ہی سرسری انداز میں پوچھا تھا۔ ”یہیں مری، کاغان ہو کر آئے ہوں گے، کیوں۔؟“

”نہیں کہاں جاسکے۔!“ اس نے شکایتی انداز میں سر کو جنبش دی تھی۔ ”احسن نے بات ٹال دی پھر کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“

”رنیلی۔؟“ فارحہ کو حیرت ہوئی۔ ”یار! شادی اور مٹی مون تو ایسے لازم و ملزوم لگتے ہیں کہ مجھے تعجب ہوتا ہے ان جوڑوں پر جو شادی کر کے بھی گھر ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ شروع کے چار دن ہی تو ہوتے ہیں ہنسی خوشی گزارنے کے، ایک دوسرے کو سمجھنے کے پھر کہاں ٹائم ملتا ہے۔“ اس نے سانس بھری۔

”احسن نے ٹھیک طرح سے پلاننگ ہی نہیں کی تھی۔ سارے پیسے شادی میں لگا دیے اور وہ ہیں نامیری ساس، فرخندہ آپا۔“ اس کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ ”لیفٹنٹ کی پوٹلی، کچھ انہوں نے کان بھر دیے احسن کے۔“

”تمہاری ساس۔؟“ فارحہ نے تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔ ”اچھا، وہ تمہاری مالک مکان۔ ان کا اتنا عمل دخل ہے تمہاری پرسل لائف میں؟ کیوں بھئی۔؟“

زینب کا دل پہلے ہی ان کی جانب سے میلا تھا۔ فارحہ کے جملے نے جیسے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ اس نے ان کی کافی برائیاں کیں۔ احسن کے خیالات پر ان کا کتنا کشر و ل تھا یہ بھی بتایا۔

پر اسرار خزانہ

ہر اسرار خزانہ..... کہانی ہے ایک حیرت و اسرار میں ڈوبی ہوئی رومانوی داستان کی، جس کا آغاز ہزاروں سال قبل عیسوی (پاکستان) کے محلات (آج کے کھنڈرات) میں ہوا اور اختتامِ تبت کے پر اسرار جنگلوں اور پہاڑوں میں۔ یہ کہانی گھومتی ہے انسانی محبت، اخلاص اور ہمدردی کے جذبات کے گرد، اور اسے سنگین بناتی ہے انسان کی لالچ، طمع اور خود غرضی کے جذبے۔ ایک بے قرار، بھٹکتی روح کو سکون اور چین دینے کے لیے کئے گئے دشوار گزار سفر کی داستان، جس میں کچھ لوگوں کے پیش نظر ایک بیش بہا خزانہ بھی تھا۔

ہر اسرار خزانہ کو **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”یار! دیکھو اسیدھی بات ہے۔ میں نے تو کبھی اپنی سگی ساس کو اتنی لفٹ نہیں کرائی کہ وہ مجھے صحیح اور غلط میں فرق بتاتی پھرے۔“ بھی میرا اپنا پوائنٹ آف ویو ہے کہ میں کس چیز کو ٹھیک سمجھتی ہوں، کس کو غلط۔ یہ بات میں نے شروع دن سے ہی فیصل سے بھی کلیئر کر رکھی ہے۔ تم ان کی اتنی پرواہی کیوں کرتی ہو جو تمہارا دل جلے۔ جو چاہتی ہو، کرو۔ جیسے رہنا چاہتی ہو، رہو۔ وہ نصیحتیں کرنے کی کوشش کریں تو انہیں صاف صاف کہہ دو کہ اپنے گھر میں تم اپنی مرضی سے رہو گی۔ ایک آدھ مرتبہ زبانی جھڑپ ہی ہو گی پھر وہ راہ راست پر آ جائیں گے۔ احسن بھائی بھی ذرا محتاط ہو جائیں گے۔“ وہی دونوں انداز تھا فارحہ کا، جس پر زینب کو بار بار رشک آتا تھا۔

”تم جانتی ہو، میں ایسا کری نہیں سکتی۔“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”پھر بھگتو۔“ اس نے کاندھے اچکا دیے۔ ”اور پھر تمہیں کرنا ہی کیا ہے۔ کرایے کا گھر ہے، تبدیل کر لو۔ تمہاری جان اس ایریا سے بھی چھوٹے گی اور فرخندہ آپا کے غیر متوقع چھاؤں سے بھی۔ یہ مشورہ تو میں تمہیں پہلے بھی دے چکی ہوں۔“

”گھر تبدیل کرنے کی بات کی تھی میں نے احسن سے۔“ زینب آہستگی سے بولی۔ ”لیکن انہوں نے تو.....“

”بیک جنش“ ”سُر“ ”رو کر دیا تمہارا کہا۔؟“ فارحہ نے استہزائیہ انداز میں اس کی بات کاٹنے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

”وہ کہتے ہیں فارحہ! گھر انسان کا اپنا ہوتا وہ اس کے گرد و پیش کے حسن کے متعلق احساس بھی ہو۔ کرایے کے گھر کا کیا ہے، کہیں بھی ہو۔ انہوں نے کہا، جب بھی اپنا گھر لیں گے، اچھے سے علاقے میں لیں گے۔“

”یا خدا۔!“ فارحہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”زینب! میری جان! کتنی کم عقل ہوں۔ یہ بندہ اول روز سے تمہیں اپنے اشاروں پر چلا رہا ہے۔ اور تم آنکھیں بند کئے چل رہی ہو پھر بھی یہی تکرار ہے کہ احسن مجھے بہت چاہتے ہیں، احسن میرا بہت خیال رکھتے ہیں، احسن میری ہر بات مانتے ہیں۔ مجھے کوئی سی ایک بات بتا دو جو اس شخص نے تمہارے کہے پر بلا جوں و چرا مان لی ہو؟ دیکھو زین، یہ جوشوہ رہتے ہیں تا یہ بہت جلیبی ٹائپ ہوتے ہیں بلکہ پیاز کھوتو زیادہ مناسب ہوگا۔ اتنی اتنی تمہیں ہوتی ہیں ان کی کہ اندر کی بات پتا چل کر نہیں دیتی۔ سب سے بڑی ٹرک تو یہی ہوتی ہے ان کی کہ اپنی منوائے جاتے ہیں اور ”تمہاری ہی مانتا ہوں۔“ کاراگ الاپتے رہتے ہیں تمہیں میرا بہترین مشورہ ہے۔ یہی وقت ہے اپنی اہمیت جاننے کا۔ یہ اندازہ لگانے کا کہ اس آدمی کو تمہارا کتنا خیال ہے۔ اڑ جاؤ اپنے مطالبے پر، منوا کر چھوڑ دو۔“

”لیکن فارحہ! ایسے تو دلوں میں فاصلے پیدا ہوتے ہیں۔“ وہ کچھ ڈر کر بولی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے بے نگری سے ہاتھ بلایا۔ ”یہ میاں بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہے۔ ابھی صدیوں کے فاصلے پر کھڑے ہیں تو اگلے ہی بلندی کنارے کا سا ساتھ ہوتا ہے بلکہ مزہ ہی اس تغیر میں ہے۔ ایک دوسرے کی چالوئی کرتے کرتے تو اکٹھا ہونے لگتی ہے۔ تمہیں نہیں ہوتی؟“

اس نے اچانک پوچھا تھا۔ زینب اسے دیکھ کر رہ گئی۔



اس کی واپسی مغرب کے وقت ہوئی تھی۔ فارحہ اسے خود چھوڑنے آئی تھی۔ زینب اسے ہاتھ ہلا کر گھر میں داخل ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے سخت بد مزگی کا شکار ہونا پڑا۔ ہاتھ میں تسبیح تھا فرخندہ آپا سامنے ہی کھڑی تھیں۔ اپنے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑی وہ شاید اسی کی منتظر تھیں۔ اسے دیکھ کر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلایا اور خود دعا کے انداز میں ہاتھ چہرے پر پھیرنے لگیں۔

”السلام علیکم۔“ وہ ان کے قریب پہنچ کر قہرے تھکے ہوئے اور ہزارے انداز میں گویا ہوئی۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے اس کی پیشانی اور گریبان پر پھونک ماری۔ ”عین مغرب کے وقت نکلی تھیں گھر سے؟ تھوڑا جلدی نکل آتیں یا

پھر اور بھر کر آتا تھا۔“

”جی ہاں وہ.....“ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ گڑبڑا کر رہ گئی۔

”مجھے چاہی دے گیا ہے۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر اسے روکنے کا مقصد بیان کیا۔ ”یہ لیتی جاؤ۔“

”اوہ!“ اس پر اس کی گری۔ ”احسن گھر پر نہیں ہیں؟ کہاں گئے ہیں؟“

”کیا معلوم، کسی دوست کے ہاں ہی گیا ہوگا۔“ اس غریب کا اور ہے کون شہر میں۔ ویسے زینب بیٹا تمہاری طبیعت کا بچپنا کسی طور جاتا

معلوم تو نہیں ہوتا۔ روٹی ہانڈی کیے بغیر پورے دن کے لئے غائب ہو جانا شادی شدہ عورت کو تو زینب نہیں دیتا۔“

”آپا! وہ قدر سے تنگی سے بولی تھی۔“ دیکھئے، یہ ہم میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے اور پھر میں احسن سے ہی اجازت لے کر گئی تھی۔ یا

آپ سمجھتی ہیں کہ کہیں آنے جانے کے لئے مجھے آپ کی اجازت درکار ہے؟“

فرخندہ آپا کے لئے اس کا لہجہ اور بات دونوں ہی غیر متوقع تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے شیشائے ہوئے انداز میں اسے دیکھتی رہ گئیں۔

”زینب!“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”بیٹا! میں تمہارے بھلے کے لئے ایک بات کہہ رہی تھی۔ خدا نخواستہ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ تمہاری ذاتی

زندگی میں مداخلت کروں۔“

”آپ کر رہی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر کرتی رہتی ہیں۔“ وہ انہیں نرم پڑتا دیکھ کر مزید جارح ہوئی۔ ”ہر چند کہ صبح و شام مجھے نصیحتیں کرتے رہنے

کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ آپ صرف ہماری مالک مکان تھیں کوئی خدائی فوجدار نہیں۔“

”زینب!“

اچانک ہی اس کی پشت پر احسن کی غصیلی، تنبیہ سے بھری آواز ابھری تھی۔ زینب چند لمحوں کے لئے سن ہو کر رہ گئی۔ اسے احسن کی یوں

اچانک آمد کا خیال تک نہ تھا۔ وہ پلٹ کر تیزی سے اپنی میزبانی کی طرف بڑھ گئی۔ احسن کی طرف اس نے دیکھا تک نہ تھا۔

اور پہنچ کر اس نے تالا کھولا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ چند لمحوں میں اس کے سر پر موجود تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی تھی زینب۔؟“ وہ آتے ہوئے بولا تھا۔ ”کیا وہاں سے کوئی نشہ کر کے آئی ہو جس نے تمہیں چھوٹے بڑے کی تمیز اور بات

کرنے کا سلیقہ بھلا دیا۔؟“

چند لمحوں کے لئے وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔

”اور آپ؟ یہ کس طرح سے بات کر رہے ہیں مجھ سے۔ اس عورت کے لئے جو آپ کی کچھ نہیں لگتی، آپ اپنی بیوی سے.....“

”مت کہو کہ وہ میری کچھ نہیں لگتیں۔“ احسن نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے اول روز تمہیں بتا دیا تھا کہ میں انہیں

بہت کچھ سمجھتا ہوں۔ رشتے رگوں میں دوڑتے خون کا نام نہیں ہوتے زینب! دلوں کے جذبات سے بنے ہیں اور میرے دل میں ان کا بہت احترام

ہے۔ وہ میری بڑی بہن کی طرح ہیں اور یہ تمہیں اچانک کیا ہوا؟ ایسی بھی کیا بات ہو گئی تھی جس کے لئے تم نے مجھے یوں ذلیل اور بے مایہ کر کے رکھ

دیا؟ اور! کیا سوچتی ہوں گی فرخندہ آپا۔“

وہ شدید تاسف کا شکار تھا۔

”سوچتی رہیں وہ۔“ وہ غصہ سے پھٹ گئی۔ ”انکے سوچنے کی بہت پروا ہے! پکڑاؤ اور میں..... میرا کچھ خیال نہیں؟ رتی برابر پر وہ انہیں تمہیں

میرے جذبات کی۔ انہیں کاراگ الاپ رہے ہیں جب سے۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں کہ انہوں نے کس طرح میرے دل کو گھیس پہنچائی ہے۔“

”اس لئے کہ میں تمہیں بھی سمجھتا ہوں اور انہیں بھی جانتا ہوں۔“ اس نے نسلکتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔ ”واقف ہوں تمہاری پل میں

تولہ پل میں ماشہ والی کیفیت ہے۔“

”اوہ!“ اسے شدید صدمہ ہوا۔ ”تو فرخندہ! آپ کی سب کچھ ہیں۔ ان کے سامنے کسی کی کوئی اہمیت نہیں آپ کے نزدیک۔“
 ”میں نے یہ تو نہیں کہا زینب۔“ وہ گہرا سانس بھر کر قدرے نرم پڑا۔ ”تم جانتی ہو میرے لئے تم جو کچھ ہو.....“
 ”رہنے دیجئے۔“ اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں سمجھ چکی ہوں اپنی اہمیت، اپنا مقام، مزید کچھ جاننے کی تمنا نہیں۔“
 اپنے کپڑے اٹھا کر وہ ہاتھ روم میں بند ہو گئی پھر رات کو اس سے کوئی بات کہے بنا وہ دوسری جانب کروٹ لے کر سو گئی تھی۔



”زینی..... اوزینو.....“ احسن نے بڑی آہستگی سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا کر اسے جگایا تھا۔ زینب کی آنکھ کھل گئی لیکن وہ سوتی بنی رہی۔

”کہتے ہیں، میاں بیوی کو اپنے تمام جھگڑوں کا تصفیہ رات سونے سے قبل ہی کر لینا چاہیے تاکہ نیا سورج ایک ہنسی مسکراتی صبح کی نوید لے طلوع ہو دیکھو، ہم دونوں نے کتنی بڑی حسانت کر ڈالی۔ ابھی تو زندگی کا آغاز ہوا ہے اور ہم نے ایک رات ایک دوسرے سے خوارہ کر بر باد بھی کر دی۔ کس قدر قیمتی ہیں یہ لمحات زینو، جو ایک دوپے کی ہر اہمی میں بیت رہے ہیں، انہیں مزید ضائع نہ کرو۔ اٹھو جی یار۔“
 وہ اس کے قریب بیٹھا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

زینب کے دل میں رات کی باتوں کا غبار بدستور اڑ رہا تھا۔ کوئی ایک ذرہ بھی نہ بیٹھا تھا بدگمانی کی دھول کا۔ اس نے ناراضی سے اس کا ہاتھ اپنے پر سے جھٹک دیا اور سر تک چادر لپیٹ کر لیٹی رہی۔

”زینو! اٹھو تیار، پلیز!“ اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ”میں مانتا ہوں، میں رات کچھ زیادتی کر گیا تمہارے ساتھ لیکن رات کی باتیں رات کے ساتھ چلی جانے دو۔ دیکھو، میں تمہارے لئے چائے بنا کر لایا ہوں۔ مسکرا کر شکریہ ادا کر دو میرا۔“ اس نے ٹون بدل کر شوشی سے کہا۔ ”اٹھ جاؤ نا جانو۔“

”مجھے تنگ نہ کریں احسن پلیز۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”سر میں سخت درد ہے میرے۔ سونے دیجئے۔“
 ”سوتی رہنا سارا دن گھوڑے سچ کر۔ ابھی میں آفس جا رہا ہوں۔ رخ روشن کے دیدار سے میری نظروں کو سیراب تو کر دو۔ یوں ہی پیاسا جلا جاؤں گا تو کیا خوشی ملے گی تمہیں؟“

”میرے چہرے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ان کا چہرہ دیکھیں جن سے دلی جذبات وابستہ ہیں آپ کے۔“ وہ ناراضی سے بولی۔
 احسن اس کی بات پر خاموش ہو کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر وہ وہیں بیٹھا غالباً کچھ سوچتا رہا پھر اٹھ گیا۔

”میں جا رہا ہوں زینی! دروازہ بند کر لینا۔“ آہستگی سے کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ اس کے جاتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نیند تو رات کو ہی مشکل سے آئی تھی۔ اس وقت سر بھاری تھا لیکن اس سے سو یا نہ گیا۔ عجیب سی کک محسوس ہو رہی تھی۔ کسی خلش کا احساس ستار ہا تھا۔ شادی کے بعد سے اب تک ایسا نہ ہوا تھا کہ صبح وہ یوں اسے دیکھے بنا آفس چلا جاتا۔

بے دلی سے اٹھ کر وہ کچن تک آئی۔ احسن ناشتے کی ٹرے چھوئے بغیر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہر شے جوں کی توں موجود تھی۔ سکے ہوئے سلاکس، فرائی انڈہ اور چائے کا کپ۔ اس نے چائے اٹھا کر پینا چاہی لیکن گھونٹ حلق سے اتارنا دشوار ہو گیا۔ اس کے بھوکے چلے جانے کا خیال ستانے لگا۔ کپ واپس وہیں رکھ کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ ہر جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یوں تو روز ہی یہی خاموشی ہوتی تھی۔ لیکن یوں دیرانی کا سا احساس نہ ہوتا تھا۔ اس کا دل بھرا پھر اماں یاد آگئیں۔ وہ وہیں بیٹھ کر خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔

”زینب میری بچی۔!“ اچانک ہی فرخندہ آ پاندر داخل ہوئی تھیں۔ اسے روٹا دیکھ کر وہ بے اختیار آگے بڑھ آئیں اور خود سے لپٹا لیا۔

”جی جی جی..... ذرا سی بات اور ایسا فسانہ بن گئی۔ مجھ بد بخت کو کیا خبر تھی ورنہ ایسی بات منہ سے نہ نکالتی۔ جو دو دلوں میں ایسا فرق پیدا کر دے۔ زینبی! اپنی! معاف کر دو مجھے۔ میری وجہ سے تمہاری میاں کے ساتھ جھڑپ ہو گئی۔ کیسا احساس ندامت ہے۔ ڈوبی جاتی ہوں۔“ وہ دکھ سے بولی تھیں۔

زینب خاموشی سے آنسو پونچھنے لگی۔

”میرا کچھ کہنا تمہیں برا لگتا ہے تو آئندہ کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔ میں تو..... میں تو..... تمہیں بہت اپنا جان کر سمجھاتی تھی۔ اولاد سے محروم ہی ہوں۔ تم دونوں ایسے لگنے لگے ہو جیسے خدا نے بیٹھے بٹھائے بیٹے سے بھی نواز دیا اور بیٹی سے بھی۔ اسی بھروسے سے وہ کچھ کہہ گئی جو تمہارے دل کو ٹھیس پہنچا گیا۔ معاف کرنا بیٹی، مجھ عقل کی انجمنی نے یہ نہ سوچا کہ تمہارے لئے تو میں اس اہمیت کی حامل کبھی نہیں ہو سکتی، جس اہمیت کے حامل تم دونوں ہو میرے نزدیک۔ تمہارے لئے تو میں مالک مکان ہوں، اور بس۔“

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی تھیں بیٹی! تمہاری زندگی میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہمارا کوئی ایسا تعلق ہے کہ میں تمہیں نصیحت ہی کر سکوں۔ کل شاید میں کچھ زیادہ ہی کہہ گئی تھی۔ دراصل جب شام پانچ بجے احسن نے مجھ سے کھانا مانگا اور مجھے علم ہوا کہ وہ سارا دن بھوکا رہا ہے تو مجھے کچھ غصہ آ گیا تھا۔ اسی لیے زبان سے وہ سب کچھ نکل گیا۔ بھول گئی کہ مجھے تم سے باز پرس کا کوئی اختیار نہیں۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔؟“

وہ اتنا کچھ کہہ چکی تھیں کہ مزید کسی صفائی اور وضاحت کی ضرورت نہ رہی تھی پھر اسے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ آئندہ کے لیے انہوں نے احتیاط کا دامن تھام لینا تھا۔

”بس بھی کیجئے آپا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کیوں اتنا شرمندہ کر رہی ہیں مجھے۔؟“

”شرمندہ تو میں ہوں زینب! کل ساری رات جاگ کر، رو کر گزاری ہے۔“ وہ دکھ سے بولیں۔

”نہیں آپا، اب ایسا بھی کیا ہو گیا۔ ایسے چھوٹے موٹے اختلافات تو ہوسی جاتے ہیں جہاں چند انسان بستے ہیں۔ جو آپ نے محسوس کیا، کہہ دیا۔ جو میرے جی میں آیا، میں نے کہہ ڈالا بس اب جانے دیجئے۔“

”جیتتی رہو۔“ وہ گہرا سانس بھر کر کھڑی ہو گئیں۔

”چلتی ہوں۔“

”نہیں آپا! چائے پاتی ہوں۔“ وہ بھی ان کی ہمراہی میں کھڑی ہو گئی۔

”بس بیٹی! چلوں گی، نیچے بھی گھر اکیلا ہے پھر ابھی کھانا بنانا ہے، صفائی کرنی ہے۔ میں تو کچن سیٹ کر پہلے تم سے ملنے چلی آئی تھی۔ دل ایسا بے قرار ہو رہا تھا۔ رہا نہیں گیا۔“ وہ انہیں چھوڑنے میز ہیوں تک آئی۔ فرخندہ آ پا بھی کچھ بھی کہے بنا میز حیاں اتر گئی تھیں۔

”ہونہ، بیٹا اور بیٹی سمجھتی ہیں۔ ہر ماہ کرایہ تو بڑی باتا عدگی سے لیتی ہیں۔ اپنی اولاد سے بھی کوئی کرایہ لیتا ہے۔“

وہ سر جھٹک کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔

شام کو احسن کی آمد سے قبل اس نے ہنسا دھو کر لباس تبدیل کر لیا تھا۔ وہ بھی مزید لڑائی نہ چاہتی تھی اور پھر فرخندہ آ پاس کے نزدیک واقعی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ وہ ان کی وجہ سے کیوں اپنے شوہر سے دور رہتی۔

احسن آیا تو وہ دروازہ کھولتے ہوئے ہولے سے مسکرا دی تھی۔

”السلام علیکم۔“ آہستگی سے اسے سلام کیا۔

”والسلام، مزاج بخیر۔؟“ وہ بھی مسکرایا۔ ”کوئی ٹھنڈا شربت بنا کر پیا؟ مزاج کی گرمی کچھ دور ہوئی؟ اتفاقاً ہوا۔؟“
”احسن!“ وہ اسے گھورنے لگی۔

”جی جناب! مجرم حاضر ہے، جو چاہے سزا سنا دیں، منظور ہوگی۔ بس دوری کی سزا نہ ہو، جو پھانسی سے بھی بری ہے۔“
وہ اس کے قریب چلا آیا۔

”سوچ لیں۔ سزا کوئی سی بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ اسے دھکانے والے انداز میں بولی تھی۔

”جیب پر جتنا بھی بوجھ ہو، برداشت ہے۔ دل کا بوجھ برداشت نہ ہوگا۔“ وہ مسکرایا۔

”ٹھیک ہے۔ تو آج رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔“

”منظور۔“ وہ ہنسا۔ ”یہ سزا تو مجرم پہلے ہی اپنے واسطے تجویز کر چکا تھا۔“

”ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑی۔ ”مابدولت کچھ شاپنگ بھی کریں گے۔ سردی کا اختتام ہے۔ لان کے کچھ سوٹ سیل میں سے لیے جائیں

گے۔“

”مابدولت سوچ لیں۔ مینے کا بھی اختتام ہے۔“ اس نے دہائی دی تھی۔ ”ایسا نہ ہو کہ مجرم کنگال ہو جائے اور پیٹرول تک کے پیسے نہ

بچیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ اس نے بے رخی سے سر ہلایا۔ ”کوئی رعایت نہیں ہو سکتی۔“

”حکم حاکم۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”چلیے جناب! تیار ہو جائیں۔“

وہ شام بے حد خوشگوار گزری تھی۔ احسن نے اسے اچھا سا کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ کافی ساری شاپنگ بھی کرائی تھی اور اس کی پسندیدہ

جگہوں پر گھمایا پھرایا بھی تھا۔ نہ سب کاموڈ بہت اچھا تھا، ہر چند کہ وہ بری طرح سے تھک گئی تھی۔ سارے پکٹ بستر پر گراتے ہوئے وہ خود بھی وہیں

گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ جوتے اتارتے ہوئے احسن نے مڑ کر دیکھا اور مسکرایا۔

”بس، اتنی سی شاپنگ نے اتنا تھکا ڈالا۔ جو میں بہت امیر ہوتا تب کیا ہوتا۔؟“

”تب؟“ اس نے سوچا۔ ”تب میں روز شاپنگ پر جاتی اور روز جھکتی۔“

”تو تب تو بے تم عورتوں کو شاپنگ کے علاوہ بھی کچھ سوچتا ہے؟ پیسے خرچ کر کے آخر خون سی تسکین حاصل ہوتی ہے۔؟“

”پیسے خرچ ہوتے ہیں تو ضرورت کی چیز بھی تو ملتی ہے آدمی آخر کما تا ہی کیوں ہے۔“

”آدمی اسی لیے کماتا ہے۔“ اس نے حسرت سے سانس بھر کر کہا۔ ”کہ اس کی بیوی آخر مینے میں جا کر ڈھیر ساری ضرورت کی چیزیں

خرید لائے۔“ نہ سب کو ٹھنی آگئی۔

”تو آپ بھی کچھ لے لیتے اپنے لیے۔ میں نے منع تو نہیں کیا تھا۔“ پھر وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”ہائے احسن ج، آپ نے تو اپنے لیے کچھ بھی

نہیں خریدا، سارے پیسے مجھ پر ہی خرچ کر ڈالے، کوئی اچھی سی شرٹ ہی لے لیتے۔ کتنی کی چند شرتیں ہیں آپ کے پاس۔“

”ارے ہم درویش لوگ ہیں۔ کام چلا لیتے ہیں جب تک چلے۔ بس آپ خوش رہیں اور ہمیں کیا چاہیے۔“

”ج احسن! بہت محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے۔؟“ وہ ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرہ لے کر اسے دیکھنے لگی۔

”یہ بھی کوئی سوز گز کے فاصلے سے پوچھنے والی بات ہے؟“ وہ شرارتی ہوا۔ ”بہت چالاک ہو تم نہ سب خاتون۔“

”مذاق نہ کریں۔ صحیح جواب دیں میری بات کا۔ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کس سے کرتے ہیں آپ۔؟“

”تمہارے دل سے رات والی بدگمانی شاید اب تک نہیں گئی۔“ وہ سنجیدہ ہو کر اس کے قریب آ بیٹھا۔ ”زینو! میری جان! دیکھو۔ جب سے

شعور کی دنیا میں قدم رکھا ہے، کسی اپنے کو نہیں دیکھا۔ کسی سچے رشتے کو نہیں پایا۔ ایک سرائے کی سی مانند تھی دنیا میرے لیے۔ تم ملی ہو تو میں نے جانا ہے رشتہ کیا ہوتا ہے، محبت کیسے کرتے ہیں، گھر کیسے بنتا ہے۔ ایک جھوٹے سے مکان میں ایک پوری دنیا کیسے آباد ہو جاتی ہے پھر بھی تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ محبت کس سے کرتا ہوں؟ ظاہر ہے، تم سے کرتا ہوں۔ تم ہی میری دنیا ہو، میری زندگی ہو، تم میری بیوی، میرا سب کچھ۔“

نہیب مطمئن ہو کر مسکرا دی۔

”اچھا، تو سنیں! ایک فرمائش ہے میری آپ سے۔ اسی محبت کے بھروسے جو آپ مجھ سے کرتے ہیں۔“

”ہوں، کہو۔“ وہ بغور اسے دیکھنے لگا۔

”ہم جلد ہی گھر تبدیل کر لیں گے۔“ وہ آخر کہہ ہی گئی۔ ”میرا یہاں جی نہیں لگتا احسن۔“ وہ چند لمحوں کے لیے گم سم سا ہو گیا تھا۔

”کیا سوچنے لگے ہیں؟ کوئی بہت بڑی فرمائش تو نہیں۔ دنیا جہاں سے انوکھی تو کوئی بات نہیں، آخر اتنا عرصہ ہو گیا آپ کو یہاں رہتے ہوئے، اب تو کوئی تبدیلی، کوئی ترقی ہونی چاہیے۔“ احسن دانتوں سے نچلے لب کو کانٹنے لگا تھا۔

”اچھا چلیں بھی اب۔“ نہیب نے اسے ٹھوکا دیا۔ ”کپڑے چینج کر لیں۔ دس بج رہے ہیں۔ صبح آفس جانے کے لیے اٹھنا ہے، جھٹی نہیں ہے جناب کی۔“ وہ خاموشی سے اٹھ گیا تھا۔



اگلے روز اس کے لیے اہم تھا۔ دو پہر میں اچانک ہی آمنہ چلی آئی تھی۔ اس کی عزیز از جان دوست، نہیب بڑی گرم جوشی سے ملی۔ آمنہ سے مل کر اسے بچانے کیوں اماں کی یاد آ جاتی تھی۔ شاید آمنہ سے اس کے میسج کی یادیں وابستہ تھیں۔

”کبھی ہوا آمنہ۔“ پھر اس نے بغور آمنہ کا جائزہ لیا۔ ”دبلی ہو رہی ہو اور رنگت بالکل زرد ہو رہی ہے، کیا بات ہے۔ خوش تو ہونا اپنے گھر میں۔؟“ اس نے قدرے تشویش سے پوچھا تھا۔ آمنہ خوش دلی سے ہنس دی۔

”بہت خوش ہوں، بالکل مطمئن۔ تم اپنی سناؤ۔“

”راوی چینین ہی چینین لکھتا ہے۔“ وہ شغفی سے مسکرائی۔ ”ویسے یہ داستان امیر حمزہ تو تم کئی مرتبہ سن چکی ہو۔ آج تو تمہاری باری ہے، اپنی کہو۔ اپنے میاں صاحب کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھو۔ عادت کے، مزاج کے کیسے ہیں؟“

”بہت اچھا۔“ آمنہ کے چہرے پر وہی مطمئن مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ”انور عادت کے، مزاج کے بہت اچھے اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ بہت نرمی اور ٹھہراؤ ہے ان کے اندر۔ بہت اچھی گزر رہی ہے۔“

”اور وہ، ان کی بیٹی۔؟“

”کنزلی! ارے وہ تو بہت ہی پیاری بچی ہے۔ قانع اور صابر و شاکر۔ بالکل اپنے باپ کی طرح مجھ سے بہت اچھی ہو گئی ہے تھوڑے سے ہی دنوں میں۔ بہت عزیز ہو گئی مجھے اور انوار تو اسے بہت چاہتے ہیں، دیوانوں کی طرح۔“

نہیب نے اس کے چہرے پر اور لمبے میں کچھ کھوجنا چاہا مگر ناکام رہی۔

”ایک بات بتاؤ آمنہ۔“ پھر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”تمہیں کبھی کبھی اس سے چلیسی نہیں فیل ہوتی۔؟“

”کنزلی سے۔؟“ آمنہ حیران رہ گئی پھر دوسرے ہی لمحے ہنس دی۔ ”ارے نہیں نہیب! بالکل نہیں۔ وہ تو ایک معصوم سی، فرشتہ صفت بچی

ہے، بن ماں کی بچی۔ اسے میری جیلسی کی نہیں، میری توجہ اور پیار کی ضرورت ہے۔ انوار کے پاس کہاں اتنا ناٹم ہوتا ہے کہ وہ اسے بھرپور توجہ دے سکیں جس کی وہ اس عمر میں متقاضی ہے۔ صبح جاب، شام کوٹیوشن وغیرہ دیتے ہیں۔ انہیں تو بالکل وقت نہیں ملتا۔ اماں اس کی ہے نہیں۔ میرے سوا کون ہے اس کی دیکھ بھال کرنے والا، اسے چاہنے والا۔“

”لیکن آمنہ! میں نے تو سنا ہے، سوتیلی ماؤں کے دل ایسی بچیوں کے حق میں پتھر جیسے ہوتے ہیں۔“ وہ تجسس لہجے میں بولی۔ ”تمہیں اس سے اتنی محبت کیسے ہو گئی؟“

”پتا نہیں۔ شاید ایسی ماؤں کے سینے میں دل ہوتے ہی نہیں جو عورت بچے سے محبت نہ کر سکے۔ زنب! سمجھو خدا نے اسے دل دیا ہی نہیں۔ دل، گوشت کے اس ٹکڑے کا نام نہیں ہے جو سینے میں مسلسل حرکت کرتا رہتا ہے۔ دل تو نرم احساسات، نازک جذبات کے مجموعے کا نام ہے۔ زنب، اسے کوئی پتھر کیسے کر سکتا ہے؟ دل میں تو ہر لمحے خدا بستا ہے، خدا سے چوری چھپے کسی سے نفرت کیسے کی جاسکتی ہے؟ وہ بھی کسی معصوم بچے سے۔“

”تمہیں کیا کہوں آمنہ! تم تو دنیا سے نرالی ہو اور نہ ایسی ماؤں کے ظلم و ستم کے قصے کس نے نہیں سن رکھے ہوتے۔ دراصل بات ہوتی ہے جذبہ رقابت کی، جو عورت سوتیلی اولاد سے محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنے شوہر کے قریب کوئی غیر وجود دکھاتا ہے۔ شوہر پر تو کسی دوسرے کا حق برداشت ہوتی نہیں سکتا۔“ اپنی بات مکمل کرتے کرتے اس کے ذہن میں فرخندہ آپار آئیں۔ اسے کچھ ہی عرصے میں وہ کتنی بری لگنے لگی تھیں۔ محض اس لیے ناکہ وہ احسن پر اپنا حق جتاتی تھیں۔

”میں نے انوار سے شادی سے قبل ہی یہ تسلیم کر لیا تھا کہ کسزئی کا حق ہر حال میں مجھ سے زیادہ رہے گا۔ مجھ سے بھی زیادہ اور میری اولاد سے بھی زیادہ۔“

آمنہ نرمی سے مسکرا دی۔ ”ہر انسان اپنا مقصد آپ ہوتا ہے زنب! اور ہر کسی کو ہونا چاہیے لوگوں سے شکایت کم سے کم ہوتی ہے اور زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ ذہن پریشانیوں سے بچا رہتا ہے۔“

”تم تو مجھے دلی لگتی ہو آمنہ۔“ زنب نے برا سا منہ بنایا۔ ”تمہارے جیسا تو کوئی بن ہی نہیں سکتا۔“ آمنہ بے ساختہ ہنس دی تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ، کیا کھاؤ گی؟ میں نے ابھی تک کھانا نہیں بنایا ہے۔ بس اب کچن کا رخ کرنے، ہی والی تھی۔ اب جو تم کھانا چاہو گی وہی بنا لوں گی۔“

”دال چاول بنا لو زنب۔ ہری چٹنی کے ساتھ اور اچار بھی ہو تو بہت اچھا ہے۔“

”دال؟“ زنب نے منہ بنایا۔ ”پہلی مرتبہ کھانا کھاؤ گی تم میرے گھر، کچھ ہوش کے ناخن لو۔ اچھا، ایسا کرتی ہوں، تو رمدہ بنا لیتی ہوں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”خدا رانہیں۔“ آمنہ نے ہاتھ جوڑے۔ ”بچ زنب! اس حال میں گوشت کا ذکر تک اچھا نہیں لگتا، میں نے بنا کسی تکلف کے وہی ڈش بنائی ہے جو کھانے کو میرا دل چاہتا ہے۔ آج کل دال اور اچار چٹنی کے سوا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”اس حال میں؟ آج کل؟“ زنب کو اس کے کچھ لفظ معنی خیز معلوم ہوئے۔

”اوہ!“ پھر اس نے آمنہ کو غور سے دیکھا۔ ”تو یہ معاملہ ہے۔“

”ہوں۔“ وہ ہنس دی۔ ”اس زرد رنگ کا یہی راز ہے۔ اب تو مطمئن ہو۔؟“

”بالکل۔“ زنب ہنس دی۔

پھر وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ اسے ایک عجب سا احساس ہوا تھا۔ شاید آمنہ نے بھی اس کی کیفیت کو بھانپ لیا تھا تب ہی پوچھنے لگی۔

”نہنہ! تمہاری شادی کو سال ہونے والا ہے۔“
 ”ہاں، ہونے والا ہے لیکن ایسی کوئی بات فی الحال نہیں ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔
 ”چلو! خدا بہتر کرے گا۔ اچھا ہے کچھ دن فارغ رہ کر گزارو پھر یہ فرصتیں کہاں ملتی ہیں۔“
 آمنہ نے ہنس کر کہا تھا۔ نہنہ بھی مسکرا دی لیکن اس کا دماغ الجھ گیا تھا۔



شام کو احسن سے اس نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

”بچے۔“ وہ بھنائی۔ ”گو یا میں نے کوئی پر لطف لطیفہ سنایا ہو۔“

”پر لطف لطیفہ۔“ وہ مزید ہنسنے لگا۔

”آخر اس میں ہنسنے والی بات بھی کیا ہے احسن۔؟“ وہ برامان گئی۔ ”کسی بات کو تو سیریس لے لیا کریں۔“

”اچھا بھئی، ہو گئے سیریس لیکن تم یہ بتاؤ کہ اس میں بھلا پریشانی والی کیا بات ہے؟ کیا آزادی کے یہ چند دن برے معلوم ہو رہے

ہیں۔؟“

”آزادی۔؟“ اسے حیرت ہوئی۔ ”بچے کیا قید ہوتے ہیں؟ زنجیر ہوتے ہیں پیرودی؟ آپ کو بچے اچھے نہیں لگتے احسن۔؟“

احسن قدرے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

”مجھ سے زیادہ کس کو اچھے لگیں گے بچہ نہنہ! محبتوں کا، رشتوں کا ترسا ہوا انسان ہوں۔ میں تو دعا کرتا ہوں اللہ مجھے دس بارہ بچے

دے۔“

”ہائیں۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”نہیں بھئی، بس دو، تین کافی ہیں، مجھ سے نہیں سنبھالے جائیں گے اتنے بچے۔“

”اسی خیال کے تحت تو کہہ رہا تھا۔“ وہ ہنس دیا۔

”ابھی تو تم نے خود کو ہی بشکل سنبھالا ہے۔ میرا مطلب ہے شکل سے ہوش سنبھالا ہے۔“

”کیوں؟“ اس نے فطی سے اسے گھورا۔ ”ایسی بھی کیا بات ہے۔؟“

”بچہ سنبھالنا بہت مشکل کام ہے جانم! خود کو بھول جاتی ہے عورت۔“

”اور وہ جوتے اتنے بچے سنبھالتی ہیں عورتیں، وہ کیا بہت خاص الخاص ہوتی ہیں۔؟“ وہ نااہلی کے اس شوٹ کلیٹ پر جل کر رہ گئی۔

احسن مزے مزے سے منہ بنانے لگا۔ اسے نہنہ کو چڑا کر مزہ آرہا تھا۔

”میں آپ کو بہت غیر ذمہ دار لگتی ہوں؟ بدسلطنت؟“ اسے مزید غصہ آیا۔

”کسی عورت کے سلطنت کو جانچنا ہوتا تو اس کی الماری، اس کا پرسل ہاتھ روم اور اس کا کچن لغور دیکھنا چاہیے۔ میں نہیں سیانے کہتے ہیں۔“ وہ

مسکرا رہا تھا۔ ”الماری تمہاری ایسی کنڈیشن میں رہتی ہے کہ ایک کپڑا ہارنگ لٹا تو دس کپڑے زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ کچن تمہارا بس گزارے لائق ہی

ہوتا ہے۔ رہ گیا ہاتھ روم تو وہ ہمیشہ تمہاری توجہ کا طالب بناد ہائیاں دیتا رہتا ہے۔“

”میں کوئی جھدارنی تو نہیں ہوں۔“ وہ جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔ پھر رو ہنسی ہو کر کہنے لگی۔ ”ہر وقت جھاڑو سنبھالے کیا ہاتھ روم میں تمہیں

رہوں۔“

”میں تھوڑا ہی کچھ کہتا ہوں۔“ احسن نے اسے چکارا۔ ”میں تو سیانوں کی بات بتا رہا تھا۔ اب ان سے کوئی پوچھے، عورت کو اور کوئی کام

”بہیں جو وہ جھاڑو سنہالے ہاتھ روم میں گھسی رہے۔ عورت، عورت ہے، جعدارنی تو نہیں۔ وہ بھی میری زینب جیسی۔“

”اماں نے کبھی مجھ سے کوئی کام نہیں کروایا۔“ وہ بولنے لگی۔ ”میں تو بس کالج جاتی تھی یا گھر میں ہوتی تو بستر میں گھسی کہانیاں پڑھتی رہتی تھی۔ اماں بہت عزیز رکھتی تھیں مجھے، سارے کام خود ہی کر لیتی تھیں اور یہ بچن اور ہاتھ روم کے کام تو میں نے کبھی نہیں کیے۔ تو بہ! گندی گندی نالیاں دیکھ کر کتنی ہو جاتی ہے۔“

”وہ اماں کا گھر تھا زینب! یہ گھر تمہارا ہے۔“ وہ قدرے سنجیدگی اور نرمی سے بولا۔ ”اے سجانا، سنو انا، صاف ستھرا رکھنا تمہارا کام ہے۔ گھر، عورت کی پہچان ہے زینو۔“

زینب خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ اے اپنے ہاتھوں کی خوبصورتی بہت عزیز تھی۔ انکا بڑا دھیان رکھتی تھی وہ، اسی لیے اسے کچن کے کاموں سے ہمیشہ سے ہی چڑ رہی تھی لیکن آج احسن کی بات نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں کو کم اور گھر کو زیادہ غور سے دیکھتا تھا۔ ”بات بھی کہاں سے کہاں نکل گئی۔“ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے احسن بولا تھا۔ ”تم چاہو تو کسی ڈاکٹر سے ٹائم لے لوں۔؟“

”نہیں نہیں۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی تھی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

اسے احساس ہوا تھا کہ احسن کو گھریلو معاملات میں اس سے کئی شکایات تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی گرہمن ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ ایسے میں بچے کی ذمہ داری وہ غیر ضروری اور اضافی خیال کرنا تھا۔ ہر چند کہ اسے بچے بے حد پسند تھے۔

احسن کے سوجانے کے بعد بھی وہ دیر تک اس موضوع پر سوچتی رہی۔



اگلے روز وہ احسن کے جاگنے سے قبل ہی بیدار ہو گئی۔ ہر چند کہ ایسا شازدہ نادر ہی ہوا کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر احسن اس کے اٹھنے سے پہلے ہی چائے بنا لیا کرتا تھا۔

کچن میں آکر اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور آنے کے پیڑے بنانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ احسن کو آلیٹ اور پرائیٹ کا ناشتہ بے حد مرغوب ہے اور وہ محض اس کی نیند خراب ہونے کے خیال سے سلاکس اور فرائی انڈے سے ناشتہ کر کے چلا جاتا تھا۔

بڑی محنت اور لگن سے اس نے پرائیٹ تیار کیے، آلیٹ بنایا، چائے تھرموس میں نکالی۔ اتنی دیر میں وہ اٹھ کر چلا آیا تھا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر بڑی معنی خیز نظروں سے اس نے ساری تیاریوں کا معائنہ کیا۔

”خیریت؟“ پھر وہ بولا۔ ”طبیعت ٹھیک ہے۔؟“

”باتیں نہ بنائیں، منہ دھو کر آجائیں۔ ناشتہ تیار ہے۔“ اٹنے والے ہاتھ سے بالوں کو سینٹھے ہوئے اس نے مصروفیت کے عالم میں کہا۔

”میں جاگ گیا ہوں۔؟“ وہ معصومیت سے سوچنے لگا۔ ”کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں۔“ زینب نے آگے بڑھ کر اتنی زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھری کہ وہ چلا اٹھا۔

”بس! اگلیا یقین۔ اب جائیں جلدی سے منہ دھوئیں۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے پرائیٹ۔ بس پانچ منٹ ہیں آپ کے پاس۔“

وہ مسکراتا ہوا بینس کی طرف بڑھ گیا۔ ناشتے کے دوران اس نے کتنی ہی بار اس کے پرائیٹوں کی تہوں پر چائے کی خوشبو کی تعریف کی۔

زینب کا سیرو خون بڑھ گیا۔

”جی ہاں! مزہ! اگلیا ناشتہ کا۔ ایسا ناشتہ تو آدمی زندگی میں بس ایک آدھ بار ہی کرتا ہے۔“

”آپ چاہیں تو ایسا ناشتہ ہر روز کر سکتے ہیں۔“

نہیں بے فراخ دلانہ پیش کش کی۔ ”جلدی اٹھنا کچھ ایسا زیادہ مشکل بھی نہیں۔ اب میں روز آپ کو ناشتہ بنا کر دوں گی۔ ٹھیک۔“

”نہیں یار۔“ وہ ہنستا سے مسکرایا۔ ”اچھی چیز کو کم ہونا چاہیے ورنہ اس کا لطف جاتا رہتا ہے۔ ایسا ناشتہ جتنے میں بس ایک آدھ باری مل

جائے تو پورا ہفتہ زبان کا ذائقہ ہی کچھ اور ہو۔“

وہ اٹھ کر تیار ہونے چل دیا۔ سب برتین سیٹھنے لگی۔ احسن کے آفس چلے جانے کے بعد اس نے دل ہی دل میں دن بھر کے کاموں کی

فہرست تیار کی۔

کل رات احسن نے مذاق ہی مذاق میں جو شکایت کی تھی اس پر اس نے بڑی سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ وہ واقعی گھر کی جانب اتنی توجہ نہ دیتی

تھی جتنی کر دینے کا حق تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ شادی سے پہلے جب وہ احسن کے گھر آئی تھی تو پورا گھر احسن کی صفائی پسند طبیعت کا مظہر تھا۔ ہر

شے نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ بستروں کی چادروں سے لے کر گھر کے فرش تک ہر شے جگمگا رہی تھی۔ اس وقت تو اس نے ساری صفائی کو فرخندہ آپا کے

ہنرمند ہاتھوں کا کمال جانتا تھا لیکن بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے احساس ہوا تھا کہ احسن خود بہت نفاست پسند طبیعت کا مالک تھا۔ وہ

اپنے کام کے دوران صفائی ستھرائی کا بڑا خیال رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے کبھی نہ سب کو کسی معاملے میں نہ ٹوکا تھا۔ وہ جس طرح کا بھی کام

کرتی، احسن کو شکایت نہ ہوتی تھی۔ کل نبانے کس خیال کے تحت اس کے لبوں پر وہ چند جملے چلے آئے تھے جن میں شکایت بھی تھی اور طعنہ بھی تھا اور

نہیں نے تہیہ کیا تھا کہ وہ آئندہ اسے کبھی وہ لفظ دہرانے کا موقع نہ دے گی بلکہ اپنے بارے میں اس کے خیالات ہی بدل ڈالے گی۔

اس نے سب سے پہلے اپنی اور احسن کی الماری صاف کی۔ سارے کپڑے استری کر کے بیگروں میں ڈالے۔ غیر ضروری اشیاء ڈسٹ

بن کی نذر کیں۔ ضروری کاغذات فائلوں میں لگائے۔ جوتے بھاڑ کر ترتیب سے رکھے۔

بچرہ وہ کچن کی جانب متوجہ ہوئی۔ برتن دھو کر الماری میں بند کیے اور پورا کچن دیواروں سمیت دھو ڈالا۔ سب کو گڑ گڑ کر چمکا یا۔ چوبے

صاف کیے۔ جب وہ کچن سے نکل رہی تھی تو اس کی جگہ گھٹ دیکھ کر اس کا اپنا دل خوشی سے بھر گیا۔ اسے یاد آیا شادی سے قبل کچن بالکل ایسا ہی تھا۔

بعد میں نہ سب کی بے مہری اور بے توجہی نے اسے وہ کالک زدہ روپ عطا کر ڈالا تھا۔

دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی وہ ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔ یہ کام ہر چند کہ بہت مشکل تھا اور اس کی نرم و نازک طبیعت سے میل نہ کھاتا تھا

پھر بھی دل پر جبر کر کے اس نے اچھی طرح سے صفائی کی۔

ٹائلٹ بول، ٹائلز، واش بیسن اور آخر میں آئینہ۔ ہر چیز کو گڑ گڑ کر چمکا دیا۔ سوڈے اور صابن سے اس کے نرم ہاتھوں پر خراشیں پڑ گئیں

اور ان میں جلن ہونے لگی۔ گیلی گیلی چلیوں سے اسے گھن آنے لگی۔ لیکن اس نے کمروں اور پھر صحن تک کی صفائی کر ڈالی۔ سارے گلوں کو ترتیب

سے لگا کر صحن دھو دیا۔ سیرھیاں نیچے تک صاف کرائی۔ پھر اپنے کپڑے لے کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

جس وقت وہ نہا کر نکلی۔ اس کا جوڑ جوڑ ہانپاں دے رہا تھا۔ اس نے اپنی ہمت سے زیادہ کام کیا تھا۔ اور اب اس میں اتنا بھی حوصلہ نہ تھا

کہ ایک روٹی ہی بنا کر کھالے، وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی اور چند لمحوں میں غافل ہو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو عصر کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ چند لمحوں تک بے

سہ لپٹی وہ جسم میں ہوتی تبدیلیوں کو محسوس کرتی رہی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور جسم حد درجہ گرم تھا۔ کاندھوں کی حالت قابل رحم تھی۔ گردن نا دیدہ

بو جھ سے ڈھلکی جا رہی تھی۔

وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھی تو اسے احساس ہوا، اس کی آنکھ کال تیل کی آواز سے کھلی تھی یقیناً احسن کی واپسی ہو چکی تھی اور وہ نبانے کب سے تیل

دے رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

”کمال کرتی ہو یار! کیا گھوڑے، گدھے، اونٹ، ہاتھی سب بیچ ڈالے تھے؟“ پندرہ منٹ ہو گئے ہیں مجھے نیچے کھڑے ہوئے۔ میں تو ڈر

ہی گیا تھا۔ پھر سوچا شاید تم ہاتھ روم میں ہو!“

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں!“

وہ کمرے میں آکر پٹنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”خیریت!“ وہ چونکا پھر اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھا۔

”اودہ تمہیں تو نمبر پچ ہے زینو! کوئی دوائی لی؟“

”نہیں۔ میں تو بس سو گئی تھی!“ اس نے دونوں کنپٹیاں دبائیں ”تھکن ہی اتنی ہو گئی تھی۔“

”تھکن؟“ وہ حیران ہوا۔

پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ جالے اتارے گئے تھے۔ چھت اور دیواریں صاف تھیں۔ بستر کی چادریں تبدیل کی گئی تھیں۔ فرش

حد درجہ صاف نظر آتا تھا۔

”اودہ تو صفائیاں ہوئی ہیں۔ کس خوشی میں؟“ وہ مسکرایا۔

”بس یونہی!“ وہ واپس لیٹ گئی ”اور میں نے کچھ پکایا بھی نہیں ہے!“

”خیر، وہ تو کوئی مسئلہ ہے۔ میں قریبی دکان سے کچھ لے آتا ہوں۔ بلکہ تمہاری دوائی بھی لانی ہے۔ لیکن یہ اتنی صفائیاں۔ خیر تو ہے!“

اس نے باہر نکل کر پورے گھر کا جائزہ لیا۔ کچن دیکھا، باتھ روم میں جھانکا۔

”واہ بھئی، بڑا روپ دیا ہے۔“

زینب نے دیکھا۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ اسے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔ پل بھر میں اسکی ساری تھکن رفع ہو گئی۔ کاندھوں کا درد غائب ہو گیا۔

”واہ بھئی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تھا ”صفائی ہو تو ایسی، جس کے بعد انسان دودن تک بستر سے نہ اٹھ سکے۔ نمبر پچ ہو جائے!“

”میں نے کبھی اتنا کام کیا جو نہیں!“ وہ اترائی۔

”میں نے تو باب بھی نہیں کہا تھا جانو۔“ وہ بڑی محبت سے بولا ”یہ سب تو تم نے اپنی خوشی سے کیا ہے۔“

”آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“

”گھر کا چپہ چپہ تمہارے وجود کی گواہی دے رہا ہے۔ مجھے خوشی نہ ہو گئی؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا ”اور اس محنت کا کچھ انعام دیا جائے

تمہیں تو کیسا رہے؟“

”آپ کی تعریف ہی میرا انعام ہے!“ اس نے جھینپ کر کہا تھا۔

”نہیں بھئی، زیادتی ہو گئی۔“

پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ زینب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”اپنا پیسہ مون جو کہیں کھو گیا تھا!“

زینب کی آنکھوں میں الجھن ابھری تو وہ ہنس دیا۔

”بونس ملا ہے آج۔ پورے پچیس ہزار ہیں۔ مگن لو، کافی ہوں گے نا پچیس پیسہ مون کے لیے۔“

زینب کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو بھرا آئے۔

”سچ احسن؟“

”سچ جانم!“

وہ ہنس پڑی۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ احسن نے اسے پیار سے نال دیا ہے اور اب کبھی وہ یہ ذکر دوبارہ نہ دہرائے گا۔ لیکن وہ اپنی زبان کا پابند نکلا تھا۔

”میں نے وعدہ کیا تھا نام سے۔ اسی خیال کے تحت کہ جب بھی بوس ملا، میں ضرور تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ یہ ضرور ہے کہ میرے انداز سے سے کچھ زیادہ یہ لیٹ ہوگئی کپہنی لیکن وہ کہتے ہیں نا، دیر آیا درست آیا۔ خوش ہونا؟“

”بہت! اتنی!“ اس نے باز دوپھیلا کر دکھائے۔ ”بلکہ اس سے بھی زیادہ!“

وہ ہنس دیا۔

”اچھا میں کھانا لاتا ہوں اور تمہاری دوا۔“

”صرف کھانے آئیں۔ دوا کی اب ضرورت نہیں۔“ وہ شوشی سے بولی۔ ”میرا بخار بھی اتر چکا ہے اور میرے سر میں درد بھی نہیں ہے!“

احسن نے اس کا ہاتھ چھوا اور ہنس دیا۔

”تو ثابت یہ ہوا کہ تھکن کا بخار خوشی کی گولی سے منٹوں میں غائب ہو جاتا ہے!“

”جی ہاں!“ اس نے سر ہلایا ”لیکن ڈوز ذرا ہائی پادور کا ہونا چاہیے!“ دونوں ہی بے ساختہ ہنس دیے تھے۔



”میں اندر آ سکتی ہوں؟“

وہ خوشی خوشی اپنے کپڑوں کا انتخاب کر رہی تھی۔ آواز پر چونک کر پلٹی کھلے دروازے سے صوفیہ اندر جھانک رہی تھی۔

”اوہ تم!“ وہ مسکرائی ”اندر آ جاؤ۔ باہر کیوں کھڑی ہو۔“

وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اندر آ گئی۔

”زینے کا دروازہ کھلا تھا۔ نیل دینے کا مجھے دھیان نہیں رہا۔“

”بیٹھو تو سہی۔ ابھی گئیں تو کیا ہوا۔ میں تم سے پردہ تو نہیں کرتی اور پھر میں بھی اکیلی ہی ہوتی ہوں۔“

زینب مسکرائی ”احسن تو اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش بیٹھی رہی۔ زینب کے سامنے آکر ایسا ہوتا تھا۔

”کہیں جا رہی ہیں آپ؟“ وہ سوٹ کیس اور اس کے کپڑوں کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ہاں!“ وہ اطمینان سے کپڑے ایک طرف کر کے اس کے سامنے بیٹھ گئی ”شادی کے بعد ہم لوگ کہیں گھومنے نہ جا سکے تھے۔ اب جا رہے ہیں!“

”اوہ!“ صوفیہ یک لخت مرجھاسی گئی ”کتنے دنوں کے لیے؟“

”یہی کوئی دس پندرہ دن، جتنے دن کی چھٹی منظور ہو جائے!“

زینب نے اس کے چہرے پر لہراتے سایوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ یہ لڑکی شاید احسن کی اس سے شادی کو اب تک ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ زینب کو پہلے اس پر ترس آیا کرتا تھا۔ آج نجانے کیوں غصہ آ گیا۔

”کسی کام سے آنا ہوا؟“ وہ رکھائی سے پوچھ بیٹھی۔

”جی؟“ وہ کسی خیال سے چونکی تھی ”نہیں۔ میں فارغ تھی سو چال آؤں۔ شاید میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے!“

”جی نہیں، آپ نے نہیں، میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے!“ وہ طنز سے مسکرای۔

”جی؟“ صوفیہ کے چہرے پر حیرانی لہرائی ”میں سمجھی نہیں؟“

”کچھ نہیں!“ پھر زنب کو اپنے خراب رویے کا احساس ہوا۔ وہ سنبھل گئی ”چائے بناؤں تمہارے لیے یا کچھ ٹھنڈا پیو گی؟“

”اس وقت تو کچھ نہیں!“ وہ کھڑی ہو گئی ”آپ اطمینان سے اپنی پیکنگ کریں۔ میں پھر کسی دن آؤں گی۔“

”ارے بیٹھو، پیکنگ تو میں رات کو بھی کر سکتی ہوں۔ یہ ایسا کون سا لمبا چوڑا کام ہے۔“

زنب اسے روکتی ہی رہ گئی۔ لیکن وہ پھر کی نہیں۔ معذرت کر کے چلی گئی۔

”عجیب لڑکی ہے!“ وہ سوچنے لگی تھی ”ہمیشہ اسی طرح آتی ہے۔ چلاوے کی طرح۔ نجانے یہ مجھ سے ہی ملنے آتی ہے۔ یا۔“

وہ اس سے آگے نہ سوچ پائی تھی۔ اسے بڑی زور کا پکڑا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کسی غیر مرئی چیز کو تھامنا چاہا پھر فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

عجیب سی کیفیت تھی۔ دل اندری اندر دڑبڑاتا چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے سیاہ دھبے سے ناچنے لگے تھے۔

ایسے میں فرخندہ آپارحت کا فرشتہ بن کر نازل ہوئیں۔

”زنب ارے!“ وہ چونک اٹھیں ”کیا ہوا ابھی؟ ارے زنب! خیریت تو ہے؟“ انہوں نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ پانی کا گلاس بھر کر

لائیں۔

”یہ لو پانی پیو!“ زنب نے دو گھونٹ لیے تو اسے تے ہو گئی۔

”افو تو یہ معاملہ ہے۔“ فرخندہ آپا فکر مند ہوئیں ”تم لیٹ جاؤ بیٹی۔ بلڈ پریشر لو ہو جاتا ہے ایسے میں۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا!“

”ہائے۔“ وہ کراہنے لگی ”یہ مجھے کیا ہو گیا آپا! یوں اچانک جیسے جسم میں جان ہی نہیں!“

”خیر ہے بیٹی۔ اللہ کا فضل ہوا ہے۔ کب سے ایسی طبیعت ہے؟“ وہ پوچھنے لگیں۔

تب زنب کی سمجھ میں ان کا مطلب آ گیا۔ اسے عجیب سی جھینپ محسوس ہوئی۔

”مجھے تو آج پہلی مرتبہ ہی۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔!“

”چلو احسن آئے تو ڈاکٹر کے پاس چلی جانا۔ بلکہ میں تمہیں یہی کہنے آئی تھی۔ احسن کا فون تھا، وہ ڈرائیٹ ہو جائے گا۔ میں لے چلوں

ڈاکٹر کے پاس؟ یہیں گلی کے کونے پر کلینک ہے؟“ زنب نے چند لمحوں کے لیے تامل کیا پھر تیار ہو گئی۔ اس کی طبیعت عجیب ہو رہی تھی اور احسن کا بھر و سناہ تھا

وہ کتنی دیر سے آتا۔

چادر اوڑھ کر وہ فرخندہ آپا کے ساتھ چل پڑی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا اور کچھ ٹیسٹ لکھ دیے۔

”یونہی تسلی کے لیے ٹیسٹ وغیرہ کرائیں۔ ویسے سب ٹھیک ہے!“ اس نے کہا تھا۔

”کوئی دوائی وغیرہ؟“ فرخندہ آپا پوچھنے لگیں۔

”نہیں کوئی دوائی نہیں۔ ڈائیٹ وغیرہ اچھی لیں اور آرام کریں۔ کوئی ٹینشن وغیرہ نہ لیں۔ زیادہ بیوی کام سے پرہیز کریں۔“

اس نے کافی ساری ہدایات اسے ذہن نشین کرا دیں۔ واپسی پر فرخندہ آپا نے اس کے لیے پھل وغیرہ خرید لیے۔ وہ منح کرتی رہ گئی۔

”آپا! احسن خود لے آئیں گے۔ آپ کیوں زحمت کرتی ہیں؟“

”لو اس میں زحمت کی کیا بات؟ بیٹی جیسی ہو میرے لیے۔ احسن تو دیر سے آئے گا۔ میں تمہیں جوس وغیرہ نکال دوں گی۔“

گھر آ کر انہوں نے بصد اصرار سے جوس پلایا۔ پھل کاٹ کر اس کے پاس رکھے اور بیٹی اس سے باتیں کرتی رہیں۔

”اس حال میں جی بہت گھبرا رہا ہے۔ اکیلی عورت تو بہت پریشان ہوتی ہے۔ خیر، تم بالکل نگرمت کرنا۔ میں ہوں تا یہاں۔ دھیان رکھوں گی تمہارا۔ خدا تمہاری گود ہری کرے ساتھ خیریت کے۔ سمجھو گھر میں رونق ہی رونق ہوگی۔“

وہ اس قدر خوش نظر آ رہی تھیں کہ زینب کو حیرت ہونے لگی۔

”کب سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا میرے احسن کو بنادے۔ اس نے میری دعا قبول کی یا خدا تیرا شکر ہے!“

وہ بڑی لگن سے کہتی اس سے، کبھی خود سے، کبھی خدا سے مخاطب تھیں۔ زینب نے انہیں اتنا خوش کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ واقعی احسن کو بے حد چاہتی تھیں۔ اسے یقین آ گیا۔ احسن آیا تو ایک غیر متوقع چویشن دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ پھر جب اسے صورت حال کا علم ہوا اس کے چہرے پر روشنیاں جل اٹھیں۔

لیکن فرخندہ آپا کی موجودگی کی وجہ سے وہ کچھ اظہار نہ کر سکا۔

زینب فرخندہ آپا کے جلد چلے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن وہ اپنی دھن میں احسن کو نبھانے کیا کیا ہدایت دیے جا رہی تھیں۔

”ہم لوگ تو ویسے بھی گھومنے جا رہے ہیں آپا!“

احسن انہیں خوشی خوشی بتانے لگا، ”اس کا دل تو ویسے ہی لگا رہے گا دس پندرہ دن!“

”ہائیں!“ وہ جھل پڑیں ”باؤ لے ہوئے ہو۔ اس حال میں بچی کی شامت بلوائی ہے؟ خبردار جو اسے گھر سے نکالا۔ پہلی پہلی مرتبہ بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔“

زینب کا دل اچھل کر طحط میں آ گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر رنگ میں بھگ ڈالنے لگی تھیں۔

”کیا مطلب آپا؟“ احسن تشویش سے پوچھنے لگا۔

”کیا اس میں کچھ غلط بھی ہو سکتا ہے؟ کوئی خطرے کی بات ہے؟“

”بیٹا! اس حال میں ڈاکٹر سفر سے، مکان سے منع کرتے ہیں اور پھر ہم نے تو یہی سنا ہے بزرگوں سے کہ لڑکی کو اپنے گھر میں رہنا چاہیے۔ کبھی مجبوراً نکلتا پڑ جائے تو اور بات ہے۔ ویسے تم لوگ چاہو تو ڈاکٹر سے مشورہ کر لو!“

احسن گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔

فرخندہ آپا چلی گئیں تو وہ اس کے قریب آ بیٹھا لیکن اس کے تیور مگر پکے تھے۔

”بس اب آپ ان کے کہنے پر بننا بنایا پروگرام نہ بگاڑ دیجیے گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یازرنی آپا ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ ٹرین کا سفر تو ویسے بھی تمہارے لیے ٹھیک نہیں پھر گھومنا پھرنا تو انسان کو جسانی طور پر تھکا دیتا ہے۔“

اس نے رسائیت سے سمجھایا۔ زینب کا منہ پھول گیا۔ ساری خوشی عارت ہو کر رہ گئی تھی۔

”اس مصیبت کو بھی اس وقت نازل ہونا تھا!“ وہ میز کر بولی۔

”زینو! احسن کو اس کی بات بہت بری لگی“ یارا! کچھ ہوش کے ناخن لو۔ جو منہ میں آتا ہے، بولتی چلی جاتی ہو۔ پتا ہے کتنی خراب بات کی ہے اس وقت!“

”پتا ہے مجھے۔ میرے نصیب میں تو کوئی خوشی ہے ہی نہیں۔“ وہ منہ چھپا کر رونے لگی۔ ”کتنی محنت سے پیکنگ کی تھی۔ کپڑوں کا انتخاب کیا تھا۔“

”ارے یار..... تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ پھر چلے چلیں گے۔ دو نہیں تین بن کر!“ اس نے قدرے شوخی سے اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا۔

”جی ہاں! میرا ماغ خراب ہے جو میں وہاں جا کر پوترے دھوٹی رہوں!“ احسن کو ہنسی آگئی۔

”اور یہ فرخندہ آپا یہ تو قاتل ہیں میری خوشیوں کی۔ مجال ہے جو یہ میری کوئی سی خوشی سلامت رہنے دیں۔ اسی وقت چھری چلا دیتی ہیں۔“

”یا خدا!“ احسن نے سر تھام لیا ”اب ان کا کیا قصور؟ انہوں نے تمہارے بھٹکی کی ایک بات کی ہے!“

”مجھے نہیں چاہئیں ان کی ہمدردیاں۔“ وہ زور سے بولی ”اپنے پاس رکھیں۔“

احسن نے مناسب جانا کہ وہ کچھ دیر کو اس کے پاس سے اٹھ جائے۔



چند روز ایسے ہی بدولی سے گزر گئے۔

اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اور موڈ بھی خراب تھا۔ وہ منہ سر لپیٹے سارا سارا دن پڑی رہتی۔ فرخندہ آپا روز آتیں۔ اس کے مختلف کام پنپا دیتیں۔ اسے کھانا، دودھ، جوس وغیرہ بعد اصرار پلاتیں لیکن وہ ان سے زیادہ کلام نہ کیا کرتی تھی۔ بس ضرورت کی کوئی بات کر لیتی تھی وہ بھی تیوری پر بل ڈال کر۔

ان کو اس بات کی چنداں خبر نہ تھی کہ وہ ایسا ناراضی میں اور کسی خفگی کے تحت کرتی ہے۔ انہوں نے اس کو بھی اس کی طبیعت کی خرابی پر محمول کیا تھا۔ احسن اس کا بہت زیادہ خیال رکھ رہا تھا۔ وہ آفس سے جلد آ جاتا تھا اور ہر ممکن طریقے سے اس کا دل بہلانے کی کوششیں کیا کرتا۔ لیکن فی الحال وہ اسے بھی زیادہ لفٹ نہ کر رہی تھی۔ اسے نہ صرف فرخندہ آپا سے بلکہ احسن سے بھی سخت شکایت تھی۔ وہ فرخندہ آپا کی ہر بات کو اب تک ایمان کا درجہ دیتا تھا۔

اور نہ اب اس کے نزدیک کم عقل اور بے وقوف تھی۔

کتنے خواب بن ڈالے تھے اس کی آنکھوں نے محض دو دن میں اور محض دو دنوں میں ہی خواب جیسے کوئی نوح کر لے گیا تھا۔ اسے تو دل ہی دل میں اس اس آنے والے وجود سے بھی چڑھی ہو گئی تھی۔

سارا دن دل خراب رہتا۔ رات کئی کئی مرتبہ آنکھ کھل جاتی اور یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اس کے سینے پر بیٹھا اس کا گلا دبائے جاتا ہے۔ ابھی تو مشکل آسان ہونے میں مبینوں باقی تھے اور وہ ابھی سے اکٹائی گئی تھی۔

”زینب!“ ایک دن فرخندہ آپا ایک لفافہ اٹھائے چلی آئیں ”یہ خط آیا ہے تمہارا لندن سے سائن کر دو۔“

”لندن سے؟“ وہ غائب دماغی سے بولی پھر چونک اٹھی ”ضرور فارحہ کا ہوگا!“ کتنے دن بعد کوئی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے جلدی

جلدی سائن کیے اور پین اور رسید فرخندہ آپا کو تھا کہ لفافہ چاک کرنے لگی۔

ایک خط اور کئی تصویریں اس کے نیچے پر بکھر گئی تھیں۔ اس نے خط کھولا۔ لکھا تھا۔

”پیاری زینب۔“

سدا خوش رہو۔

امید کرتی ہوں خیریت سے ہوگی۔

میں لندن آ چکی ہوں اور اپنا فلیٹ سیٹ کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کر رہی ہوں۔ یعنی تمہیں خط لکھنے کا۔ تم بھی سوچ رہی ہوگی

کہ میں نبانے کہاں غائب ہو گئی ہوں۔

دراصل نئی جگہ کا چارم اتنا تھا کہ کتنے ہی دنوں تو میں امی، ابو سے فون پر بات تک نہ کر سکی۔ سارا سارا دن گھر کی سیٹنگ کرتی اور شام کو

میں اور فیصل گھومنے نکل جاتے۔

چند ہی دنوں میں لندن گھما ڈالا ہے فیصل نے مجھے۔ بہت اچھا شہر ہے۔ مجھے بہت پسند آیا یا شاید نئی جگہ کی بات ہے۔ ویسے اگلے ماہ ہم لوگ پورا یورپ گھومنے جا رہے ہیں۔ اتنی ایکسٹنٹ ہے مجھے، رات کو نیند نہیں آتی!

اگلا خط تمہیں ٹور سے واپس آ کر لکھوں گی۔ اپنی اور اپنے فلیٹ کی تصویریں بھیج رہی ہوں ہے تو چھوٹا سافلیٹ لیکن میں نے اسے بڑے چاؤ سے سنوارا ہے۔ تصویریں دیکھو اور میرے ذوق کی داد دو۔ اور وہاں! تمہارا ایڈریس اگر تبدیل ہو جائے (جس کی امید اب مجھے باقی نہیں رہی) تو میرے سیکے اطلاع کر دینا میں اکثر وہاں فون کرتی ہوں۔

اور تم کسی ہو؟ کیا پروگریس ہے؟ احسن بھائی کا کیا حال ہے؟ تفصیلی لکھو۔ میرے گھومنے کے لیے جانے سے پہلے تمہارا خط آ جانا چاہیے۔

تمہاری دوست فارحہ فیصل۔

وہ خط رکھ کر تصویریں دیکھنے لگی۔ فارحہ کی صورت سے زیادہ غور اس نے فارحہ کے گھر اور اس کی چیزوں پر کیا۔ واقعی فارحہ نے بڑی محنت سے اپنا چھوٹا سا گھر ترتیب دیا تھا۔ بہت خوب صورت چیزیں اسے سنوارنے میں استعمال کی تھیں۔
نیزب ایک گہرا سانس بھر کر اپنا کمرہ دیکھنے لگی۔ اس کے دل میں بھی کیسا شوق بیدار ہوا تھا ایک خوب صورت سے گھر کا۔ جو کسی اچھی سی، صاف ستھری سی جگہ پر ہوتا۔ جس کے کمروں کی آرائش و سجاوٹ پر اس کی احسن سے گھنٹوں بحث ہوتی۔
لیکن قسمت!

”سچی سچی تو کہہ رہی تھی فارحہ۔“ اسے فارحہ کی ایک گزری ہوئی بات یاد آئی ”احسن نے تو کبھی بھی میری کسی بھی خواہش کا احترام نہیں کیا۔ جو بھی میں نے کہا، نال دیا۔ وقت کی گرد کے نیچے میری ہر خواہش کو دباتا جاتا ہے یہ شخص۔“
پھر اس کے دل میں نئے سرے سے ایک عزم بیدار ہوا تھا۔



سلگتے چہرے

ضو بار یہ ساحر کے جذبات نگار قلم سے ایک خوبصورت ناول..... اُن سلگتے چہروں کی کہانی جن پر بھی آنکھوں میں انتظار کا عذاب لودے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدانِ گل میں آنا پڑا۔ اس کے زلزلہ جاذبوں پر فرض کا ناگ مٹھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پر کھٹنے کے فن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے ویرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دیتا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیٹنے والی ہر اذیت کو اُس نے بھجوا دیا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ کس کبھی پیکر بن کر اس کے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آرہا ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

”بس اب تمہاری نہیں چلی احسن صاحب! اب تمہیں میری بات ماننی ہوگی۔ میں بھی دیکھتی ہوں تمہیں میرا کتنا خیال ہے؟“

وہ بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اسے احسن کا شدت سے انتظار تھا۔ اپنی سون کا پروگرام تو ملیا میٹ ہو ہی گیا تھا لیکن اب اسے اپنا دوسرا خواب پورا کرنا تھا۔ وہ ہر حال میں یہ گھر بدلنا چاہتی تھی۔ اسے اس جگہ سے بھی جان چھڑانی تھی فرخندہ آپا سے بھی اور فارحہ کے طعنوں سے بھی!

احسن آیا تو وہ غیر معمولی حد تک خاموش تھی۔ اس کے گرم جوشی سے کیے گئے سلام اور مزاج پر سی کا جواب بھی محض اس نے سر ہلا کر دے دیا تھا۔

وہ اس کے رویے کو طبیعت کے متضعل بن پر محمول کرتا ہوا، کپڑے تبدیل کرنے کے چلا گیا پھر خود ہی جا کر کچن سے کھانا نکال کر لے آیا۔
”کھانا کھالیا ہے نہ یوتم نے؟“ دسترخوان کی تہیں کھولتے ہوئے وہ گھن سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔
”نہیں۔“ وہ دھیسے سے بولی۔

”آ جاؤ پھر جلدی سے۔ یہاں تو بھوک سے آنتیں بل کھا رہی ہیں۔“

”آپ کھائیں، مجھے بھوک نہیں۔“ اس کا رویہ حدود پر خشک تھا۔

اب کے اس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ لگے سے لباس میں ملبوس، الجھے الجھے بالوں کے ساتھ وہ بے حد اداس نظر آ رہی تھی۔ وہ کھانا وہیں چھوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”کیا بات ہے نہ یوتم؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔ کھانا کیوں نہیں کھالیا اب تک؟“ وہ بے حد فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میری طبیعت کو کیا ہونا ہے۔ بس بھوک نہیں ہے۔“ وہ چڑے چڑے سے انداز میں گویا ہوئی۔

احسن نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”دیکھو نہ ب! پھر وہ بولا۔“ تم جانتی ہو نا اس حالت میں بھوکا رہنا کس قدر ضرر رساں ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا نا اس بات کا خیال رکھنے کے لیے اور پھر فرخندہ آپا جو دن رات تمہیں سمجھاتی رہتی ہیں۔“

”فرخندہ آپا، فرخندہ آپا، فرخندہ آپا۔“ وہ چیخ پڑی۔

”بس اسی نام کی تسبیح کرتے رہا کریں ہر وقت آپ! چڑ ہو گئی ہے مجھے اس نام سے ہی۔ گھوم پھر کر بات میں بس ان کی بات، بس ان ہی کا ذکر، ان کی نصیحتیں یوں ہی دماغ تھکا دینے کو کافی ہیں۔ آپ مزید شکر مکر نہ کیا کریں۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ پھر وہ بولا۔ ”کیا پھر جھگڑا بیٹی ہو ان سے؟“

”میرا دماغ ابھی اتنا خراب نہیں ہوا کہ ہر وقت کسی نہ کسی سے جھگڑتی ہی رہوں۔“ وہ جیسے برا مان کر بولی تھی۔

”ای خدا۔“ وہ جیسے جھکا سا گیا۔ ”نہیب! معاملہ کیا ہے؟ کیوں ہمہ وقت الجھی الجھی سے، خفا خفا ہی رہتی ہو۔ کس سے شکایت ہے تمہیں؟ مجھ سے؟ فرخندہ آپا سے؟ یا کسی اور سے؟“

”اپنی قسمت سے ہی شکایت ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”کسی اور سے کیا ہونی ہے۔“ وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”کیا ہوا ہے تمہاری قسمت کو؟“ پھر اس نے مدھم لہجے میں پوچھا تھا۔ ”کیا چاہتی ہو؟ بولو۔“

نہیب خاموشی سے دوسری جانب کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ فی الوقت وہ اس سے کچھ بات کرنا نہ چاہتی تھی۔ احسن گہری سانس لے کر سے نکل گیا۔ میز پر کھانا جوں کا توں رکھا رہ گیا تھا۔



شام تک بونہی گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ احسن ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا تھا جب کہ وہ لیٹے لیٹے سو گئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ مسجد سے مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔ احسن نیم غنودگی کے سے عالم میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ زنب چپ چاپ کچن میں چلی آئی۔ تھوڑے سے برتن دھو کر جگہوں پر رکھے اور چائے بنا کر لے آئی۔

”احسن اچائے پی لیں۔“ اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”تم نے کیوں بنائی۔“ پھر وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ بنا لیتا۔ بے وجہ تکلیف کی۔“

”تھک جاتی ہوں لیٹے لیٹے۔“ وہ بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”ہر وقت لیٹے رہنا زیادہ تکلیف دہ ہے اور پھر میں بیمار تو نہیں ہوں۔“

احسن اسے دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”ہر وقت جس طرح خود سے اور مجھ سے الجھتی رہتی ہو اگر بیمار نہیں ہو تو بھی ہو جاؤ گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں خوش رکھوں، خوش دیکھوں

لیکن تم تو جیسے ایک حالت اضطراب میں رہتی ہو ہمہ وقت۔ مسئلہ کیا ہے زنب؟“

”مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”بس مجھے اپنے گھریلو معاملات میں ہر لمحہ فرخندہ آپا کی موجودگی پسند نہیں۔ ہر عورت کی طرح میری

بھی یہی خواہش ہے کہ میرا اپنا چھوٹا سا گھر مکمل طور پر میری مملکت ہو۔

جسے میں اپنے ہاتھوں سے سنواروں، سجاؤں۔ جس کا نکاح میری خواہش کے مطابق ترتیب دیا گیا ہو۔ ایسا گھر جو میری پسند کا ہو۔ بلا

شرکت غیرے میرا ہو۔“

احسن خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور تاثرات سے عاری تھا۔

”احسن!“ پھر وہ بولی۔ ”یہ گھر میری پسند کے مطابق نہیں ہے۔ یہ جگہ، علاقہ کچھ بھی میری پسند کے مطابق نہیں اور پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ

مجھ سے زیادہ یہاں فرخندہ آپا کی مرضی چلتی ہے۔ میں مطمئن نہیں ہوں۔ میں یہ گھر تبدیل کر لینا چاہتی ہوں جلد سے جلد۔ بس یہی ایک مسئلہ ہے

میرے ساتھ۔ اگر آپ مجھے خوش رکھنا چاہتے ہیں، خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو اسے حل کرنا ہوگا۔“

”دیکھو زنب۔“ وہ پھر بڑھ کر بولنے لگا۔ ”فرخندہ آپا سے تمہاری لاکھ نہ بنتی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہم دونوں کے لیے بہت بڑی

نعمت ہیں۔ ہر تکلیف اور مشکل میں جھٹ اٹھ کر نام نہان میں آتا ہے۔ ذرا سی بات پر دوڑی چلی آتی ہیں۔ جیسے ہم سے ان کا بہت قریبی رشتہ بنتا ہو۔

آج کل کے مطلب پرست دور میں ایسی بے غرض اور بے لوث ہستی سے یوں بے وجہ ہی دل میلا کر لینا مناسب نہیں ہے۔“

”اچھے اور بے غرض لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔“ وہ قطعی انداز میں بولی تھی۔ ”یہاں فرخندہ آپا ہیں، کہیں کوئی دوسرا ہوگا۔ اب فرخندہ آپا اس

دنیا کی واحد اچھی خاتون تو نہیں ہیں۔“ وہ قدرے طعنے بولی تھی۔

”اور پھر کیا ہم انی الوتت ایک مہنگا گھر انورڈ کر سکتے ہیں؟“ وہ قدرے تامل سے بولا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ وہ فوراً ہچک کر بولی۔ ”کیوں نہیں کر سکتے۔ ہر ماہ اچھی خاصی بچت کر لیتی ہوں میں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا تا کہ وہ

پیسے نہیں بچا کریں گے، تو نہ ہی۔ لائف اسٹائل تو تھوڑا بہتر ہو جائے گا۔“

احسن خاموش ہو گیا۔ اس کے انداز میں ہار مان لینے والی کیفیت تھی۔ زنب چائے کے برتن اٹھا کر خوش خوش کچن میں چلی آئی۔ اس نے

ایک بہت بڑا مہر کر سیر کیا تھا۔ احسن سے یہ بات منوانا اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ کہ یہ گھر، یہ علاقہ اور فرخندہ آپا، ہر شے اسے

بہت عزیز تھی اور ان میں سے کوئی ایک شے بھی زنب کو پسند نہ تھی۔

ہر چند کہ احسن بے حد خاموش خاموش سا تھا اور زنب کو اس کے رویے کی تبدیلی کا واضح احساس ہو رہا تھا لیکن اسے اس بات کی چنداں

پردانہ تھی۔ اسے مکمل یقین تھا کہ احسن اس سے ناراض رہ نہیں سکتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت عارضی ثابت ہوئی۔ اس کی زندگی میں زینب سے زیادہ اہم شے اور کچھ نہ تھی اور وہ اس بات کا اظہار کئی مرتبہ کر چکا تھا۔

وہ مطمئن مطمئن سی آ کر لیٹ گئی تھی۔ احسن نجانے کتنا وقت گزرنے کے بعد کمرے میں آیا تھا۔ بستر کے دوسری جانب آ کر وہ لیٹا تو زینب نے آہستگی سے اس کی جانب کروٹ لے لی۔

”احسن!“ اس نے دھیمے سے اسے پکارا تھا۔

”ہوں۔“ وہ چونک اٹھا۔ ”تم جاگ رہی ہو اب تک؟“

”نیند نہیں آ رہی۔ کب سے میں اپنے نئے گھر کو تصور میں سجا رہی ہوں، سنو اور رہی ہوں۔“ وہ ہولے سے ہنس دی تھی۔ ”احسن! یہ کتنا خوبصورت خواب ہے جو انسان جاگتے میں دیکھتا ہے۔ ہے نا۔“

جواباً وہ خاموش رہا تھا۔

”احسن!“ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی تھی۔ ”ہم دونوں مل کر اس کی اچھی سی سیٹنگ کریں گے۔ اس میں ڈرائنگ روم بھی ہوگا اور ڈرائنگ بھی اور ایک یا دو بیڈ روم۔ ایک چھوٹا سا، ہرا بھرا لان جس کی سرسبز گھاس پر میں روز ٹہلوں گی۔ جس میں ہر رنگ کا گلاب ہوگا اور..... اور موتیا، اور چٹیل بھی اور رات کی رانی کا پودا تو میں ضرور لگاؤں گی۔ اپنا گھر شام ہوتے ہی مہک اٹھے گا۔ ہے نا۔“

دوسری جانب ہنوز خاموش چھائی رہی تھی۔

”بے شک بہت زیادہ کرائے کا گھر نہ لیجیے گا۔ بس اچھا، صاف ستھرا علاقہ ہو اور چھوٹا سا مگر اچھی طرز پر بنا ہوا گھر ہو۔“ وہ مصالحتانہ انداز میں بولی تھی۔

دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔



وہ احسن کی خاموشی سے پریشان ضرور ہو گئی تھی، لیکن اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ اسے فارحہ کی بات یاد تھی اور وہ احسن کے دل میں اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بات ہر صورت منوانا چاہتی تھی۔

اور پھر اسے انتظار نہ کرنا پڑا تھا۔ وہ اسی شام مسکراتا ہوا چلا آیا تھا۔

”کیا کھلاؤ گی؟ ایک اچھی سی خبر ہے تمہیں سنانے کے لیے۔“ وہ اندر آتے ہی بولا تھا۔

”اچھا!“ وہ بھی خوش گواریت سے مسکرائی۔

”سنائیں پھر۔ واقعی اچھی خبر ہوئی تو جو کہیں گے وہ کھلاؤں گی۔“

”جیب میں رقم ہے؟“ وہ شرارتی ہوا۔ ”یا ایسے ہی مجھے بہلا رہی ہو؟“

”نہ ہوئی تو میں اپنے شوہر سے لالوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ وہ ہنس دیا۔

”انکر سینٹ لگے تھے خواہ میں اور وہ بھی پورے اٹھارہ سو روپوں کا۔ کیسا؟“

”ہائے سچ۔“ وہ چیخ ماکر رہ گئی۔ ”سچ احسن!“

”ہاں، میں تمہاری طرح جھوٹا تھوڑا ہی ہوں اور میں ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے مل کر اور تمہاری پسند کا ایک گھر دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اب بتاؤ،

کیا کھلاؤ گی؟“

نہن کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو آگئے۔

”ہائے احسن، کتنے اچھے ہیں آپ۔ میری..... میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، میں ہنسوں کہہ دوں۔“

”تم صرف ہنستی رہو جانو! وہ محبت سے بولا۔ ”تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔ اچھا چلو تیار ہو جاؤ۔ تمہیں گھر دکھا کر لاتا ہوں اور کھانا بھی ہم باہر کھائیں گے۔“

”آپ بہت اچھے ہیں احسن۔“ وہ جذباتیت سے بولی تھی۔

”تمہارے لیے میں اس سے بھی زیادہ اچھا ہونا چاہتا ہوں زینو۔“ وہ قدرے سنجیدہ ہوا۔ ”پھر بھی نجانے کیوں کہیں نہ کہیں کو تباہی ہو ہی جاتی ہے مجھ سے۔ چلو۔“ پھر وہ سانس بھر کر بولا۔ ”جلدی کرو۔ وہ ایجنٹ نہ اٹھ جائے۔“

.....

بڑے دنوں کے بعد وہ نیچے آئی تھی۔ ویسے بھی آج کل وہ میڑھیاں کم ہی چڑھتی اترتی تھی اور پھر یوں بھی فرخندہ آپا سے اسے جوشدید قسم کی چڑا چاک ہی ہوئی تھی، اس نے بھی اسے کم آنے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

فرخندہ آپا کچن میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔

”ارے نہن! آؤ آؤ! کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں آپا۔“ وہ مسکرائی۔ ”اب تو کچھ غیر معمولی پن کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بالکل سیٹ ہو گئی ہے طبیعت۔“

”چلو، شکر ہے خدا کا۔“ وہ اسے لے کر لاؤنچ میں چلی آئیں۔ ”بیٹھو۔ اب آئی ہو تو کھانا کھا کر ہی جانا، کوئی ہنسنے بنارہی ہوں۔“ کسی کو فتنہ احسن کو تو بہت پسند ہیں۔ تمہیں کیسے لگتے ہیں؟“

”اچھے لگتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”مگر مشکل سے بنتے ہیں اس لیے میں نے کبھی بنائے نہیں۔“

”ارے کوئی ایسی مشکل نہیں ہوتی۔ کرتے کرتے ہی عادت ہوتی ہے۔ ابھی صوفیہ آئی ہوئی تھی۔ کھڑے کھڑے سارا کام پنپا گئی۔ میں اندر صفائی کر رہی تھی، اس نے دومنٹ میں قیہ پیس کر کوئی بنا ڈالے۔ میں کچن میں آئی تو وہ آدھا کام مکمل کر چکی تھی۔ انسان کرنا چاہے تو ہر کام آسان ہے اور پھر یہ تن آسانی کی عادت لڑکیوں میں تو بالکل نہیں جیتی۔“

نہن پہلو بدل کر رہ گئی۔ فرخندہ آپا بے چاری اپنی عادت سے مجبور تھیں۔

”جلیں۔“ وہ سانس بھر کر بولی۔ ”آج آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گی کھانا۔ یوں بھی چند دنوں کا ساتھ اور ہے پھر تو آپ کی باتیں ہی یاد آیا کریں گی۔“

”کیا مطلب؟“ فرخندہ آپا اچھنبے سے اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ ”میں سمجھتی نہیں۔“

”ہم لوگ یہاں سے شفٹ ہو رہے ہیں آپا۔“ وہ مسکرائی۔ ”یہی بتانے آئی تھی میں۔ کل میں اور احسن جا کر گھر پسند کر آئے ہیں۔“

فرخندہ آپا چند لمحوں کے لیے سکتے کے سے عالم میں رہ گئیں۔ نہن کو از حد خوشی ہوئی۔ کب سے وہ اپنی دل جلانے والی باتوں سے نہن کا دل جلاتی آرہی تھیں۔ اسے ایسا لگا جیسے آج اس نے یہ خبر سنا کر گزشتہ ساری باتوں کا بدلہ لے لیا ہو۔ وہ مطمئن مطمئن سی بیٹھی رہی۔

”لیکن کیوں؟“ پھر وہ اپنی کیفیت کے حصار سے باہر آ کر بولی تھیں۔ ”نہن بیٹا! یہاں خدا نخواستہ کوئی تکلیف تھی تمہیں؟ کوئی شکایت تھی؟“

”نہیں آپا۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ”کسی سے شکایت کیا ہوئی ہے۔ بس یہ ایریا مجھے پسند نہیں اور پھر آپ نے گھر کی تعمیر بھی نجانے کس

طرز پر کی ہے۔ عجیب گٹھا گٹھا سا گھر لگتا ہے۔ چلیں جب تک احسن اکیلے تھے تب تک تو بات اور تھی لیکن اب میں ہوں، کچھ دن بعد ایک اور وجود ہو گا۔ تو نہیں چھوٹا پڑے گا۔ ہم تو چار کروں والا گھر دیکھ کر آئے ہیں۔ بہت ہوا دار اور روشن۔ کچن بھی کشادہ ہے۔ بہت اچھی طرح سے سیٹ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو میری کچھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھوں۔ سچ، پریشان ہو گئی تھی میں۔“

فرخندہ آپا خاموشی سے سنتی رہیں۔

”بڑا گھر سنبھالنا بھی تو مشکل ہو گا زنب! پھر وہ بولیں۔“ ابھی تو تم اتنا کام کر بھی نہیں سکو گی۔ گھر کی سیٹنگ کچھ آسان کام تو نہیں ہے۔ اس حال میں کیسے کرو گی اتنا کچھ۔ کم از کم اپنے فارغ ہونے کا انتظام ہی کر لیتیں۔“

”ارے آپا، ہو جاتا ہے سب کچھ خود ہی خود۔“ وہ ہنس دی۔ ”میں نہیں کروں گی کچھ بھی۔ احسن چھٹی لے لیں گے دو تین روز کی۔“

”میں تو اتنا خوش تھی کہ چند دنوں کی بات ہے گھر میں رونق ہو جائے گی۔ بچے کا وجود تو سونے گھر میں روشنی اور خوشیاں بکھیر دیتا ہے۔“ وہ حسرت سے کہنے لگیں۔ ”کیا خبر تھی کہ سونے پن میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ تم دونوں کے جانے کا خیال ہی اس قدر تکلیف دے رہا ہے۔ ہائے! کیا تمنا زنب جو کچھ عرصہ اور رہ لیتے۔ کم سے کم میں اس ننھے مہمان کو یہاں چلا پھر تا تو دیکھ لیتی۔ کس قدر شوق تھا مجھے احسن کے بچے کھلانے کا۔“

”کون سا ہم ملک سے باہر جا رہے ہیں آپا۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”یہیں اسی شہر میں رہیں گے۔ جب جی چاہے اس ننھے مہمان سے ملنے چلی آئے گا۔ ہم لوگ بھی آیا کریں گے۔“

فرخندہ آپا تصویر حسرت بنی بیٹھی تھیں۔ زنب کو انہیں دیکھ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ اتنا غم زدہ چہرہ اسے رخصت کرتے سے اماں کا بھی نہیں تھا۔

”احسن کو یہاں رہتے دس سال ہو گئے ہیں۔“ وہ پھر بولیں۔ ”اب تو یہ احساس بھی مٹ گیا تھا کہ وہ کوئی اور ہے، کہیں اور سے آیا ہے۔ وہ تو اس گھر کا ایک حصہ لگنے لگا تھا۔“

”گھر کا حصہ نہیں، آپ کو اپنی جاگیر لگنے لگا تھا۔“

اس نے تپ کر سوچا تھا۔ ”اسی لیے لے جا رہی ہوں میں اسے یہاں سے کہ کم از کم آپ کی یہ غلط فہمی تو دور ہو۔ ہماری زندگیوں کو اپنے اصولوں پر چلانے کی خواہش مند تھیں آپ، ہونہ۔“

”چلیں آپا! کھانا نکالنے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”بہت بھوک لگی ہے اور آپ تو اس قدر غم زدہ ہو رہی ہیں جیسے ہم اس دنیا سے جا رہے ہوں۔“

”خدا نخواستہ۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی۔“

”ارے آپا، ہم گئے تو نئے لوگ آجائیں گے۔ گھر خالی تھوڑا ہی رہے گا۔ کرائے دار تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔“



بڑی شدت سے وہ اگلے مہینے پہلی تاریخ کی منتظر تھی۔ پہلی تاریخ کو انہیں یہاں سے شفٹ کر جانا تھا۔ وہ نئے گھر میں جاتی، اس کی سیٹنگ کرتی، آس پڑوس میں ملنے جاتی۔ کتنی ہی خوشی آسند باتیں تھیں۔ زنب کا بس نہ چلتا تھا کس طرح وہ درمیان کے یہ سات آٹھ روز غائب کر دیتی۔

جب سے وہ احسن کے ساتھ جا کر گھر دیکھ کر آئی تھی، تصور میں صبح شام اس کے کروں اور برآمدے میں پھرا کرتی۔ وہ عین اس کی پسند کے مطابق تھا۔ صاف ستھرا علاقہ، جہاں بڑے بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے، چوڑی چوڑی کشادہ سڑکیں دیکھ کر اس کا جی خواخواہ ہی ان پر چہل قدمی کے لیے چل اٹھا اور گھر۔ اس کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک بڑے سے بنگلے کا وہ ایک چھوٹا سا حصہ تھا پھر بھی اسے کشادہ محسوس ہوا تھا۔ کم از کم

فرخندہ آپا کے دڑبے سے توبہتر تھا۔ اس نے احسن سے کہا تھا۔

موزائیک فرش، بڑی بڑی کھڑکیاں، خوبصورت دروازے، ڈرائنگ ڈائننگ میں شیشے کی الماریاں، بچن میں خوبصورت کپٹنس، زینب تو خوشی سے ناچ اٹھی تھی اور پھر چھوٹا سا گھاس کا قطعہ بھی تھا جسے اس نے از خود لان کا نام دے ڈالا تھا۔ ہر چند کہ ان کی آمدورفت کے لیے دروازہ مرکزی سڑک کے بجائے ذیلی سڑک پر کھلتا تھا پھر بھی وہ مطمئن تھی۔ کم از کم اس سڑک سی گلی سے تو جان چھوٹی تھی۔ کرایہ ان دونوں کی توقع سے کہیں زیادہ تھا کہ کہیں احسن تذبذب کا شکار نہ ہو جائے۔

”اب تو آپ کی تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے۔“ اس نے واپسی میں احسن سے کہا تھا۔ ”اب ہم آرام سے اتنا کرایہ انورڈ کر سکتے ہیں اور پھر گھونسنے تو جانہ سکے۔ وہ پیسے پڑے ہیں نا۔ ان سے ایڈوائس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

اس کا بے پروا سا انداز دیکھ کر احسن خاموش ہو گیا تھا۔ آگے آگے جو جو مسائل درپیش ہونے لگے تھے اسے ان کی چنداں خبر تھی نہ پروا۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ اس گھر کے حساب سے ان کا سامان انتہائی مختصر اور ناکافی تھا۔ ڈرائنگ روم کے لیے ایک چھوٹا سا سنگل صوفہ اور ڈائننگ کے لیے ایک چھوٹی گول میز اور پھر شفٹنگ کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت پڑتی تھی جو فی الحال ایک بے حد اضافی خرچہ تھا لیکن چونکہ وہ خوش تھی، اس لیے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا۔ اس کی خوشی کے آگے وہ ہمیشہ ہی ہار مان جاتا تھا۔

اس روز وہ دونوں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے جب فرخندہ آپا چلی آئیں۔

”زینب! آپا کے لیے بھی چائے لے آؤ۔“ احسن نے اس سے کہا۔

وہ سر ہلا کر بچن کی جانب بڑھ گئی۔

”سننا ہے، گھر چھوڑ رہے ہو۔“ فرخندہ آپا احسن سے مخاطب تھیں۔ ”بتانے بھی نہ آئے۔ بڑے مصروف ہو گئے ہو۔“ زینب کو بچن میں باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ نگوشت سے سر جھٹک کر رہ گئی۔

”بس آپا۔“ احسن شرمندگی سے ہنس دیا۔ ”کبھی آفس سے دیر ہو جاتی ہے، تو کبھی کچھ اور کام پڑ جاتا ہے پھر اس کی طبیعت کے خیال سے کبھی کہیں آنا جانا چھوڑا ہوا ہے۔ ویسے زینب بتا رہی تھی، آپ بہت اداس ہو رہی تھیں۔“

”نہ ہوں اداس؟“ وہ بولی۔ ”مجھے تو یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے میرا اپنا بیٹا مجھے چھوڑ چلا ہو۔“ ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

”ہونہہ ڈرامہ۔“ زینب نے جل کر سوچا۔

”آپا، آپا! اداس نہ ہو۔ ہم لوگ روز ملنے آیا کریں گے آپ سے۔“ احسن بڑی محبتوں سے بولا تھا۔

فرخندہ آپا بے ساختہ ہی ہنس دیں۔

”یہ بھی خوب کہی۔“ پھر وہ بولیں۔ ”ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے تو ہفتوں بعد شکل دکھاتے ہو، وہاں جا کر پھر روز ملو گے خیر! بیٹا، جہاں تم دونوں کی خوشی ہو، آرام ہو، وہاں رہو۔ بس ہنسنے ہوئے، خوش باش آباد رہو۔ میرا کیا ہے، جی کرے گا تو خود ہی چلی آؤں گی۔ بڑا ارمان ہے مجھے تمہارا بچہ کھلانے کا۔ دادی کھلو آؤں گی اس سے۔“

احسن ہنس دیا۔ زینب طنز سے مسکرا دی۔ فرخندہ آپا کے کھن لگانے کے کمال کی تو وہ بڑی معترف تھی۔ احسن کو یوں ہی تو نہیں انہوں نے مٹھی میں لیا ہوا تھا۔

”ویسے بیٹا! زینب کو چیزوں وغیرہ کو نہیں اتھہ لگانے دینا۔ کچھ اٹھا کر یہاں رکھ رہی ہے تو کچھ یہاں سے اٹھا کر وہاں لے جا رہی ہے۔ اکیلے گھر میں جا رہی ہے، مجھے تو فکر ہوگی۔ یہاں کم از کم میں دن بھر میں ایک آدھ مرتبہ حال احوال پوچھ جاتی تھی۔ وہاں کون پوچھے گا مٹی نئی جگہ پر۔ تم صبح کے گئے شام کو لوٹتے ہو۔ وہ بھی کبھی کبھار دیر ہو جاتی ہے۔“

”بس اسی بات کی تشویش ہے مجھے۔“ احسن فکر مندی سے بولا تھا۔ ”یہی سوچ رہا ہوں مسلسل۔ یہاں تو کسی بات کی فکر نہ تھی مجھے۔“

اطمینان رہتا تھا کہ آپ اس کے پاس ہوں گی۔“

نہیں جلدی سے چائے کا کپ لیے کچن سے نکل آئی۔

”عورتیں رہتی ہی ہیں اکیلی بھی۔“ وہ فرخندہ آپ کو کپ پکڑاتے ہوئے بولی تھی۔ ”ہر کسی کو ایسا آسرا نہیں ہوتا۔ بعض کے شوہر تو بیرون ملک جاتے ہیں تو وہ بھی گزارتی ہی ہیں زندگی۔ آپ دونوں تو ضرورت سے زیادہ فکر اندیش ہیں۔“

”فکر کرنی پڑتی ہے بیٹا!“ فرخندہ آپا دادا سی سے مسکرا دیں۔ ”ابھی نا سمجھ ہوں، نا تجربہ کار ہو۔ عمر ہوگی تو ان باتوں کو بھی سمجھنے لگو گی۔“

وہی رٹے رٹائے نصیحت آموز جملے جن سے اسے ازلی چڑھتی۔ وہ زبردستی مسکرا کر رہ گئی۔ فرخندہ آپا کی آمد اسے زہر لگ رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہ احسن کو بہکانے چلی آئی تھیں۔

”شیطان صفت خاتون۔“ اس نے سوچا تھا۔ ”ذرا موقع لگے اور یہ لگیں الٹی الٹی باتوں کا وہم دل میں ڈالنے بابا، ان سے تو دوری ہی بھلی۔ بعد میں سمجھ نہ ہی ملیں تو اچھا ہے۔ جب آئیں گی کوئی نیا ہی شوہر چھوڑ کر جائیں گی۔“

”یہ فرخندہ آپ کو کوئی اچھی، خوش آئند بات نہیں سمجھتی۔“ ان کے چل جانے کے بعد وہ احسن سے اظہار خیال کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”جب بات کرتی ہیں کسی ممکنہ خطرے کی بات کرتی ہیں۔ کوئی ڈرانے والی بات، کوئی دلوں میں خوف چکانے والی بات۔ عجیب خاتون ہیں۔“

”اب چھوڑ دیجی یار۔“ وہ ہزاری سے بولا۔ ”اب جاتے جاتے تو ان کے گناہ معاف کر دو تمہیں تو نجانے کیسا میرا ہوا ہے ان سے۔“

نہیں اسے خفگی سے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اب تک ان کے خلاف بات نہ سنتا تھا۔



پھر وہ دن بھی آگیا جس کا وہ شدتوں سے انتظار کر رہی تھی۔ احسن سامان وغیرہ بھیجے میں لگا ہوا تھا۔

اپنے چند دوست اس نے اس مقصد کے لیے بلوا لیے تھے۔

نہیں فرخندہ آپا کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ یوں بھی وہ چیزیں وغیرہ اٹھوانے رکھوانے میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکتی تھی۔ اسے تو بس سارا کام ہو جانے کے بعد احسن کے پیچھے بیٹھ کر آرام سے چلے جانا تھا۔

بڑے خوشگوار موڈ میں، نکھری نکھری بیٹھی وہ فرخندہ آپا سے باتیں کر رہی تھی۔ جب اپنی اداس آنکھوں میں مزید اداسی بھرے صوفیہ چلی آئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ بولی تھی۔ ”اچھا ہوا آپ یہیں مل گئیں۔ میں آپ سے ملنے کا سوچ کر ہی آئی تھی۔ آپ لوگ جا رہے ہیں یہاں سے۔“

”ہاں۔“ وہ اطمینان سے مسکرائی۔ ”ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں، میں چلی جاتی پھر نجانے کب ملنا ہوتا۔“

”کیوں جا رہے ہیں آپ لوگ۔“ اس کی آنکھوں میں واضح غمی تھی۔ ”کتنا اچھا لگتا تھا آپ لوگوں کا یہاں رہنا۔ آپ..... آپ آئی تھیں تو کتنی خوشی ہوئی تھی کہ اتنی پیاری سی، گزری لڑکی اب یہاں رہا کرے گی، ہم سے ملے گی، ہم روز اسے دیکھا کریں گے۔“

نہیں مسکرا دی۔

”ہم جائیں گے تو دوسرے لوگ آجائیں گے صوفیہ! جگہیں خالی تھوڑا ہی رہتی ہیں۔“

”دوسرے لوگ؟“ وہ اداسی سے بولی۔ ”آپ لوگوں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا زینب!“ پھر اس نے اپنی کیفیات کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا تھا۔ زینب بغور اسے دیکھتی رہی۔ وہ بہت ملول اور بے حد اداس تھی۔ اگر اسے ذرا سا بھی چھیڑا جاتا تو شاید وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ ایک گہری سانس بھر کر وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ عجب لڑکی تھی۔ عجب اس کے جذبات تھے۔ ایک شادی شدہ مرد سے وہ نجانے کون کون سی خیالات اور تصورات آباد کیے بیٹھی تھی۔

”ہم لوگ اگر یہاں سے نہ بھی جاتے تو تمہیں تو جانا ہی پڑتا صوفیہ!“ وہ کچھ دیر بعد تسلی دینے والے انداز میں بولی تھی۔ ”آخر کو ایک دن تمہاری شادی ہونی ہے۔ دوسرے گھر جانا ہے۔ تم بھی یہاں ہمیشہ تو نہیں رہو گی۔“ صوفیہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔ ”زینب جی! ایس سال بعد بھی آنا ہوا تو دیکھیے گا۔ میں یہیں ملوں گی۔“ زینب اتنی حیرت انگیز بات سن کر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔



نئے گھر میں آ کر اسے حیرت کا جھٹکا اس وقت لگا تھا جب اس نے ڈرائنگ روم میں نئے پردے، نیا صوفہ سیٹ اور ڈائمنگ روم میں چھوٹی سی گر خوبصورت ڈیزائن کی ڈائمنگ ٹیبل دیکھی۔ اس کے لیے یہ بڑا زبردست، خوشگوار سر پرانز تھا۔ ”احسن..... احسن..... یہ سب کیا ہے؟“ وہ گھر میں گھوم پھر کر دیکھتی رہی۔ خوش ہوتی رہی۔ ”کتنا اچھا لگ رہا ہے نا گھر اس سامان سے۔ کہاں سے لے آئے آپ یہ سب کچھ۔ اتنے پیسے کہاں سے آئے؟“ ”جب گھر بدالیا ہے تو پھر اس میں کچھ رکھنا بھی تو تھا نا۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں تو شاید احساس نہ تھا اس بات کا۔“ ”احساس کیوں نہ تھا۔“ وہ خفا ہو کر بولی۔ ”اتنی پاگل تو نہیں ہوں میں، لیکن میں نے سوچا تھا آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا لیکن آپ بتائیں تو سہی یہ فرنیچر کہاں سے آیا؟“

احسن نے اسے گھورا۔

”لیکن اتنی رقم کہاں سے آئی۔ آپ کے پاس تو پیسے کم پڑ رہے تھے۔ کہاں سے یہ سب کچھ خرید لیا ہے۔ یہ نئے پردے ہی بہت مہنگے معلوم ہو رہے ہیں۔“ وہ حیران تھی۔ وہ دھیسے سے مسکرا دی۔

”فرخندہ آپ اپنے تختہ تیار پردے لگوا کر دیے ہیں۔ باقی رہا فرنیچر تو اس کے لیے بھی ان ہی سے ادھار رقم لی ہے میں نے۔“

”اوہ۔“ زینب لہجہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ ”مجھ سے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا انہوں نے کتنی دیر بیٹھی رہی میں ان کے پاس۔“

”بہت ظرف والی ہیں میری آپ! اپنا دوسرے کا بھرم رکھنے والی۔ تم نے ہی ہمیشہ انہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے زینو۔“

زینب ہونٹ چبا کر رہ گئی۔

”اچھا۔ اب اٹھو اور کچن میں جاؤ۔ چولہوں کی ڈنگ ہو گئی ہے۔ چیزیں جگہوں پر ہیں۔ اچھی سی چائے بنا کر پلاؤ۔“ تھکن سے برا حال

ہے۔

”اچھا اور آپ جب تک کیا کریں گے؟“ وہ مسکرائی تھی۔

”بئی وی دیکھوں گا۔“ وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

وہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی آئی تھی۔



زندگی میں بڑی خوش گواریت کا احساس در آیا تھا۔

نئی نئی محسوس ہوتی تھی اور نئی نئی شامیں۔ اپنے پاس تھوڑی سی رقم جو اس نے شادی کے وقت سے بچا کر رکھی ہوئی تھی اس سے وہ احسن کے ساتھ جا کر کتنی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید لائی تھی کچھ نئے برتن جو اس نے اب تک ڈبوں میں بند کر رکھے ہوئے تھے، نکال کر بچکن میں رکھ دیے تھے۔ غرض ہر شے اسے نئی نئی اور خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ احسن اسے لاکھ کام کرنے سے منع کرتا لیکن ہر روز آفس سے واپسی پر اسے کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور دکھائی دیتی تھی۔ وہ نہ بے لگتھا پھر اس کی ایک خوبصورت مسکراہٹ اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔

اس روز بھی وہ ایک بڑی پینٹنگ ایک دیوار سے اتار کر دوسری پر لگا رہی تھی جب ڈور بیل گنگنا اٹھی۔

بڑی آہستگی سے کرسی سے اتر کر وہ گیٹ تک آئی۔ باہر کھڑی پیاری سی لڑکی اس کے لیے بے حد مانوس اور اجنبی تھی۔

”السلام علیکم۔“ وہ گیٹ کھلنے پر غفلتگی سے مسکرائی تھی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ میں برابر والے پورشن میں رہتی ہوں۔“

”اوہ۔“ زینب بھی بھرپور انداز میں مسکرا کر ایک طرف ہوئی۔ ”آئیں اندر آئیں نا۔“ وہ مسکرائی ہوئی چلی آئی۔ زینب اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”ہیٹھیں۔“ وہ اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔ ”بھئی یہ بیٹھیں دیکھیں نہیں چلے گا۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بے تعلق سے بولی تھی۔ ”اور زیادہ سے زیادہ کتنے دن چلے گا؟ کچھ دنوں میں ہم دونوں خود بخود آپ جناب کا تکلف ترک کر دیں گے۔ تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ شروع دن سے ہی صحیح انداز اختیار کر لیں۔ ٹھیک ہے نا۔“

”ہوں۔“ زینب نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلادیا۔

”رنگ و روغن کا کام تو کئی دن سے ہو رہا تھا۔“ وہ ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ویسے شفٹ کب ہوئے تم لوگ؟“

”ہفتہ بھر ہوا ہے۔ میں ذرا گھر کی سیٹنگ میں مصروف تھی اسی لیے پڑوس میں تاک جھانک کی فرصت نہیں ملی۔ ویسے تم کہاں رہتی ہو؟“

”یہیں۔ برابر والے پورشن میں۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ ”اس پینٹنگ کے مالک نے چار پورشن بنار کھے ہیں گراؤنڈ فلور کے، چاروں کمرائے پر انٹار کھے ہیں۔ ادھر رائٹ سائڈ پر میں ہوں۔ لیفٹ والے حصے میں ایک بنگالی جوڑا مقیم ہے اور پیچھے سب سے بڑے پورشن میں ایک کچن فمیلی رہتی ہے۔ دونوں فیملیز انتہائی بور ہیں۔ مگر ملنے چلے جاؤ تو چائے تک نہیں ملتی۔ وہ بنگالی عورت تو بس لکر لکر صورت ہی دیکھتی رہتی ہے اور باہر کچن گھر اتنا تو ان کے ہاں توجہ جاؤ ان کی بوڑھی ماں گلے میں صلیب لٹکا کر بیٹھی ملتی ہے۔ باقی کوئی بندہ گھر میں موجود نہیں ہوتا۔“

زینب کو ہنسی آگئی۔

”اچھا۔ تم بیٹھو، میں چائے بناتی ہوں ورنہ میرے بارے میں بھی تمہاری رائے مشکوک ہو جائے گی۔“

”ارے نہیں یار۔“ وہ مسکرا دی۔ ”تمہیں تو میں نے پہلی نگاہ میں ہی پاس کر دیا ہے۔ ایسی موٹی صورت تو میں بغیر چائے کے بھی روز دیکھنے آسکتی ہوں۔ بائی داوے تمہارا نام کیا ہے؟“

”زینب۔“ وہ مسکرا دی۔ ”زینب شاہ!“

”گلد پیارا نام ہے۔ لگتی بھی شاہوں کے خاندان سے ہو۔ بڑے دنوں کے بعد میں نے بہت حسین چہرہ دیکھا ہے ورنہ اب تو ایسا لگتا ہے کہ حسن مٹ چلا ہو دنیا سے۔“

وہ تعریف کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی صاف گوئی۔

”غیر اتنے مباہلے سے تو کام نہ لو۔“ زینب شرما گئی۔ ”میں ایسی بھی حسین نہیں۔“

”وقت ہوا تو تفصیل سے تمہارا نقشہ کھینچوں گی تمہارے سامنے پھر خود انصاف سے کام لے کر بتانا کہ خدا نے کتنا نوازا ہے تمہیں۔ اچھا،

چلو چائے بنا تے ہیں۔“

پھر وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ زنب نے اس کی تھلید میں کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کاشن کا مگر بے حد قیمتی لباس پہنا ہوا تھا۔ دائیں کلائی میں ایک بیش قیمت نگین تھا۔ کانوں میں شاید ہیرے کے ٹاپس پہنے ہوئے تھے۔

وہ بڑی تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ میک اپ بھی خاصا گہرا کیا ہوا تھا۔

زنب اس کو لے کر کچن میں چلی آئی۔ وہ ساتھ ساتھ گھر کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ زنب ماچس سے چولہا جلانے لگی۔

”ابھی سامان رہتا ہے تمہارا یہاں لانے کیلئے؟“ وہ جائزہ لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”سامان؟“ زنب اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ ”کیا سامان؟“

”میرا مطلب ہے جہاں سے تم لوگوں نے شفٹ کیا ہے، وہاں ابھی تمہارا کچھ سامان باقی ہے؟“

”نہیں تو۔“ زنب ابھی بھی نہ سمجھ پائی تھی۔

”اچھا۔“ اس نے کانڈھے اچکائے۔ ”سامان کچھ کم نہیں ہے تم لوگوں کا؟ گھر تو بالکل خالی خالی لگ رہا ہے۔ بیڈرومز تو بالکل بھی سیٹ

نہیں۔ کچن بھی ادھورا محسوس ہو رہا ہے۔“

زنب کو سبکی محسوس ہوئی مگر وہ نازل سے انداز میں بولی۔

”دراصل وہ گھر کافی چھوٹا سا تھا۔ ادھر تو یہ سامان ہی بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ کچن بھی بس اتنا بڑا تھا کہ ایک آدمی بمشکل سما سکے۔ اب

یہاں آئے ہیں تو آہستہ آہستہ سامان لیتے جائیں گے۔“

”ہوں۔“ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ”شوہر تمہارے یہیں ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ملک میں ہی ہیں؟“

”ہاں، ہاں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”تو اور کیا۔“

”میرے شوہر تو بیرون ملک ہوتے ہیں۔ ہر چھ ماہ بعد آتے ہیں۔“ رلی بولی تھی۔ ”اسی لئے میں نے پوچھا۔“

”اور بچے وغیرہ؟“

”بچے نہیں ہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”اکیلی رہتی ہو؟“ زنب کو حیرت ہوئے لگی۔

”نہیں۔ ایک عورت رکھی ہوئی ہے۔ سارا کام بھی کرتی ہے۔ رات کو بھی میرے پاس ہی ہوتی ہے۔“

اب زنب کو اس کے گھر گھر پھرنے کے شوق کے پیچھے چھپی محرومی کا اندازہ ہوا۔ تب ہی اسے سارے لوگوں سے کہنی نہ ملنے کی شکایت

تھی۔ اس قدر اکیلے پن کی ماری عورت کو کوئی کہاں تک کہنی دے سکتا تھا۔

”ویسے میرے بھائی وغیرہ یہیں شہر میں ہی ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ میں بھی کبھی بکھار دل بہلانے

کو کوئی جاب وغیرہ کر لیتی ہوں۔ زندگی کا احساس رہتا ہے۔ مردہ نہیں ہوتا عورت اندر سے ورنہ گھر میں بند رہ کر تو دم گھٹنے کا سا احساس ہونے لگتا

ہے۔ تم نے کبھی جاب نہیں کی؟“

”نہیں۔“ زنب نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھا۔ ”پڑھائی سے فارغ بھی نہ ہو پائی تھی کہ اماں نے شادی کر دی۔ شادی کے بعد

ابھی دم نہ لیا تھا کہ یہ مصروفیت ہو گئی۔“ اس کا اشارہ اپنی پریکٹسی کی جانب تھا۔

”جاب۔“ کس وقت کرتی تیں۔

”ہوں۔ تو اس کا مطلب ہے نئی نئی شادی ہے۔ میری شادی کو سات سال ہو گئے ہیں۔“

”کچھ ہمیں ہی شوق نہ تھا، کچھ قدرت نے بھی ساتھ دیا۔“ وہ ہتھ مار کر ہنس پڑی۔

”شوق نہ تھا؟ کیوں؟“ اسے اچھنچھا ہوا۔

”بس یار! پاؤں کی زنجیر ہوتے ہیں یہ چپاؤں میاؤں کرتے بچے۔ آدمی گھر تک سے نہیں نکل سکتا۔ مجھے تو دنیا سر کر ڈالنے کا شوق ہے۔

خیر بہت وقت لے لیا آج تمہارا۔ ابھی تو وقت پڑا ہے باتیں کہنے اور سننے کے لئے۔ اب میں چلتی ہوں۔“

”آجایا کرو۔ میں تو اکیلی بھی ہوتی ہوں اور فارغ بھی۔“ زینب نے پر خلوص آفر کی تھی۔

”ضرور آؤں گی بھئی۔ عرصے بعد تو۔ کوئی ڈھنگ کی صورت نصیب ہوئی ہے۔“ وہ ہنس دی تھی۔

زینب اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔



”آج اپنی پڑوسن آئی تھی ملنے۔“ احسن کے ساتھ شام کی چائے پیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ”مملی نام ہے یہاں برابر والے پورشن میں

رہتی ہے۔“

”اچھا۔ پھر ہوگئی ہوگی دانت کاٹنے کی دوست۔“ وہ مسکرایا۔

”نہیں ہوئی تو ہو جائے گی۔“ اس نے سر ہلادیا۔

”مجھے تو بڑی اچھی لگی ہے وہ۔ بہت بے تکلفا نہ انداز ہے۔ دیکھنے میں بھی اچھی، پیاری سی لڑکی ہے لیکن بے چاری بڑی اکیلی ہے۔ شوہر

ملک سے باہر ہوتا ہے اور بچے وغیرہ ہیں نہیں۔ ایک عورت کو ساتھ رکھا ہوا ہے اس نے۔“

”چلو۔ تم دونوں مل کر ایک دوسرے کا اکیلا پن شیراز کر لیتا۔“ احسن مسکرایا۔

”پتا ہے احسن! وہ سمجھ رہی تھی ابھی ہماری شفٹنگ کپلیٹ نہیں ہوئی، اس لئے کمرے گھر خالی خالی لگ رہا تھا۔“

اس بات پر احسن کو بھی ہنسی آگئی تھی۔ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

”ویسے بڑی ٹیپ ٹاپ سے آئی تھی۔“ اس نے رملی کے متعلق معلومات فراہم کرنا جاری رکھا۔ ”بے حد قیمتی لباس، بڑا اچھا سا میک اپ،

جیولری تو بڑی شاندار پہنی ہوئی تھی۔“

”شوہر تو اس کا یہاں ہے نہیں، اتنا تیار کس کے لئے ہوتی ہے؟“ احسن نے تبصرہ کیا۔

وہ بری طرح سے چڑھ گئی۔

”یہ بھی خوب رہی۔ اب غریب کا شوہر باہر ہے تو اسے ڈھنگ سے رہنے کا بھی حق نہیں ہے کیا؟ آپ مرد لوگ تو بس عورت کی تاک میں

رہتے ہیں کہ کب کہاں کس بات کو پکڑیں۔“

”بھئی ڈھنگ سے رہنے کا طریقہ کار تو بہت سادہ ہے۔ جس عورت کو بے وجہ تیار رہنے کا شوق ہو، اسے ہم مرد لوگ واقعی اچھا نہیں

سمجھتے۔“

”اس لئے کہ آپ لوگوں کے دل میں چور ہوتا ہے۔“ وہ چپ گئی۔

”ہاں، ٹھیک ہے پھر کوئی چوروں کو راستہ کیوں دکھائے۔“ وہ اسے جان بوجھ کر تنگ کرنے لگا۔ ”ہمیں نظر آئی تو ہم تو ضرور نظر بھر کر

دیکھیں گے۔ ہماری اپنی نیگم جو سر جھاڑ منہ پھاڑتی ہیں۔“ وہ غصے سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی پھر دفعتاً اسے کچھ خیال آیا تھا۔

”اچھا، بات سنیں۔ وہ کوئی کیمرہ وغیرہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ کسی دوست سے ادھار لے لیں۔“

”خیریت؟“ اس کے کان کھڑے ہوئے۔

”مجھے تصویریں اتارنی ہیں نا گھر کی۔ فارحہ کو بھیجوں گی۔“

نہ جانے کیوں وہ ہنسا اور پھر ہنستا چلا گیا۔ زینب حیرانی سے اسے ہنستے ہوئے دیکھتی رہی۔

”کیا ہوا؟“ پھر اس نے پوچھا تھا۔ ”اس میں آخر اتنا ہنسنے والی بات کون سی ہے؟“

”بس! فارحہ کو تصویریں بھیجنے کے لئے اتنا کچھ کرنا پڑا تمہیں۔ ہیں نا۔“ وہ اسے پھینٹنے لگا۔ ”گھر بدلنا پڑا، اسے سیٹ کرنا پڑا۔ یارزینو!

وہ ایک مثال ہے نا۔ کو اچلا ہنس کی چال تو اپنی بھی بھول گیا۔ کہیں وہ تم پر صادق نہ آئے۔“

زینب قریب رکھا کٹن اٹھا کر اس کے سر پر مار بیٹھی۔



دوسرے دن وہ واقعی کسیرہ لے آیا تھا۔ زینب نے بہت ساری تصویریں اتر والی تھیں اور اس سے اگلے روز دھوا بھی لی تھیں۔

کچھ وہ تیار بھی بہت ہوئی تھی، کچھ ان بے فکر دنوں کی شکستگی تھی۔ اس کی تصاویر بہت اچھی آئی تھیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہی فارحہ کو خط لکھنے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

پیاری فارحہ!

ہمیشہ خوش رہو۔

امید کرتی ہوں خیریت سے ہوگی۔

تمہارا خط ملنے کے کافی عرصے بعد جواب دے رہی ہوں۔ وجہ میری بے تحاشہ مصروفیت رہی۔ دراصل ہم لوگ گھر تبدیل کر رہے تھے۔ کام بہت زیادہ تھا پھر نئے گھر کی سیٹنگ کا کام کتنا مشکل ہوتا ہے۔

ہمارا یہ گھر بہت اچھے پوش علاقے میں ہے اور بہت خوبصورت طرز پر بنا ہوا ہے۔ تمہارے لندن کے فلیٹ سے بھی اچھا۔ یقین نہ آئے تو تصاویر دیکھ لو۔ ساتھ بھیج رہی ہوں۔

تمہارے لئے ایک اور اچھی خبر بھی ہے۔ تم خالد بننے والی ہو۔ تمہاری کیا پروگریس ہے۔ مجھے لکھو۔

نئے گھر کا ایڈریس بھیج رہی ہوں۔ جلد جواب دینا۔

تمہاری دوست زینب

فارحہ کو خط پوسٹ کروا کر وہ بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن سے بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اس نے ایک جہاں سر کر لیا ہو۔ گھر ہمیشہ ہی سے اس کے لئے بڑی اہمیت کا حامل رہا تھا اور اسکے پرانے گھر کے متعلق فارحہ کا رویہ بڑا تکلیف دہ تھا یا شاید اسے محسوس ہوا تھا۔ کچھ بھی تھا، بہر حال اب وہ مطمئن تھی۔ احسن سے شکایات بھی ختم ہو چکی تھیں۔ اب اسے اپنی زندگی اچھی اور دلکش لگنے لگی تھی اور پھر اب زندگی میں کوئی فرخندہ آپا بھی نہ تھیں۔ وہ ہر جانب سے فارغ اور مطمئن ہو کر آنے والے دنوں کے متعلق سوچنے لگی تھی۔



چند روز بعد اسے فراغت میں رملی کا خیال آیا تھا اس کیلئے پن کے احساس سے اس کا دل بھی گھبرا رہا تھا۔ اس نے رملی کے گھر جانے کے لئے ایک اچھے سے لباس کا انتخاب کیا اور تیار ہونے لگی۔

اپنے حساب سے بہت اچھی طرح تیار ہو کر وہ گھر سے نکلتی تھی۔ رملی کا دروازہ بالکل برابر والا تھا۔ اسے زیادہ تر دندنہ کرنا پڑا۔ ڈور تیل کی آواز پر ساڑھی لپیٹے ایک بوڑھی سی عورت باہر آئی تھی۔ زینب نے اندازہ لگایا، وہ رملی کی نوکرانی تھی۔

”رملی بی بی ہیں گھر پر؟“ اس نے پوچھا۔

جواب اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے اندر لے آئی زینب اندر آ کر حیران اور ایک دم سرعوب ہو گئی تھی۔ رملی کا گھر بے حد شاندار تھا۔ گو کہ بناوٹ کا انداز ان لوگوں کے پورن جیسا ہی تھا۔ لیکن رملی نے سینک بہت زبردست طریقے سے کی ہوئی تھی۔ وال ٹوال کا پٹ جن پر پیر پڑتے ہی اندر کودھنسا جاتا تھا۔ اعلیٰ فرنیچر، مہنگی ترین پینٹنگز، قیمتی کرسٹل۔ ہر ہر شے سے امارت اور فحاش کا واضح اظہار ہو رہا تھا۔

وہ عورت اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئی تھی۔ زینب چیزوں کو جائزہ لیتی رہی اور رملی کے شاندار ڈرائنگ روم کا اپنے سادہ سے ڈرائنگ روم سے موازنہ کرتی رہی۔

تب ہی تو رملی کو اس کا گھر خالی خالی معلوم ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی تھی۔

”اچھا، تو تم ہو۔“ اسے پیچھے سے رملی کی آواز آئی اور سامنے لگی دیوار گیر شیشے میں اس کا عکس نظر آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”اماں کہہ رہی تھیں، کوئی خوبصورت سی لڑکی ہے۔ میں نے کہا، ہائیں! مجھ سے کون خوبصورت سی لڑکی ملے چلی آئی۔ سچ تمہارا دھیان نہ آیا۔“

”اس نے قریب آ کر اس کا گال چوما۔“

”آج تو اور بھی دلکش لگ رہی ہو۔ ہائے! یہ پیلا رنگ گورے لوگوں پر اتنا کیوں چمکتا ہے؟ اور اس پر یہ شہد رنگت آنکھیں سچ، میں تو پیلا رنگ پہن کر ٹکسی لگتی ہوں۔“

زینب کو ٹکسی آگئی۔

”تم میری کچھ زیادہ ہی تعریف نہیں کرتیں؟“

”قسم لے لو۔ ڈنڈی مار جاتی ہوں۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔

زینب پھر بے اختیار ہنس دی۔

”تم خود بھی تو اتنی پرکشش ہو۔ میں نے تو احسن سے بھی تمہاری تعریف کی تھی۔“ وہ بڑے خلوص سے بولی تھی۔

”ارے جانے دو یا راسورج کے آگے تو چاند نہیں لگتا۔ میں تو دم سا چراغ ہی ہوں۔ اماں! اماں! چائے لے آئیں اچھی سی۔“

اس نے سچ میں ہی رک کر آواز لگائی تھی۔

”اور ساتھ میں ہلکٹ، ایک، پیٹری، جو بھی الا بلا ہو، لے آئیں۔“ پھر اس نے مسکرا کر زینب کو دیکھا۔ ”ایسی ہی بدحرام ہوں میں۔ سارا سارا دن پلنگ توڑتی رہتی ہوں اور اماں کو آوازیں لگاتی رہتی ہوں۔ اماں بے چاری مجھے دل ہی دل میں خوب گالیوں اور کوسنوں سی نوازیتی ہوں گی۔“

”تم کچھ کام نہیں کرتیں؟“ زینب کو تعجب ہوا۔

”اوں ہوں۔ ہاتھ نہیں ہلاتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”مجھ بھی اتنی اسارٹ ہو۔ عورتیں تو سنا ہے بہت پھیل جاتی ہیں۔“ زینب نے رشک سے اس کے نرم و نازک وجود کو دیکھا تھا۔ یوں بھی وہ آج کل جس کنڈیشن میں تھی، اسارٹ لڑکیوں کو یوں ہی رشک و حسد سے دیکھا کرتی تھی۔

”میں نے تو کبھی کام کیا ہی نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”شادی سے پہلے بھی نہیں کیا۔ شاید وہ عورتیں پھیل جاتی ہیں جو کام کرتے کرتے چھوڑ دیتی ہوں۔ ویسے میں اپنی ڈائیٹ کا پورا خیال رکھتی ہوں کہ زائد کیلوریز ہرگز میرے حصے میں نہ آنے پائیں۔“

”اور یہ جو یکے لے کر اور الہا بلا مکتوا رہی ہو؟“ زینب نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”وہ تو تمہارے لئے ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”آخر پہلی مرتبہ میرے گھر آئی ہو۔“
 دونوں کے بیچ خاموشی کا ایک وقفہ آیا تھا۔ زینب ارد گرد دیکھنے لگی تھی۔

”تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے رملی!۔“ پھر وہ بولی۔ ”بہت اچھا سیٹ کیا ہے تم نے۔“

”ہوں۔“ یار اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ یہی کام کرتی رہتی ہوں۔ آؤ تمہیں اپنا بیڈروم دکھاؤں۔“ وہ اسے لے کر اندر دینی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ زینب اس کی ہمراہی میں پورے گھر کا جائزہ لیتی گئی۔ بیش قیمت قالینوں اور نہایت کم یاب انڈور پلانٹس سے سجاس کا الائنجمنٹ ہی بہت دیدہ زیب تھا۔ اس پر بیڈروم کی آرائش نے تو زینب کو گنگ سا کر دیا۔ غرض کہ پورا گھر رملی کی اعلیٰ ترین چوائس کا مظہر تھا۔ اس کا فرنیچر، پردے، انڈرور پلانٹس اور کرٹن۔ ہر شے نہایت مہنگی اور شاندار تھی۔

”تمہارے شوہر کیا کرتے ہیں رملی؟“ وہ پوچھ بھانسنے لگی۔

”میرے شوہر.....“ اس نے سانس بھری۔ ”انجینئر ہیں۔ کویت میں ہوتے ہیں۔ ہر چھ ماہ بعد آتے ہیں اور پورے چھ ماہ تھیلوں میں بھر کر نوٹ بھیجتے رہتے ہیں۔“

رملی کو ہنسی آگئی۔ زینب بری طرح سے جھینپ گئی۔

”اتنے روپوں کا کیا کرتی ہو۔“ وہ جھینپ مٹانے کے لئے پوچھنے لگی۔ ”یہی آرائش کی چیزیں خریدتی رہتی ہوں۔“

”اور ابھی بہت سے کام آتا ہے روپیہ۔“ وہ ہنسی۔ ”اس دولت کا تو اپنا ہی ایک نشہ، ایک سرور ہوتا ہے زینب جان! جیب میں روپیہ ہو تو ساری دنیا سے قدموں تلے دکھائی دیتی ہے اور جیب خالی ہو تو انسان خود کو میلے سے باہر کھڑا غریب پوچھ محسوس کرتا ہے۔“

”ہاں“ زینب نے گہری سانس بھری تھی۔

”ویسے یہ سارا سامان میں نے جمع نہیں کیا۔“ پھر رملی بولی تھی۔ ”میرے بھائی کو بھی بہت شوق ہے ایسی نادر چیزوں کا۔ جب کہیں جاتے ہیں میرے لیے نجانے کیا کچھ اٹھالاتے ہیں۔ اس کی قیمت سنی تو دودن کے لیے بے ہوش ہو گئی اور جیولری تو بہت شاندار لاتے ہیں بھائی ایک ٹیکس تو اتنا قیمتی ہے۔ میں نے پوچھا، بھائی! کہیں یہ ملکہ الزبتھ کے محلے سے تو نہیں اتار لائے۔“

دونوں ہی ہنس پڑیں۔

”ظہر، میں کچھ چیزیں دکھاتی ہوں تمہیں“ وہ اٹھ کر الماری تک گئی اور وہاں سے ایک ڈبا اٹھالائی۔
 ”یہ دیکھو۔“

اس نے ڈبہ کھول کر زینب کے آگے الٹ ڈیا زینب کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ بہت حسین اور قیمتی جیولری تھی۔ وہ ایک ایک چیز دیکھتی گئی۔
 ہار، بندے، انگوٹھیاں، بے شمار چیزیں تھیں اور نوادرات میں شمار کی جاسکتی تھیں،

”بہت خوب، رملی! تمہارے پاس تو بڑی بیش قیمت جیولری ہے۔“ وہ سحر کے عالم میں بولی تھی۔

”زیادہ تر چیزیں بھائی نے گفت کی ہوئی ہیں۔ مجھے جیولری کا کچھ ایسا خاص شوق نہیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”رملی بی! اس کی بوڑھی ملازمہ اندر آئی تھی۔“ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”اوہ ہاں مجھے تو دھیان ہی نہ رہا۔ آؤ زینب! چائے پیتے ہیں۔“

زینب دل ہی دل میں اس کی قسمت پر رشک کرتی باہر کی سمت بڑھ گئی۔



کتنے ہی دن ایک سحر کے عالم میں گزرے تھے۔ ملٹی کا گھر تو ایک خواب تھا۔ ایک مکمل خواب، جس کی تعبیر وہ اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا گھر دیکھ کر نہ بک نہ کھانا کھانا خالی اور دیران دیران لگتا تھا۔

کل تک جس گھر کی تصویریں بنا کر اس نے خوشی خوشی فارحہ کو ارسال کی تھیں، آج وہی گھر اس کی نظروں سے اتر گیا تھا تاہم اس نے احسن سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ اسے علم تھا وہ اسے خطی اور بے وقوف قسم کے خطابات سے نوازتا اور شاید اپنے طور پر حق بجانب بھی ہوتا لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی اس کا جی تو دنیا کی ہر خوبصورت اور اچھی اچھی چیزوں پر چل جاتا تھا۔

آج کل وہ گھر کا کام بھی مارے بندھے کر رہی تھی۔ گھر بڑا تھا، کام بھی زیادہ ہوتا تھا۔ وہ جھاڑو لگاتی تو اس کی کمر میں درد ہو جاتا۔ پونچھا پھیرتی تو کھڑا ہونا دو بھر لگنے لگتا پھر جھاڑو پونچھ، کچن کی صفائی سترائی، اس کے بعد برتن دھونا اور کھانا بنانا تو اسے ایک عذاب لگنے لگتا تھا۔

ایسے میں اسے پھر ملٹی یاد آ جاتی۔ کیسے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتی تھی۔ بقول اس کے، ہاتھ تک نہ ہلاتی تھی۔ ہر کام اس کی ملازمہ کے ذمہ تھا۔ کچھ دن اور تکلیف وہ انداز میں گزرے تو وہ صبح بچ ایک ملازمہ رکھ لینے کے متعلق سوچنے لگی۔ ہر چند کہ بخوبی احساس تھا کہ آج کل احسن بیسوں کے معاملے میں بہت فکر مند رہنے لگا تھا۔ گھر کا کرایہ بہت زیادہ تھا اور پھر ادھر کا خرچہ بھی بہت ہو چکا تھا۔

اس پر فرخندہ آپا کا قرض اسے پریشان رکھتا تھا۔

ایسے میں اس سے ایک ملازمہ کا تقاضا کرنا یقیناً اس پر ظلم کرنے کے مترادف ہوتا۔ چند دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے لیکن ایک شام چائے پاتے ہوئے اسے اس زور کا چکر آیا کہ وہ گرتے گرتے رہ گئی وہ تو شکر ہوا کہ احسن بھی پانی پینے کے لیے وہیں کھڑا ہوا تھا۔ اسے سہارا دے کر وہ باہر لے آیا۔

”کیا ہوا ہے زینو؟“ وہ بے حد پریشان ہو گیا تھا۔

”ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟“

”نہیں نہیں، میں ٹھیک ہوں“ اس نے سرسری کی پشت سے نکا دیا۔ ”بس یوں ہی ذرا سی نقاہت ہو گئی تھی۔“

”نقاہت؟ لیکن کیوں؟ تم سارا دن ٹھیک سے کھاتی جیتی نہیں ہو؟“ وہ خفا ہوا۔

”یہ بات نہیں ہے احسن“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”دراصل کام اتنا ہے کہ مجھ سے سنبھال نہیں جاتا۔ ایک اکیلا بندہ کیا کیا کر سکتا ہے پھر جب حالت بھی ایسی ہو۔“

”ہوں۔ بس ٹھیک ہے“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”آج کے بعد تم کچھ نہیں کرو گی۔ میں آفس سے آ کر خود ہی سارا کام کر لوں گا۔“

”آپ؟“ وہ ہلکی ہوئی۔

”ہاں ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے جھاڑو پونچا اور برتن دھونے کا کام بھی کوئی کام ہے؟ میں منٹوں میں کر لوں گا۔ سالن میں تم سے زیادہ

اچھا بناتا ہوں۔ رہا روٹیوں کا سوال تو وہ بازار سے آ جایا کریں گی۔“

”رہنے دیں آپ؟“ وہ خشکی سے بولی ”میں ہی کر لوں گی کام؟“

”اور یہ جو تمہاری طبیعت خراب ہوئی ہے آج؟“

”میں نہ ہوتا تو دھڑ سے گرتی فرش پر کوئی اٹھانے والا بھی نہ ہوتا۔ آج احساس ہوا ہے فرخندہ آپا کیسے بڑی نعمت تھیں۔ کتنا ہاتھ بٹا دیا کرتی

تھیں وہ تمہارا۔ خیال بھی رکھتی تھیں۔“

”جانے دیں اس بات کو اور میرا اتنا ہی خیال ہے تو کوئی جزو وقتی ملازمہ رکھ دیں۔ بہت ملتی ہیں ان علاقوں میں۔ چار، پانچ سو میں کتنا ہی

کام چنا جاتی ہیں۔“

”ملازمہ!“ وہ سوچ میں پڑا۔

”ہاں ہاں، یہ رملی نے تو کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی ہے دو ہزار دیتی ہے اسے اور سارا گھر کا کام کرواتی ہے میں تو صرف صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے واسطے رکھوں گی۔ پانچ سو سے زیادہ نہیں لے گی۔“

”پانچ سو“ وہ ہنس دیا ”یار! اب تو شاید پانچ روپوں کی گنجائش بھی، مشکل نکلے۔ اتنا قرض جو لے رکھا ہے آپا سے چند مہینوں کے نام پر۔“

”ہاں“ زینب نے سانس بھری ”ٹھیک ہی تو ہے۔ پہلے قرض تو اترے۔ یہ جو نچلے تو بعد کی باتیں ہیں“ احسن خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

تھا۔



اس سے اگلے روز ہی وہ ایک عورت کو لے کر چلا آیا تھا۔ زینب نے دروازہ کھولا تو اس کے پیچھے کھڑی سیاہ فام عورت کو دیکھ کر حیران رہ

گئی۔

”کون ہے یہ احسن؟“

”ذروت“ اس نے زینب کے کان میں سرگوشی کی۔ ”میں بڑا احسن پرست ہوں“

”زینب اسے گھور کر رہ گئی جب کہ وہ خود اپنی ہی بات سے لطف اندوز ہو کر ہنس پڑا تھا۔

”یہ جیلہ ہے“ پھر وہ بولا ”اسم باکی آج سے یہ روز آیا کرے گی، صفائی ستھرائی اور دوسرے کاموں میں تمہارا ہاتھ بٹا دے گی، میرے آنے تک یہ یہیں رہا کرے گی۔“

”ہوں۔“ اب کے زینب نے بغور اس عورت کا معائنہ کیا۔

وہ ایک نہایت سیاہ فام، دہلی پتلی، بے ضرری عورت تھی، ہر کام پر ”جی ہاں“ کہہ دینے والی، زینب نے اس سے ایک دو کام کروائے جو اس نے نہایت سلیقے سے اور صفائی سے سرانجام دیئے اسے او، کے کر کے زینب نے روٹی پکانے کا کام اس کے حوالے کیا اور باہر نکل آئی۔ احسن نہا دھو کر ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”کہاں سے مل گئی یہ آپ کو؟“

”تم نے کل کہا تھا نا، بس میں نے کر دیا انتظام، وہ اتر آیا۔

”بہت نوازش آپ کی، وہ دلکشی سے مسکرائی ”لیکن کل تو آپ کہہ رہے تھے کہ.....“

”ارے یار! پیسوں کا کیا ہے، پیسے خرچ ہو ہی جاتے ہیں“ وہ بولا ”دیکھیں گے کسی اور مد میں کچھ بچت کر لیں گے۔ یہ اچھی عورت ہے جو

دیں گے چپ چاپ رکھ لے گی۔ کم از کم عارف صاحب نے تو یہی بتایا ہے“

”عارف صاحب؟“

”باس ہیں میرے۔ آج ان سے ذکر کیا تھا میں نے، انہوں نے اسے بلا بھیجا کہہ رہے تھے بڑی مظلوم قسم کی عورت ہے۔ لفافے بنانے

کا کام کرتی ہے، اس سے گز نہیں ہوتا۔ گھروں میں کام کاج کی تلاش میں رہتی ہے۔ میں اسے یہاں لے آیا یہ ہے کل کہانی“

”بہت دلچسپ ہے“ وہ کھسکا کر ہنس دی۔ ”کم از کم مجھے تو بہت دلچسپ لگی۔“

”تمہیں تو لگتی ہی ہے“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”اور آپ کو؟“ وہ شرارتاً بولی تھی۔

”ہمارا کیا ہے بھئی؟“ اس نے سانس بھری۔ ”ہم تو آپ کی خوشی میں خوش ہیں“
 زینب غرور سے مسکرائی۔



اس روز اچانک ہی بالکل غیر متوقع طور پر فرخندہ آپا چلی آئی تھیں۔ نجانے کیوں اتنے دن بعد ان سے مل کر زینب کو بھی خوشی ہوئی انہیں
 لیے وہ خوشی خوشی اندر چلی آئی۔

”بھئی بڑے بے مروت ہو دونوں میاں بیوی“ وہ اندر آ کر بیٹھے ہوئے بولی تھیں ”ایسے گئے کہ پلٹ کر نہ اپنی خبر دی، نہ دوسرے کی
 پوچھی۔ اور وہ احسن کہاں ہے؟ کہتا تھا روز ملنے آؤں گا۔“

زینب مسکرا دی۔

”نیا گھر لیا پھر بھی جھوٹے منہ نہ بلایا کہ آکر ہمارا گھر ہی دیکھ جاؤ۔ ایسی بھی کیا مصروفیت، میں تو اسے بے مروتی ہی کہوں گی۔“
 زینب واقعی شرمندہ ہو گئی۔

”ہاں آپا! سچ تو یہ غلطی ہوئی ہے ہم دونوں سے۔ چلیں جو سزا چاہیں سنا دیں“

”اری بیٹی! میں کون ہوتی ہوں سزا سنانے والی“ وہ فوراً ہی مسکرا دیں۔ ”میں تو تم دونوں کے لیے دعا گو رہتی ہوں کہ جہاں رہو، خوش
 رہو، آباد رہو، آج تم دونوں سے ملنے کو اتنا جی بے چین ہوا کہ رہا نہ گیا، چلی آئی۔ آئندہ بھی جی ہوا تو چلی آؤں گی۔ تم لوگوں کی اپنی خوشی ہے، آؤ نہ آؤ
 ملنا چاہو نہ ملنا چاہو۔“

”اچھا یہ بتائیں چائے پیسے کی یا ٹھنڈا“

”نہ چائے نہ ٹھنڈا، کھانا کھاؤں گی مگر اطمینان سے ابھی تم بیٹھو میرے پاس“ انہوں نے اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ”اور تم اپنا حال
 بتاؤ“ کیسی طبیعت ہے؟ دن ٹھیک سے گزر رہے ہیں نا؟“

”جی شکر ہے خدا کا“ وہ مسکرائی ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کمزور لگ رہی ہو“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

”بس وہ کچھ کام کی زیادتی ہو گئی تھی۔ اب تو احسن نے ملازمہ رکھ لی ہے“

”بہت اچھا کیا، ان دنوں میں یوں بھی تمہیں آرام ملنا چاہیے لیکن چلتی پھرتی رہا کر دو، بیٹھے رہنے سے تو جسم پھولے گا۔ اچھا یہ دیکھو کیا
 لائی ہوں میں۔“

انہوں نے ہاتھ میں تھا مایک کھولا تھا۔

”کب سے اسی چکر میں لگی ہوئی تھی اب کہیں جا کر تیاری مکمل ہوئی ہے۔“

”کیا ہے آپا؟“ وہ بھی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

”بہت خوشی خوشی دل سے کیا ہے یہ سب کچھ میں نے۔ خدا کرے کہ تمہیں پسند آ جائے۔“ وہ چیزیں نکال نکال کر بستر پر رکھنے لگیں۔

زینب چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی اس بات کو تو اسے اب تک دھیان نہ آیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے کپڑے، فرائیں، انگوٹ، رد مال چھوٹا سا گدا، کڑھی ہوئی چادریں، ادنی سوٹ، ٹوپیاں، موزے، غرض کہ چھوٹے بچے

کی ضرورت کا سارا سامان تھا۔

وہ ہر چیز اٹھا اٹھا کر دیکھتی مٹی اور ایک انوکھے، خوبصورت احساس سے دوچار ہوتی مٹی۔

”تم نے بھی کچھ تیاری کی ہے یا ایسے ہی بیٹھی ہو؟“ انہوں نے اسے گھورا تھا۔

”ہائے! میں نے تو اب تک کچھ خیال ہی نہ کیا تھا پھر ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ تقریباً پانچ چھ مہینے ہیں۔“

”بیٹا! ہر کام وقت سے پہلے ہو جائے تو اچھا ہے، عین وقت پر بھاگ دوڑ کر کے خود کو بلکان کرنے سے کیا حاصل۔ تھوڑی تھوڑی سی چیزیں لالا کر رکھتی رہو گی تو کام بھی ہلکا رہے گا اور تمہیں بھی نہیں ہوگی پھر خرچے کا بھی پتہ نہ چلے گا۔“

”جی ٹھیک کہتی ہیں آپ آپ“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔ پھر اس نے کچن کا رخ کیا تھا۔ ان کے لیے بڑا اچھا سا کھانا بنا کر اس نے ڈانگ ٹیبل پر پر تکلف انداز میں چنا تھا۔

”چلیں آپ، کھانا کھالیں“ وہ انہیں لینے آئی تو وہ لیٹے لیٹے سوچتی تھیں۔

”ارے، میں کیا سوچتی تھی؟ لو بتاؤ۔ تمہارے ساتھ کچھ کام ہی کروا لیتی۔“

”رہنے دیں آپ، اتنے دن بعد ملی ہیں، میں کام کرواتی بھی نہیں آپ سے اور پھر اب تو مجھے صرف کھانا ہی بنانا ہوتا ہے، باقی سارا کام تو جیلہ ہی کرتی ہے۔“

فرخندہ آپا گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ۔“ پھر انہوں نے کہا تھا۔ ”خدا مبارک کرے۔ بہت اچھا گھر ہے۔“

نہن کے ذہن کے افق پر لمبی کا گھر چمکنے لگا تھا۔ وہ سر جھٹک کر مسکرانے لگی۔ شام کو احسن کے آنے تک فرخندہ آپا وہیں موجود تھیں۔

احسن ان سے بے حد گرم جوشی سے ملا۔ ان سے اپنی لاپرواہیوں پر کوتاہیوں پر معذرت طلب کرتا رہا۔

”آپا کی خاطر وغیرہ بھی کی ہے یا یونہی آلتی پالتی مارے بیٹھی رہی ہو؟“ اس نے اطمینان سے بیٹھی نہن کو گھورا تھا۔

”ارے نہیں احسن ایسے نہ کہو۔ بچی نے بڑی محنت سے کھانا بنایا تھا میرے لیے۔ چاول، سالن، رائیہ، سلاڈ۔ ہر شے اس اکیلی نے بنائی۔ میں تو بڑی سوتی رہی۔ جیسے ساس ہوتی ہے۔“

اپنی بات پر وہ خود ہی بے تحاشہ ہنسی تھیں۔

فرخندہ آپا کے جانے کے بعد نہن نے احسن کو ان کی لائی ہوئی چیزیں دکھائیں تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش بیٹھا رہ گیا۔

”شائد ارے۔“ پھر اس نے کہا تھا۔ ”یہ سب کچھ آپا نے تیار کیا ہے؟ گریٹ۔“

”احسن!“ نہن بولی۔ ”آپا پوچھ رہی تھیں، ہم لوگوں نے کیا تیاری کر کے رکھی ہے۔ انہیں تو اس بات پر بڑا چنچا ہوا کہ ہم لوگ اب تک

ایسے ہی بیٹھے ہیں۔“

”ہاں یار۔“ وہ سوچنے لگا۔ ”اس پنج پر تو اب تک سوچا ہی نہ تھا۔ یہ تیاری بھی تو کرنی ہے۔ تم نے بھی احساس نہ دلایا۔“

”میں تو سوچ رہی تھی، ابھی بہت وقت پڑا ہے لیکن آپا نے کہا ہر کام وقت سے پہلے ہی کر کے رکھنا چاہیے۔ بعد میں مشکل نہیں ہوتی۔“

”ہاں“ ٹھیک ہے۔ اس مرتبہ تنخواہ ملے گی تو سب سے پہلے یہی شاپنگ کریں گے۔ کیا کیا لیتا ہے۔“ وہ سوچنے لگا تھا۔ ”کپڑے، فیڈ،

واکر، سائیکل وغیرہ۔“

”واکر، سائیکل؟“ نہن زور سے ہنس دی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

”احسن.....“ پھر وہ بمشکل ہنسی پرتا ہوا کر بولی تھی۔

”آپانے وقت سے پہلے کام کرنے کا ضرور کہا تھا مگر اتنا پہلے؟“

احسن بھی کچھ سوچ کر ہنس دیا تھا۔

وہ ایک مرتبہ پھر رملی کی طرف چلی آئی تھی۔

ایکلی گھر میں بیٹھے بیٹھے یونہی جی گھبرا جاتا تھا۔ کسی کو دیکھنے اور بات کرنے کی خواہش جی میں زور پکڑنے لگتی تھی۔

رملی اسے اپنے کمرے میں لے گئی ہوئی ملی۔ چمک نائی میں اس کا سر پا غضب ڈھا رہا تھا۔

”ہائے زنب! آ جاؤ۔ چلی آؤ۔ تم سے کیا پردہ؟ وہ اٹھ کر بیٹھے ہوئے بولی۔

”ابھی سو کر اٹھی ہو؟“ زنب نے اس کی حالت دیکھ کر استفسار کیا۔

”نہیں یار، نیند تو دیر سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ بس پڑی ہوئی تھی سوتی بن کر۔ کبھی کبھی اس قدر اداسی ہوتی ہے کہ مر جانے کو جی کرتا ہے۔ اچھا

ہوا تم چلی آئیں۔“

”میں بھی فارغی تھی پھر میں نے سوچا، تم بہت دنوں سے نہیں آئی ہو۔“

”ہاں، ٹھیک کیا اچھا تم بیٹھو، میں ذرا اشارہ لے لوں۔“

”ہوں۔“ زنب نے اثبات میں سر ہلایا۔

رملی تولیہ اٹھا کر ہاتھ کی سمت بڑھ گئی۔

زنب قریب رکھا ہوا در سالار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ کوئی فیشن میگزین تھا۔ وہ دلچسپی سے صفحے پلٹتی گئی۔ وہ اس قدر منہمک تھی کہ اسے خبر بھی نہ

ہوئی، کوئی بڑی خاموشی سے اندر چلا آیا تھا۔

”ہائے رملی!“

کسی نے پیچھے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائی تھیں۔ زنب کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ تیزی سے مڑی۔

.....

اس کے یوں اپنی جگہ سے اچھلنے پر نوراد بھی چند لمحوں کے لیے کنفیوز ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے قدرے آنکھیں میکر کر

اسے دیکھا پھر اس کے لبوں پر ایک خوب صورت مسکراہٹ در آئی۔ شرمندہ ہونے یا معذرت کرنے کے بجائے اس نے بڑی دلچسپی سے اس کا معائنہ

کرتے ہوئے کہا تھا۔

”میں آپ کو رملی سمجھ بیٹھا! میرے بے وقوف ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔ بھلا رملی اور آپ میں کون سی قدر مشترک ہے؟

بائی داوے، مے آئی نو پور سوئیٹ نیم؟“

زنب بالکل ہی کنفیوز ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ ایک بے حد دراز قامت، سرخ و سفید رنگت کا مالک، پینتیس سے چالیس سال کی درمیانی عمر کا جوان تھا۔ سیاہ آنکھوں میں خود اعتمادی

اور ذہانت کے تمام رنگ نمایاں تھے۔ بالوں میں کہیں کہیں کوئی سفید تار جھلکتا تھا پھر باقی بالوں کی گہری سیاہی میں چھپ جاتا تھا۔ اس کے نقش و پتلے

پتلے مگر خوب صورت تھے۔

”میں نے آپ کا نام پوچھا ہے مادام!“ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا ”اگر آپ بتانا پسند کریں تو؟“

”یہ زنب ہیں۔ زنب شاہ!“ پیچھے سے رملی کی آواز کرے میں گونجی تھی۔

وہ نجانے کس وقت ہاتھ روم سے برآمد ہو گئی تھی۔ تولیہ کیلے بالوں میں رگڑتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے چلتی ان تک پہنچی۔

”اور نہ ب! ان سے ملو۔ یہ میرے بھائی ہیں۔ میرا سکندر علی!“

نہیں محض سر ہلا کر رہ گئی۔

”یہ لوگ برابر والے پورشن میں آئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں شفتنگ ہوئی ہے ان کی۔“ پھر وہ میرا سکندر علی کو مزید تفصیل سے آگاہ کرنے لگی ”ان کے شوہر احسن ایاز کی مل میں۔“

”شوہر!“ وہ سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹوں کو سیکٹر کر یک لخت بول پڑا تھا۔ آنکھوں میں سوچ کے سائے جھللائے تھے۔ ”آپ ایک عدو شوہر بھی رکھتی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ نہ ب کے بجائے رملی بولی تھی۔ لہجے میں کسی قدر طنز کی آمیزش تھی۔

وہ رملی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا۔

”بیٹھے کو نہیں کہو گی؟ ساری باتیں یونہی کھڑے کھڑے ہو جائیں گی؟“

”جی ضرور۔“ چلیں باہر بیٹھے ہیں۔ ویسے آج آپ نکلے کہاں سے ہیں صبح ہی صبح؟ مہینہ بھر سے تو خبر نہیں تھی آپ کی۔“

رملی تولیہ شانوں پر پھیلاتے ہوئے مصروف سے انداز میں پوچھنے لگی۔

”صبح ہی صبح؟ رملی بی بی دوپہر کے اڑھائی بجتے کو ہیں۔ لٹچ ٹائم ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ کسی اچھی سی جگہ لٹچ کرنے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔ تمہارا تو ابھی بریک فاسٹ ٹائم بھی نہیں ہوا۔ کب سدھرو گی تم؟“

”ارے بھائی! جانے دیں، اپنی زندگی کی یہی بے لگاری اور بے پروائی تو عزیز ہے مجھے۔ رات سونے کا موڈ نہ بنے تو گھومنے نکل جاؤ۔“

دن کو بیزار سی اور سستی ہو تو سارا دن اسی کی بلیکٹ لپیٹے پڑے رہو۔ چار دن زندگی کے ہیں۔ یونہی گزر جائیں گے!“

”بڑی دلبرداشتہ معلوم ہوتی ہو۔“ میرا سکندر علی نے تہقید لگایا۔

”جتنی معلوم ہوتی ہوں، اس سے کہیں زیادہ ہوں۔“ رملی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

نہیں کے لیے مزید وہاں رکن نامکن نہ رہا۔ دونوں بہن بھائی آپس میں ایک عجیب سی مصنوعی گفتگو میں مصروف تھے۔ وہ خود کو اضافی اور

غیر ضروری سی شے خیال کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”میں چلوں گی رملی اب۔“ وہ دوپٹہ اپنے وجود پر درست کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

میرا سکندر نے قدرے کن اکھیوں سے اس کے وجود کا جائزہ لیا اور ہلکا سا کمرے سے باہر نکل گیا۔

رشتوں کے ریشم

رفعت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ..... رشتوں کے ریشم..... جس کی سطر سطر محبت خلوص یکا نکمت، اور

بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں، ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔ افسانوں

کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے افسانے سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

”ارے میری جان! آئی ایم سوسوری۔ میں اتنی دیر سے شاید تمہیں نظر انداز کر رہی ہوں خیر ابھی تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ کھانا کھا لو پھر اجازت ملے گی۔“

”نہیں نہیں.....“ وہ بے طرح گھبرا کر بولی تھی۔

”کھانا میں ہرگز نہیں کھاؤں گی پھر کسی دن اکٹھے ہوئے تو کھانا بھی کھالیں گے لیکن آج نہیں۔ پلیز رملی!“

اس کا انداز بے حد انتہائی تھا۔ رملی مسکرا دی۔

”چلو، کیا یاد کرو گی تم بھی نہ نب شاہ! آج معاف کرتے ہیں تمہیں۔“

”میں چلوں پھر۔“

”چلو، میں تمہیں دروازے تک چھوڑ آتی ہوں۔“

”کیوں، انکے پلٹ کر آ جانے کا ڈر ہے؟“ عقب سے سکندر کی آواز آئی تھی۔

وہ دونوں کمرے سے نکل رہی تھیں۔ رملی نے پلٹ کر شاید اسے نظروں ہی نظروں میں سرزنش کی تھی پھر وہ اسے لیے بیرونی دروازے تک چلی آئی۔

”تم بھائی کی باتوں کو مانیڈ مت کرنا یا!“ اسے رخصت کرتے ہوئے وہ بولی تھی۔ ”یہ ہر کسی سے اسی طرح بے معنی گفتگو کر جاتے ہیں جس سے مخاطب ہزار طرح کے معنی اخذ کر سکتا ہے اُلے سیدھے۔“

”نہیں، میں نے کچھ مانڈ نہیں کیا۔“ وہ بے پرواہ سے انداز میں بولی تھی۔

حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ میر سکندر علی کے جملوں اور نظروں کی کاٹ سے بچنے کے لئے اتنی جلدی اٹھتی تھی۔ ورنہ وہ کھانا رملی کے ساتھ کھانے کا ارادہ باندھ کر ہی گھر سے نکلتی لیکن وہ شخص بہت عجیب و غریب تھا، ناقابل برداشت قسم کا۔ زنب کا ماحول بھی ہمیشہ سے کچھ اس قسم کا رہا تھا کہ اسے ایسے آزاد منش لوگوں سے الجھن محسوس ہوتی تھی۔ بے جھجک گھورنے والے، بے خوفی سے بات کرنے والے لوگ۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ کوئی کم عمر کنواری لڑکی تو نہ تھی جس سے وہ شخص اس طرح برتاؤ کر رہا تھا۔

اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور ایک عجیب سی الجھن بھی اپنے وجود سے لپٹی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ میر سکندر علی کی نگاہوں کا خیال کچھ ایسا ہی تھا۔ گھر آ کر وہ کھانا بھی نہ کھا سکی۔ ایسے ہی خالی پیٹ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ یوں بھی جیلہ کے آ جانے سے اس کے کام کاج کی عادت متاثر ہوئی تھی۔ اسی لیے بھوک بھی نہ لگتی تھی۔ سستی اور بے زاری کے عالم میں اسے رملہ کے الفاظ یاد آئے۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔

”ایسی سپاٹ، بیزار زندگی..... کسی تڑپ اور لگن کے بغیر۔ میں بھی کہیں ایسی ہی نہ ہو جاؤں۔“

سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی تھی۔



دو پہرہ جس قدر بے مزہ ہوئی تھی، شام اتنی ہی خوشگوار اور زندگی سے بھرپور ثابت ہوئی۔ احسن نہ صرف جلد گھر آ گیا تھا بلکہ اپنے ہمراہ بہت سے چیزیں بھی لایا تھا۔ آج اسے تنخواہ ملی تھی اور وہ اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے زنب اور بچے کے لیے بہت کچھ لے کر آیا تھا۔ زنب دلچسپی سے چیزیں دیکھتی اور تھرے کرتی رہی۔

”کپڑے آپ سارے بچیوں کے لائے ہیں۔ یہ فریکس، یہ روپمر، سب بچیوں کے ڈیزائن ہیں۔ لڑکا ہوا تو یہ کپڑے پہن کر عجیب سا

لگے گا۔“

”اچھا! وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چلو ایک سال کے لیے یہ کپڑے اٹھا کر رکھ لینا۔ اگلے سال کام آئیں گے!“
 زینب نے پہلے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تعجب سے اس کی جانب دیکھا پھر اس کی شرارت سمجھ کر اسے گھورنے لگی۔
 ”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کوئی مشین ہوں؟“

”نہیں بھئی، یہ تو مشترکہ کپڑی ہے۔ ہر سال نیا ماڈل پروڈیوس کرنے والی۔ تم اکیلی تھوڑی سی۔“
 زینب نے کشن اٹھا کر اسے مارنے کی دھمکی دی تو وہ دبک کر بیٹھ گیا۔

”اچھا بھابھا! اور چیزیں تو دیکھو، تم تو بلا کو خان کی جتنی معلوم ہوتی ہو۔ ذرا منہ سے بات لگتی نہیں اور تم نے تیز تیز لگا ہوں سے گھور انہیں۔ تو بہ۔“

وہ کان پکڑنے لگا۔ زینب مسکراتے ہوئے دوسری چیزیں دیکھنے لگی۔

”اور یہ کھلونے؟“ پھر وہ کھلونے دیکھ کر ہنس پڑی ”یہ سب تو دو دھائی سال کی عمر کے بچے کے ہیں، یہ جہاز، ریل گاڑی، واحد یہ گڑیا! یہ تو ہنستی اور روتی بھی ہے۔ چھوٹا سا بچہ بھلا ان کھلونوں سے کھیل سکتا ہے؟“

”ارے یہ تو تمہارے لیے ہیں۔“ وہ فوراً بولا۔ ”بچے کو اتنا بھلا نا نہیں پڑے گا جتنا مجھے تم کو بھلانا پڑتا ہے۔ ذرا سی بات ہوئی اور تم ناراض ہو گئیں۔ میں نے سوچا، چند کھلونے ہی لے لو!“

”احسن!“ اسے ہنسی آگئی ”کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کریں۔ میں کہہ رہی ہوں یہ اتنے پیسے ضائع کرنے کی بھلا کیا تک تھی؟ پہلے ہی ہاتھ اتنا تنگ ہے!“

”ہاتھ تنگ ہے تو اس میں بھلا اس آئیو لے ننھے منے سے وجود کیا قصور!“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”اسے تو ضرورت کی ہر شے ملنی چاہیے اور پھر بھی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ خریدتے ہوئے مجھے خود کو بہت زیادہ خوشی اور مسرت ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سا خوش کن احساس تھا جس میں گھر کر میں اتنا کچھ خریدتا چلا گیا۔ آج سے پہلے مجھے دکانوں پر جانا، چیزیں خریدنا بے مقصد معلوم ہوتا تھا۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد میں نے اس قدر جذباتی انداز میں شاپنگ کی ہے! یقیناً مانو زینب! کھلونوں کی دکان سے باہر نکلنے کو تو میرا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے اس وقت شاید میرا اپنا بچپن آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ روتا بسورتا، مسکین اور مظلوم قسم کا بچپن!“
 وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔ اس کی نظریں کہیں دور بھٹکتے لگیں۔

”پتا ہے زینب! جن بچوں کو اپنے من پسند کھلونے نہیں ملتے نا ان کے اندر اس محرومی سے پیدا ہونے والے خلا کو پھر تمام عمر کوئی شے نہیں بھر سکتی۔ ساری عمر آنکھوں کے سامنے وہی رنگ بھوک پیاس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ پتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ وہ دور گزر جانا کے بعد انسان پیٹ بھر کر روٹی کھا سکتا ہے مگر کھلونوں سے نہیں کھیل سکتا۔ یہ احساس محرومی تو بس ایک جگہ ایک ہی حالت میں ساکت رہ جاتا ہے، اسی لیے۔ اسی لیے میں نے زینب بہت کچھ اٹھالیا۔“

زینب اس کے الفاظ کے ساتھ ساتھ نجانے سوچ کے کس بہاؤ میں بہہ گئی تھی۔ شاید اس کی آنکھوں کے سامنے بھی اس کا محروم بچپن اور کڑھتا لڑکپن اکھڑا ہوا تھا۔

”تم کیا سوچنے لگی ہو؟“ احسن اپنی کیفیت کے حصار سے نکلا تو ہنس کر ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے خیال سے بولا۔ ”اب ایسا نہ ہو کہ تم جب بھی بازار جاؤ تو میرے لیے ڈھیروں ڈھیر کھلونے اٹھاؤ!“

زینب نے ایک عجیب سی سانس بھری اور اسے عجیب سی سوچتی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”احسن! وہ وقت تو زندگی میں ابھی بھی نہیں آیا کہ ہم بازار جا کر کوئی چیز ڈھیروں کے حساب سے لے سکیں۔ آج تو آپ یہ سب کچھ لے

آئے ہیں۔ کیونکہ پہلے پہلے بچے کا چاؤ ہی کچھ اور ہوتا ہے لیکن جب ایک سے دو اور دو سے تین ہوں گے تب شاید میں اور آپ بھی اپنے بچوں کو وہی محرومی اور سسکتا پن دیں گے جو ہمارے بچپن میں ہمارا مقدر تھا۔ ہمارے بچے بھی عام سے کپڑے پہنیں گے اور عام سے اسکولوں میں پڑھائیں گے اور لمبی لمبی گاڑیوں میں بیٹھ کر مہنگے اسکولوں کی جانب جاتے بچوں کو یوں حسرت اور حیرانی سے نکلیں گے جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں، بس یہی نہیں چاہتی تھی، میں اس بات سے بچی تھی لیکن وہی بات میرا مقدر ٹھہری!“

اس نے پھر سانس بھر کر سر تکیے سے نکا دیا۔

اسکی باتوں نے احسن کو چپ سا کر دیا۔ وہ نچلے لب کا کوتا دانت سے کھپتے ہوئے اپنی لائی ہوئی چیزوں کو عجیب سے انداز سے دیکھنے لگا۔

”تمہاری سوچ میں، بہت شدت ہے نہ نب!“ پھر وہ کچھ دیر کے بعد بولا تھا ”ایسی شدت پسندی انسان کو اور اس کی سوچ کو کمزور اور بیمار کر دیتی ہے۔ میرا وہ سب کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں احساس کمتری کا شکار ہوں یا میرے بچپن کے حالات کی وجہ سے میری ذات میں کوئی کمی یا خامی رہ گئی ہے۔ میں تو ابھی بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر گزار ہوں کہ اس نے ہمیشہ کرم نوازی کی اور بہتوں سے بہتر رکھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی محرومیاں اور دل کے کوٹوں کھدروں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے پیاسے احساسات تو ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چیزوں کی تقسیم میں نا انصافی نہیں کی یہ تو ہم انسان ہی ناشکرے ہیں۔ ہمارے بچوں کو خدا نے چاہا تو کبھی کسی چیز کی محسوس نہیں ہوگی۔ ہم ان کی تربیت بہترین انداز میں کریں گے۔“

”کی نہ ہونا اور کی محسوس نہ ہونا دو الگ الگ باتیں ہیں!“ وہ قدرے تلخ انداز میں بولی تھی۔

”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی!“

”ایسا بھلا ہو سکتا ہے نہ نب! کہ دنیا سب کو انسان کی تعظیم پر آ جائے؟“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولا تھا ”بچوں کی تربیت اس انداز میں ہونی چاہیے کہ ان کی طبیعت سے حرص و ہوس کا مادہ نکل جائے۔ قناعت پسندی اور شکرگزاری ان کے اوصاف ہوں۔ وہ ہر چمکتی شے پر نہ لگیں۔ اس سے اچھا تحفہ کوئی ماں باپ اپنی اولاد کو نہیں دے سکتے!“

”چلیں، ٹھیک ہے۔ ہم اپنے دل کو یونہی بہلا لیں گے۔“ وہ سر جھٹک کر بولی ”انکی ضرورت کی شے مہیا نہ کر سکے تو صبر کرنا ہی سکھا دیں گے۔“

”تم بہت تلخ ہو جاتی ہو نہ نب!“ اس کا موڈ آف ہو گیا ”ہر بات کو غلط انداز میں سوچنا بیمار ذہنیت کی علامت ہے۔ ایسے انسان کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے!“

”میں، میں بیمار ذہنیت رکھتی ہوں؟“ اسے اور غصہ آ گیا۔ ”حقیقت پسند سوچ رکھنا اور بیمار ذہنیت رکھنا آپ کے نزدیک برابر ہو سکتا ہے ورنہ ان دونوں میں کوئی مماثلت نہیں۔ میں ہر بات حقیقت پسندانہ انداز میں سوچتی ہوں جب کہ آپ حقیقت سے نظریں چرائے ذہن کو فرار کے رستے پڑا لے رہتے ہیں۔ جیسے کبوتر آنکھیں بند کر کے خود کو محفوظ خیال کرتا رہتا ہے۔ اس کے آنکھیں بند کر لینے سے سامنے بیٹھی ملی مر تو نہیں جاتی۔ کیا غلط کہتی ہوں میں؟ کیا ہمارے بچے عام سے بچے نہیں ہوں گے؟ عام سے سرکاری اسکولوں میں پڑھ کر وہ عقل و دانش کے کون سے عظیم مرتبے پر فائز ہو جائیں گے؟ کیا اپنی محدود تنخواہ میں آپ انہیں ان کی پسند کے کھلونے، اچھے کپڑے اور مہنگی مہنگی کتابیں لے کر دے سکیں گے؟ چینیوں میں کہیں گھما کر لائیں گے؟ ایک اکیلی بیوی کو تو آج تک لے جائیں سکے! یہی ایک اچھے، مطمئن خوشگوار، بچپن کی ضروریات ہوتی ہیں احسن صاحب! ایک مضبوط، متوازن شخصیت کی بنیاد، ایک اچھے بھرپور مستقبل کی ضمانت! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ کیا یہ سب کچھ سوچنا بیمار ذہنیت رکھتا ہے؟ آپ بھلے سے انہیں شکرگزاری اور قناعت پسندی کے اوصاف دلاتے رہیں لیکن اس سے ان کی آنکھیں نہیں بند ہو جائیں گی۔ وہ دنیا کو دیکھنا نہیں چھوڑ دیں گے۔ ان کی خواہشات مرنے نہیں جائیں گی۔ یہ دنیا، اس کے بازار، ان کی دکانیں اور ان پرچی، اپنی جانب کھینچتی اشیاء سب کے سب اپنی جگہوں پر موجود ہوں گے۔“

احسن ہونٹ پیچھے اس کی تقریر سن رہا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اتر آئی تھی۔ چہرے کی تمازت اس کے دماغ کے حدود پر گرم ہونے کا پتا دیتی تھی۔

نہیں رخ موڑے اس کے پھٹ پڑنے کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا اور کچھ بھی بولے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ اس کی لائی ہوئی اشیاء نہیب کے سامنے کھری رہ گئیں۔ بے دلی سے ایک گہرا سانس لے کر اس نے سر کیسے سے نکالیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے کا ماحول کس قدر خوشگوار تھا۔ وہ دونوں کتنا خوش تھے اور اچانک ہی دونوں کے درمیان کیسی تلخی پھیل گئی تھی۔
 ”پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ وہ سوچنے لگی ”کیوں میں نے یہ سب کچھ کہہ ڈالا، اب تک تو مجھے احسن اور اپنی زندگی سے اور اس کے حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے۔ مجھے سمجھوتے کی راہ پر چلنا کیوں نہیں آتا۔“
 وہ آزدگی سے سوچنے لگی۔

”شاید محرومی اپنے لیے ہو تو انسان سمجھوتا کر بھی لیتا ہے..... لیکن یہی محرومی اپنی اولاد کا مستقبل بنی نظر آئے تو توجیح نکل ہی جاتی ہے!“



دونوں محاذوں پر اگلے دور و زنگ خاموشی چھائی رہی۔ احسن نے چند ایک مرتبہ اس سے ضرورتاً بات کر لی لیکن نہیب کو کوئی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ وہ سخت بد دل اور بے مزہ ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ بات کچھ بھی نہ تھی ایک زبانی جھڑپ ہو کر رہ گئی تھی لیکن اپنے اپنے طور پر دونوں نے اسے بہت محسوس کیا تھا۔

اس روز احسن کے افس چلے جانے کے بعد وہ بہت افسردہ اور اداس اداس سی تھی۔
 جیلہ اپنے مقررہ وقت پر آگئی تھی اور اب بچن کی صفائی میں مصروف تھی۔ نہیب کے پاس کرنے کے لیے کوئی دوسرا کام نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنی پڑمردہ سوچوں سے لڑتی رہتی۔ جنگ کرتی رہتی۔ بستر پر لیٹی وہ یہی کام بے مقصد انجام دے رہی تھی جب جیلہ کی ہمراہی میں رملی اندر داخل ہوئی۔

”ہیلو کیا ہو رہا ہے بھئی۔ تم اور اس وقت تک بستر میں؟ کہیں میرا اثر تو نہیں آ گیا؟“
 ”نہیں نہیں، میں تو ابھی لیٹی تھی۔ ویسے تو صبح ہی بیدار ہو گئی تھی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھے ہوئے بولی۔ ”میں تمہاری طرح دودو بجے تک نہیں سو سکتی۔ شادی سے پہلے نو، دس بجے اٹھتی تھی تو اماں سو صلو اتیس ساتی تھیں۔ اب بھی وہی عادت ہے۔“
 رملی ہنس دی۔

”بس اپنا پنا دستور ہے!“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی، اور ویسے بھی کبھی اتفاق سے میں جلد بیدار ہو بھی جاؤں تو خود سے یہی پوچھتی ہوں کہ رملی بی بی! اٹھ کر دو کر بھی کیا؟ کوئی دھندا ہے تمہیں؟ بس یہی سوچتی ہوں اور دوبارہ اندھنی ہو جاتی ہوں۔“
 ”ہاں اب تو کچھ کچھ یہ معاملہ میرے ساتھ بھی ہو گیا ہے۔“ نہیب سوچتے ہوئے بولی ”جیلہ کے آجانے کے بعد کرنے کو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ نماز روزے کی میں کبھی بھی پابند نہیں رہی اپنی زندگی بے کار اور بے مقصدی لگ رہی ہے!“
 ”حیرت ہے۔“ رملی نے کاندھے اچکائے۔

”حالانکہ جس دور سے تم گزر رہی ہو کم از کم اس میں تو ایسے فیل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے تو سنا ہے بڑے خوب صورت خیالات اور احساسات ہو جاتے ہیں عورت کے!“

نہیب مسکرا دی۔ رملی کے انداز میں حالانکہ قطعاً کسی قسم کا تاسف یا حسد نہیں تھا پھر بھی وہ چند لمحوں سے اس کے چہرے پر کچھ تلاش

کرتی رہی۔

رملی کچھ جڑی ہوئی تو اسے اور لطف آیا۔

”بھئی ایسے کیا گھورنے لگیں؟“ وہ بول پڑی۔

”سچ کہو رملی! اپنی زندگی میں یہ کی محسوس نہیں ہوتی تمہیں؟ ماں بننے کو جی چاہتا ہے تمہارا؟“

”نہیں۔“ وہ قدرے بے رحمی سے بولی تھی ”پہلی بات تو یہ کہ میں محرومی کے احساس کے بھاری پتھر تلے دب کر اپنی موت مر جانے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ اس محرومی کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنی انا کو محفوظ رکھتی ہوں جس چیز کی کمی ہوتی ہے اس چیز سے چڑنے لگتی ہوں۔ اسے حاصل کرنے کا نہیں سوچتی۔ اس سے بچنے رہنے کے طریقوں پر غور کرتی ہوں!“

”ہائیں؟“ زنب کو حد درجہ حیرت ہوئی تھی ”یہ نفسیات کا کون سا پہلو ہے؟ ایسا تو کبھی نہیں سنا؟“

”آج سن لو!“ وہ فخر سے بولی ”مجھے تو روتے بلکتے بچوں سے چڑ ہے۔ انھیں محسوس ہوتی ہے۔ ماؤں پر ترس آتا ہے کہ بچا ریاں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہیں۔ نہ رکھتے بنے نہ پھینکتے بنے!“

”تم جھوٹ بولتی ہو۔“ زنب کو یقین نہ آیا۔

”کسی عورت کے خیالات ایسے ہوتے نہیں سکتے!“

”چلو تم نہ مانو مگر حقیقت ہے۔“ وہ تسخیر سے ہنس دی ”ابھی یہ چند دن اور سکون سے گزار لو پھر علم ہو گا تمہیں کہ میں جھوٹ کہہ رہی تھی یا سچ یہ سارا حسن پانی بن کر بہہ جائے گا زنب شاہ کہیں گم ہو کر رہ جائے گی اور یہاں ایک عجیب و غریب سی، بے ڈھنگے وجود کی عورت چلتی پھرتی نظر آئے گی جو خود کو ”ماں“ کہتی ہوگی!“

زنب کو اس کی بات بہت بری لگی اور حد درجہ غصہ بھی آیا مگر وہ اس کے مہمان ہونے کے خیال سے خاموش ہو گئی۔

”کھانا کھاؤ نا؟“ اس نے مصلحتاً بات کا موضوع بدل دیا ”چنے کا پلاؤ اور لوکی کا راستہ بنایا ہے آج جیلہ نے!“

”ریٹلی!“ اس کے منہ میں پانی بھر آیا ”ضرور کھاؤں گی۔ ویسے بھی میں سوچ کر آئی تھی کہ دوپہر کا کھانا تمہاری طرف ہی کھانا ہے اور تم کس قدر بدتمیز ہو۔ اخلاقیات سے عاری، اس روز میرے اتنا روکنے کے باوجود چلی آئیں۔ کیا تھا جو رک جاتیں۔ کون سے یہاں تمہارے کارخانے چل رہے ہیں جن کی نگرانی اشد ضروری ہے۔ سچ زنب! سکندر بھی بہت ماسٹر کر ہاتھا۔ کہہ رہا تھا ہم اس کی شکل دیکھ کر یوں بھاگیں جیسے وہ کوئی بھوت ہو۔“

زنب کو وہ شخص اور اس کی نگاہیں یاد آئیں۔ وہ مزید بد مزہ ہوئی۔

”کیوں بھئی، میں تم سے ملنے آئی تھی، ان سے میرا کیا واسطہ جو وہ میرے حوالے سے کچھ ماسٹر کریں۔ مجھے بے وجہ پر اپنی عورتوں کو موضوع گفتگو بنانے والے مرد اچھے نہیں لگتے رملی۔ بتا دینا حضرت کو!“

”پھر تمہیں کیسے مراد اچھے لگتے ہیں؟“ رملی مذاقاً اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہی ”وضاحت کر دو میں وہ بھی بتا دوں گی اسے۔“

”رملی!“ زنب تپ کر رہ گئی ”یہ کیا مذاق ہے؟“

”اوہو۔“ وہ بے وجہی زور زور سے ہنسنے لگی ”تم تو ذرا ذرا سی بات پر سیریس ہو جاتی ہو۔ ارے زنب جان! زندگی میں یہ سب چلتا ہی

رہتا ہے۔ اس میں اتنا بارمانے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی ”کیا چلتا رہتا ہے زندگی میں؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”کچھ نہیں!“ وہ یک لخت خاموش ہو گئی پھر کچھ دیر بعد بولی ”بھائی بہت تعریف کر رہا تھا تمہاری، کہتا تھا، اس نے ایسا چہرہ آج تک نہیں

دیکھا حالانکہ ایک دنیا گھوم چکا ہے وہ کف افسوس مل رہا تھا تمہارے میر ڈھونڈنے پر!“

زینب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک پرانے مرد کی ایسی کھلی تعریف پر وہ اندر تک کٹ کر رہ گئی۔ ساتھ ہی اسے رملی کی ذہنیت پر تعجب بھی ہوا۔ اگر بہن بھائی کے درمیان ایسی گفتگو ہوئی بھی تھی تو اسے وہ سب کچھ زینب سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

”تم آج کچھ زیادہ ہی بکواس کر رہی ہو۔“ وہ بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے بستر سے اتر آئی ”گلتا ہے تمہیں بھوک کچھ زیادہ لگی ہے۔ چلو کھانا کھاتے ہیں!“

”ہاں!“ رملی نے ایک گہری سانس بھری ”حینوں کے انداز ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ میری کوئی اس طرح تعریف کرتا تو میں گھنٹوں بیٹھ کر ایک ایک لفظ منتہی۔ یادداشت میں محفوظ کرتی۔ بتانے والے سے کرید کرید کر دریافت کرتی کہ کہنے والے نے اور کیا کیا کہا تھا!“ زینب کو ہنسی آ گئی۔

”مجھے تمہیں کریدنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میرامیاں ہی میری اتنی تعریف کر دیتا ہے کہ میں سیراب ہو جاتی ہوں۔“

”ارے اس نے تمہاری تعریف کرنی ہی ہے۔ تم نے اسے شرف زدہ جیت جو بخشا ہے۔ بچاؤ دن رات ڈرتا ہوگا کہ کہیں کوئی دوسرا تمہیں اڑانہ لے جائے۔“

تعریف کی ڈوریوں سے تمہارے پر باندھتا رہتا ہے۔“

زینب چلتے چلتے رگ لگی۔ بے تعجب سے اس نے رملی کی شکل دیکھی، نبھانے وہ آج کس قسم کی گفتگو کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، زینب کی جانب سے اس کے دل میں کسی بات کا غبار تھا جو وہ رہ کر نکل رہا تھا۔

”تمہیں ہوا کیا ہے رملی!“ وہ کہے بغیر نہ رہ سکی ”آج تو گلتا ہے تمہاری زبان سے کوئی دوسرا بول رہا ہے۔“

”کھانا کالو یار۔“ وہ اس سے نظریں چرا کر بچن میں گھس گئی ”وہ کیا کہا ہے شاعر نے اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں.....“

زینب بھی سر جھٹک کر اندر داخل ہو گئی۔



رملی سے اس ملاقات نے اس کی طبیعت پر نبھانے کیسا اثر چھوڑا تھا۔ وہ ذہنی طور پر پریشان ہی ہو گئی تھی۔ اس کی ذہنی گفتگو، رہ رہ کر ایک عجب سے طنز کا احساس، ایک حسد کا غبار زینب کو الجھن کا شکار کر گیا تھا۔ وہ سوچنے اور تہہ تک اترنے کی کوشش کرتی تو اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے۔ وہ خود پر بھی حیران تھی۔ ایسا تو اس کے ساتھ پہلے کبھی بھی نہ ہوا تھا۔

شاید اس میں احسن کے رویے کا بھی دخل تھا۔ وہ ذرا سی بات پر اس سے ناراض ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ تین دن ہو گئے تھے اس نے زینب سے کام کی باتوں کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ کی تھی۔

زینب حد درجہ ٹینشن کا شکار ہو کر رہ گئی۔

اس روز صبح سے اس کی طبیعت گری گری سی تھی۔ ناشتہ کرنے سے دل اور بھاری ہو گیا تھا۔ زینب نہانے کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرنے الماری کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ اچانک ہی اسے متلی سی محسوس ہوئی نظروں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے سہارا لینے کے لیے الماری کا پتہ تھا پھر دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

جیلہ پیچھے کھڑی فرنیچر صاف کر رہی تھی۔ بھاگ کر اس تک پہنچی۔

”بی بی جی! جینو جی جینو! جی کیا ہوا۔!!“

زینب کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔ وہ اسے جواب دینے کے بھی قابل نہ رہی تھی۔ ہاتھ پیروں میں جان ہی نہ رہی تھی۔ زبان میں ہلنے کی

سکتے تھے۔ بس اپنی کیفیت کی وجہ سے آنسو دھواں دھار نکل رہے تھے۔ جیلہ اسے بمشکل سہارا دے کر بیڈ تک لائی۔ پھر اسے لٹا کر پانی کا گلاس بھر کر لے آئی۔

بہت دیر کے بعد وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہوئی تھی۔

”جیلہ۔“ اس نے احسن کے آفس کا نمبر اسے تھماتے ہوئے کہا ”برابر رملی بی بی کے ہاں سے احسن کو فون کر کے آؤ بلکہ ان سے کہنا وہ خود فون کر کے انہیں میری طبیعت کا بتادیں۔ ذرا جلدی آجانا میرا دل بیٹھا جاتا ہے!“ تاہم بھرے لہجے میں کہہ کر اس نے سر کیجے پر ڈال دیا۔ جیلہ کچھ سمجھنے، کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتی بھاگ بھاگ نکل گئی تھی۔

تھوڑی دیر میں رملی جیلہ کے ہمراہ چلی آئی اور اس کے پندرہ منٹ بعد ہی سفید چہرہ لیے احسن آگیا۔

”زینو جان! کیا ہوا تمہیں؟“ وہ سخت گھبراہٹ ہوا تھا۔

اس کا چہرہ دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر زینب پھر جھرجھرا آنسو بہانے لگی۔ کتنے دنوں کے بعد اس کا یہ سابقہ انداز دیکھا تھا۔

”میں گاڑی لاتی ہوں۔“ رملی بولی تھی ”اسے ڈاکٹر کے ہاں لے چلتے ہیں!“

”جی پلیز! میری ہانگی آپ کی۔“ احسن ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے شائستگی سے بولا۔

”میریانی کی کیا بات ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“ وہ رکی سا جملہ بول کر رسی سے انداز میں مسکرا کر باہر نکل گئی تھی۔

”زینو! کیا ہوا ہے جانو!“ وہ بڑی فکر مندی سے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگا ”تم ٹھیک تو ہونا۔ یوں اچانک ہی۔“

”پتا نہیں احسن! میں خود اپنی حالت سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ دل ایسا لگتا ہے، کسی سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔“

اس پر حد درجہ تھکتا طاری تھی۔ وہ محبت سے اس کی ہتھیلی سہلانے لگا۔ زینب نے آنکھیں موند لیں۔

ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کر کے اسے ڈرپ لگا دی تھی۔ اس کا بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔

”ان کو ڈپریشن بھی ہے۔“ اس نے کہا تھا ”کسی بات سے ان کے احساسات مجروح ہوئے ہیں۔ آپ کو ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایسی

حالت میں عورت کو بہت زیادہ ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے!“

وہ احسن سے کہہ رہی تھی اور احسن کی حالت ایسی تھی کہ کو تو تو لہو کی بوند نہ نکلے۔ وہ تاسف اور شرمندگی کے سمندر میں غرق تھا۔ وہ زینب کی

خراب طبیعت کی تمام تر ذمہ داری اپنے رویے کی وجہ سے اپنے کاندھوں پر محسوس کر رہا تھا۔

”میں بہت برا ہوں زینب! بار بار انجانے میں تمہیں کوئی نہ کوئی تکلیف دے بیٹھتا ہوں۔“ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

زینب نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ احسن اپنے رویے پر شرمندگی محسوس کرے اور آئندہ اس سے بچھڑا نہ

کرے۔ اس نے احسن کی کسی بھی معذرت کے جواب میں نرمی بھرا رویہ اختیار نہ کیا اسے ڈسچارج کرتے ہوئے بھی ڈاکٹر نے احسن کو کافی ساری

ہدایات کی تھیں۔

”انہیں ہر حال میں خوش رکھیں۔ ان کا خوش رہنا ہی ایک تندرست اور صحت مند بچے کی ضمانت ہے۔ ان کی غذا کا خیال رکھیں۔ مناسب

سیر و تفریح کرائیں۔ یہ ذرا سی بات پر ڈپریشن ہو جانے والی خاتون ہیں۔ ایسے لوگوں کی غیر معمولی کیئر کرنی ہوتی ہے۔“

وہ ہر بات کو دل کی لوح پر محفوظ کرتا اسے لے کر گھر لوٹا تھا۔

”زینو..... یقین جانو۔ آئندہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی!“ اس نے زینب کا ہاتھ تھام کر غلوں دل سے یقین دہانی کرائی تھی۔ وہ

ہولے سے مسکرا کر رہ گئی۔



اور پھر اس نے واقعی اپنا کہا پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی۔ وہ آفس سے جلد آ جاتا تھا اور اپنے ساتھ کھانے پینے کی کوئی چیز لانا نہ بھولتا۔ ہر روز اس کے ہاتھ میں زینب کی پسند کی کوئی شے ضرور ہوتی تھی۔ دونوں مل کر کھانا کھاتے، پھلوں سے لطف اندوز ہوتے اور ٹی وی دیکھتے رہتے۔

شام ڈھلنے لگتی تو دونوں گھر کے سامنے صاف ستھری سڑک پر واک کے لیے نکلتے اور دیر تک ٹہلا کرتے۔ چند ہی دنوں میں زینب کے وجود پر اس کی ساری تک دود کے اثرات واضح نظر آنے لگے۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا، رنگت میں ایک عجیب سی تازگی اور چمک آگئی اور جسم پہلے سے بھی بھرا بھرا لگنے لگا۔

اس روز بھی وہ شام زرد رنگ سولی تھی۔ احسن اس کے لیے چائے بنانے لگا۔ جیلہ اے اٹھانے چلی آئی۔

”جینو بی بی! اٹھ بھی جائیں، صاحب اپنے ہاتھوں سے چائے بنا رہے ہیں!“ اس کے انداز میں حد درجہ استعجاب تھا۔

زینب کو ہنسی آگئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”پھر کیا ہے جیلہ؟ بنا رہے ہیں تو بنانے دو!“

”نہ جی، گھر کی عورت کا کام ہے اپنے میاں کا چائے پانی کرنا۔ مرد یہ جنانے (زنانے) کام کرتا اچھا نہیں لگتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی ”میں چاہتی بھی نہیں ہوں کہ میرا شوہر میرے علاوہ کسی اور کو اچھا لگے۔ مجھے تو وہ ہر حال میں اچھا لگتا ہے۔“

”ہائے جینو بی بی کیسی باتیں کرتی ہو؟“ جیلہ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

احسن چائے لے اندر آیا تو اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

”چائے جینو بی بی!“ وہ سرگوشی میں بولا تھا۔

زینب کو بے تحاشا ہنسی آئی۔ وہ ہنستی چلی گئی۔

”کیوں ہنس کیوں رہی ہو؟ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ جیلہ کی نگاہوں میں میرے لیے حد درجہ رحم اور تاسف ہے۔ وہ خود کو اور مجھے ایک ہی صف میں کھڑا سمجھ رہی ہے۔“

”کیا غلط سمجھتی ہے!“ وہ مزے سے چائے پینے لگی۔

”بالکل درست سمجھتی ہے جناب! جب ہی تو آپ کو جینو بی بی کہہ کر پکار رہا ہوں۔ ویسے کتنا پیارا لگتا ہے نا یہ نام تم پر ”جینو!“ اس نے ہولے سے دوبارہ پکارا۔

”کوئی نہیں اچھا لگتا۔“ وہ شرمندہ ہو گئی ”جیسے میں بھی کوئی کام کرنے والی ہوں۔ جیسے رامو، فضلو، جینو!“ احسن کو بھی ہنسی آگئی۔

”اچھا چلو اٹھو، کپڑے چینج کر لو۔ باہر زرا سی واک کرتے ہیں!“ پھر وہ بولا تھا ”تمہاری طبیعت بھی فریٹش ہو جاتی ہے اور میرا وزن بھی ذرا کنٹرول میں آگیا ہے!“

”نکال دیں۔ کون سے کپڑے پہنوں!“ وہ لاڈ سے بولی اور دوبارہ لیٹ گئی۔

وہ اسے گھورتا ہوا الماری کی جانب بڑھ گیا۔

پھر اس نے چھوٹے چھوٹے کاسی پھولوں سے سجائے زرد رنگ کا سوٹ منتخب کیا۔ یہ سوٹ اسے بے حد پسند تھا۔ وہ اکثر زینب سے یہی لباس پہننے کی فرمائش کرتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اسے کم کم پہنا کرتی تاکہ یہ لباس زیادہ عرصے تک درست حالت میں رہے۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اس ہلکے زرد رنگ کے لباس میں بے پناہ حسین نظر آتی تھی۔

”چلو جلدی سے نہا کر فریش ہولو“ وہ لباس بیڈ پر ڈال کر بولا تھا۔ ”میں تب تک حلیہ درست کر لیتا ہوں۔“

نہیں مسکراتی ہوئی اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ نہا دھو کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ لمبے بالوں کو سنوار کر چوٹی بنائی اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر کمرے سے نکل آئی۔ احسن ٹی وی آن کیے خبریں دیکھ رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر اس نے ریوٹ سے ٹی وی آف کیا اور مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”جینونی بی! بڑا کجب ڈھاتا ہے یہ لباس تم پر!“ وہ مجھٹوں سے بھرپور لمبے میں بولا تھا۔

پھر دونوں ہنستے مسکراتے باہر نکل آئے۔ ان کی روٹین تھی، وہ سیدھی ہموار سڑک پر دوڑ تک نکل جاتے تھے پھر جہاں سڑک موڑ کاٹ کر ایک دوسری سڑک میں ضم ہوتی تھی وہاں سے وہ واپس لوٹتے تھے۔ اس روز وہ دونوں باتیں کرتے کرتے دور نکل آئے۔

”دیکھیں نا احسن! کتنا خوب صورت علاقہ ہے۔ یہاں دیر تک ٹپلتے رہنا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنا پچھلا محلہ تھا اس قابل کہ وہاں یوں شام کو ٹھہلا جاتا ہے ہر گھر سے آنکھیں جھانکنا کرتی تھی۔ یہاں کتنی پرائیویسی اور سکون ہے۔ بس یہی سمجھاتی تھی میں آپ کو اور آپ مجھے کم عقل اور نا عاقبت اندیش گردانتے تھے۔“

احسن نے محض مسکراتے رہنے پر اکتفا کیا۔

”مجھے تو اس وقت بھی یہی فکر تھی کہ اس علاقے کے بچوں کے ساتھ مل کر اپنے بچوں کی اخلاقیات متاثر ہوں گی دراصل وہاں تعلیم کی کمی تھی

تا۔“

وہ روز یونہی اپنی ہی ہانکتی رہتی تھی۔ احسن اب اس کی باتوں کی تردید کرنا نہ زیادہ حصہ لیا کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے مسکراتے ہوئے اس کی باتیں سننا رہتا اور یوں ان کی خوشگوار واک اختتام کو پہنچا کرتی تھی۔

قدم سے قدم ملاتے وہ چلتے چلے جا رہے تھے جب سامنے سے تیزی سے آتی بلیک کرولا ان کے قریب پہنچ کر اچانک ہی رک گئی۔ احسن جو روڈ کی سائیڈ پر تھا اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور حیرانی سے مڑ کر گاڑی ڈرائیو کرنے والے کو گھومنے لگا۔ وہ میر سکندر علی تھا۔ گاڑی سے سر باہر نکالے وہ بڑے دلکش انداز میں مسکراتا ہوا نہنبد کو دیکھ رہا تھا۔

”ہیلو کہاں جا رہی ہیں آپ؟ کہیں تو آپ لوگوں کو ڈراپ کر دوں؟“ وہ بڑے دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ احسن نے قدرے بے یقینی سے نہنبد کی سمت دیکھا جیسے اسے یہ ماننے میں تامل تھا کہ نہنبد اس قطعی اجنبی شخص کو جانتی تھی۔ دوسری جانب نہنبد کا مارے غصے اور نفرت کے برا حال تھا۔ اس کے گال ٹھانر کی طرح سرخ ہو گئے۔ وہ اسے کوئی سخت سا جواب بھی نہ دے سکی۔

”یہ آپ کے مسیڈ ہیں؟“ وہ ان دونوں کی حالت تذبذب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”جی ہاں۔“ اب کے احسن نے قدرے سنبھل کر بد مزگی سے کہا تھا ”آپ کی تعریف؟“

”اجی ہماری کیا تعریف ہوئی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگا کر بڑی لگن سے نہنبد کے چمکتے چہرے کو دیکھا۔

”تعریف کے قابل تو خدا نے اور بہت سے لوگ بنائے ہیں۔ ویسے خاکسار کو میر سکندر علی کہتے ہیں۔ نہنبد سے تو میں پہلے بھی مل چکا ہوں ہاں آپ سے پہلی ملاقات ہے۔ ویسے مجھے خوشی ہوئی!“

احسن کے چہرے سے اس کے دلی تاثرات کا واضح اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود میر سکندر علی پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔

”کہیں تو آپ لوگوں کو گھر تک ڈراپ کر دوں؟“ اس نے اپنی پیشکش دہرائی۔

”جی نہیں بہت شکریہ! احسن، مشکل مسکرا!“ ہم ذرا واک کے لیے نکلے ہیں۔“

”اوہ آئی سی!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نہنبد کا تفصیلی جائزہ لیا ”چلیں جی۔ آپ کی مرضی۔ پھر کبھی ملیں گے بائے!“

تیر کی تیزی سے وہ اپنی چمکتی، نئے ماڈل کی گاڑی اڑا کر لے گیا۔ وہ دونوں کھڑے کچھ دیر تک سڑک پر اڑتی دھول دیکھتے رہے۔
 ”عجیب بے ہودہ آدمی ہے۔“ پھر احسن نے کسی قدر دانت پیس کر کہا تھا ”کون ہے زنب یہ؟“

اس کے انداز میں ایک جھلاہٹ تھی۔ زنب کا دل سہم گیا۔ آج تک اس قسم کی صورت حال سے اس کا سامنا نہ ہوا تھا۔ اس میر سکندر علی نے بیٹھے بٹھائے اسے ایک مشکل سے دوچار کر دیا تھا۔ اس نے ہمیشہ سے یہی سنا تھا کہ شوہر کے دل میں ایک مرتبہ بال آ جائے تو پھر بڑی مشکل سے یہ شیشہ صاف ہوتا ہے۔ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”ملنی کا بھائی ہے یہ۔ ایک مرتبہ اسی کے گھر دیکھا تھا۔ خواہ مخواہ کی جان پہچان جھاڑ رہا تھا۔ مجھے تو اس کا نام تک یاد نہیں تھا۔ یقین کریں احسن!“

احسن نے جسکں آلود پیشانی کے ساتھ اس کی جانب دیکھا پھر اس کی اڑی اڑی رنگت اور گھبرا ہوا انداز دیکھ کر کچھ نرم ہو گیا۔
 ”ہاں ٹھیک ہے۔ تم کیوں گھبرا گئی ہو۔ ریلیکس ہو جاؤ۔ اس نیچر کے آدمی بھی ہوتے ہیں دنیا میں، اگلی مرتبہ اس نے یہ حرکت کی تو طبیعت صاف کروں گا موصوف کی!“

زنب کی جان میں جان آئی۔ دونوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔



بڑے دنوں کے بعد فارحہ کا خط آیا تھا۔ زنب لفافے پر نگاہ پڑتے ہی پہچان گئی کہ خط کس کا ہو سکتا ہے۔ بڑی بے تابی کے ساتھ اس نے خوشی خوشی لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔
 پیاری زنب۔

بہت سی دعائیں اور بہت سا پیار۔ امید کرتی ہوں خیریت سے ہوگی اور جتنا میں تمہیں یاد کرتی ہوں، اتنا ہی تم بھی مجھے یاد کرتی ہوگی۔ میں بھی یہاں خیریت سے ہوں اور اس ماحول میں ذہنی طور پر سیٹ ہونے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ دعا کرنا زنب! کہ میں اس قطعی اجنبی ماحول میں یوں مدغم ہو جاؤں کہ اسی کا ایک حصہ معلوم ہونے لگوں۔ ہم پر دینی لوگوں کے لیے عافیت کا یہی ایک رستہ ہے۔ تم نے اپنی تصویریں بھیجیں یقیناً جانو مجھے از حد خوش ہوئی۔ کتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھا۔ میری آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔ تم بہت اچھی لگ رہی ہو اور تمہارا اپنا گھر بھی خوب صورت ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ تم اسے سیٹ کرنے میں مصروف ہو۔ یقیناً اب تک تم نے اسے خوب سجا، سنوار لیا ہوگا۔ یوں بھی شادی نے تمہاری نیچر پر جو خوشگوار اثرات مرتب کیے تھے میں تو ان سے عاری ہی رہی۔ یا ر! اب احساس ہوتا ہے کہ بندے میں چلک اور جھک جانے کا مادہ ہونا ہی چاہیے۔ مجھ جیسے ضدی اور خوسرے لوگ تو اکثر ناخوش ہی رہتے ہیں خیر۔

میں کہہ رہی تھی کہ تمہارا خط پا کر اور تمہارے حالات سے آگاہ ہو کر مجھے واقعی مسرت ہوئی اور وہ خالہ والی خبر! میں تو زور زور سے ہنسنے لگی۔ یقین ہی نہیں آیا۔ حالانکہ ایک نیچر بات ہے کوئی انہونی تو نہیں۔ پھر بھی بہت دیر تک اسی پہلو پر سوچتی رہی۔ یہاں فی الوقت ایسے کوئی آثار نہیں فیصل کو بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ زندگی انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔ رہی میری بات تو میں انہیں کوشش کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ یہاں دونوں ہی بندے اپنے اپنے طور پر ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔

اور تمہارے سرتاج کیسے ہیں۔ تم ان کی جتنی تعریفیں کرتی ہو اس حساب سے وہ اچھے ہی ہوں گے۔

تم سے ملنے کو بہت سن کرتا ہے۔ دیکھو قسمت نے کب، کون سا موڑ معین کیا ہے۔ اپنا احوال لکھنا۔ یہاں بہت اکیلا پن ہے۔

بہت سے پیار کے ساتھ۔

فارحہ۔

نہیں خط پڑھ کر کافی دیر تک سوچتی رہ گئی۔ فارحہ کا یہ خط بہت ہٹ کر پچھلے خطوط سے بہت مختلف تھا۔ فارحہ کی سوچ میں ایک نمایاں فرق کی عکاسی کرتا ہوا یہ خط اپنے لفظوں کے پس منظر میں بہت کچھ کہہ رہا تھا۔

”یوں لگتا تھا فارحہ ڈسٹرب ہے!“ اس نے شام کو احسن سے کہا تھا ”اس کے کئی جملے اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں!“

”جن لوگوں کو دوسروں کو ڈسٹرب کرنے کی عادت ہو، وہ کبھی نہ کبھی تو خیا زہ بھیگتے ہی ہیں۔“ وہ نوالہ چباتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔

”ایسے تو نہ کہیں احسن!“ اسے دکھ ہوا ”اس نے بھلا کیا کہا ہے۔ اس کی تو نیچر ہی ہمیشہ سے اس طرح کی ہے۔“

”ہاں۔“ وہ سر ہلا کر ہنس دیا ”اچھی صفائی ہے اس کے حق میں!“

”میرا دل چاہ رہا ہے فارحہ سے ملنے کو!“ وہ حسرت بھرے انداز میں بولی۔

احسن نے جھٹ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”خدا رابہ، مت کہہ دینا کہ احسن! مجھے انگلیٹنڈ جانا ہے بس یہ میری خواہش سمجھ لیں!“

اس نے نہ نہیں کی بڑی پرفیکٹ نقل اتاری تھی۔ وہ چڑ کر رہ گئی۔

”میں پاگل تو نہیں ہوں۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔



دوسرے دن دوپہر میں رملہ آئی تو نہ نہیں اسے دیکھ کر باوجود خوشی کے مسکرا کر نہ سکی۔ رملی پر نگاہ پڑتے ہی اسے میر سکندر علی اور اس کا اس روز والا رویہ یاد آ گیا تھا۔ آخر کو وہ اسی رملی کا بھائی تھا۔

”کبھی طبیعت ہے تمہاری۔“ رملی نے اس کا رویہ زیادہ محسوس کیا ”اب تو بہت بہتر لگ رہی ہو۔ یارا!“

”مصرفیت کچھ ایسی رہی کہ میں اتنے دنوں تک چاہتے ہوئے بھی تم سے ملنے نہ آ سکی۔ ویسے کیا ہو گیا تھا اس روز تمہیں؟ ڈاکٹر تو اعصابی

تناؤ، کسی ذہنی بوجھ کا ذکر کر رہی تھی۔ کیا میاں سے کچھ جھگڑا ہو گیا تھا؟“

حالانکہ حقیقت یہی تھی لیکن نہ نہیں بے پروائی سے مسکرا دی۔

”میرا میاں جان چھڑکتا ہے مجھ پر۔ کسی لڑائی، کیسا جھگڑا؟ یہاں تو رادیو چین ہی چین لکھتا ہے۔ میرا تو ذرا بی پی لو ہو گیا تھا۔ یہاں تو

ڈاکٹر کو مرض میں نہ آنے تو جھٹ ڈپریشن اور ذہنی پریشانی کا نام لے دیتے ہیں!“

”ہوں۔“ رملی سر ہلا کر رہ گئی۔

”اور مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے۔ میں خود آنا چاہ رہی تھی تمہاری طرف اچھا کیا تم چلی آئیں۔“

اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ رملی پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ہاں کہو، کیا بات ہے؟“ اس کا انداز بے حد محتاط تھا۔

”رملی، پلیز! اگر تم مجھ سے یہ دوستی برقرار رکھنا چاہتی ہو تو ذرا اپنے بھائی کو اچھی طرح سمجھا دو۔ مجھے غیر مردوں کا اس طرح خواہ مخواہ سر پر

سوار ہونا قطعاً پسند نہیں۔ میری ان سے نہ کوئی جان پہچان یا واسطہ ہے نہ ہی میں آئندہ ایسا کچھ چاہتی ہوں۔ وہ میرا راستہ روکیں، میرے شوہر سے

عجیب و غریب قسم کی گفتگو کریں یا مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھیں، مجھے یہ سب کچھ ناقابل برداشت حد تک ناپسند ہے یا تو تم انہیں سمجھا دو یا پھر میں خود

سامنا ہونے پر اچھی طرح ان کی عزت افزائی کر دوں گی۔ ہر چند کہ میں آئندہ ان کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی!“

رملی خاموشی سے سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود بھی زینب کی باتوں سے پوری طرح متفق تھی۔
 زینب خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس بھرنے لگی۔ وہ اتنا کچھ بولنے اور یوں تندہ تیز بولنے کی عادی نہ تھی۔ رملی کو سر جھکائے دیکھ کر اسے قدرے افسوس بھی ہوا لیکن پھر اس نے سوچا کہ اگر اس وقت ہی پیش بندی نہ کی گئی تو اسے آگے بھی مشکلات کا سامنا پڑ سکتا ہے۔
 ”مجھے بھائی نے بتایا تھا۔“ وہ کافی دیر کے بعد بولی تھی ”کہ انہوں نے تمہیں اور احسن کو گھر ڈراپ کرنے کی آفر کی تھی۔ میرے خیال میں اس میں اتنا برا ماننے والی تو کوئی بات نہیں ہے!“

”زینب، جو اسے سر جھکائے دیکھ کر متاسف ہو گئی تھی، نئے سرے سے غصے کا شکار ہو گئی۔
 ”تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے؟ ایک غیر مرد مرزک پر رستہ روک کر مجھے گھر چھوڑنے کی پیش کش کرے وہ بھی میرے شوہر کی موجودگی میں تو یہ ایک غیر اہم بات ہے؟“
 ”تم دونوں غیر کب ہو؟ مل چکے ہو میرے گھر پر۔ سکندر نے محض میرے حوالے سے تمہارا احترام کرتے ہوئے تم سے ایسا کہہ دیا تو ایسا کیا آسان ٹوٹ پڑا زینب؟ ویسے میرا خیال ہے کہ تمہارے شوہر بے حد شکی مزاج اور غصیلے واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے شاید گھر لوٹ کر تمہیں برا بھلا کہا ہو گا اور اسی لیے تمہیں غصہ آ گیا!“

”نہیں۔“ زینب ٹھنڈی سانس بھر کر خود بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں، احسن نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ نہ وہ شکی یا غصیلے ہیں۔ انہیں تو مجھ سے خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔ دیکھو رملی! بات یہ ہے کہ تمہارے بھائی کا انداز کچھ عجیب سا ہے۔“
 ”ہاں۔“ رملی نے اس کی بات کاٹ دی ”سکندر ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہے۔ دوسروں کے احساسات کی پروا کیے بنا اپنی سی کرتا اور کہتا رہتا ہے۔ پھر فرینک ہو جاتا ہے ہر کسی کے ساتھ اور اس میں کوئی خالی نہیں۔ اصل میں زینب! تم بہت ہی دبی دبی سی، اپنے خول میں کٹی ہوئی لڑکی ہو۔ اس روز بھی تم بھائی کو دیکھ کر یوں سہم گئی تھیں جیسے وہ کوئی جن ہو۔ یا راؤ راسی خود اعتمادی پیدا کر خود میں۔ انسان کی یہی خوش شکل ہو، دبی دبی شخصیت اس کا سارا بیج تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ بھلا اتنی سی بات پر اتنا برا ایٹھ کھڑا کرنے کی کیا نیکی تھی؟“
 رملی کو سمجھانا یا اس سے الجھنا بالکل بے کار تھا۔

زینب کو احساس ہوا کہ وہ بہت مختلف ذہنیت کی حامل تھی اور شاید زینب کے ماحول سے بھی اس کا ماحول بہت الگ تھا۔ وہ دونوں علیحدہ علیحدہ دنیاؤں کی رہائشی تھیں۔

”خیر جانے دو!“ وہ بالآخر بولی تھی ”شاید میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی۔ لیکن رملی! بس اتنا جان لو کہ تمہارے بھائی کی جو بھی نیچر ہو اور وہ جیسے بھی خیالات رکھتا ہو میں اس کا یوں فری ہونا فوراً نہیں کر سکتی۔ اپنے بھائی کو بھی بس اتنا سمجھا دینا!“
 ”اوکے۔“ وہ کاندھے اچکا کر رہ گئی ”میں اس سے کہہ تو دوں گی ویسے وہ بہت لالچالی فطرت کا مالک ہے۔“
 زینب جان گئی کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے رویے کی ذمہ داری قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ وہ گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔



اس روز کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ نہ وہ رملی کے گھر جائے گی اور نہ اس کا سامنا اس شخص سے ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی۔ لیکن معاملہ اس کی سوچ سے کہیں آگے جا چکا تھا۔ ایک صبح جیلہ نے بائی پوسٹ آیا ایک کارڈ اس کے سوکر اٹھنے سے پیشتر ہی اس کے سر ہانے لاکر رکھ دیا۔

وہ انھی تو لفافے پر درج اپنا نام دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بیچنے والے نے اپنا نام تحریر نہیں کیا تھا لیکن مہربانی تھی کہ وہ اسی شہر سے سپردِ ذاک کیا گیا تھا۔

ایک سحر کے عالم میں اس نے لفافہ چاک کیا۔

”آئی لو یو“ کے پہلی حروف سے سجا کارڈ اس کے رو برو تھا۔ زینب مسکرا دی۔ یہ کام احسن ایاز کے سوا اور کون کر سکتا تھا! مسکراتے ہوئے اس نے کارڈ کھولا۔ ایک خوب صورت نظم تحریر تھی۔

تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم

تیرے چہرے کے یہ سیاہ اچھوتے سے نقوش

میرے تخیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں

تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ

کیسی ان جانی سی معصوم خطا کرتے ہیں

خلوت بزم ہو یا جلوس تجہائی ہو

تیرا پیکر مری نظروں میں ابھر آتا ہے

کوئی ساعت ہو، کوئی فکر ہو، کوئی ماحول

مجھ کو ہرست ترا حسن نظر آتا ہے

چلتے چلتے جو قدم آپ ٹھنک جاتے ہیں

سوچتا ہوں کہ کہیں تو نے پکارا تو نہیں

تم سے ہو جاتی ہیں نظریں تو خیال آتا ہے

اس میں پنہاں تیری آنکھوں کا اشارہ تو نہیں

دھوپ میں سایہ بھی ہوتا ہے گریزاں جس دم

تری زلفیں مرے شانوں پہ بکھر جاتی ہیں

تھک کے جب سر کسی پتھر پہ نکادیتا ہوں

تیری بانیں مری گردن میں اتر آتی ہیں

آنکھ لگتی ہے تو دل کو یہ گمان ہوتا ہے

سر بالیں کوئی بیچا ہے بڑے پیار کے ساتھ

میرے بکھرے ہوئے، الجھے ہوئے بالوں میں کوئی

انگلیاں پھیرتا جاتا ہے بڑے پیار کے ساتھ

کس کو معلوم مرے خوابوں کی تعمیر ہے کیا

کون جانے کہ مرے غم کی حقیقت کیا ہے

میں سمجھ لوں بھی اگر اس کو محبت کا جنون

مجھ کو اس عشق جنوں خیز سے نسبت کیا ہے

جھ کو معلوم نہیں، تجھ کو نہ ہوگا معلوم

تیرے چہرے کے یہ سادہ اچھوتے نقوش

مرے تخیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں

تیری زلفیں، تیری آنکھیں، تیرے ہونٹ

کیسی ان جانی سی معصوم خطا کرتے ہیں

زینب ایک تحیر کے عالم میں لفظوں پر نظرس دودڑا آتی گئی۔ ایسا خوب صورت اظہار تو آج سے قبل احسن نے کبھی بھی نہ کیا تھا۔ نجانے اسے کیا خیال آیا تھا جو اس نے یوں بنا اسے بتائے یہ کارڈ بھیج دیا تھا۔ وہ تاریخ سوچنے لگی۔ پھر اسے مایوسی ہوئی۔ نہ تو اس کی سالگرہ تھی۔ کم از کم اسے تو یاد نہ پڑتا تھا۔

پھر کارڈ ایک طرف رکھ کر وہ چھوٹے موٹے کام نپٹانے لگ گئی۔ یہ معرہ تو شام کو احسن کی آمد پر ہی حل ہو سکتا تھا۔

شام تک اس کے ذہن سے کارڈ والی بات بالکل نکل چکی تھی۔ احسن آیا تو وہ اس کے کپڑے لٹکانے باتھ روم میں گھس گئی۔ باہر نکلی تو احسن اس کی جانب پشت کیے کھڑا تھا۔ وہ دیر سے دیر سے چلتی اس کے قریب چلی آئی۔

”نہانا نہیں ہے؟ آپ کے کپڑے میں نے باتھ روم میں۔“

پھر اس کی نگاہ اس کے ہاتھ میں لرزتے کارڈ پر پڑی

”ارے ہاں!“ وہ ہنس دی ”یہ کیا حرکت تھی، بھی؟ اور اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟ آج سے قبل تو کبھی ایسا خوب صورت خیال۔“

”کس نے بھیجا ہے یہ؟“ احسن کی سرد آواز نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

وہ ایک سناٹے کے عالم میں رہ گئی۔ یہ خیال تو اسے چھو کر نہ گزرا تھا۔

”احسن! یہ آپ نے۔“ وہ ہٹکا کر رہ گئی۔

”یہ میں نے نہیں بھیجا ہے زینب!“ اس کا انداز حد درجہ سرد تھا ”اور نہ میری ہینڈ رائٹنگ ہے کیا تم میری ہینڈ رائٹنگ بھی نہیں پہچانتی ہو؟“

”میں تو یہی سمجھتی رہی احسن۔“ وہ مجرموں کی طرح سر جھکا کر رہ گئی ”میں میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔“

احسن چند لمحوں تک کھڑا ہونٹ پکلتا رہا پھر پھر کارڈ ایک طرف ڈال کر سر جھٹک کر باتھ روم میں گھس گیا۔

زینب چند لمحوں کے لیے وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کا دل بری طرح سے دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ الفاظ احسن کے نہیں کسی غیر کے تھے، یہ خیال دل کی تہوں میں عجب ہلچل پیدا کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ گرم ہو گیا تھا۔

”کون ہو سکتا ہے بھلا۔“ وہ خود کو سوچنے کے قابل بھی نہیں پارہی تھی ”میری بھلا کس سے ایسی شناسائی ہے، میں نے تو کبھی کسی سے بات

تک..... اوہ!“

اس کی سوچ کی سوئی اٹک گئی تھی۔

”میر سکند علی!“

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

سنہرے حروف سے سجا کارڈ بستر پر پڑا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔



اس نے کال بیل کے بٹن کو پش کیا اور پھر انگلی ہٹانا بھول گئی۔

اسے یاد نہ تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی خون کی اتنی تیز گردش اور اتنی زیادہ گرمی محسوس کی تھی۔

غصہ تھا کہ سمندر کی منہ در بہروں کی طرح اندازاً کر چکرا رہا تھا۔

مٹھیاں سختی سے بھیجنے، دانت پر دانت جمائے وہ کھڑی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی، جب دروازہ کھلا اور رملی کی صورت نظر آئی۔

”ارے زینب تم؟“ وہ مسکرائی اور ایک طرف ہو گئی ”آؤ اندر آؤ نا۔“

زینب چند لمحوں کھڑی اسے خشمگین نظروں سے دیکھتی رہی پھر اندر داخل ہو گئی۔

”کیا بات ہے؟ بڑے جارحانہ تیوروں میں لگتی ہو۔ میاں سے جھگڑاؤ گزرا تو نہیں ہو گیا؟“ رملی دروازہ بند کر کے پیچھے ہستی ہوئی آ رہی

تھی۔

”بات سنو رملی!“ زینب اچانک ہی مڑی۔ ”تم مجھ سے تعلق رکھنا چاہتی ہو یا نہیں؟ یا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم دونوں برابر برابر گھروں میں

رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی بن جائیں۔ ایک دوسرے سے کلام تک نہ کریں۔ بلا ارادہ نظر پڑ بھی جائے تو منہ پھیر کر نکل

جائیں؟“

اس کی آواز قدرے تیز اور انداز بے حد جارحانہ تھا۔ رملی چند لمحوں کے لیے ہراساں سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”بات کیا ہے؟“ پھر وہ قدرے سنبھل کر بولی ”ایسا کیا ہو گیا ہے؟ میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی؟ ٹھیک ٹھیک بات کرو، یہ آج تم کس

انداز میں آئی ہو؟“

”بات یہ ہے!“ زینب نے اس کا ہاتھ تھام کر اس پر وہ کارڈ رکھ دیا ”پڑھو اسے اور خود بتاؤ کہ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا اور وہ تمہیں ایسا بے

ہودہ کارڈ بھیجتا تو تمہارا رد عمل کیا ہوتا۔ میں کوئی کم سن، کنواری لڑکی تو نہیں ہوں، ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ تمہارے بھائی کو سوچنا چاہیے کہ اس کی

ان بچکانہ بلکہ غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے میری ازدواجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔“

رملی چپ چاپ کارڈ پڑھتی رہی پھر نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

زینب کا چہرہ شدت جذبات سے تھمارا ہوا تھا۔

سانس بہت زیادہ بولنے سے بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہ رملی کی جانب سے کسی رد عمل کے اظہار کی منتظر تھی۔

”خاموش کیوں ہو؟ اب بولو، میرا غصہ بجا ہے کہ نہیں؟ کیا تمہارے بھائی کی ان بے ہودہ حرکات سے تنگ آ کر میں تم سے ملنا جلنا ترک

نہ کر دوں گی؟“ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی تھی۔

”لیکن زینب!“ رملی ٹھنڈے لہجے میں بولی ”اس پر یہ کہاں لکھا ہے کہ یہ کارڈ میرے سکندر علی نے بھیجا ہے؟ تم نے آخر میرے بھائی کا نام لیا

کیوں؟“

زینب چند لمحوں کے لیے ہٹکا کر رہ گئی۔ اسے رملی کی جانب سے کم از کم اس جواب کی امید ہرگز نہ تھی۔

وہ دوسرے سے اس بات سے ہی منکر ہو گئی تھی کہ وہ کارڈ میرے سکندر علی کا بھیجا ہوا تھا۔

”اس لیے کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے جو یہ کام کرے۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”کیا مطلب ہے زینب تمہارا؟“ رملی کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔ ”پوری دنیا میں تمہیں صرف میرے سکندر علی کا خیال آیا محض اس لیے کہ اس

نے ایک بار تمہیں لفٹ کی پینکشن کر ڈالی؟ حالانکہ اس وقت بھی تم اکیلی نہیں تھیں تمہارا شو تمہارے ہمراہ تھا۔ اگر سکندر کے ذہن میں کسی غلط خیال کا

پرچھاواں بھی ہوتا تو وہ تمہارے شو ہر کی موجودگی میں ایسی آفر ہرگز نہ کرتا۔ ایک تو تم حسین عورتوں کی یہ بہت بڑی خامی ہوتی ہے۔ کوئی مرد اگر تمہارا

گرا ہوا دمال بھی اٹھا دے تو تم اس ذرا سے خلوص کو اپنے حسن کی کرامت خیال کرتی ہو اور اس آدمی کو پلک جھپکتے میں اپنے شہیدوں کی فہرست میں شامل کر لیتی ہو۔ آخر سکندر نے ایسا کیا ہی کیا ہے جو تم نے اس عجیب سے کارڈ کو اس سے منسوب کر ڈالا؟ وہ تم سے ملا ہی کتنی مرتبہ ہے جو اس طرح سے تمہارا والدہ شیدا ہو جائے گا کہ ایسی نظم لکھ کر تمہیں پوسٹ کر ڈالے۔ اس میں تو صاف صاف بے پناہ محبت کا اظہار ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ دوسری سی ملاقاتوں میں میر سکندر علی تم پر یوں شہید ہو جائے گا؟ معاف کرنا زینب بی بی! ابھی تم میر سکندر علی سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ شہر کی آدمی لڑکیاں اس سے ملے اور اس کے ساتھ ذرا سادقت گزارنے کی خواہش دل میں لیے پھرتی ہیں۔ کتنی ہی ہیں جو اس کے عشق میں مبتلا صبح شام آپیں بھرتی ہیں اور سکندر انہیں مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اگر محض میرے حوالے سے اس نے تم سے چند باتیں کر ڈالیں تو تم نے اسے کوئی پچا، لفظ کا خیال کر ڈالا؟“

زینب خفت کے بے پناہ احساس سے ہونٹ کاٹنے پر مجبور ہو گئی۔ ملٹی خواہ کبھی ہی دلیلیں دے ڈالتی اسے پورا یقین تھا کہ یہ کام اس ہی شخص کا تھا۔ اپنی زندگی میں جتنے مردوں کو وہ جانتی تھی ان کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتی تھی اور اس کے ذہن میں دور دور تک کسی ایسے شخص کا خیال نہ تھا جو اسے ایسا کارڈ بھیجتا۔

”تم خواہ کچھ بھی کہو رملی۔“ پھر وہ نسبتاً ٹھنڈے اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ”حقیقت یہی ہے کہ یہ تمہارے برادر محترم کی شرارت ہے۔ پچھلے کچھ دنوں میں وہی ایک اجنبی شخص نکرایا ہے مجھ سے ورنہ میں تو یہاں کسی اور کو جانتی تک نہیں۔“

”جائے دو زینب!“ رملی طنز سے مسکرا دی۔

”ساری عورتیں ایسے ہی کہتی ہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد سب ہی کا ایک آدھ افیر تو ہوتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی نظر بازی الگ۔“

”رملی!“ زینب بھنا کر رہ گئی ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ کیا سمجھا ہے تم نے مجھے؟ اور تم بھی تو ایک عورت ہی ہو، تمہارے کتنے افیر چلے ہیں شادی سے پہلے اور شادی کے بعد؟“

خلاف توقع ہی رملی کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ زینب نے حیرت سے اس کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھا۔

”ارے ہم کیا، ہماری اوقات کیا۔“ پھر اس نے ہنستے ہوئے زینب کا بازو تھام لیا اور اسے اندر لے جانے لگی ”یہ تم حسن والوں کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ ہمیں بھلا کوئی مڑ کر بھی دیکھتا ہے؟ خیر! امیر مطلب وہ نہ تھا جو تم نے سمجھا اور اب غصہ تھوک دو۔ بہت نوک جھونک ہو گئی۔ جو کچھ بھی ہوا اس کے لیے مجھے اور تمہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے اور اپنے تعلقات خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو، کارڈ خواہ سکندر ہی نے بھیجا ہو لیکن اس میں میرا کوئی ہاتھ تو نہیں ہے۔ پھر تم میرے ساتھ کیوں الجھ رہی ہو اور میں بھلا اس سلسلے میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ خواہ وہ اپنی انرجی ویسٹ کرنے والی بات ہے۔“

”تم کم از کم اخلاقی طور پر تو میری حمایت میں بول سکتی ہو۔ معذرت طلب کر سکتی ہو۔ لیکن تم تو انا میرے سرائز نگار ہی ہو۔“

زینب کا غصہ اترا نہ تھا۔ رملی اپنے کمرے میں لے آئی۔

”اچھا بابا، میں اپنے بھائی کی جانب سے بہت بہت معذرت خواہ ہوں۔ شرمندہ ہوں کہ اس نے ایسی بے ہودہ سی شرارت کی جس سے تمہیں جہنمی تکلیف پہنچی۔ ہر چند کہ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ یہ کام سکندر کا ہے۔“

اس نے زینب کو بیڈ پر بٹھا دیا۔

”میرا یقین کرور ملی۔ میں کیوں کسی پر جھوٹا بہتان باندھوں گی۔“ اب کے وہ بھی رسائیت سے بولی تھی ”یہ کارڈ دکھانا اسے اور پوچھنا۔“

”اچھی کلاس لوں گی حضرت کی، تم فکر نہ کرو۔“

رملی نے اسے تسلی دی ”اگر یہ حرکت اسی کی نکلی تو صاف کہہ دوں گی کہ مجھے میرے گھر مت آیا کرو میرے تعلقات متاثر ہوتے ہیں۔ اب

”خوش؟“

”نہیں میں یہ تو نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم بھائی بہن آپس میں جھگڑو یا تعلقات منقطع کر لو لیکن رملی میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ ایک قطعی اجنبی شخص کی وجہ سے میری گھریلو زندگی متاثر ہو۔“

آج میرے شوہر نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ میرے اد پر کسی قسم کا شک نہیں کیا لیکن کل کچھ اور ہوا تو وہ بھی سوچنے پر مجبور ہوگا۔ مجھ سے باز پرس کرے گا کہ آخری شخص کون ہے اور میرا اس سے کیا واسطہ ہے؟ بس میں تمہیں یہی سمجھانے آئی تھی کہ اپنے بھائی سے کم از کم اتنی باز پرس ضرور کرو۔ یہ نہیں کہ اس سے تعلقات ہی ختم کر کے بیٹھ جاؤ۔“

رملی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھری لیکن پھر وہ کچھ بولی نہیں۔ زنب کا غصہ بھی کافی حد تک اتر چکا تھا۔ وہ نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

”سکندر کی نیچر بھی بس عجیب ہی ہے۔“ پھر کافی دیر بعد رملی بولی۔ ”کبھی کبھار کوئی ایسا کام کر جاتا ہے جو اسے بالکل سوٹ نہیں کرتا لیکن بس کبھی کبھار ہی عموماً وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔“

زنب کو اس کی بات سے قطعاً اتفاق نہ تھا۔ لیکن وہ پھر کچھ بولی نہیں۔ اس کے خیال میں وہ پہلے ہی بہت زیادہ بول چکی تھی۔ اس معاملے میں رملی کا کچھ قصور نہ تھا لیکن وہ رملی سے بے حد حدت الفاظ میں بات کر چکی تھی۔

”یہ مرد بھی نبھانے کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔“ رملی کی خالی خالی آنکھیں نبھانے کہاں دیکھنے لگیں ”کسی ایک مقام پر انہیں صبر ہی نہیں آتا۔ تمہارا شوہر..... تمہارا شوہر کیسا ہے زنب؟“

”کیا مطلب؟“ وہ اس کے انداز اور سوال دونوں سے الجھ گئی۔

”تمہیں اپنے شوہر پر پورا بھروسہ ہے؟ تمہیں یقین ہے کہ تمہارے سوا کسی دوسری عورت کی اس کی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں؟“

”ہاں!“ وہ بے حد پر اعتماد لہجے میں بولی تھی ”مجھے احسن کی محبت اور وفا پر کوئی شک نہیں۔ میرے سوا نہ کوئی عورت اس کی زندگی میں آئی ہے اور نہ کبھی آئے گی۔“

رملی مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں کی طرح اس کی مسکراہٹ بھی زنب کو بہت خالی لگی تھی۔



احسن بے حد چپ چاپ تھا۔ زنب نے چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے خاص طور پر اس کا رویہ نوٹ کیا۔ وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

”میں رملی کی طرف گئی تھی صبح۔“ وہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر بولی۔

احسن نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اخبار لپیٹ دیا۔

”کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟“ وہ بولا تھا ”رملی کے ہاں تو تم اکثر جاتی ہی ہو۔ خاص طور پر ذکر کیوں کر رہی ہو؟“

”احسن میرا خیال ہے وہ کارڈ اس کے بھائی نے۔“

”دفع کر دیا۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بیزاری سے بولا ”جنہم میں جائے وہ۔ جس کسی نے یہ حرکت کی تم بے وجہ اس موضوع پر سوچ سوچ کر کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔“

”اس لیے کہ آپ اس موضوع پر سوچ کر ہلکان ہو رہے ہیں۔“ وہ اسی کے انداز میں بولی۔

”میں؟“ وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا ”نہیں میں نے تو پھر سوچا تک نہیں کہ۔“

”جھوٹ مت بولیں احسن!“ اس نے احسن کی بات کاٹ دی ”بیوی ہوں آپ کی۔ اپنی جراثیں جگہ پر نہ ملنے سے اگر آپ کی پیشانی پر بل پڑتے تو مجھے وہ بل بھی نظر آ جاتا ہے۔ پھر بھلا مجھے یہ خبر نہ ہوگی۔ کہ آپ اس واقعے سے ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔ بلکہ صرف آپ ہی نہیں میں خود بھی پریشان ہو گئی تھی۔ اسی لیے دلی کے گھر جا کر اس بے چاری کو بھی اچھا خاصا برا بھلا کہہ دیا۔ دراصل مجھے یقین سا ہے کہ یہ کام اسی کے بھائی کا ہے اور بھلا کون ہو سکتا ہے یہ چھوڑی حرکت کرنے والا؟ ویسے رملنی کہہ رہی تھی کہ وہ اسے سمجھا دے گی بلکہ اسے اپنے گھر آنے سے ہی منع کر دے گی۔“

احسن بے ساختہ مسکرا دی۔

”کیوں اس غریب کو اس کے بھائی سے لڑواری ہو۔“

”میں؟ میں لڑواری ہوں؟“

”بھئی، سیدھی سی بات ہے۔ خدا نے عورت کو خنثا طرز پر نہیں مگر میں رہنے اور اپنا آپ چھپانے کی ہدایت کی ہے۔ رملنی کے گھر اس کا بھائی نہ آئے اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم رملنی کے گھر آنا جانا چھوڑ دو اور پھر شخص شک کی بنا پر تو ہم کسی کو مجرم نہیں ٹھہرا سکتے نا۔“

وہ برا سامنے بنا کر بیٹھ گئی۔

”آپ کی بھی عجیب ہی منطقیں ہوا کرتی ہیں!“ پھر وہ بولی تھی ”اب میں چادر کی بکل مار کر گھر میں تو نہیں بندرہ سکتی۔ انسان ہوں۔ کبھی باہر نکلنے کو، کہیں آنے جانے کو میرا بھی جی کرے گا تو کیا ایسے لنگھوں کے خوف سے میں باہر پڑوس تک میں جانا ترک کر دوں اور رملنی ٹھیک ہی کرے گی اگر اس سے قطع تعلق کرے گی تو آج اسے میں نظر آئی ہوں کل کوئی دوسری عورت نظر آ جائے گی۔ رملنی کس کس سے ملنا چھوڑے گی۔ بہتر یہی ہے کہ فساد کی جڑ کو ختم کیا جائے۔“

”اچھا بابا چھوڑ واس ٹا پک کو۔ ذرا سی بات پر بے وجہ خود سے اور باقی لوگوں سے الجھ رہی ہو۔“

”ذرا سی بات ہے تو پھر آپ نے کیوں اتنا محسوس کیا؟ کل سے چپ چپ سے ہیں۔“ وہ قدرے فحاشی سے بولی۔ احسن چند لمحوں کے لیے خاموش سا ہو گیا تھا۔

”ہاں زینو!“ پھر وہ بولا تھا ”نجانے میں کیوں ڈسٹرب ہوا اس بات سے حالانکہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ایسے چھوٹے موٹے ناپسندیدہ واقعات سے تو تقریباً ہر عورت ہی دوچار ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بھرے بازار میں کوئی راہ گیر جان بوجھ کر کسی عورت سے ٹکرا جائے یا قریب سے گزرتا سا نیگل سوار کوئی بے ہودہ سافقرہ کس دے۔ ایسے ہی کسی فائرغ آدمی نے اٹھ کر ایک کارڈ پوسٹ کر ڈالا۔ ایسے واقعات تو نہ چاہتے ہوئے بھی ہو ہی جاتے ہیں۔ انہیں کیا دل پر لینا، کیا موڈ آف کرنا لیکن پھر بھی نینب! خود کو یہ سب کچھ سمجھا کر بھی میں بے چین سا ہو گیا۔ بار بار خیال آتا ہے۔ نجانے کس نے تمہیں ان نظروں سے دیکھا ہوگا جن سے میں تمہیں دیکھتا ہوں۔ نجانے کس کے جی میں کون سا خیال آیا ہوگا جس کے اظہار کے لیے اس نے ایسے لفظ منتخب کیے۔ عجیب جلیسی سی ہوتی ہے نینب مجھے۔ یہ جذبات جن کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بہت بوجھل کر رہے ہیں طبیعت کو۔ آخر کیوں نینب؟“

آخر میں اس نے بچوں کی طرح پوچھا تھا۔ نینب بے ساختہ مسکرا دی۔

”پتا ہے کیوں اس لیے کہ آپ مجھے بہت چاہتے ہیں۔“ وہ شوخ سے انداز میں بولی ”اتنی زیادہ محبت بھی انسان کو مشکل میں مبتلا کر ڈالتی ہے۔“

”اچھا!“ وہ بھی مسکرا دیا ”پھر کیا کروں؟ محبت کچھ کم کر دوں؟“

”جی نہیں!“ اس نے اسے گھورا ”اسی محبت کے سہارے مجھ پر اعتماد رکھیں اور اسے ایک عام سا ناپسندیدہ واقعہ سمجھ کر بھلا دیں۔ میں آپ

کی ہوں۔ آپ کے گھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آچکی ہوں۔ اب کوئی مجھے آپ سے چھین کر نہیں لے جاسکتا۔“
حسن کھل کر مسکرایا۔

”کتنی مرتبہ سمجھا ہا ہے ایسے ڈائلاگ اتنی دور سے نہیں بولا کرتے۔ بے وجہی آدمی کا بندر بننے کو جی چاہئے لگتا ہے۔“ وہ خوشی سے بولا تھا۔

”بندر بننے کو؟“ وہ حیرت سے مسکرائی۔

”ہاں! اتنی لمبی چمکانیں بندر ہی لگایا کرتے ہیں نا۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

زیب بے ساختہ ہی ہنس دی تھی۔



”جینو بی بی! کوئی عورت آئی ہے آپ سے ملنے کے واسطے!“ جیلہ نے اسے بڑی گہری نیند سے جگایا تھا۔

”مجھ سے ملنے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا پھر مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی ست دیکھا۔

ساڑھے دس بجتے کو تھے۔

”اتنی صبح کون آ گیا ہے؟“ اسے حیرت کے ساتھ ساتھ بیزار بھی ہوئی تھی۔

دراصل اسے سب سے پہلا خیال فرخندہ آپا کا آیا تھا۔ اپنا سارا کام نو، ساڑھے نو بجے تک مناکرو ہی اتنے سویرے سویرے دوسروں کے ہاں چھاپے مارنے نکلتی تھیں۔

”کہاں بٹھایا ہے؟“ اس نے نکھرے ہوئے بالوں کا جوڑا سا بناتے ہوئے جیلہ سے پوچھا،

”ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے، انتظار کر رہی ہے آپ کا۔“

”اکیلی ہی ہے یا کوئی ساتھ ہے؟“ وہ اٹھ کر دوپٹہ اوڑھنے لگی۔

”ایک بچی ہے جی۔“

”اچھا تم چائے بنالو۔ میں دیکھتی ہوں۔“ وہ باہر کی جانب بڑھ گئی۔ ”بچی بھی ساتھ ہے، نجانے کون ہے؟“ وہ الجھتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ پھر ڈرائنگ روم میں کونے میں رکھے صوفے پر آمنہ کو بیٹھا دیکھ کر اس کی ساری الجھن، بیزارگی اور کوفت یک لخت اڑن چھو ہو گئی۔

”آمنہ آمنہ۔“ وہ بڑی گرم جوشی سے اس کی جانب بڑھی اور اس سے بغل گیر ہو گئی۔

”کیسی ہوتی؟“

پھر اس نے ڈرائنگ روم میں آمنہ کو بغل سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی کنڈیشن دیکھ کر ہنس دیں۔

”تو یہاں بھی بھرپور تیاری ہے؟“ آمنہ مسکرا دی تھی۔

زیب نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اور تم تو لگتا ہے بس فارغ ہونے ہی والی ہو۔“ پھر اس نے ہنس کر پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ آمنہ کے انداز میں بے حد اطمینان تھا ”شاید اسی مہینے اسی لیے میں نے سوچا کہ تم سے مل آؤں بعد میں نجانے کتنی مصروفیت ہو جائے۔ پہلے تمہارے پچھلے گھر گئی تھی۔ مجھے علم نہ تھا کہ تم نے گھر تبدیل کر لیا ہے وہاں فرخندہ آپا ملیں۔ انہوں نے بتایا کہ تمہیں تو تقریباً دو ماہ ہو گئے ہیں شفٹ کیے ہوئے۔ ان سے پتہ لیا اور یہاں آ گئی۔ انوار ساتھ تھا۔ میری وجہ سے انہیں بھی دیر ہو گئی۔ پورا گھنٹہ لیٹ ہو گئے آفس سے۔“

وہ بظہر بظہر تفصیل سے بات کر رہی تھی۔ زنب نے اس کی باتوں کے دوران لاشعوری طور پر اس کا جائزہ لے ڈالا۔

لان کے ہلکے پھلکے سے لباس میں آمنہ بہت فریش اور پرامتنا نظر آ رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا اطمینان اور متانت آگئی تھی جو بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ جیسے اس نے زندگی کو پوری طرح سے سمجھ لیا تھا اور جیسے وہ زندگی سے خوش اور بہت مطمئن تھی۔

پھر زنب کی نگاہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی بچی پر پڑی۔ جو کمر کر زنب کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”اوہ، یہ“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

”کنزئی ہے۔“ آمنہ نے اسے لپٹا لیا ”میری بیٹی!“

”بہت پیاری ہے آؤ بیٹا ادھر آؤ“ میں آپ کو پیار کروں۔“ زنب نے پیار سے اسے بلایا وہ اٹھ کر زنب کے پاس چلی آئی۔

”بیٹا! سلام کرو آؤ نئی کو۔“ آمنہ نے اسے تلقین کی۔

”السلام علیکم آئی!“ وہ مہین سی آواز میں بولی تھی۔

”وعلیکم السلام!“ زنب نے مسکرا کر اس کا گال چوما۔

جیلہ چائے لے آئی تھی۔ زنب نے ٹکٹ اٹھا کر اسے پکڑ لیا تو وہ شرمائی۔

”لو بیٹا!“ آمنہ بولی تھی ”اور اب آپ باہر جا کر کھیلیں میں آپ کی آئی سے باتیں کروں گی۔ پھر تھوڑی دیر میں گھر چلیں گے۔“

”جی امی ٹھیک ہے۔“ وہ ٹکٹ پکڑ کر باہر چلی گئی۔

”بہت پیاری، تیزروالی بچی ہے۔“ زنب اسے باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگی ”آمنہ!“

پھر وہ آمنہ کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

”جج جج بتاؤ! تمہیں واقعی یہ اپنی بیٹی محسوس ہوتی ہے۔ اب جو تمہارے بچہ ہوگا تو کیا تم دونوں میں فرق محسوس نہیں کر دو گی؟“

”محسوس ہونا اور احساس کے مطابق عمل کرنا یہ کتنا دور علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں۔ مجھے اگر دونوں میں فرق محسوس ہوا ابھی تو میں اسے کسے عمل

سے اسے ظاہر نہیں ہونے دوں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا تاکہ میں اپنے بچے سے زیادہ محبت محسوس کروں گی تو کیا ہوا۔ یہ بات تو ہمیشہ میرے دل

میں رہے گی۔ میں انوار صاحب یا کنزئی کو کبھی اس بات کا احساس نہ ہونے دوں گی۔“

زنب حیرانی سے آنکھیں پھیلائے اس کی بات سنتی رہی۔

”تمہیں اس بچی سے حسد محسوس نہیں ہوتا آمنہ؟ اس نے شروع دن سے تمہارے شوہر کو شیر کیا ہوا ہے۔“

آمنہ مسکرا دی۔

”میرا بچہ بھی تو انوار کی محبت شیر کرے گا تو کیا میں اس سے بھی حسد کروں گی؟ نہیں زنب! میں نے تو کبھی اس مری ہوئی عورت سے حسد

محسوس نہیں کیا جس کی یہ زندہ نشانی ہے۔ انوار بتاتے ہیں کہ انہیں زاہدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اکثر مجھ سے اس کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن مجھے

کبھی اس سے حسد محسوس نہیں ہوا۔ انوار کی زندگی میں میری اپنی علیحدہ جگہ ہے۔ ایک خاص مقام ہے۔ کسی سے حسد یا جلن محسوس کر کے میں اس جگہ

اور مقام سے نیچے تو جاسکتی ہوں، آگے نہیں بڑھ سکتی اور میں آگے جانا چاہتی ہوں اور آگے بڑھنے کے لیے بے غرض اور بے لوث ہونا بہت ضروری

ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کنزئی! کچھ ہی دنوں میں مجھ سے کتنی زیادہ اونچ ہو گئی ہے۔ میں دسترخوان پر نہ ہوں تو نیوالہ نہیں لیتی۔ کہتی ہے امی کے ساتھ

کھاؤں گی اور جتنا زیادہ یہ مجھ سے محبت کا اظہار کرتی ہے اتنی میری قدر انوار کے دل میں بڑھتی جاتی ہے۔ ایسا صرف اس لیے ہے کہ میں نے بہت

خلوص سے اور بہت بے غرض ہو کر اس بن ماں کی بچی کو اپنا لیا ہے۔ اسے ماں کی محبت حاصل کی ہے تو جواب میں اس کی معصوم اور بے لوث محبت

حاصل کی ہے۔ اگر میں رقابت کے جذبات دل میں لے کر اس گھر میں داخل ہوتی تو نہ مجھے شوہر کا اعتماد حاصل ہوتا اور نہ ایک بیٹی کی چاہت۔ بس ہر

جانب حسد کے شعلے اور بے سکونی بکھری رہتی۔ مجھے تو محبت اور سکون کا گہوارہ بنا اپنا گھر بہت عزیز ہے۔“

زینب بہت غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہت خوش اور مطمئن ہو۔“ اس نے آمنہ کی بات سن کر کہا تھا۔

”ہاں بالکل!“ آمنہ مسکرائی۔ ”اور اپنی کہو۔ یہاں تو صاف نظر آ رہا ہے۔ راوی چین چین لکھتا ہے۔ ایک پیارا، خوب صورت سا گھر، اپنے پورے تصرف کے ساتھ اور ایک چاہنے والا جیون ساتھی اور ایک آنے والے مہمان کا خوش کن تصور! ہوں؟“

”آں!“ زینب چونک اٹھی۔ پھر ہولے سے مسکرا دی ”ہاں آمنہ!“

”مجھے تم سے بہت شکایت ہے زینب!“ پھر آمنہ بولی تھی ”میری شادی پر بھی تم مہمانوں کی طرح شریک ہوئی تھیں اور شادی کے بعد کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئیں۔ تمہارا مجھ سے ملنے کو جی نہیں کرتا زینب! اگر ایسا ہے تو مجھے بھی بتا دو تاکہ میں بھی تم سے ملنے نہ آیا کروں۔ بے وجہ تم پریشان ہوتی ہوگی۔“

”ہائیں۔“ وہ خفگی سے بولی ”پاگل ہوئی ہو۔ میرا تم سے ملنے کو کس قدر دل چاہتا ہے میں بیان نہیں کر سکتی۔ ابھی ڈرائنگ روم میں تم کو بیٹھا پا کر یوں لگا گویا مفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ تم تو میرے میکے کی واحد نشانی ہو آمنہ۔“

وہ اداس سی ہو گئی تھی۔

”تم سے مل کر مجھے اپنا میکہ، وہ محلہ اور اماں یاد آتی ہیں۔ وہ دن یاد آتے ہیں جواب کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔ جب بے لکری سے ملا کرتے تھے۔ گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔“

اسے نجانے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیک گئیں۔

”پھر مجھ سے ملتی کیوں نہیں ہو؟“ آمنہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”اب آؤں گی انشاء اللہ۔“ وہ بیٹھی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔ ”تم مجھے مٹھائی بھیجتا۔ میں اگلے روز ہی وارد ہو جاؤں گی۔ چلو، اب کھانا بناتے ہیں۔ میرا لٹچ تو چار پانچ بجے ہوتا ہے لیکن تمہیں جلدی بھوک لگ جائے گی اور پھر یہ بچی بھی تو ہمراہ ہے۔ آؤ کچن میں چلتے ہیں۔“

دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔



مقید خاک

ساحر جیل سید کا ایک اور شاہکار ناول..... مقید خاک..... سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیر خیز داستان۔ ڈاکٹر کلکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مرہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا..... یوسف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا..... یوسا:- ایک حراماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا..... مر یاقس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسدِ خاک میں مقید تھی..... شیلندر رائے ہریجن:- ایک پرائیویٹ ڈیپلکٹر، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی..... مہرجی:- پرکالہ آفت، انسانی قالب میں ڈھلی ایک آسمانی بجلی..... ایکشن، سسٹمز اور تھرلر کا ایک ندرکنے والا طوفان..... یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے ایکشن ایڈوینچرزم جوئی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

دن معمول کے مطابق گزر رہے تھے جب اس کی زندگی کی پرسکون جھیل میں کنگر اُٹھ گیا۔

اتفاق سے اس روز جیلہ نے بھی چھٹی کی تھی۔ زینب گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر ہانڈی کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی جب ڈوریل بجی۔

اس نے کچن کے دروازے میں آ کر لاؤنج میں گئی گھڑی میں ٹائم دیکھا پھر بڑا اٹھی۔

”اس وقت کون آگیا۔ جیلہ بی بی تو نہیں چلی آئیں شاداں دفرہاں۔“

وہ وہ پند لیے بغیر ہی دروازے کی سمت چلی گئی تھی۔ لاک کھول کر اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

وہاں میر سکندر علی کھڑا سکر رہا تھا۔

”اندرا آسکتا ہوں..... مسز زینب شاہ!“ اس نے گردن کو ذرا سا خم دے کر اجازت طلب کی تھی۔

پھر اس نے زینب کی جانب سے کسی رد عمل کے اظہار کا انتظار کیے بغیر ہی اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ زینب اگر تیزی سے ایک طرف

نہ ہو جاتی تو شاید وہ اس سے ٹکرا بھی جاتا۔

”آپ.....“ وہ غصے سے بولی ”آپ اندر کیوں چلے آ رہے ہیں..... میں نے آپ سے اندر آنے کو نہیں کہا۔“

”مجھے یقین ہے، آپ انکار بھی نہ کریں گی۔ میں محض چند باتیں کرنے کے لیے آیا ہوں۔“

وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بڑے اطمینان سے چلتا ہوا لاؤنج میں پہنچ گیا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر بڑے تذبذب کی حالت میں

اس کے پیچھے آئی تھی۔

”دیکھیں سکندر صاحب! آپ پلیز اس وقت چلیں جائیں۔“ بے موقع افتاد سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔

”آخر“ آخر آپ کیوں اس طرح میرے گھر چلے آئے ہیں؟“

”آپ نے یہ کارڈ کیوں واپس کیا؟“ وہ یکا یک پلٹا تھا۔

زینب نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی کارڈ تھا جو وہ رملی کے گھر چھوڑ آئی تھی۔

”یہ..... یہ آپ نے بھیجا تھا؟“

”آف کورس میں نے بھیجا تھا۔“ وہ دھیسے سے مسکرایا۔ ”مجھے اس پر اپنا نام تحریر کرنے میں کسی قسم کا ڈر خوف نہ تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ آپ

مجھے پہچان لیں گی۔“

”اسی لیے میں نے رملی سے دو ٹوک انداز میں کہا تھا کہ یہ سراسر آپ کا کام ہے۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔

”ہاں میں نے رملی کو بھی بتا دیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”لیکن رملی اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے؟ یہ تو میرا پرسل معاملہ ہے۔“

”آپ تو نہایت ڈھیٹ شخص ہیں۔“ وہ جڑ ہو گئی ”لیکن آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”یہ کارڈ واپس کرنے۔ رملی کے ڈیرنگ ٹیبل پر پڑا یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے آپ اپنے ڈیرنگ ٹیبل پر رکھیں۔ یہ بڑا قیمتی کارڈ

ہے۔ اس پر جو لٹم تحریر ہے، یہ میری ہینڈ رائٹنگ میں ہے۔ یقین جائیں میں نے آج تک کسی کو کارڈ پر کچھ تحریر کر کے نہیں دیا۔ آپ کا چہرہ دکھائی دیا تو

نجانے کب کی پڑھی لٹم لا شعور سے نکل کر شعور میں وارد ہو گئی اور آپ یہ کارڈ اٹھا کر وہاں پھینک آئیں۔ یہ صرف آپ کے لیے ہے زینب!“

”آپ۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔“ اس کے بدن میں لرزش پیدا ہو گئی ”میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔“

”سووٹ؟“ اے جیسے اس بات پر حیرانی ہوئی تھی کس کتاب میں لکھا ہے کہ شادی شدہ عورت سے عشق نہیں کیا جاسکتا؟“

”سکندر صاحب!“ وہ بظاہر مضبوط بن کر چیختی ”آپ حد سے زیادہ بڑھ رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں آپ فوراً سے پیٹر یہاں سے نکل

جانیں۔“

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

”خوب صورت لوگوں کو ایسے رویے سوٹ نہیں کرتے زینب شاہ! میرا یہاں آنا آپ کو برا لگ رہا ہے تو میں چلا جاتا ہوں ویسے مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت بے ضرر آدمی ہوں ہاں کچھ من موچی ہوں۔ آپ سے ملنے کو دل چاہتا تو چلا آیا۔ آپ ناراض ہوتی ہیں تو چلا جاتا ہوں۔“

وہ مسکراتا ہوا جانے کے لیے پلٹا پھر کر گیا۔

”اور ہاں۔“ وہ مڑ کر بولا تھا ”یہ کارڈ اپنے پاس رکھیں۔ اس پر بڑے سچے جذبات تحریر ہیں ایسا اظہار تو کبھی احسن صاحب نے بھی آپ سے نہ کیا ہوگا۔ آئی ایم رائٹ؟“

زینب کے پاس اس کے سوال اور پھر پور مسکراہٹ کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے بھنا کر منہ پھیر لیا۔

”چلتا ہوں۔“ وہ باہر نکل گیا تھا۔

اس کے نکلنے ہی اس نے لپک کر دروازہ لاک کیا تھا مبادا وہ پھر پلٹ آئے۔ پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے سارے گھر کے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان بند کر لیے۔ اسے تو کبھی یہ خیال چھو کر بھی نہ گزرا تھا کہ کبھی کوئی غیر شخص اس طرح ٹھسے سے منداٹھا کر اندر آ سکتا ہے۔ وہ تو بے حد لا پرواہی سے رہنے کی عادی تھی۔ احسن چلا جاتا تو اکثر اس کی واپسی تک دروازہ لاک ہی نہ کیا کرتی تھی۔ حالانکہ اس سلسلے میں اسے احسن اکثر دیشتر تنبیہ کرتا رہتا تھا۔

لیکن آج خوف سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ میر سکندر علی تو آکر اسی طرح واپس بھی چلا گیا تھا لیکن اگر اس کی جگہ کوئی ڈاکو، چور اچکا یا کوئی بہروچی ہی آگھستا تو وہ کیا کر لیتی۔ بار ہاں اور پڑھا تھا کہ ایسے لوگوں کے نزدیک دوسروں کی جان اور عزت کی اتنی ہی اہمیت ہوا کرتی ہے جتنی بیروں کے نیچے آ جانے والی چوٹی کی۔

خوف کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے تین چار گلاس پانی پیا پھر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی اس وقت اسے شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا لیکن دوسرا ہٹ میسر نہ تھی۔ بھلا کس کو بلا سکتی تھی وہ اور پھر دروازہ کھولنے اور گھر سے قدم باہر نکالنے کا تصور ہی خوفزدہ کر رہا تھا۔

وہ وہیں بیٹھی دل کی دھڑکنوں کو سنتی رہی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا خوف ختم ہوا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی تھی یہ تو طے تھا کہ اسے احسن سے اس واقعے کا ذکر ہرگز نہ کرنا تھا۔ وہ تو محض کارڈ بھیجے جانے سے ہی اتنا ڈسٹرب ہو گیا تھا تو پھر یہ واقعہ تو اسے از حد ٹینس کر ڈالتا۔ یہ بات اگر اس کے علم میں آجاتی تو پھر وہ کبھی اسے گھر پر تنہا چھوڑ کر کہیں نہ جاتا اور پھر کیا یہی تھا کہ وہ میر سکندر علی سے ہی بھڑ جاتا۔ احسن سے اس واقعے کا ذکر کرنے میں سراسر نقصان ہی تھا اور وہ کوئی بھی نقصان مول لینے کے لیے تیار نہ تھی۔ پھر اس نے رملی کے متعلق سوچا تو اسے پھر مایوسی ہی ہوئی رملی سے پہلے بھی زبانی طور پر اتنی جھڑپ سے بھلا کیا حاصل ہوا تھا۔ بلکہ اسی جھڑپ کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ یوں بے خوف و خطر اسے دیکھنے کو اس کے گھر چلا آیا تھا اور آج اگر جیلہ ہوتی تو نجانے کیا ہوتا۔ وہ کس طرح احسن سے یہ بات چھپاتی اور کس منہ سے جیلہ کو اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنے کی تاکید کرتی۔

پریشان کن سوچوں میں گھر کر اس نے کچن کے کاموں کا آغاز کیا تھا۔ یہ کیسے حالات کا سامان ہوا تھا کہ وہ مجھ ہی نہ پار ہی تھی کہ اسے کرنا کیا چاہیے۔

”عجیب و غریب خبیلی شخص ہے۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔ ”کس لیے پیچھے پڑا ہے اور کیوں؟ اگر آج کے بعد اس نے پھر کوئی پیش رفت کی تو میں کیا کروں گی؟ پھر شاید احسن کو تباہی ہی پڑے گا۔ احسن تو پہلے ہی ڈسٹرب ہو چکے ہیں۔“

اس کا دماغ کسی نقطے پر نہ ٹھہر رہا تھا۔

کام سے فارغ ہو کر وہ کچن سے نکلی تو اس کی نگاہ سینئر ٹیبل پر رکھے کارڈ پر پڑی۔ اس نے جھپٹ کر اسے اٹھالیا اور بیڈروم میں آ کر بیڈ کی میٹریس کے پیچھے گھس دیا۔

”ایسا اظہار تو کبھی احسن صاحب نے بھی آپ سے نہ کیا ہوگا!“

اسے میر سکندر علی کے الفاظ اور اس کی مسکراہٹ یاد آگئی۔ نجانے کیوں وہ سوچنے پر مجبور ہوئی۔ یہ سچ ہی تھا کہ کارڈ ملنے پر وہ نظم پڑھ کر وہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ اسے احسن کا بھیجا ہوا کارڈ سمجھ کر اسے کس قدر حیرت ہوئی تھی۔ کہ احسن نے پہلی مرتبہ اس قدر اچھوتے اور خوب صورت انداز میں اظہار کیا تھا۔ کچھ کہنے کا انداز واقعی خوب صورت تھا۔

”عجیب شخص ہے۔“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے سوچا ”بے فکر، بے پروا امن موجدی سا۔ کچھ ہے اس کی شخصیت میں جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔“

پھر اپنی ہی سوچ سے گھبرا کر وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔



کچھ دنوں تک وہ بے حد ہراساں اور پریشان سی رہی تھی۔ احسن نے کتنی ہی مرتبہ اس سے اس کی حالت کے متعلق استفسار کیا لیکن وہ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال گئی۔

احسن آفس چلا جاتا وہ گیمبرائی سی ادھر سے ادھر پھرا کرتی۔ دروازے اور کھڑکیاں چیک کرتی پھرتی۔ جیلہ کی موجودگی سے بھی اسے تسلی نہ ہوتی تھی۔ ایک عجیب خوف سادل کی جڑوں میں بیٹھ گیا تھا رملی بھی ایک آدھ مرتبہ ہو کر چلی گئی تھی لیکن زینب نے اس سے بھی کچھ نہ کہا۔ اسے جیسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ رملی کے اختیار سے باہر تھا۔ اپنے طور پر اس نے یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ آئندہ وہ کبھی رملی کے گھر نہ جائے گی۔

کچھ دن اور تسلی سے گزر گئے تو وہ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی۔ اسے نیند بھی ٹھیک طرح سے آنے لگی اور دن بھی اطمینان سے گزرنے لگا۔

بڑے دنوں کے بعد احسن کے ساتھ باہر گھومنے کے خیال کے تحت اس نے کپڑوں کا انتخاب کرنے کے لیے الماری کھولی تھی۔ کچھ دیر تک وہ کھڑی سامنے رکھے تہ شدہ کپڑوں کو دیکھتی رہی پھر مایوسی سے سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ احسن آفس سے ابھی ابھی لوٹا تھا اور کپڑے تبدیل کر کے ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

”بات سنیں نا!“ وہ اس کے سامنے جا بیٹھی۔

”سنائیں جی!“ اس نے آواز کم کر کے اسے دیکھا۔

”مجھے لان کے کپڑے بنوانے ہیں۔ کم از کم چھ سات جوڑے۔ سچ بالکل بھی کپڑے نہیں ہیں۔“

احسن نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کی صحیح الدماغی پر اسے شبہ ہو۔

”جا کر اپنی الماری کا بنظر غائر جائزہ لیں محترمہ۔ اوپر سے نیچے تک یوں بھری ہوئی ہے جیسے انار دانوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور ابھی بھی کپڑوں کی کمی کا دردنا ہے؟“

”اودھو وہ جہیز اور بری کے کپڑے؟ کیا ان سے میری جان ساری زندگی نہیں چھوٹے گی؟ اور کیا وہ ریشمی گونا گونا ساری کے کپڑے میں اتنی سخت گرمی میں گھر میں پہن کر بیٹھ جاؤں؟ میں لان کے کپڑوں کی بات کر رہی ہوں احسن اور پھر اب تو وہ پرانے کپڑے مجھے آئیں گے بھی نہیں۔“

میں کچھ ڈھیلے ڈھالے کپڑے سلوانا چاہتی ہوں۔ پچھلے سال کے سارے ہلکے، گرمی میں پہننے والے کپڑے ٹائٹ ہو گئے ہیں۔ برے لگتے ہیں۔“

”پھر ایسا کر دے میرے کپڑے پہن کر کام چلا لو۔ میرے کپڑے تو تمہیں ابھی بھی ڈھیلے ہی ہوں گے۔“ وہ بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے

ٹی وی کی آواز پھر سے تیز کرنے لگا۔

”اوہ..... ہاں!“ زینب نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔ ”یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا! آپ کے کپڑے پہن کر تو پورا سال آرام سے گزر سکتا ہے۔“

احسن نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ زور سے ہنس دی۔

”آپ کے کپڑے خود آپ کو تو پورے نہیں پڑتے مزید یہ کہ میں بھی پہننا شروع کر دوں؟ تین پتلونیں، پانچ شرٹیں، چار عدد شلوار سوٹ، تین جوڑی جرابیں دور دال اور چار بنیاس یہ ہے آپ کی کل کائنات! کیا خود پہنیں گے کیا مجھے پہنائیں گے۔!!“

”بھئی کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔“ اس نے سر دھڑکی ”بازار جاؤ تو اپنی باری آتے آتے جیب یوں خالی ہو جاتی ہے جیسے کسی جھوٹے کا وعدہ! ہلکی اور بے وزن۔ جہاں بیگم صاحب کو ہر دوسرے ماہ کچھ نئے کپڑے بنوانے کا خیال ستاتا ہو وہاں صاحب بے چارہ تین پتلونوں میں گزرا نہ کرے تو اور کیا کرے؟“

”کیا؟ کیا کہا؟“ وہ چیختی ”مجھے ہر ماہ دو ماہ بعد نئے کپڑوں کا خیال ستاتا ہے؟ احسن! کچھ تو خوف خدا کریں۔ جھوٹ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔“

”کیا غلط ہے؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ”اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی تمہیں سردیوں کا خیال آ جاتا ہے کاشن کے سوٹ اور رنگ برنگے سوئٹروں کا خیال اور تذکرہ اٹھتے بیٹھتے شروع ہو جاتا ہے۔ فروری بمشکل گزرتا ہے کہ تم موسم بہار کی مناسبت سے کچھ خوب صورت رنگوں کے ہلکے پھلکے کپڑوں کی بات کرتی ہو۔ ابھی جناب اپریل آدھا ہی گزرا ہے کہ لان کے نئے پرنس کا ذکر ہونے لگتا ہے۔ پھر بیچ بیچ میں کہیں آنے جانے کے لیے پہننے جانے والے کپڑوں کی بات الگ تو بہتہ تو خواتین کا بس چلے تو کلینڈر کی تاریخوں کے حساب سے کپڑوں کی خریداری کرو یہ بیس جنوری کا سوٹ، پہلی فروری کا سوٹ، یہ جوڑا ذرا ایویس سا ہے فرسٹ اپریل کو پہن لوں گی۔“

زینب کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

”احسن! احسن! پلیز کچھ سنجیدہ ہو جائیں۔“

اس نے احسن کو دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے دیکھ کر التجا سیہ انداز میں کہا۔

”ہاں بابا اب کیا ہے؟“ وہاں اس کا کوئی پسندیدہ پروگرام چل رہا تھا۔ وہ قدرے جھلا کر بولا۔

”میں نے آپ سے کچھ کہا تھا۔“ وہ روٹھائی ہوئی ”میری بات کا جواب تو دیا نہیں۔ یونہی اٹنے سیدھے مذاق کر کے مطمئن سے ہو کر لیٹ گئے ہیں۔“

”زینو یار!“ وہ واقعی سنجیدہ ہو گیا ”کہاں سے بنوادوں ابھی کپڑے؟ ابھی آدھا مہینہ باقی ہے اور پیسوں کو لگتا ہے پر لگے ہوئے ہیں۔“

فرخندہ آپا سے ادھار رقم لیے کتنے ماہ ہو چلے ہیں اور ہم نے ذرا سی رقم پس انداز نہیں کی۔ ابھی چند ماہ بعد جو خرچا ہوتا ہے وہ الگ۔ اس کے لیے بھی کچھ سوچا ہے؟“

وہ اداس سی شکل بنا کر ہیر کے ناخنوں سے اپنی چہل ادھیڑنے لگی۔

”کپڑوں کا کیا ہے یار؟“ وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولا ”انسان کا گزرا تو ایک جوڑے میں بھی ہو جاتا ہے۔ اس سال یونہی وقت نکال لو۔ اگلے سال لان کے بہت سے کپڑے بنوالیتا۔“

”اگلے سال؟“ وہ دوہانسی ہوئی ”اگلے سال کے اپنے علیحدہ خرچے ہوں گے۔ کون سا ہمارے پاس غیب سے خزانہ آ جائے گا۔“
احسن نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

”اچھا! چلو یوں کرتے ہیں تنخواہ ملنے پر ایک جوڑا بنا لیتا۔ پھر اس سے اگلی تنخواہ پر ایک جوڑا یا ایک کٹھے چار پانچ سوٹ والی بات ہنسنے نہیں ہوگی۔“

وہ برا سامنہ بنا کر اٹھ آئی۔ کمرے میں آکر پھر الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔

”رہنے دیں ایک سوٹ بھی۔“ وہ بڑبڑائی ”میں انہیں پرانے کپڑوں کو کھول لوں گی۔ کام ہی چلانا ہے تو چل جائے گا کام! یہ فرخندہ آپا اتنی دور سے بھی میرے سر پر سواری رہیں۔ ابھی بھی میری خوشیوں کی راہ میں ان ہی کا نام رکاوٹ بن جاتا ہے۔“
وہ الماری کے پٹ سے سر نکال کر نبانے کیا کچھ سوچنے لگی تھی۔



صبح اسے بے حد خوشگوار لگی تھی۔

احسن نے اسے سوتے سے جگا کر خوش خبری سنائی تھی۔

”سنو زینو! تمہاری دوست آمنہ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ اٹھو، مٹھائی کھا لو۔“

وہ جھٹ آنکھیں کھول کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آمنہ کے بیٹا ہوا ہے؟“ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں چیخی ”آپ کو کیسے پتا؟“

”اس کے شوہر آئے تھے۔ انوار علی صاحب! مٹھائی دے کر گئے ہیں کہہ رہے تھے آمنہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“ وہ مارے خوشی کے جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تیار ہو جاتی ہوں احسن! آپ آفس جاتے ہوئے مجھے آمنہ کے گھر چھوڑ جائیں واپسی میں لے لیجیے گا۔“

”محترمہ! ذرا گھڑی کی جانب نگاہ اٹھائیں۔ ساڑھ نو بجے ہیں یہ کوئی آفس ٹائم ہے؟“

اس نے حیرانی سے گھڑی کی سمت دیکھا پھر اسے یاد آیا، وہ جھٹی کا دن تھا۔

”اچھا سامناشتہ بنا کر دو کپڑے استری کرو۔ اس کے بعد کوئی فرمائش کرنا۔“ وہ شابانہ انداز میں بولتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

زینب مسکراتے ہوئے کچن کی سمت بڑھ گئی۔ آمنہ کی خوشی اسے اپنی خوش لگ رہی تھی۔ احسن کو ناشتہ بنا کر دینے کے بعد اس نے اپنے اور احسن کے کپڑے پر لیس کیے۔ پھر احسن سے پہلے ہی تیار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”جلیں نا احسن۔ اٹھ بھی جائیں۔“ وہ ٹی وی دیکھتے احسن کے سر پر جا کھڑی ہوئی ”میں تیار بھی ہو گئی ہوں اور آپ اب تک ٹانگ پر ٹانگ جمائے لیٹے ہیں۔“

”محترمہ!“ اس نے دلچسپی سے اس کا جائزہ لیا ”آپ تو تیار ہو گئی ہیں لیکن یہ غریب جو آج کا دن اکیلا اور تنہا گھر پر گزارے گا، کچھ اس کے بارے میں بھی سوچا ہے؟ یہ کیا کھائے گا؟ کیا پئے گا؟ تنہا کیسے جیے گا؟“

زینب کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ درآئی۔

”جیلہ آ جائے گی گھنڈہ بڑھ گھنڈہ میں۔ سارا کام نپا دے گی آپ اپنے کھانے پینے کی فکر نہ کریں۔“

”اچھا!“ اس نے کسمندی سے اٹھڑائی لی ”جیلہ آ جائے گی؟ چلو، پھر تو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“

”ہائیں!“ زینب نے اس کے لہجے کی معنی خیزی پر اسے گھور کر دیکھا ”دماغ تو ٹھکانے پر ہے آپ کا؟“

”کیوں؟“ وہ معصومیت سے بولا ”میں نے کیا کہا ہے؟ تم ہی تو کہہ رہی ہو، جیلہ آ جائے گی۔“

”سچ کہتے ہیں یہ مرد بڑے میسے ہوتے ہیں۔“ وہ دانت پیس کر بولی ”اپنی بات کہہ دو اور معصوم بھی بن گئے۔ اب وہاں سارا دن میرا

دل پریشان ہوتا رہے گا۔“

”شرم کرو یا را!“ احسن کھلکھلا کر ہنس دیا تھا ”اتنا بے اعتبار کر ڈالا مجھے لحوں میں وہ بھی جیلہ کے لیے؟“ دونوں کو یہی ہنسی آ گئی تھی۔ پھر وہ

اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ آمنہ کے گھر پہنچی تو ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ وہ پہلی مرتبہ آمنہ کے گھر آئی تھی۔ تجسس نظروں سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتی ہوئی صحن تک

جائینگی۔

وہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ صحن کے بعد ایک مختصر سا برآمدہ اور اس سے آگے بنے ہوئے دو کمرے۔ برآمدے کے ایک سائیڈ میں غالباً

اسٹور روم تھا جس کے لکڑی کے دروازے پر تالا ڈالا ہوا تھا۔

پورا گھر نہایت صاف ستھرا ہو رہا تھا۔ فرش پر کہیں ایک فالتو تنکے کا بھی نام پتہ نہ تھا۔ دیواروں پر تازہ تازہ سفیدی کی گئی تھی۔ برآمدے کی

دھوپ سے بچانے کی خاطر صحن اور برآمدے کے بیچ میں ایک پردہ لٹکا یا گیا تھا جو فی الوقت ایک طرف کو کیا ہوا تھا۔

وہ دروازہ بجا کر گھر میں داخل ہوئی لیکن دستک کی جواب میں کوئی اب تک کمرے سے باہر نہ نکلا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی ایک کمرے کے

دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ ایک بوڑھی خاتون دروازے کی جانب پشت کیے لوہے کے ٹریک میں جھکی بنانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے گلا صاف کر کے سلام کیا تھا۔

”کون؟“ وہ مزید ”علیکم السلام۔ کون ہو بیٹی؟“ ان کی عمر لگ بھگ ستر برس کے قریب معلوم ہوتی تھی، لیکن آواز نہایت صاف اور

پاٹ دار تھی۔

”میں..... آمنہ کی دوست ہوں۔ زینب!“ وہ خاتون کے رعب سے مرعوب ہو گئی۔

”اچھا اچھا آمنہ کی دوست ہو۔ چلو، میں آمنہ سے ملواتی ہوں۔“

وہ اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلی آئیں۔

کمرے میں ہلکا سا اندھیرا تھا۔ خاتون نے لائٹ جلا دی۔

”آمنہ! تمہاری دوست آئی ہے۔“

زینب نے دیکھا۔ بیڈ پر آمنہ کے پہلو میں ایک ننھا منسا وجود چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ دونوں ماں بیٹھے غالباً سو رہے تھے۔

آمنہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی رنگت بے پناہ زرد ہو رہی تھی لیکن وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھی۔

”مبارک ہو آمنہ!“ زینب نے اس کا گال چوما ”بہت خوش ہوئی مجھے یہ سن کر۔ دیکھو، دوڑی چلی آئی ہوں۔“

”شکریہ!“ وہ دھیرے سے بولی ”بیٹھو زینبی! اور ہو کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔“

وہ خاتون اب تک کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”اماں یہ میری بہت اچھی سہیلی ہے، زینب اور زینب، یہ انوار صاحب کی خالہ ہیں۔ انہوں نے ہی میری ساس کے انتقال کے بعد ان کی

پرورش کی ہے۔“ زینب محض سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ اسے نہایت اصول پسند اور سخت گیر۔ خاتون لگی تھیں۔

”میں نے چھوٹے کے لیے بچھونیاں اور چادریں نکال لی ہیں۔“ وہ آمنہ سے مخاطب تھیں ”کچھ کپڑے بھی ہیں، وہ بھی کام آئیں گے۔“

کنزئی کی ماں نے نہایت سلیقے سے استعمال کر کے بالکل نئی حالت میں ساری چیزیں اگلے بچے کے لیے ٹرک میں رکھ دی تھیں۔ تم دیکھو گی تو یقین نہیں کرو گی کہ یہ استعمال شدہ چیزیں ہیں۔ اب تمہیں بھی ساری چیزوں کو اتنی ہی حفاظت اور سلیقے سے برتنا ہے۔“

”جی اماں!“ آمنہ آہستگی سے بولی۔

”چھوٹا دودھ پینے کے لیے اٹھا تھا؟“ وہ یوں دریافت کر رہی تھیں جیسے بچے کی ماں آمنہ نہیں، وہ خود تھیں۔

”جی ہاں اٹھا تھا دودھ پی کر پھر سو گیا۔“

”ہوں ابھی دو دن کا ہے۔ بچے ایسے ہی چوہیں گھسنے سوتے رہتے ہیں۔“ انہوں نے بیچ میں زینب کو بھی معلومات فراہم کیں۔ غالباً اس کی حالت کے پیش نظر۔

”اچھا۔ تم دونوں باتیں کرو۔ میں کھانا بناتی ہوں۔“

”دیرو ہو گئی ہے لیکن کیا کروں۔ ابھی صفائی سے فارغ ہوئی ہوں۔ برتن تو منہ اندھیرے ہی دھو لیے تھے۔“

وہ خود ہی خود بڑبڑاتی باہر نکل گئیں۔

زینب نے آمنہ کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

”انوار کی سگی خالہ بھی ہیں اور ساس بھی۔ زاہدہ ان ہی کی بیٹی تھی۔“

”اوہ کنزئی کی تانی؟“

”ہاں! بے چاری اکیلی رہتی تھیں۔ میں اپنے پاس لے آئی۔“ وہ بتا رہی تھی۔

”لیکن ان کا رویہ تو ایسا ہے جیسے یہ تہا باری ساس ہوں۔ کسی حکمران کا سا انداز ہے۔“ زینب کہے بنا رہ نہ سکی۔

”ہاں ان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔ لیکن دل کی بری نہیں ہیں۔ بس ہر بات مانتے رہو تو بہت خوش رہتی ہیں۔“ آمنہ بچے کو ڈھانپتے ہوئے گمن سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”اور تم خود انہیں اپنے گھر میں لے آئیں؟“

زینب نے برا سنا منہ بنایا۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے آمنہ؟ لڑکیاں تو ساس نندوں سے خالی گھر کے خواب دیکھتی ہیں۔ ایک مکمل اپنے اختیار کا گھر ہر لڑکی کی پہلی ترجیح ہوتی ہے اور تم نے خود ایک عدد ساس کو گھر میں گھسالیو۔ وہ کبھی ایسی سخت گیر خاتون جنہیں دیکھ کر خوف آئے؟“

”اکیلی تھیں بالکل۔ مجھے ترس آتا تھا اور پھر زینب! سال کے تین سو ساٹھ دن بندہ کسی کی خدمت کرے تو پانچ دن ایسے بھی آتے ہیں جب اسے بھی دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت احساس ہوتا ہے کہ سودا گھائے کا نہ تھا۔ اب دیکھو نا، دو دن سے میں اس بستر سے اٹھی نہیں بس ہاتھ روم تک جاتی ہوں اور واپس بستر میں اماں نے ہی گھر سنبھالا ہوا ہے۔ برتن، جھاڑو، روٹی ہانڈی۔ ہر کام اپنے ہاتھ سے کر رہی ہیں۔ پھر چھوٹے کی دیکھ بھال الگ۔ رات کو روتا ہے تو اماں مجھ سے پہلے اٹھ جاتی ہیں۔ میری ساری ریاضتوں کا بدلہ انہوں نے ان دونوں میں دے دیا ہے۔ یہ نہ ہوتیں تو کون سنبھالتا گھر کو؟ میری امی تو اپنا گھر چھوڑ کر نہیں آ سکتی تھیں۔“

”ہونہر دو چار دن کو تو بندہ ماسی وغیرہ بھی رکھ لیتا ہے۔“ زینب نے نخوت سے ناک چڑھائی ”اس کے لیے پورا سال کسی کی خدمت کرنا

ضروری نہیں۔“

آمنہ مسکرا دی۔

”چلو اپنی اپنی سوچ ہے۔ میں اماں کو اس خیال کے تحت نہیں لاتی تھی کہ ان سے کبھی اپنی خدمت کرواؤں گی۔ بس دوسرا ہٹ کا خیال تھا۔

اماں بھی اکیلی تھیں اور میں بھی۔“

”کنزئی کہاں ہے؟ اور انور بھائی؟“ اس نے جان کر موضوع بدلا۔

”مٹھائی دینے گئے ہیں کچھ عزیزوں کے ہاں۔“ وہ مختصر ابولی۔

”اور میرا بھانجا کیسا ہے۔ میں نے تو باتوں میں لگ کر اسے بھی غور سے نہیں دیکھا۔“ اس نے بڑے اشتیاق سے بچے کو اٹھایا۔

”کس پر گیا ہے آمنہ؟“ وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”معلوم نہیں۔“ آمنہ ہنس دی۔ ”ابھی تو اس کے نقش بالکل واضح نہیں ہیں۔“

”بندر سا لگتا ہے۔“ زینب کا کسی نومولود کو دیکھنے کا نیا تجربہ تھا۔ اسے بچہ کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ واپس آمنہ کے پہلو میں لٹا دیا۔

جب کے آمنہ اس کے ریمارکس پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”بندر کہہ لو یا کچھ اور ایسا ہی ایک بندر تمہارے پاس بھی آنے والا ہے۔“

اس کی بات سن کر زینب کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے بچہ کو پھر سے اٹھالیا۔

”یہ تمہیں بہت اچھا لگتا ہے آمنہ؟“ اسے بچہ کو دیکھ کر یقین نہ آتا تھا۔

”ہوں! لاؤ اسے مجھے دے دو۔ گیلا ہو گیا۔ میں بدل دیتی ہوں۔“ آمنہ نے بچہ اس کی گود سے لے لیا اور اس کی پیٹی بدلنے لگی۔

زینب کو اس عمل سے متلی کی محسوس ہوئی۔ اس نے تو کبھی ان سب باتوں کے بارے میں غور تک نہ کیا تھا۔

”ہائے آمنہ!“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ ”یہ سب بھی کرنا پڑے گا؟“

”جی جناب!“ آمنہ ہنسی۔ ”اور اپنے یہ لبا بنے ناخن تراش لو ابھی سے، ماؤں کے ناخن لمبے نہیں ہونے چاہئیں۔ بچے کو لگ بھی سکتے

ہیں۔“

زینب نے تاسف سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔



کھانا پکانے سے فارغ ہو کر وہ گرمی گرمی پکارتی ہاتھ روم میں جا گھسی تھی۔ جمیلہ اپنے کاموں میں ہمیشہ کی طرح مصروف تھی۔ اس نے ہاتھ روم سے ہی آواز لگا کر اپنے کپڑے اور تولیہ منگوایا۔

پنک کمر کا سوٹ پہن کر وہ بالوں کو تولیہ سے رگڑتی بے فکر سے انداز میں باہر نکلی تو جمیلہ نے اطلاع دی۔

”مہمان؟“ اس کا ہاتھ بالوں میں ہی رک گیا۔ ”کون ہیں؟“

”رملی بی بی۔“ وہ مختصر ابولی۔

”افوہ رملی! مہمان کب سے ہو گئی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے یونہی ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہیں رک گئی۔

رملی کے ساتھ میر سکندر علی بھی ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ ہمیشہ کی طرح پینٹ شرٹ میں لمبوں وہ بڑے بے فکر سے انداز میں ہاتھ صوفے کی پشت پر پھیلائے بیٹھا تھا۔ ہونٹوں میں سگار کا کوٹا دبا ہوا تھا۔ زینب کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور اخلاقا کھڑا ہو گیا۔

”ہاؤ آر یو زینب شاہ؟“

زینب نے پریشان نظروں سے رملی کو دیکھا تھا جو خود بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد پھیکا ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر برائے نام مسکراہٹ

تک نہ تھی۔

”نہیں! یہ سکندر تم سے معذرت کرنا چاہ رہے تھے۔“ وہ کچھ رکے رکے سے انداز میں بولی۔ ”میں نہیں جانتی تمہیں ہمارا یہاں آنا کیسا لگے گا لیکن بہر حال یہ ضد کر کے چلے آئے۔“

”ایکسیکو زمی میں آتی ہوں۔“ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر ہی مڑ کر چلی آئی۔

کرے میں آکر اس نے تولیہ بیڈ پر پھیلا یا اور اپنا ڈوپٹہ اٹھا کر اچھی طرح سے خود پر پھیلا لیا۔ بالوں کو سمیٹ کر پن انکائے۔ اس دوران وہ مسلسل سوچتی رہی تھی کہ اسے ان لوگوں کے ساتھ کیا سہارا دے کرنا چاہیے۔ بہر حال وہ اس کے گھر مہمانوں کی طرح ہی آئے تھے۔ وہ انہیں نکال تو نہیں سکتی تھی۔ پھر وہ معذرت کرنے آیا تھا۔ بنانے کس بات کی؟ لیکن ان دونوں کا رویہ ایسا تھا کہ نہ نوبت ان سے چاہتے ہوئے بھی کھردرے انداز میں پیش نہ آسکتی تھی۔

گھر آئے مہمان کے ساتھ بدتمیزی کرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ وہ پلٹ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ دونوں کوئی بات کر رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر زبردستی جاکر رملی کے قریب جا بیٹھی۔

”یوں اچانک کیسے آنا ہوا؟“

”سکندر کہہ رہے تھے کہ چند روز پیشتر یہ تمہارے گھر چلے آئے تھے۔ بنا اجازت۔“ رملی نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

”تم نے مجھ سے کہا بھی نہیں؟“ رملی کے لہجے میں عجیب سی شکایت تھی۔

نہیں خفیف سی ہو کر رہ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے رملی نے اس پر کوئی بہتان تراشا ہو۔

”تم سے کیا کہتی؟“ وہ ذرا سی تلخ ہوئی۔ ”پہلے تم سے کہنے کا کیا فائدہ ہوا۔ النام مجھ سے الجھ پڑی تھیں۔“

”ارے خواتین!“ وہ بیچ میں بول اٹھا تھا۔ جانے دیجئے ان باتوں کو۔ نہ نوبت! محض اتنی ہے کہ مجھے احساس ہوا ہے کہ میرا انداز بہت غلط تھا۔ میں ایڈمٹ کرتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے آپ سے یوں بی ہونہیں کرنا چاہیے تھا۔ سو میں نے رملی سے کہا، میرے ساتھ چلو۔ میں معزز خاتون سے سواری کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کو احساس ہو گیا۔ یہی کافی تھا۔“ وہ روکے سے انداز میں بولی۔ ”معذرت کی کیا ضرورت تھی۔“

”نو۔۔۔ نو۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ضرورت تھی۔ اخلاقیات بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ کیوں رملی؟ ایم آئی رائفٹ“

”جیلہ کہاں ہے نہ نوبت؟“ رملی اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نہ نوبت سے پوچھنے لگی۔ ”میں چائے کا کبہ کر آتی ہوں۔“

اس سے پیشتر کہ نہ نوبت کچھ بولتی وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ نہ نوبت کو عجیب جھلاہٹ نے آگھیرا۔

عشق کا عین

عشق کا عین..... علم الحق حتی کے حساس قلم سے، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی داستان، ع.....ش.....ق کے حروف کی آگاہی کا درجہ بہ درجہ احوال۔ کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے۔

”ہتا ہے زنب شاہ! آپ نے میرے بارے میں بہت غلط اندازے لگائے۔ رملی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے کہ آپ مجھے کس قماش کا بندہ سمجھتی ہیں۔ اودہ آئی وائر نیکی شا کڈ! میرے بارے میں اس قدر گڈ لکنگ خاتون ایسی رائے رکھے میں برداشت نہیں کر پاتا۔ پہلی فرصت میں آپ کو سوری کہنے آیا ہوں۔ دراصل زنب! میرا ذوق بہت اچھا ہے۔ مجھے ہر خوب صورت شے اٹریکٹ کرتی ہے اور میں ہر خوب صورت چیز کو ایک خوبصورت مقام پر دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ کبھی میرے گھر آئیں نا۔ دیکھیں میں نے کیا کیا نوادرات جمع کر رکھے ہیں۔“

زنب اسے الجھن سے دیکھنے لگی۔ اسے ان باتوں کا مقصد قطعی سمجھ نہ آیا۔

”خیر جانے دیجئے۔ آپ سے میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے ہر خوب صورت شے اٹریکٹ کرتی ہے اور میں اسے ایڈ مار کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کے بے پناہ حسن سے متاثر ہوا تو سوچا کسی خوبصورت سے انداز میں اپنی بات کہنی چاہیے۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ ایک کارڈ سے اس قدر پریشان ہو جائیں گی۔ کیا آپ واقعی پریشان ہو گئی تھیں؟“

وہ ہلکے سے ہنسا تھا۔

”کیا کوئی خاتون اپنی تعریف سے پریشان بھی ہو سکتی ہے؟“

”آپ تو ایسے بات کرتے ہیں جیسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ جیسا آپ یہاں کے ماحول، تمدن، ریت رواج سے واقف نہ ہوں۔“ وہ جل ہی گئی۔

”اودہ ریت رواج! آئی ڈیم کیئر۔“ وہ بے پروا سے انداز میں کاغذ سے اچکا کر بولا۔ ”بہر حال! حقیقت ہے کہ آپ سے زیادہ حسین چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔ چند دنوں کے لئے کنیوز ہو گیا تھا میں بٹ ناؤ آئی شیو۔ میری جانب سے آپ کو کسی بھی قسم کی کوئی شکایت نہ ہوگی۔“

وہ چند لمحوں کے لئے سگار کی جانب متوجہ ہوا۔

”میں نے رملی سے بھی وعدہ کیا ہے۔ میری وجہ سے اتنی اچھی سہیلیاں آپس میں اپنے تعلقات کیوں خراب کریں۔ ٹھیک ہے رملی؟“

اس نے پیچھے سے آتی رملی کو مخاطب کیا تھا۔

”ہوں!“ اس نے سرسری سے انداز میں کہا اور ٹرے سینئر ٹیبل پر رکھ دی۔ ”میں نے سوچا، جیلہ کی بیٹی ہوئی چائے شاید سکندر پسند نہ کریں۔ میں خود چائے بنا کر لائی ہوں۔“

”ٹھیک یور ملٹی۔“ وہ کش لیتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ”تمہاری یہی باتیں اچھی لگتی ہیں۔“

چائے نہایت خاموش ماحول میں پی گئی۔ زنب نے نوٹ کیا رملی ضرورت سے زیادہ چپ چپ سی تھی۔ سکندر سے اس کا رویہ کچھ کشیدہ تھا۔ البتہ میر سکندر علی اپنے ازی انداز میں تھا۔ اس نے چند لمبی مذاق بھی کئے اور زنب سے بار بار معذرت بھی طلب کی۔ پھر وہ گھڑی دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اوکے معزز خواتین آئی ہڈ لیو ناؤ! آپ اپنی باتیں کریں۔ پھر ملیں گے ہائے۔“

وہ باہر نکل گیا تھا۔ رملی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”زنب! مجھے بے حد افسوس ہے۔“

”جانے دو۔ خیر گزری کہ تمہارے بھائی کا دماغ ٹھکانے پر آ گیا۔“ اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”مجھے علم نہ تھا کہ سکندر تمہارے گھر بھی پہنچ گیا ہے۔ میں نے تو انجانے میں ذکر کیا تھا کہ زنب بہت دنوں سے آئی نہیں۔ تب مجھے بتایا کہ معاملہ کیا ہے۔ تو اسی لئے تم نے میرے ہاں آنا جانا ترک کر دیا تھا؟“

”کیا کرتی رملی میں؟ کوئی اور راستہ بھی تو نہ تھا میرے پاس۔ کچھ کہتی ہوں۔ تمہارے بھائی نے مجھے ذہنی طور پر بے حد تباہ کر دیا تھا۔ کچھ

میں نہ آتا تھا کس سے مدد طلب کروں۔ بس یہی ایک راستہ نظر آیا کہ تم سے ملنا جلنا تمہارے گھر آنا جانا ترک کر دوں۔“

”میں نے سکندر کو بھی سمجھایا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”دراصل اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ باہر گزرا ہے اے اتنا اندازہ بھی نہیں ہے کہ یہ حرکتیں ایک میرڈ عورت کی زندگی میں کیسا زہر گھول سکتی ہیں۔ بہر حال اب وہ بھی سمجھ گیا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کبھی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔ تم اس کی جانب سے بے فکر ہو جاؤ۔“

اس نے سکون کا سانس لیا۔

رملی کے جانے کے بعد بھی وہ بے حد مطمئن انداز میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ سب کچھ جان کر اسے ایسا لگا تھا جیسے سینے پر سے ایک بھاری پتھر مگر گیا ہو۔ کتنے دن اس نے ایک پریشان کن سوچ سے نبرد آزما رہ کر گزارے تھے۔ اب اسے خود اپنی حالت کا سوچ کر ہنسی آنے لگی۔ بے وجہ ایک خطی انسان کی چھوٹی سی شرارت سے وہ اتنا خوف زدہ ہو گئی تھی۔

”تم تو اچھی خاصی بے وقوف ہو زینب خاتون!“

اس نے احسن کے انداز میں کہہ کر اپنے سر پر ایک چپٹ لگائی اور ہنسنے لگی۔



شام کو کبھی اس کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔

احسن ٹی وی لگے بیٹھا تھا۔ جب کہ وہ قریب بیٹھی اپنی لڑائیاں سنائے جا رہی تھی۔ یکا یک اس کے من میں شرارت ابھری۔

”احسن! احسن سنیں نا!“ اس نے نوٹ کیا وہ اس کی جانب کم کم متوجہ تھا۔

”ہوں..... کبھی؟“ وہ بدستور پروگرام کی جانب متوجہ تھا۔

”یہ آدمی شادی کے بعد اس قدر جلد کیوں بدل جاتے ہیں؟“

”کیا مطلب۔“

”بیوی کی جگہ اتنی جلدی ٹی وی کو دے دیتے ہیں۔“ وہ شرارتاں مکرانی۔

احسن کے لبوں پر خوش گواری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ٹی وی پر پروگرام بدل بدل کرتے ہیں، جانو بیوی تو زرا خبر نامہ!“ وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولا۔

”اچھا!“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”تو پھر ایک خبر سناؤ؟ اچھل ہی نہ پڑیں آپ!“

”کیا زیادہ سے زیادہ کسی اور سٹیبل کے کچھ ہوا ہوگا۔“ وہ ہولے سے ہنس دیا۔

زینب جل کر رہ گئی۔ اس کی جانب کچھ توجہ ہی نہ تھی۔

”پتا ہے دوپہر کو وہ آیا تھا۔“

”کون؟“

”وہی اسماٹ سا بندہ میر سکندر علی!“

احسن کا رد عمل اچانک اور بے حد خطرناک تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں ٹی وی آف کر دیا۔

”کیا؟ کیا کہا؟“

زینب کا دل اس کا رویہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔

چنکھوں کے لئے وہ اس قدر ہراساں ہوئی کہ اس سے کچھ بولا بھی نہ جاسکا۔

احسن پیشانی پر ہزار سلوٹس ڈالے اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

”بولو زنب! کیا کہہ رہی تھیں تم؟ وہ شخص یہاں آیا تھا؟ یہاں، میرے گھر میں؟ بنا میری اجازت اور موجودگی کے اور..... اور تم نے اسے آنے بھی دیا۔ کیوں؟“

اس کا لہجہ بے حد خراب تھا۔ زنب کا جیسے خون ہی خشک ہونے لگا۔

”احسن! احسن! آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔“ وہ بمشکل بولی۔ ”میری بات تو سنیں۔ وہ اکیلا نہیں تھا رملی کے ساتھ آیا تھا، معافی مانگنے۔“

”کس بات کی معافی؟“ وہ بدستور درشت تھا۔

”وہ..... وہ اس روز والے رویے کی۔ جب اس نے راستے میں ہم دونوں کو لفٹ کی آفر کی تھی۔“ زنب سے بات سنبھانی مشکل ہو گئی۔

اگر وہ کارڈ کا ذکر کرتی تو احسن مزید چڑھ سکتا تھا۔ اس نے اصل بات گول کر جانے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

”در اصل میں رملی سے خوب جھگڑا کرتی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ اس کا بھائی کس قدر بدتمیز اور بے ہودہ ہے۔ راہ چلتے لوگوں سے مذاق کر گزرتا ہے..... اسی لئے، اسی لئے وہ مجھ سے معذرت کرنے آیا تھا کہ اگر ہم دونوں کو اس کے رویے سے تکلیف پہنچی ہے تو اسے معاف کر دیں۔ اس نے تو محض پڑوسی ہونے کے ناتے ہمیں لفٹ کی پیشکش کی تھی۔“ اس نے جلدی جلدی بات گھڑی تھی۔

”اور وہ منحوس کارڈ؟ وہ اس کے چچا نے بھیجا تھا؟“

اس کے بات بنانے کے باوجود احسن کو اصل قصہ یاد تھا۔ ”وہ محض تعلقات مزید بڑھانے آیا تھا۔ زنب اور تم نے اسے اندر بٹھا کر اس کی

رام کہانی بھی سنی۔ تمہاری عقل کہاں گھاس چرنے لگی ہوئی تھی۔ تمہیں لوگوں کو، ان کی نظروں کو پہچاننا نہیں آتا؟ کتنی ہوس ٹپکنی ہے اس آدمی کی نظروں

سے اور..... اور..... تم نے اس کے سامنے بیٹھ کر.....“

شدت جذبات سے اس کی آواز بند ہونے لگی۔

”نہیں، نہیں۔ احسن! اس نے وہ کارڈ نہیں بھیجا۔“ زنب مزید جھوٹ بول کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ”وہ تو..... وہ تو.....“

قسمیں کھا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ میں اس کی ہینڈر اسٹنگ چیک کر سکتی ہوں۔ اب بے وجہ تو کسی کو موردا لزام ٹھہرانا جائز نہیں ہے نا۔ اس روز تو آپ خود کہہ

رہے تھے کہ میں بنا تصدیق کے کیوں اس کا نام لے رہی ہوں اور آج خود اپنی ہی بات کی تردید کر رہے ہیں۔ وہ اتنا برا آدمی نہیں ہے۔ یقین

کریں۔“

احسن نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”خود کو درست قرار دینے کے لئے بے وجہ اس کی وکالت نہ کرو زنبی!“ بالآخر وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ”میں بندے کو ایک نگاہ میں

پہچان لیتا ہوں۔ بہر حال، اتنا نوٹ کر لو کہ آئندہ وہ شخص اس گھر میں داخل نہ ہونے پائے۔ خواہ اس کے ساتھ ملٹی ہو یا کوئی اور اور دوسری بات یہ کہ

اس کی موجودگی کی صورت میں تم بھی رملی کے ہاں نہیں جاؤ گی۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ رملی کے گھر جانا ترک کر دو۔ بہر حال وہ اس کا بھائی ہے۔ کسی

وقت بھی وہاں آ جاسکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا اس سے آسنا سامنا ہو۔ اس شخص کا یہاں آنا صرف اور صرف ایک بات کی نشان دہی کرتا ہے۔

جو بے ہودہ، اخلاقیات سے عاری سلسلہ اس نے شروع کیا ہے وہ اسے مزید جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اور گاڈ..... اس وقت اگر وہ میرے سامنے آ

جائے تو میں اس کا خون پی جاؤں۔ سچ کہتے ہیں۔ ایسوں کو ڈھیل دینے کا نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ انہیں تو پہلی سیزر می پر ہی ایسی چار چوٹ کی پڑنی چاہیے

کہ مزید قدم اٹھانے کا حوصلہ نہ رہے۔“

وہ بے تحاشا سنجیدہ ہو رہا تھا۔ زنب نے اسے پہلے کبھی اس موڈ میں نہ دیکھا تھا۔ اس کا رویہ بہت مختلف تھا۔ وہ تو اسے کوئی اور ہی احسن

لگ رہا تھا۔ بردبار، بھنڈے مزاج کے احسن سے بالکل مختلف۔

رہی کے گھر آنے جانے پر پابندی کا سن کر وہ پریشان سی ہو گئی اور یہاں اس کا تھا ہی کون جس کے پاس گھڑی دو گھڑی کو جا کر وہ اپنا دل بہلا سکتی اور پھر اس کا اپنا دل تو یہی کہتا تھا کہ میرا سکندر علی جس انداز میں معذرت کر کے گیا تھا اس کے بعد اس کی جانب سے مزید کسی پیش قدمی کی توقع رکھنا درست نہیں تھا۔ وہ حقیقتاً معذرت کرنے ہی آیا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس نے ساری صورت حال پر غور کیا۔ اور جلدی سے مسکرا دی۔

”اوہ احسن! آج آپ سے تو ذرا ساندق کرنا دو بھر ہو گیا۔ آپ اس قدر سنجیدہ ہو جائیں گے، میں نے تو سوچا تک نہ تھا۔ ورنہ کاہے کا یہ برا ساندق کرتی۔“

”کیا مطلب؟“ احسن نے اسے خشکیں نظروں سے گھورا۔

”مطلب یہ کہ کون میرا سکندر اور کہاں کا میرا سکندر۔ یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ اس غریب کو تو اب میری صورت تک یاد نہ ہوگی۔ میں نے تو یو

نہی ذرا سا آپ کو چھیڑنے کے لئے.....“

”نہب! وہ جھڑکنے کے سے انداز میں بولا۔ ”اب تم چکی تو نہیں ہو جو ان باتوں کی نزاکت کو سمجھ نہ سکو۔ مذاق کرنے والی بات ہے؟ مذاق ایسے کیا جاتا ہے؟“

”جانے بھی دیں احسن اب۔ آپ نے تو چچھا ہی لیا۔ میرے فرشتوں کی توبہ جو میں نے آئندہ آپ سے ایسا تو کیا کسی بھی قسم کا مذاق کیا ہو۔ ویسے مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا ہے کہ آپ اس قدر شکی مزاج اور غصیلے ہیں۔“

اس نے دے دے سے انداز میں اپنی برہمی کا اظہار کر ڈالا۔

”نہیں زینی!“ اس نے گہرا سانس بھرا۔ ”میں شکی مزاج نہیں ہوں۔ میں خدا نخواستہ تم پر شک نہیں کر رہا تھا۔ تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ زمانہ بہت خراب ہے۔ یہاں تو بظاہر شریف اور سادہ نظر آنے والے لوگوں پر بھروسہ کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ کجاہے کہ ان پر بھروسہ کیا جائے جن کی نگاہوں سے ان کی دلی، آلودہ خواہشات کا اظہار ہوتا ہو۔ بہر حال، تم نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ تمہیں ابھی تک مذاق تک کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ آج ایک بات گروہ میں باندھ لو۔ شوہر خواہ کیسا ہی نرم مزاج اور بے ضرر کیوں نہ ہو اس سے اس طرح کی بات نہیں کرتے۔“

نہب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ احسن اسے بے طرح شرمندہ کئے جا رہا تھا۔

”میں دیکھتی ہوں۔ جیلہ نے اب تک چائے گرم نہیں کی۔“ اس نے وہاں سے اٹھنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

بچن میں آ کر وہ دیر تک بنا کسی مقصد کے کھڑی چیز کو گھورتی رہی۔ اسے آج نجانے کیوں یہ احساس ستا رہا تھا کہ احسن اب وہ نہیں رہا تھا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔



صبح سے ہی وہ سخت قسم کی سستی کا شکار تھا۔ کوئی بھی کام نہ کرنے کا ارادہ کر کے وہ لیٹی رسالہ پڑھ رہی تھی، جب دروازے کی بیل بجی۔ نہب نے رسالے سے نگاہ ہٹا کر گھڑی کی جانب دیکھا۔ ساڑھے گیارہ کا ٹائم تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ احسن گھر پر ہی موجود تھا۔ اس نے

احسن کی موجودگی کے خیال سے اٹھ کر دروازے تک جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور لیٹی رسالہ پڑھتی رہی۔

چند ہی لمحوں بعد احسن کی معیت میں فرخندہ آپا اور صوفیہ اندر داخل ہوئیں تو لیٹی ہوئی نہب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھی تھی۔

”السلام علیکم۔“ انہوں نے اسے پیار سے لپٹایا۔ ”کیسی ہو بیٹی؟“

صوفیہ نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ وہ کچھ شرمائی شرمائی سی کھڑی تھی۔

”بھینس نا آپ لوگ۔“ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کمرے کی حالت کچھ ابتری تھی۔

”جیلہ اب تک نہ آئی تھی۔ وہی آکر گھر کی صفائی سے کام کا آغاز کیا کرتی تھی۔ زینب نے صبح سے اٹھ کر کچھ بھی نہ کیا تھا۔“ ہوں“ فرخندہ آپانے حسب عادت ایک نافدانہ نگاہ کر کے کی حالت زار پر ڈالی اور بستر کے کنارے نگ گئیں۔ ”ابھی ابھی ہو؟ ہم لوگ کچھ جلدی ہی چلے آئے۔ دراصل یہ صوفیہ کافی دنوں سے کہہ رہی تھی تم سے ملنے کا۔ آج میں نے سوچا چٹھی کا دن ہے۔ احسن بھی گھر پر ہوگا، پکڑ لگایا جائے۔“

”بہت اچھا کیا۔“ وہ اوپری دل سے بولی۔ ”میں بھی سارا دن اکیلی رہ رہ کر اکٹا سی جاتی ہوں۔ آپ لوگوں کے آنے سے میرا دن بھی اچھا گزر جائے گا۔“

حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے ان لوگوں کی آمد قلعہ اچھی نہیں لگی تھی۔ ایک تو ویسے ہی اس کی طبیعت سستی ہو رہی تھی اور جیلہ کا ارادہ بھی چھٹی کرنے کا معلوم ہو رہا تھا، ورنہ اب تک تو وہ آ جایا کرتی تھی۔

”آپ لوگ بیٹھیں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ کھڑی ہوئی۔

”پہلے بستر تو بھاڑ دو زینب!“ احسن جراتی دیر سے خاموش کھڑا ہوا تھا، آہستگی سے بولا۔

”جی۔“ وہ چونکی۔ ”اچھا۔“

جلدی جلدی چار چھڑا کر اس کی شکلیں دور کیں تھکے لگائے۔ پھر چند ایک میلے برتن جو سائڈ ٹیبل پر رکھے تھے، اٹھا کر کچن کی جانب چلی آئی۔ وہ اس وقت شدید قسم کی کوفت کا شکار ہو رہی تھی۔

چائے کا پانی چوبے پر رکھ کر وہ سوچنے لگی کہ ان لوگوں کے لئے کیا کھانا بنائے۔ فرج میں گوشت، مرغی، قیہہ سب ہی کچھ موجود تھا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ مینو کے متعلق سوچنے لگی۔ سبک میں پڑے رات کے کھانے اور صبح کی چائے کے گندے برتن اور گھر کی صفائی کا خیال بھی سر پر سوار تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ ساری باتیں بھول کر جیلہ کو کونے لگ گئی۔

چائے کی پتلی میں چھانے ہوئے وہ زرباب بڑبڑا بھی رہی تھی، جب صوفیہ کچن کے دروازے میں نمودار ہوئی۔

”کیا کرنے لگی ہیں آپ؟ تھوڑی دیر تو ہمارے پاس بھی بیٹھتیں۔“

زینب جبراً مسکرائی۔

”تم چلو صوفیہ! میں چائے لاتی ہوں۔“ وہ نہیں چاہتی تھی کہ صوفیہ کچن کا حلیہ بخور دیکھے۔ وہ کبھی اسکے گھر نہیں گئی تھی لیکن فرخندہ آپا کی زبانی اس کے ہنر اور سلیقے کے قصے سن کر اسے ازبر ہو چکے تھے۔

”آج شاید آپ کی ماسی نہیں آئی۔“ وہ اندر چلی آئی۔

”ہاں، پھر میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“ وہ کینٹ سے کپ نکالتے ہوئے بولی۔

”اوہو، ہم نے آپ کو مصیبت میں مبتلا کر ڈالا۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”ارے نہیں بھی، ایسا بھی نہیں۔“ زینب مسکرائی۔ ”اچھا چلو چائے پیئیں۔“

”چلیں۔“

زینب بڑے اٹھا کر کچن سے نکل آئی۔ احسن اور فرخندہ آپا خوشگوار موڈ میں کسی بات پر غور نہیں رہے تھے۔

”ہاں بھئی زینب! کیا وعدہ کیا تھا تم لوگوں نے مجھ سے۔“ فرخندہ آپا نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”کہتے تھے، ہر دوسرے دن

آپا سے ملنے آیا کریں گے۔ یہاں چھ ماہ ہونے کو ہیں۔ پلٹ کر پوچھنا نہیں کہ آیا جیتی ہے یا مرنے ہے۔“

”میں نے کہا۔ آپا! اب بات دوسری ہے۔ اب آپ قرض خواہ اور ہم قرض دار ہیں۔ اب تو ہم چھپتے پھر رہے ہیں۔ آپ سے۔ کیوں

زینب؟“ احسن ہنس رہا تھا۔

”چل ہٹ شیر کہیں کا۔“ آپ نے ایک دھپ رسید کی۔ ”بہن بھائی میں کچھ تیرا میرا نہیں ہوتا۔ سب سانجھا ہوتا ہے۔ تم لوگوں کی ضرورت تھی، میں تو دے کر بھول بھی گئی۔ اب جب خدا کا فضل ہو تو لوٹا دینا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں تو تمہاری محبت میں کھنٹی آتی ہوں۔ کبھی تم لوگ دل میں بدگمانی لاؤ۔“

”نہیں آپ۔“ احسن نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر چوا۔ ”میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ میں، اور آپ کی نیت پر شک کروں گا؟ ناممکنات میں سے ہے۔ میں جانتا ہوں، میری آپ کا دل آئینہ ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے، اسی کا عکس آنکھوں میں، وہی زبان پر۔ پھر بھی آپ! قرض تو قرض ہوتا ہے نا۔ بس بہت جلد آپ کی رقم لوٹا دوں گا۔ بہت کجوس ہو گیا ہوں اسی فکر میں۔ زینو سے پوچھ لیں۔“

بہن بھائی کا یہ حد درجہ التفات زینب کو نجانے کیوں بے حد ناگوار گزار رہا تھا۔ جیسے دل پر کسی نے کھولتا گرم پانی ڈال دیا ہو۔ اسے ان دونوں کی گفتگو بنا دئی اور اوپر پر محسوس ہو رہی تھی۔

”ہو گیا ہوں، سے کیا مطلب؟“ وہ رکھائی سے بولی۔ ”کئی کئی زمانے میں تھے آپ؟ میں نے تو اول دن سے آپ کو ایسا ہی پایا ہے۔“ احسن اور فرخندہ آپ کا یکدم خاموش سے ہو گئے۔ دونوں ہی نے اس کے لہجے کی تپش اور بات کی گہرائی اور سنجیدگی کو محسوس کر لیا تھا۔ ”نہیں خیر۔“ پھر فرخندہ آپ کا قدرے خوشگوار انداز میں بولیں۔ ”میرا احسن کجوس نہیں ہے اور تمہیں تو بہت چاہتا ہے۔ تمہارے لئے تو اس نے ہمیشہ دل اور ہاتھ دونوں کو ہی کھلا رکھا ہے۔ تمہیں تو مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔“

”میرا احسن۔“ زینب کو مزید کوفت ہوئی تھی۔

وہ پلک جھپکتے میں زینب کو کونے میں کھڑا کر دینے کی ماہر تھیں۔ آج اسے نجانے کیوں بات بے بات غصہ آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے نکال کر دونوں کو کپ پکڑا نے لگی۔

تیسرا کپ بھر کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”یہ صوفی کہاں رہ گئی؟“ فرخندہ آپ نے بھی اسی احساس کے تحت پوچھا، جو یکنیت زینب کو ہوا تھا۔

”ہاں نہیں۔“ وہ کھڑی ہوئی۔ ”دیکھتی ہوں۔“

وہ کمرے سے نکل کر کچن تک آئی۔ صوفیہ تک برتن دھو کر بگمیں پر رکھ چکی تھی۔ ڈسٹر سے سلیب کی صفائی کر رہی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو صوفیہ؟“ اسے واقعی حد درجہ حیرت ہوئی۔ ”مجھے شرمندہ تو نہ کرو۔“

”ارے نہیں۔“ وہ ہنس دی۔ ”تھوڑا سا کام ہی ہے۔ کون سے پہاڑ توڑ ڈالے میں نے۔ پھر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہم لوگ آ کر اور

آپ کے سر پر سوار ہو گئے۔“

”تم تم بلیر آؤ اندر۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ انسان کی طبیعت ٹھیک ہو یا نہ ہو۔ اپنے گھر کا کام کرنا ہی ہوتا ہے۔ تم نہ آتیں تب بھی یہ

سارا کام مجھے ہی کرنا تھا۔“

صوفیہ کچن صاف کر چکی تھی۔ ڈسٹر ایک طرف رکھ کر سنک میں ہاتھ دھو نے لگی۔ پھر اس کے ساتھ اندر چلی آئی۔ چائے کے برتن سمیٹ کر

زینب نے احسن کی جانب دیکھا تھا۔

”بات سنیں۔ کیا پکاؤں؟“

احسن نے پونے ایک بجائی گھڑی کو دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”آپا کے ہاں دو پھر کا کھانا بارہ بجے کھالیا جاتا ہے۔ تم تو انہیں تین بجے تک ہی کھانا دے پاؤ گی۔“

”میں پوچھ رہی ہوں۔ پکاؤں کیا؟“ اس نے بظاہر شٹنڈے اور سادہ لہجے میں پوچھا۔

”آلو تیرہ بناؤ۔“ اس نے اپنی پسندیدہ ڈش فوراً بتا دی۔ ”چاولوں میں گوشت ڈال لو یا مٹر۔ ساتھ لو کی کاراسیہ، تھوڑا کسٹر بھی بناؤ۔“

”ارے ارے احسن میاں! بچہ کی حالت کا کچھ خیال کرو۔“ فرخندہ آفا فوراً بولی تھی۔ ”نہیں بیٹا! تم سالن بناؤ۔ روٹیاں صوفیہ ڈال لے گی۔ اتنی گرمی میں کوئی ضرورت نہیں بچن میں گھسے رہنے کی۔

بلڈ پریشر بھی لو ہو جاتا ہے۔ بس فنافٹ کام نہ کرنا کر بیٹھو کچھ کے نیچے۔

ان کی دل جوئی سے نہیب کی طبیعت پر کوئی خوش گوار اثر نہ پڑ سکا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی آئی اور جو جو شیز احسن نے گنتوائی تھیں، ان کی تیاری کرنے لگی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ احسن جان بوجھ کر بار بار اسے ذلیل کر رہا تھا۔ فرخندہ آفا کو تو خیر وہ کسی خاطر میں لاتی ہی نہیں تھی لیکن صوفیہ کے سامنے اپنی بکی کے احساس نے اس کے اندر جیسے آتش فشاں کا منہ کھول دیا تھا۔

”لائیں نا۔ پیاز میں کاٹ دیتی ہوں۔“ صوفیہ نجانے کب اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

”صوفیہ پلیز! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں اپنا کام خود کر لوں گی۔ برائے مہربانی اندر جا کر بیٹھو۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ صوفیہ ٹھک کر رہ گئی۔

”اچھا۔“ پھر بھی وہ مسکرا کر شیریں لہجے میں بولی۔

”جیسے آپ کی خوشی۔ میں آپ کے پاس ہی بیٹھتی ہوں۔“

نہیب کو کلو بھر کے لیے اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس تو ہوا پھر وہ سر جھٹک کر جلدی جلدی پیاز کاٹنے لگی۔ احسن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس نے ٹھیک تین بجے کھانا میز پر چنا تھا لیکن چیزیں زیادہ تھیں، اسی لیے دیر بھی زیادہ لگی۔

دوپٹے سے چہرے کا پینہ خشک کرتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئی تو چند لمحوں کے لیے ٹھک کر رہ گئی۔ احسن صوفیہ کو نجانے کیا بات بتا رہا تھا۔ وہ چہرے پر مسکراہٹ اور دھنک کے ہزار رنگ کھڑے بغور اس کی بات سن رہی تھی۔ خود احسن کے لبوں پر بھی جاندار، گرم مسکراہٹ تھی۔

فرخندہ آفا آنکھوں پر دوپٹہ ڈالے بے خبر سو رہی تھیں۔ نہیب چند لمحوں کے لیے وہیں کھڑی رہی۔ وہ دونوں گفتگو میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں اس کی آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔

وہ کھٹکھٹا رہی تو دونوں ہی چونک اٹھے۔

”کھانا لگ گیا ہے۔ آجائیں۔“ وہ آہستگی سے بول کر پلٹ گئی۔

کھانے کی میز پر سب نے ہی اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی تعریف کی۔ لیکن نہیب کا دل بھجھ کر پھر دوبارہ نہ کھل سکا تھا۔ وہ جبراً مسکراتی رہی۔

کھانے کے بعد وہ لوگ زیادہ دیر نہ بٹھیرے تھے۔ احسن نے بے پناہ اصرار کیا لیکن فرخندہ آفا مزید رکنے پر تیار نہ ہوئیں۔

”بس بیٹا! اب ہمیں ٹیکسی میں بیٹھا ڈو۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”یوں بھی پانچ بجے کو ہیں۔ دن ڈھلنے میں اور اب کتنی دیر باقی ہے پھر صوفیہ کی ماں سے بھی میں شام تک کا کہہ کر آئی تھی۔ وہ بھی راہ دیکھتی ہوگی۔“

نہیب نے البتہ ایک بار بھی ان لوگوں کو مزید رکنے یا پھر آنے کے لیے نہ کہا۔ وہ تھک بھی بہت گئی تھی۔

کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی۔

احسن ان لوگوں کو ٹیکسی اسٹینڈ تک چھوڑنے گیا تو وہ کپڑے نکال کر ہاتھ رو م میں گھس گئی۔ نہادھو کر وہ بال سنوار رہی تھی جب وہ لونا۔

”نہیب۔“ وہ اس کے قریب چلا آیا۔ ”ہمارے کتنے جاننے والے ہیں جو ہمارے گھر ہم سے ملنے آتے ہیں؟“

”جی؟“ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ جیرانی سے اس کی سمت دیکھنے لگی۔ ”میں سمجھی نہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ کہ کتنی کے چند افراد ہیں جو کبھی کبھار غلطی سے چلے آتے ہیں۔ اگر ان کا آنا بھی تمہیں پسند نہیں تب تو ہمیں کسی دیرانے میں

چل کر رہنا چاہیے۔“

”میں نے ایسا کب کہا؟“ اس کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔

”تمہارا رویہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔“ اس کی آواز قدرے تیز ہو گئی۔ ”زنوب! وہ لوگ ہم سے کچھ مانگنے! کچھ چھیننے نہیں آئے تھے۔ محبت

میں، خلوص میں آکر ملنے چلے آئے تھے اور تم! تم اس طرح بی بیو کر رہی تھیں جیسے کسی نے تمہیں جبراً مہمان داری پر مجبور کر دیا ہو۔ کوئی کسی کے کھانے کا

بھوکا نہیں ہوتا۔ زنوب! جو کھلا کرتے ان پر احسان عظیم کیا۔ اخلاق، خلوص، رواداری کے بھی کچھ معنی ہوتے ہیں۔“

”کمال ہے۔“ اس نے برش بیڈ پر پھینک دیا۔ ”جھگڑنے کی کچھ بنیاد بھی ہو۔ ایک تو سارا دن برباد کر کے آپ کے مہمان کی خاطر

داریاں کیں۔“

”کوئی احسان کیا کسی پر؟ کوئی احسان کیا؟ ہر کوئی گھر آئے مہمان کو عزت دیتا ہے۔ حسب توفیق خاطر داری کرتا ہے لیکن اس کی پیشانی پر

شکون کا جال نہیں ہوتا۔ لہجے میں اتنی تلخی اور بیزاری نہیں ہوتی۔“

”میں تھک گئی تھی۔“ اس نے بے درخی سے منہ پھیر لیا۔

”تھکن میں اور بیزاری اور نخوت میں فرق ہے زنوب بی بی۔“ وہ بٹلے ہوئے انداز میں بولا ”آج کی تاریخ نوٹ کر لو اور دیکھو آئندہ وہ

دونوں کبھی تم سے ملنے نہیں آئیں گی۔ مجھے علم ہے اچھی طرح۔ میری آپا کتنی خود دار اور ناک والی ہیں۔ اب وہ کبھی تمہاری اس ”مہمان داری“ کا

احساس اپنے سر پر نہ لیں گی۔“

”آپا بچاری کا نام کیوں مفت میں بدنام کرتے ہیں۔“ وہ بھی تیکھے لہجے میں بولی۔ ”اس کی بات کریں جو آپ کی فرقت سے بے چین و

بے قرار ہو چکی آئی تھی۔ ویسے اس کی آپ فکر نہ کریں۔ اس میں خود داری اور ناک جیسی کوئی شے نہیں۔ وہ آئندہ بھی ثابت قدمی سے ان ہی بے

قرار یوں کا مظاہرہ کرتی رہے گی۔“

”زنوب!“ وہ مشدد رہ گیا۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو۔“

”یہ بکواس ہے؟ غلط ہے؟ جھوٹ ہے؟“ وہ چیخی۔

”کیوں آئی تھی، وہ جب مجھ سے اور آپ سے اس کی نہ کوئی رشتہ داری ہے، نہ تعلق؟ کیا جواز بنتا تھا اس کے آنے کا۔“

”آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔ اسی سلسلے میں مشورہ لینے آئی تھی وہ۔“

”ہاں۔“ وہ تمسخر سے ہنسی۔ ”ایک ہی تو مشیر اعلا ہے اس کا۔ نہ باپ، نہ بھائی منداٹھا کر مشورہ لینے یہاں پہنچ گئیں۔“

”زنوب!“ احسن نے اسے تاسف سے دیکھا۔

”تم جانتی ہو۔ ٹیوٹر ہا ہوں میں اس کا۔“

”ٹیوٹر کیوں؟“ (Lover) کیسے نا۔“

”زنوب!“ وہ مٹھیاں بھیجنے کر رہ گیا۔ ”تم پر اعتماد کر کے اپنے ماضی کی جھٹک دکھانے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ تم میرے کردار کی وجہاں یوں بکھیر

رہی ہو۔“

”جب آپ میرے سکندر علی کے نام کی آڑ لے کر مجھ پر گرج برس رہے تھے، تب میں نے تو ایسی شکایت نہیں کی آپ سے۔ اب اپنی باری

آئی تو مجھ پر اپنے اعتماد کی بات کرتے ہیں۔“

”میں نے تم پر کسی قسم کا شک نہیں کیا تھا نہ ب!“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ڈھیلا پڑا۔ ”تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن تم..... تم مجھ پر اور اس نیک فطرت لڑکی پر بے بنیاد شک کر کے ہمارے کردار مسخ کر رہی ہو۔ مجھے تم سے اس ذہنیت کی امید نہ تھی۔“

نہیب کا دماغ اس کے الفاظ سے مزید گرم ہو گیا۔

”نیک فطرت لڑکی؟ میں اس پر شک کر رہی ہوں؟“

”احسن صاحب! میں کوئی نا سمجھ بچی نہیں ہوں جو آپ کے ان لفظوں کے ہیر پھیر میں آؤں گی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے لولیزرز پڑھے ہیں۔ اسے گھنٹوں آپ کے انتظار میں چھت پر ٹھلکتے دیکھا ہے۔ ہنہ! بے بنیاد شک۔ سکندر علی کی آنکھوں سے بچکتی حرص وہوں تو آپ کو نظر آ گئی۔ صوفیہ بی بی کی نگاہوں کے پیغامات پڑھنے سے قاصر ہیں آپ؟“

”خدارا نہیب! لگام دو اپنی زبان کو۔“ وہ عاجز سا ہو گیا۔ ”آج کیا ہوا ہے تمہیں۔ یہ کون سا روپ ہے۔ تمہارا؟ یہ رویہ، یہ لہجہ، یہ الفاظ۔ تم مجھے نہیب نہیں، کوئی ان پڑھ لڑکا، جاہل عورت لگ رہی ہو۔ اوہ گاڈ!“

تاسف سے اپنی پیشانی ملتا کرے سے نکل گیا۔ نہیب شدید غصے کے عالم میں لبوں کو کھینچ کر رہ گئی۔

”ان پڑھ لڑکا، جاہل عورت۔“ احسن کے الفاظ اس کے کانوں میں پچھلے ہوئے سیسے کی مانند اترے تھے۔

”کیا ایسا لیے؟ کیا ایسا لیے شادی کی تھی میں نے تم سے کہ تم ان لوگوں کے لیے مجھے ذلیل کرو جن سے تمہارا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ کیا ایسا لیے جموئے وعدوں کے سراب دکھا کر اسے تپتے صحرا میں مجھے اپنے پیچھے پیچھے لیے چلے آئے تم۔ ستاروں سے بھرا آسمان تھی تمہارے لیے میں دسترس میں آگئی ہوں تو دھرتی کی طرح روندنے لگے ہو پیروں تلے۔ دن بدن میری وقعت کم سے کم کرتے چلے جا رہے ہو۔“

آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے وہ ہونٹ کپکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔



دو تین دن ایسے ہی بے دلی کے عالم میں گزر گئے تھے۔ وہ سارا دن بستر پر پڑی نجانے کیا کچھ سوچتی رہتی تھی۔ زندگی کے متعلق اس کی رائے بدل گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ بنجیدگی سے غور کرنے لگتی کہ آیا اپنی زندگی کے متعلق اس نے جو فیصلہ کیا تھا، وہ درست بھی تھا یا نہیں؟ کہیں اس نے جلد بازی میں آکر غلط فیصلہ تو نہیں کر لیا تھا۔

احسن بھی زیادہ تر چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ اس مرتبہ کا جھگڑا بھی عجیب ہی تھا۔

وہ آپس میں بات چیت تو کر رہے تھے لیکن دلی طور پر ایک دوسرے سے کھینچے کھینچے سے تھے۔

اس روز وہ صوفیہ پر ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں بیٹھی ٹی وی پر ڈراما دیکھ رہی تھی، جب بتل بجی۔ احسن کمرے سے نکل کر باہر گیا پھر

تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آیا۔

”نہیب! دو کپ چائے بنا دو تمہاری دوست آمنہ کے شوہر آئے ہیں۔ انوار علی۔“

جیلہ اپنا کام ختم کر کے جا چکی تھی، سو وہ خود ہی اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ انوار علی کی اچانک آمد کے متعلق سوچتے ہوئے اس نے چائے تیار

کی تھی۔ جس وقت دو کپ کی پلیٹ اور چائے کے کپڑے میں رکھ رہی تھی، احسن کچن میں چلا آیا۔

”تیار ہے چائے؟“ وہ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

”ہی لیکن یہ آئے کیوں ہیں؟“ اس نے نرے اسے تھمائی۔

”جینے کا عقیدہ کر رہے ہیں پرسوں۔ اسی کی دعوت دینے آئے ہیں۔“

وہ وڑے لے کر باہر نکل گیا۔ زنب سوج میں پڑ گئی۔

میں نے کا آخر تھا۔ اسے علم تھا، احسن کی جیب تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ اب آمنہ کے بیٹے کو کچھ دینے دلانے کا مسئلہ کھڑا ہوتا تھا، کپڑوں کا مسئلہ تھا۔

احسن، انوار علی کو رخصت کر کے اندر آیا تو وہ اپنی سوجوں کا شکار تھی۔

”کیا بات ہے؟“ احسن نے اسے پریشان صورت بنائے مگر صبر سے دیکھا تو پوچھے بنانہ رہ سکا۔ ”کچھ کھو گیا ہے کیا؟“

”جی؟“ اس نے غائب دماغی سے اس کی جانب دیکھا۔

”ایسی صورت تو تم اس وقت بناتی ہو جب اپنی کوئی انگوٹھی وغیرہ ادھر ادھر رکھ کر بھول جاتی ہو۔“

اس کا موڈ کچھ خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً پچھلے چند دنوں سے ان دونوں کے درمیان در آنے والی تلخی کو زائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

زنب نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

”میں سوج رہی تھی۔ اب آمنہ کے بیٹے کو دینا کیا ہے؟ پھر کپڑوں کا وہی ازلی مسئلہ۔ سوچتی ہوں۔ نہ جاؤں تو بہتر ہے۔“

”ارے کمال ہے۔ اتنے خلوص سے اس نے بلاوا بھیجا ہے، پھر واحد سبکی ہے تمہاری۔ کیا سوچے گی وہ؟ جانا چاہیے تمہیں۔“ وہ یقیناً پورے طور سے خفگی ختم کر بیٹھا تھا۔

”پھر دوں گی کیا؟“ وہ سوچنے لگی۔ ”یا ایسا کرتی ہوں۔ اس روز جو آپ اتنے سارے کھلو نے اٹھالائے تھے، ان میں سے کوئی چیز دے دیتی ہوں۔“

”پاگل ہوئی ہو؟“ وہ خفا ہوا۔ ”وہ میں اس لیے نہیں لایا کہ تم یوں بانٹتی پھرو۔ ان میں سے کوئی چیز تم کسی کو نہیں دو گی۔“

”آپ کا بوجھ ہلکا ہو گا۔ میرا کیا ہے۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”رہنے دو تم اس طرح میرا بوجھ ہلکا کرنے کو۔ پیسے لیے لیتا مجھ سے۔ کپڑے بھی اگر نئے بنوانے ہیں تو چل کر لے آؤ۔“

زنب نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ آج شاید اس نے حاتم عالمی کی روح کو شرمندہ کرنے کی ٹھانی تھی یا شاید اپنی شرمندگی مٹانا چاہتا تھا۔ بہر حال، کچھ بھی تھا۔

اس کے لیے موقع غنیمت تھا۔

”کپڑے تو لینے ہی پڑیں گے۔ ورنہ کیا پہن کر جاؤں گی۔“ وہ فوراً بولی۔ ”لیکن میں نے کا آخر ہے۔ کپڑے کہاں سے دلو انیس گے۔“

”وہ میرا مسئلہ ہے۔ فرخندہ آپا کے لیے جمع کی گئی رقم سے نکال لیتا ہوں۔ تنخواہ ملنے پر واپس ڈال دوں گا۔ چلو پھراٹھو، تیار ہو جاؤ۔“

”چلیں۔“ وہ فوراً ہی رضا مند ہو گئی۔

اور پھر حسب عادت اس نے اچھی خاصی شاؤنگ کر ڈالی تھی۔ آمنہ کے ہاں جانے کے لیے ایک خوبصورت سے سوٹ کے علاوہ لان کے دو تین سوٹ بھی خرید لیے تھے۔ ایک اچھی سی چنل بھی خرید لی۔

احسن سر تسلیم خم کیے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ واپسی پر وہ سارے کپڑے درزی کو دیتی ہوئی آئی تھی۔

”کل یاد سے میرے کپڑے لیتے آئے گا۔“ اس نے احسن سے کہا۔ ”پرسوں جانا بھی ہے۔“

”یعنی کل درزی کی جیب بھی گرم کرنی ہوگی؟“ اس نے مسکین صورت بنائی۔

”ظاہر ہے۔ اب وہ بے چارہ مفت سلائی تو کرنا نہیں ہے۔ پیسے دے کر ہی کپڑے ملیں گے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھی۔

”سچ کہتے ہیں لوگ۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”شاید بندے کے اعمالوں کی دنیاوی سزا ہے۔“

”بچھتا رہے ہیں؟“ وہ اپنے ناخنوں کو بغور دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”ہا۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”یہ وہ لڈو ہیں جو کھانے والا بھی بچھتا رہا ہے اور نہ کھانے والا بھی۔ تم سے شادی نہ کرتا تو شاید عمر بھر بچھتا رہتا۔“ وہ بہت اچھے موڈ میں تھا لیکن نہ سنبھالنے کیوں پھر کچھ سوچنے لگی تھی۔



آمنہ کے گھر جانے کے لیے وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ گرے اور پنک کبھی نیشن کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں اس کے جسم کا بے ڈول پن قدرے چھپ گیا تھا۔ بڑا سا گرے دوپٹا اپنے وجود پر پھیلا کر اس نے تنقیدی نگاہوں سے اپنا تفصیلی جائزہ لیا۔ پنک میک اپ نے اس کا چہرہ نکھار دیا تھا۔ وہ بہت فریٹس اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ زرقون کے ننھے ننھے آویزے کانوں میں روشنی پڑنے سے دک اٹھتے تھے۔ بالوں کی سیاہ، لمبی چوٹی اس کے وجود کو اور رڈن بخش رہی تھی۔ اس نے پرنیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کیا اور مطمئن ہو کر کمرے سے نکل آئی۔

احسن تیار بیٹھا اخبار میں گم تھا۔

”چلیں جناب!“ اس نے ہلکے سے کھٹکھا کر کہا۔

اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دیا۔

”ویری گلد۔ ٹائم پر تیار بھی ہو گئی ہو اور ایک دم پرفیکٹ بھی لگ رہی ہو۔“

”بہت دنوں کے بعد کہیں جانے کا موقع ملا ہے۔ میں تو گھر میں پڑے پڑے بور ہو گئی تھی۔ اسی لیے اتنا دل لگا کر تیار ہوئی ہوں۔ اچھی لگ رہی ہوں نا؟“

”ویری ناکس۔“ وہ سناٹھی لہجے میں بولا تھا۔

”جب ہی تو کہتا ہوں۔ تم سے شادی نہ کرتا تو زیادہ بچھتا رہتا۔“ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے گھر سے نکل آئے۔ احسن دروازہ لاک کرنے لگا۔

”مجھ سے شادی نہ ہوتی تو پھر کس سے شادی کرتے آپ؟“ وہ اس کے پیچھے بایک پر سوار ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔ احسن دھیرے سے ہنس دیا۔

”تمہارے ذہن میں کس کا نام آتا ہے؟“

”کسی کا بھی نہیں۔“ صفائی سے مگر گئی۔ ”میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔“

”جی جی بتاؤں۔“ وہ شریر ہوا۔ ”یا چکر دے دوں؟“

”جی بتائیں۔ بالکل جی۔“ وہ دھکانے والے انداز میں بولی تھی۔

”تو پھر سنو۔ جینو جی۔“ وہ زور سے ہنسا تھا۔ ”تم مجھ سے شادی کی ہامی نہ بھرتیں تو میں عمر بھر شادی نہ کرتا۔ پکا فیصلہ کیا تھا میں نے۔ کہ یا تو تم یا کوئی نہیں۔ کچھ ایسی ہی بات تھی تم میں۔“

”دقتی؟ کیا مطلب؟“ وہ اس کے الفاظ سے سا تو میں آسمان پر جا پہنچی تھی۔ ”اب نہیں ہے؟“

”اب تو کچھ خرافات ہو گئی ہو۔“ وہ شرارت سے ہنس دیا۔

زینب نے ایک دھموکا اسے جڑ دیا تھا۔ گنگو کا سارا چارم ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

آمنہ کے گھر زیادہ لوگ مدعو نہ تھے مگر چھوٹا سا آنگن پر رونق دکھائی دے رہا تھا۔ اچلے صاف فرش پر دیواروں کے ساتھ ترتیب سے رکھے مگلوں میں موتیا مہک رہا تھا۔ تھوڑی سی کرسیاں لگائی گئی تھیں جن میں سے بیشتر ہنوز خالی پڑی تھیں۔ زیادہ تر خواتین اور بچے کھڑے تھے یا ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔

زینب کو دیکھ کر برآمدے کے قریب کھڑی آمنہ اس کی جانب چلی آئی۔
 ”السلام علیکم“ وہ مختلف سی مسکرائی تھی۔

”وعلیکم السلام۔ مبارک ہو۔“ وہ اس سے معافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”کہاں ہیں صاحبزادے؟“
 ”اندر، اماں کے پاس۔ چلو تم اماں سے بھی مل لو۔ کئی بار تمہارا ذکر کر چکی ہیں۔“

وہ آمنہ کی ہمراہی میں اندر کی جانب چلی۔ ہر جانب سے اٹھنے والی نظروں کا اسے خوب ادراک ہو رہا تھا۔ عورتیں اس کے بارے میں ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں انتشار کر رہی تھیں۔

کمرے میں آمنہ کی خالہ ساس کے علاوہ اس کی امی بھی تھیں۔ زینب کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھی۔ آمنہ کے بیٹے کو پیسے دیے پھر اٹھ کر باہر آگئی۔ چھوٹے سے کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اتنی گرمی میں محض سیلنگ فین کی ہوا کے سہارے اندر بیٹھے رہنا آسان نہ تھا۔ پھر لوگ بھی کافی سارے تھے۔ باہر قدرے کشادگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اکیلی ایک کونے کی کرسی پر بیٹھی رہی۔
 تھوڑی دیر میں آمنہ مختلف کاموں سے فراغت پا کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو زینب“ اس نے اپنی ازلی سادگی سے اس کی تعریف کی۔ ”تقریب کی ساری خواتین تمہارا پوچھ رہی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے ان کے منہ کوئی پری آکر بیٹھ گئی ہو۔ اتنی حیرت ہے سب کی نظروں میں تمہارے لیے۔“
 زینب افتخار سے مسکرا دی۔

”احسن بھائی آئے ہیں ناں؟“

”ہاں ہاں۔ ان ہی کے ہمراہ تو آئی ہوں۔ باہر انوار بھائی کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“

”گھر چھوٹا ہے نا۔ مردوں کا انتظام باہر کرنا پڑا۔“ آمنہ نے وضاحت کی۔ ”حالانکہ ہم نے بہت کم لوگ بلائے ہیں۔ چند رشتہ دار اور کچھ محلے دار۔ چند ایک انوار کے آفس کے لوگ ہیں اور بس۔ پھر بھی جگہ کم پڑ گئی ہے۔“

”تمہارا گھر تو بہت ہی چھوٹا ہے آمنہ۔“ نجائے کیوں اس کے لبوں سے نکل گیا، پھر وہ خود ہی شرمندہ بھی ہو گئی لیکن آمنہ نے اس کی بات کو قطعاً محسوس نہ کیا تھا۔

”رہنے کے لیے بہت اچھا ہے زینب! تقریبات کون سا روز روز ہوتی ہیں۔ ویسے ہم لوگوں کے لیے ہر لحاظ سے اچھا اور مکمل ہے یہ گھر۔ پھر اپنا ہے، کرایہ وغیرہ کا جیکر تو نہیں ہے نا۔“

زینب کو مزید سبکی محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ سادہ لوح آمنہ کو نہ طنز کرنے کی عادت تھی، نہ کسی بات کا برا مان کر جوابی حملوں کی ضرورت اسے کبھی محسوس ہوئی تھی۔ وہ تو بس اپنی دنیا میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔

”آمنہ!“ زینب نے بغور اس کا جائزہ لے کر دھیرے سے کہا تھا۔ ”تمہیں ابھی کپڑے بدلنے ہیں کیا؟“

”نہیں تو۔ میں تو دوپہر میں ہی نہائی تھی۔“ وہ قدرے تعجب سے بولی۔ ”کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”تم نے اپنے بیٹے کے عقیقے کے لیے یہ کپڑے بنوائے ہیں؟“ زینب کہے بنارہ نہ سکی۔ ”اتنے سادہ؟“

آمنہ مسکرا کر اپنے کپڑوں کو دیکھنے لگی۔ لان کا پلین اسکاٹی بلیوسٹ جس کے دوپٹے کے کناروں پر سفید کوشیا کی نیل بنی ہوئی تھی۔ کانوں

میں وہی سونے کی موٹی موٹی بالیاں جو وہ ہمیشہ پہنے رہتی تھیں اور گلے میں چھوٹا سا لفظ ”اللہ“ کالا کٹ۔ بس یہی اس کی ساری تیاری تھی۔

”انوار تو کہہ رہے تھے کپڑوں کا لیکن میں نے کہا۔ پہلے ہی اتنا خرچ ہو رہا ہے، مزید انہیں کیا پریشان کرنا پھر ایک سنت ہی تو پوری کرنی ہے۔ اور پھر نوب! میں اکیلی تو نہیں ہوں نا۔ انوار، کنزی، اماں سب ہی لوگ ہیں۔ میں نے کپڑے بنوائی تھی اور باقی لوگ وہی پرانے کپڑے پہنتے تو اچھا نہیں لگتا۔ بس یہی سوچ کر میں نے منع کر دیا۔ ویسے تو کپڑے بھی نئے ہیں۔ احمد کی پیدائش پر امی نے دیے تھے۔“

”نئے سے کیا ہوتا ہے۔“ وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی۔ ”ذرا ڈھنگ کے تو ہوں۔ اپنے گھر کی تقریب، وہ بھی پہلی اور تم لان کے کپڑے پہن کر بیٹھ گئیں۔“

”اچھی نہیں لگ رہی کیا؟“ وہ شرارت سے مسکرائی۔ ”انوار تو بہت تعریف کر رہے تھے۔“

”انہوں نے تو تعریف کرنی ہے۔“ نوب بھی ہنس دی۔ ”خرچا جو نہیں کرایا تم نے ان کا اور ویسے تم ہو بھی انتی اچھی کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔“

کھانا لگا تو وہ بھی دوسری خواتین کے ہمراہی میں کوٹنے میں لگی واحد ٹیبل کی جانب بڑھ گئی۔

”آمنہ..... آمنہ.....!“ اسے انوار علی کی آواز آئی تھی۔ ”کہاں ہیں آپ؟ اپنی دوست کا خیال رکھیں۔ وہ کہاں رش میں لے پائیں گی۔ انہیں الگ سے نکال کر دیں۔“

آمنہ اس کی طرف آئی اور اسے کمرے میں لے گئی۔ کمرہ اب خالی تھا۔ بس آمنہ کی خالہ ساس بیٹھی ہوئی تھیں۔

”تم یہاں بیٹھو نوب! میں اپنا اور تمہارا کھانا یہیں لے آتی ہوں۔“

نوب اس کے بچے کی جانب متوجہ ہو گئی۔ وہ محنت مند ہو رہا تھا اور اب اچھا بھی لگتا تھا۔ نوب نے اسے اٹھالیا پھر دوسرے ہی لمحے اس کے لمبوں سے چیخ نکلی گئی۔ بچہ گیلیا ہو رہا تھا۔ اس نے نوب کے ہاتھ اور کپڑے گندے کر دیے تھے۔

آمنہ کی خالہ ساس نے بچہ اس سے لے لیا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔

”جا کر ہاتھ دھو لو۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ میں خود کتنی کتنی بار کپڑے بدلتی ہوں۔“

نوب چاہنے کے باوجود مسکرانے کی ہمت نہ کر سکی۔ اس کی ساری خوشی چند لمحوں میں کافور ہو گئی تھی۔ ایسے گندے پن کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ صابن سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھو کر آئی۔ کپڑوں کو صاف کیا لیکن کھانا کھانے کو پھر اس کا جی نہ چاہا۔ وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ لے سکی۔

آمنہ بچے کی پیٹی بدلوا کر سکون سے بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔

”تمہیں گھن نہیں آتی آمنہ؟“ وہ منہ بنا کر پوچھنے لگی۔ ”ابھی پیشاب صاف کیا، ابھی پوٹی اور پھر کھانا کھانے بیٹھ گئیں؟“

آمنہ کو ہنسی آ گئی۔

”ایسا ہی کرنا پڑتا ہے اور بچے تو ایسا کام خاص طور پر اس وقت کرتے ہیں جب ماں دستر خوان پر بیٹھے نہ جانے ان کی کون سی حس کام کرتی ہے۔“

”ماں کے قدموں تلے یونہی تو جنت نہیں ہے بی بی۔“ اماں بولے بنانہ رہ سکی تھیں۔ ”جنت کو تو خدا نے ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ دل مار کر کیسے کیسے کام کرنے پڑتے ہیں۔“

وہ منہ بنا کر بیٹھی رہی۔ کچھ دنوں کے بعد اسے بھی یہ سب کرنا ہوگا۔ سوچ سوچ کر دل بیٹھا جاتا تھا۔

رات کو وہ احسن سے بھی یہ ذکر کر بیٹھی۔ وہ سن کر زور سے ہنس دیا تھا پھر وہ دیر تک ہنستا رہا۔

آپ ہنس رہے ہیں؟“ وہ بھٹا اٹھی۔ ”اس میں بھلا ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں سچ کہتی ہوں۔ مجھ سے گندے سندے کام نہ ہو سکیں گے۔ میں تو جیل سے بات کروں گی۔ وہ تھوڑے پیسے زیادہ لے لے لیکن بچے کو بھلا تا دھلا تا اور اس کے گندے کپڑے دھونے کی ذمہ داری قبول کر لے۔ ورنہ کوئی اور عورت دیکھنی ہوگی۔“

اس کا لہجہ قطعی تھا۔ احسن بنجیدہ ہو کر تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

”کمال ہے یار!“ پھر وہ بولا۔ ”ہمیں بھی تو ہماری ماؤں نے پال کر اتنا بڑا کیا ہے۔ انہوں نے بھی تو ہمارے یہ سارے گندے کام کیے ہوں گے۔ ساری دنیا کی مائیں کرتی ہیں۔ بے شک تم بہت زیادہ حسین ہو لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے۔“

نہیب اس کے لہجے میں چھپا طنز محسوس کر گئی پھر بھی آرام سے بولی۔

”بہت سی مائیں نہیں بھی کرتیں۔ آخر گھروں میں اتنی نوکرانیاں کیوں رکھی جاتی ہیں؟ اور بھی اپنی طبیعت اور دل پر تو انسان کا زور نہیں ہوتا نا۔ میری طبیعت نہیں ہے ایسی۔ سچ احسن! آمنہ کے بیٹے نے مجھ پر پیشاب کر دیا تو مجھے الٹی آنے لگی۔ کتنی مشکوں سے دل پر قاپو پایا میں نے۔“

”اپنے بچے کی بات الگ ہوتی ہے نہیب!“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”اس کی محبت تمہیں سب کچھ بھلا دے گی۔ تم خود ہی اس کے سارے کام شوق سے اور ہلکی خوشی کرو گی۔“

”دیکھا جائے گا۔“ وہ اکتا کر بولی۔

”اور کون سا تم اتنی نمازن اور پرہیزگار ہو جو تمہیں ہر وقت کپڑوں کی فکر رہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”جیسے کی نماز بھی مشکل سے ہی پڑھتی ہو۔ عورتوں کو تو سنا ہے عبادت کا بہت شوق ہوتا ہے۔“

”عبادت کا شوق تو کسی کو کبھی ہو سکتا ہے۔“ وہ چڑھی۔ ”عورت مرد کی تخصیص اور نماز تو آپ بھی اتنی پابندی سے نہیں پڑھتے۔“

وہ دل جلانے والے انداز میں مسکرا دیا۔ نجانے کیوں وہ ہر وقت اسے جلانے پر تیار ہوتا تھا۔

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے آپ وہ احسن نہیں جس سے میری شادی ہوئی تھی۔“ وہ بے اختیار غلوہ کر بیٹھی۔ ”ہر وقت چڑانے پر تلے رہتے ہیں۔“

”کبھی کبھی مجھے تمہاری باتوں اور خیالات سے عجیب سا خوف محسوس ہوتا ہے۔ تب میں ایسی گفتگو کرتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ ”شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات!“ وہ بنجیدگی سے بولا تھا۔ ”ایسے سٹپلی خیالات کے ساتھ انسان کی زندگی گزرنی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ زندگی میں کامیابی چاہتی ہو تو متوازن سوچ اپناؤ۔ خود میں گہرائی پیدا کرو، سوچا سمجھا کرو۔ کیا اچھا ہے، کیا برا ہے، کیا کہنا چاہیے، کیا نہیں کہنا چاہیے۔ یہ سب باتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً عورت کے لیے۔“

”ہونہ پھر وہی عورت، مرد۔“ وہ ترخ اٹھی۔ ”اور یہی سب کامیاب زندگی کے گر ہیں تو ہمکنار کیجیے نا اپنی زندگی کو کامیابی سے۔ کیوں اب تک اتنے پیچھے کھڑے ہیں؟“

احسن چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”کس چیز کی کمی ہے میری زندگی میں؟“ پھر دفعتاً وہ سگلتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ ”کیوں میں ہر لحظہ تمہیں ایک ناکام آدمی نظر آتا ہوں؟ کیا نہیں دیا ہے میں نے تمہیں نہیب؟“

وہ سانس بھر کر، منہ پھیر کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے نہیب؟“ وہ خاموش رہنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔

”مجھے آپ ہر وقت یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ میں ایک کامیاب عورت نہیں ہوں۔ میں بھی تو خاموشی سے سن لیتی ہوں آپ کی

بات، پھر کبھی میں کچھ کہہ جاؤں تو آپ برا مان جاتے ہیں۔“ اس نے احسن کا خطرناک موڈ دیکھ کر مصالحتہ انداز اختیار کیا۔

”تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میری باتیں عموماً مذاق میں ہوتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے تمہیں چھیڑنے کو بولتا ہی رہتا ہوں میں۔ لیکن تم زینب! تم کوئی ایسی تھقی، سلگتی بات کہتی ہو جو مجھے دنوں آبلہ پار کھتی ہے۔ بے چین ہو جاتا ہوں۔ زینب! طعنہ اگر سچا ہو تو آدمی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اپنی خامی پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے لیکن طنز اگر محض برائے طنز ہو تو آدمی کے دل میں آگ سی بھڑک اٹھتی ہے۔ تم کیوں مجھ جان کر دکھ دیتی ہو؟“

زینب چند لمحوں کے لیے خاموش بیٹھی سامنے دو پار کو گھورتی رہی پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ نجانے کیوں وہ دونوں باتوں ہی باتوں میں ایک دوسرے سے الجھ پڑتے تھے۔ پھر بات ایسا رخ اختیار کرتی تھی کہ بدگمانی کے سائے دونوں دلوں پر منڈلاتے رہتے۔

نظریات میں اس قدر فرق تھا کہ کبھی کبھی محبت بھی مات کھائی محسوس ہوتی تھی۔



دل اس قدر مایوس اور پریشان ہو رہا تھا کہ وہ انگلی صبح اپنی دوست رملی کے گھر کبھی نہ جانے کا ارادہ تو ذکر اس کے گھر جا پہنچی۔ رملی بھی اکیلی لیٹی ٹی وی چینل بدل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کھل تھی۔

”ہائے زینب! کیسی ہو جان؟ شکر ہے تمہاری قسم بھی ٹوٹی۔ میں تو مایوس ہی ہوئی تھی تمہاری طرف سے۔ کسی اور کے کیے کی سزا تم مجھے دے رہی تھیں۔“

وہ اسے دیکھ کر ہلکتی ہی چلی گئی۔ زینب کو اس کے چپکنے سے اس کی خوشی کا اندازہ ہوا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”کیا کر رہی تھیں؟“

”دیکھو۔ یہ فضول فضول چینل دیکھ کر اپنا جی بہلا رہی ہوں اور کرنے کو کچھ نہیں ہے تب ہی تو تمہیں اچانک پا کر اتنی مسرت ہوئی ہے مجھے، اٹ اٹو سو کا نیڈ آف یوز بی!“

”اتنی اکیلی رہتی ہو۔ تنہائی کو اس قدر محسوس کرتی ہو پھر اپنے شوہر کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟ آخر وہ بے چارہ بھی تو وہاں اکیلا پرن محسوس کرتا ہوگا۔ یہ خود ساختہ جدائی کیوں؟“ جو بات وہ رملی کو دیکھ کر ہمیشہ سوچا کرتی تھی، وہ بالآخر اس کے لبوں پر چلی آئی۔

رملی کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”مرد اکیلا ہو تو کبھی اس کے لیے لفظ ”بے چارہ“ استعمال نہیں کرتے زینب! اکیلا مرد کبھی ”بے چارہ“ نہیں ہوتا۔ وہ تو آزاد فضاؤں کا پتھچی ہوتا ہے۔ اسے آزادیاں عزیز ہو جاتی ہیں، بندھن برے لگنے لگتے ہیں۔ بے چاری تو عورت اکیلی عورت ہوتی ہے۔ واقعی بے چاری۔“ وہ طنز سے ہنس دی۔

زینب کو ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی دکھائی دی جو اگلے ہی لمحے غائب بھی ہو گئی۔

”کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بہت کرتا ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”ہر دفعہ فون پر تو وہ یہی کہتا ہے۔ واللہ اعلم!“

”تم کوئی بچہ ایڈاپٹ کیوں نہیں کر لیتیں؟“

”اس سے کیا ہوگا؟“ اس نے تسخر سے زینب کو دیکھا۔ ”ایک گھنٹی گلے میں اور باندھ لیں۔ بس اسی کی کسر ہے۔ خیر چھوڑو یا ر! یہ آج تمہاری سوئی کہاں انک گئی ہے؟ مجھے تو اس طرح زندگی گزارتے سات سال ہونے کو آئے ہیں اور..... اور میں خوش بھی ہوں۔ اپنی ایک آزاد، مطمئن زندگی ہے۔ کوئی روک نہ ٹوک، فائدہ نہ فکر۔ موج مستویں میں باقی عمر بھی یونی گزر جائے گی۔ کبھی کبھی فرسٹریشن کا شکار ہوتی بھی ہوں تو جلد اس کنڈیشن سے نکل آتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی سہارا مل ہی جاتا ہے۔ جیسے ابھی تم چلی آئیں اور میرا موڈ یکدم بحال ہو گیا۔ تم اپنی کہو، کیا کہتا ہے

راوی؟

نہیں بھی اداسی سے مسکرائی تھی۔

”میں بھی تنہائی اور اداسی سے گھبرا گئی تھی۔ تب ہی چلی آئی۔“

”تم؟“ اسے حیرت ہوئی۔ ”کیوں، تمہیں کیوں تنہائی اور اداسی کے آسیب ستانے لگے؟ یہ تو ہم جیسوں کے درد سر ہیں۔ ویسے زین! تمہاری سوشل لائف تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہر وقت گھر میں بند، پڑوسیوں تک سے دور ہوگی تو کبھی نہ کبھی تو دل گھبرائے گا۔ انسان کو تھوڑا بہت سوشل، تھوڑا سا فرینڈز لی ہونا چاہیے۔ اندر سے مرجھاتے مرجھاتے بھی کچھ دیر لگتی ہے۔ تم نے تو خود ساختہ قید اختیار کی ہوئی ہے۔“

”میں بھلا کہاں جایا کروں؟“ وہ اداس ہو گئی۔ ”نہ ماں، نہ باپ۔ میکے کے نام پر کوئی گھر نہیں۔ دوستیاں میں نے کبھی زیادہ کی ہی نہیں پھر احسن بھی میری طرح ہی ہیں۔ ان کا بھی کوئی رشتہ دار ایسا نہیں جہاں انسان رشتہ داری نبھانے ہی چلا جائے۔ بس کبھی کبھی احسن کے ساتھ گھومنے چلی جاتی ہوں۔“

”میرے ساتھ کل پارٹی میں چلو۔“ دلی نے پُر خلوص آفر کی۔ ”پھر دیکھنا کتنی دوستیاں ہو جاتی ہیں۔ وہاں سب تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔“

”کبھی پارٹی؟“ وہ تعجب سے بولی تھی۔

”بس یونہی گیٹ ٹو گیدر ہوتی ہے۔ اپنے اپنے گھروں اور ان کی مصروفیات سے چند لمحوں پر اکچھ خواتین اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، ایک دوسرے کی برائیاں، شکوے، شکایتیں۔ اچھا وقت گزرتا ہے، پھر اگلی پارٹی کی جگہ اور وقت کا تعین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہیں۔ چلو گی؟“

”کل کہاں ہے پارٹی؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

وقت گزارنے اور دل بہلانے کا اچھا طریقہ تھا۔

بوریت سے کسی طور تو چھٹکارا ملتا۔

”کل سرخیش کی طرف جانا ہے۔ میری گاڑی میں چلنا۔ شام سات بجے جائیں گے۔“

”اور واپسی؟“

”جب فراغت ہوئی لوٹ آئیں گے۔“ وہ ہنس دی۔ ”کنوئس پراہلم تو ہو گی نہیں۔ پھر گھروں کو ہی لوٹنا ہے۔ گھر کون سا کہیں بھاگ جاتے ہیں۔ ویسے دس گیارہ بج ہی جائیں گے۔“

”اچھا، میں احسن سے پوچھوں گی۔“ اس نے نیم رضا مند ہو کر کہا تھا۔

”دیکھو، اب آ جانا۔ میرا بھی موڈ بن گیا ہے تمہیں لے جانے کا۔ اور ہاں! کچھ بنا کر بھی لانا ہے۔ وہاں کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ یہ پارٹی کا اصول ہے۔“ وہ ہنسی تھی۔

”مثلاً کیا؟“ نہیں سوچ میں پڑ گئی۔

”کچھ بھی۔ کباب، شاپ، بکے، شکہ، کچھ بھی چلے گا۔“ وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”میں نے تو چکن سینڈوچز بنانے کا سوچا ہے۔“

”ایرانی، افغانی، کوئی سے بھی بنالینا۔“ زمینی ہنس دی تھی۔ ”وہاں سب کے ہاتھوں میں ایک سا ذائقہ ہے۔“

”اچھا، اب میں چلوں۔“ وہ گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔



شام کو اس نے احسن سے بات کی تو خلاف توقع اس نے فوراً ہی منع کر دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے گھر بیٹھو۔“

زینب حیرانی سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ اسے احسن سے اس رد عمل کی توقع نہ تھی۔ وہ تو سمجھتی تھی، احسن بالکل اعتراض نہیں کرے گا۔

”لیکن کیوں احسن؟“ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ”اس میں بھلا حرج ہی کیا ہے؟“

”حرج کیوں نہیں ہے؟ اپنی حالت دیکھی ہے تم نے؟ یہ پارٹیاں اٹینڈ کرنے والی حالت ہے؟ اور پھر میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔

مجھے نہ تو یہ رملی بی بی پسند ہیں نہ تمہارا ان سے زیادہ گلہنا ملنا۔ اس کا ایک نتیجہ تو تم بھگت چکی ہو۔ مزید کیا چاہتی ہو؟ نہیں زینب! تم وہاں نہیں جاؤ گی

نجانے وہاں کون کون ہو۔ کیسے لوگ ہوں۔“

”وہاں صرف خواتین ہوں گی۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”عورتوں کی پارٹی ہے اور پھر میری حالت کو کیا ہوا ہے؟ معذور ہو گئی ہوں؟ چل پھر نہیں سکتی یا اب میرا ہنسا، بولنا، کھانا، پینا ممنوع قرار پا

گیا ہے؟“

”کیوں بحث کر رہی ہو یا ر؟“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”مجھے ایک کپ چائے بنا کر لا دو۔ میرے سر میں سخت درد ہے۔ میں آرام کرنا چاہتا

ہوں۔“

وہ اٹھ کر کچن میں آگئی۔ اسے احسن پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ یہ شخص آہستہ آہستہ اسے زندگی کی ہر خوشی سے محروم کرتا چلا جا رہا تھا۔ ہر بات پر

پابندی ہر بات پر روک ٹوک۔

”ٹھیک ہی تو کہتی ہے رملی۔“ اس نے چائے کپ میں چھانٹے ہوئے سوچا۔ ”ایک آئیڈیل لائف گزار رہی ہے۔ گھر، شوہر، بچے۔

ایک جھنجھٹ ہی ہے وہاں جان۔ اپنی مرضی سے سکون کا ایک سانس تک نہیں لے سکتی ہے عورت۔“

وہ چائے بنا کر واپس آئی تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔

”احسن۔“ اس نے آہستہ سے سائیڈ ٹیبل بجائی۔ ”احسن، چائے۔“

”ہوں، رکھ دو۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”تھک گئے ہیں؟“ وہ چاہتی تھی کہ اس کے سونے سے قبل وہ ایک مرتبہ اور استفسار کر لے۔

”ہوں۔“ وہ واقعی نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔

”احسن! پھر بتائیں نا، میں کل چلی جاؤں؟“ اس نے اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لجاجت سے پوچھا۔

احسن نے دوسری جانب کروٹ لے لی تھی۔ وہ کھول کر ہی رہ گئی۔



دوسرے دن وہ سو رہی تھی جب احسن نے اسے جگا کر دروازہ اندر سے لاک کرنے کا کہا اور آفس چلا گیا۔ وہ دس بجے کے قریب اٹھی

تھی۔ جیلہ اب تک نہ آئی تھی۔ بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔ کچن میں آکر چائے کا پانی رکھا اور کچھ سوچنے لگی۔

چائے کپ میں ڈال کر وہ ابھی لاؤنج میں آئی ہی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ جیلہ کا سوچتی ہوئی وہاں تک گئی تھی لیکن

دروازہ کھولنے پر اسے رملی کی ملازمہ نظر آئی۔

”سلام بی بی! رملی بی بی نے پوچھا ہے شام کو چلیں گی؟“

نہیں سوچ میں پڑ گئی۔ احسن اسے جانے سے منع کر چکا تھا لیکن اس نے دل میں پکا ارادہ کیا تھا کہ وہ رٹلی کے ساتھ ضرور جائے گی۔ احسن سے اس سلسلے میں وہ ایک مرتبہ مزید استفسار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ رات کو جلد سو گیا تھا اور پھر صبح اس کے اٹھنے سے قبل آفس روانہ ہو گیا تھا۔ وہ اس سے بات ہی نہ کر پائی۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے ملازم کو دیکھا۔ ”ہاں اماں! ان سے کہنا، میں چلوں گی ساتھ۔“

اسے رخصت کر کے وہ اندر چلی آئی اور آرام سے صوفے میں جھنس کر چائے کے گھونٹ بھر لی گئی۔ کپڑوں کی سیلکشن کا تو کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ ابھی چند روز قبل اس نے آمنہ کے بیٹے کی رسم عقیدہ کے لیے جو کپڑے بنوائے تھے وہ اس موقع کے لیے بہترین تھے اور پھر وہ اس پر بچے بھی خوب تھے۔

چائے پی کر اس نے فرنیچ سے قیر نکالا اور کباہوں کا سالہ ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیا۔ اتنی دیر میں جیلہ بھی آچکی تھی۔ اس نے جیلہ کو کباب بنانے کے متعلق ہدایات دیں اور کمرے میں چلی آئی۔

بہت دنوں کے بعد اس نے کہیں جانے کے لیے شادی سے پہلے کا سا اہتمام کیا تھا۔ چہرے کی کلیننگ کی، ہاتھ بیروں کی صفائی کر کے نیل پاش لگائی پھر کپڑے نکال کر پر لیں کرنے لگی۔

احسن کے آنے کے تاخیر تک وہ مکمل تیار تھی۔ ہر طرح کے ہتھیار سے لیس۔ اسے یقین تھا، احسن اسے تیار دیکھ کر جانے سے منع نہ کرے گا۔ شامی کباب بھی وہ طرح کی چٹنیوں کے ساتھ میز پر تیار رکھے تھے۔ اس میں بھی جیلہ کی محنت کا زیادہ دخل تھا۔

احسن عموماً ساڑھے پانچ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا، جبکہ اسے سات بجے جانا تھا۔ چھ بج گئے، تب بھی وہ مطمئن مطمئن سی پھرتی رہی کہ اس نے گھر ہی آنا تھا۔ آفس سے وہ اور کہیں نہیں جاتا تھا لیکن جب ٹھیک ساڑھے چھ بجے باہر رٹلی کی گاڑی کا ہارن بجا تو وہ بے طرح پریشان ہو گئی احسن تو اب تک نہ آیا تھا۔

وہ باہر نکل کر گاڑی تک پہنچی۔ رٹلی نیوی بلیو شینون کا سوٹ پہنے، بے پروائی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اسٹیرنگ پر انگلیاں چلا رہی تھی۔

”رٹلی! وہ ڈراما جھکی۔“ ابھی تو ساڑھے چھ بجے ہیں۔ تم نے تو سات بجے کا کہا تھا۔“

”اوہ، سوسپیت۔“ رٹلی نے اسے دیکھ کر سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سیڑھے۔ ”بہت ہی اچھی لگ رہی ہو۔ فیشل کیا ہے؟ چہرہ بہت صاف لگ رہا ہے۔“

”انور، میری بات کا تو جواب دو۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”ارے میری جان! آدھے گھنٹے کا تو راستہ ہے۔ پھر راستے سے کو لڈز کس بھی لینی ہیں۔ پریشانی کی کیا بات ہے؟ تم تو ایک دم ریڈی ہو۔“

”نہیں، وہ..... رٹلی! اصل میں احسن اب تک نہیں آئے ہیں۔ میں نے جانے کے متعلق ان سے پوچھا نہیں ہے۔“

”جیلہ ہے؟“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”ہاں، جیلہ تو ابھی ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بس پھر کا ہے کی فکر۔ آ جاؤ تم! جیلہ تمہارے صاحب بہادر کو اطلاع کر دے گی۔“

وہ چند لمحوں کے لیے فکر مند سی کھڑی سوچتی رہی۔ اب اسے احسن کے غصے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”کم آن زین! ہری اپ۔ وی آر گیٹنگ لیٹ (We are getting late) کیا سوچ رہی ہو تم؟“ رٹلی کچھ بیزاری سے بولی

تھی۔

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں آتی ہوں۔“

پھر وہ مڑ کر اندر گئی۔ جیلہ کو احسن کے متعلق ضروری ہدایات دے کر وہ کباہوں کا باکس اٹھا کر باہر چلی آئی۔

”کیس احسن ناراض نہ ہو جائیں۔“ وہ فکر مند تھی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ وہ بے پروائی سے ہنسی۔ ”اور پھر اس قدر حسین بیوی کو تو شوہر کے غصے کی پروا ہونی ہی نہیں چاہیے۔“

اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ اس بات پر زنب بھی ہولے سے مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی، احسن اس سے زیادہ دیر ناراض بھی نہیں رہ پاتا تھا۔
رملی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ راستہ کافی لمبا تھا۔

انہیں وہاں پہنچتے پہنچتے آدھا پون گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اونچے سیاہ گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر رملی نے ہارن دیا تو زنب اس کوٹھی کی شان و شوکت دیکھ کر مرعوب سی ہو گئی۔

”کس کا گھر ہے یہ؟“ اس نے پوچھا۔

بارودی چوکیدار نے گیٹ ان کی گاڑی کے لیے وا کر دیا تھا۔ رملی گاڑی تیز رفتاری سے اندر لے گئی۔

”مسز شیخ نے آج کی پارٹی ارینج کی ہے۔ میں نے بتایا تو تھا۔ مسٹر ابراہیم شیخ کا گھر ہے یہ۔ شہر کے معروف بزنس مین ہیں۔“ وہ گاڑی لاک کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

رملی کی ہمراہی میں وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو اس کی سانس ہی رک گئیں۔ ایسا شیش محل تو اس نے کبھی خوابوں میں بھی نہ دیکھا تھا۔ یہ محل تو اس کے خوابوں سے زیادہ نازک اور حسین تھا۔ وہ سحر کے عالم میں رملی کے پیچھے چلتی چلتی جا رہی تھی۔

وال ٹو وال بچھے دیز قالین، بیش قیمت فرنیچر، ہر سروسشیاں بکھیرتے بلوریں جھومر، حد درجہ انوکھے شوپسز جن کی قیمتوں کا تعین کرنا ہی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو خواب کے عالم میں دیکھتی جا رہی تھی۔ جب رملی اسے لے کر ایک کشادہ اور ویل ڈیکورینڈ کمرے میں جا پہنچی۔

”ہیلو یوری باڈی۔“ وہ اندر جا کر چکی تھی۔

”ادھر رملی..... جان! آج کچھ لیٹ ہو گئی ہو۔“ ایک خاتون اپنی ساڑھی سنبھالتی اس تک پہنچیں اور اس کا گال چوما۔ ”کیسی ہو؟“

پھر انہوں نے رملی کے عقب میں کھڑی زنب کو دیکھا اور چند لمبے شوق سے دیکھتی رہیں۔

”ان کی تعریف؟“ بڑی شائستگی سے انہوں نے دریافت کیا تھا۔

”زنب! زنب شاہ۔ میری نئی فرینڈ ہے۔ کچھ ہی عرصہ ہوا ہمارے ہمسائے میں آئے ہیں یہ لوگ۔ اور زین! یہ مسز شیخ ہیں۔“

”السلام علیکم۔“ زنب نے قدرے تھپتھپے ہوئے انداز میں انہیں سلام کیا تھا۔

”والسلام۔ ویری ٹاکس ٹومیٹ یو۔“ انہوں نے پلک جھپکتے میں اس کا گال بھی چوما۔ ”اچھا کیا چلی آئیں۔ میری ڈلگتی ہو؟“

پھر انہوں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کا سراپا غور سے دیکھا۔ زنب نے مسکرا کر سر اس بات میں ہلایا۔

”کیا کرتے ہیں آپ کے سہیل؟“

”جی..... وہ.....“ آج اسے نجانے کیوں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے عجیب سی جھجک محسوس ہوئی تھی۔ وہاں جس قسم کی خواتین موجود تھیں، انہیں دیکھ کر ہی ان کے شوہروں کے ایشیئس کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ بیش قیمت ملبوسات اور ڈائننگ اور روہنی کے جواہرات سے بکی خواتین۔ ان کے انگریزی زدہ لہجے اور بناوٹی مسکرائشیں اور تصنع کے رنگ میں رنگی باتوں کے ڈھیر۔ سب ہی کچھ بتاتا تھا کہ وہ ہائی سوسائٹی کی پروردہ خواتین تھیں۔

مسز شیخ اسی لمحے ایک نووارد خاتون کی جانب متوجہ ہوئیں تو اس کی جان میں جان آئی۔

”میرے سہیل میں ملازم ہیں۔“ کا جملہ اس کے حلق میں کانٹنے کی طرح اٹکا ہوا تھا۔

رملی کسی عورت سے گفتگو میں مصروف تھی۔ وہ کونے میں رکھے ہوئے نرم صوفے میں جا حسی۔

وہاں کے رنگ ڈھنگ بہت نرالے تھے۔ بیشتر خواتین اسموگنگ کر رہی تھیں۔ بہت سوں کا لباس زینب کی اخلاقیات کے حساب سے کافی حد تک قابل اعتراض تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی ان سب کا جائزہ لیتی رہی۔

پھر رملی نے اسے دیکھا تو اسکے قریب آئی اور معذرت کر کے اس کا ہاتھ گھسیٹ کر اٹھا لے گئی۔ ایک ایک سے اس کا تعارف کرانے لگی۔

”یہ مسز مونیاسر فرماؤ ہیں، یہ مسز سہگل، یہ مس روزیہ علیخان، یہ مسز فلاں.....“

نجانے کتنے چہروں سے اس نے زینب کو روشناس کرایا لیکن زینب کسی سے بھی ٹھیک سے بات تک نہ کر پائی۔ وہ ان سب کے درمیان خود کو بہت حقیر اور کمتر محسوس کر رہی تھی۔ وہ لباس جو کل تک اس کی نظروں میں کافی مہنگا اور دیدہ زیب تھا، اب اس کے دل سے اتر گیا تھا۔ لمبوسات تو دور حقیقت وہ تھے جو ان عورتوں نے زیب تن کر رکھے تھے۔ جن کی قیمتیں اس کے تصور میں نہ سہاری تھیں۔ وہ ہر اس میں رملی کے پیچھے پیچھے پھرتی رہی۔ نجانے یوں ہی مختلف چہروں کو کتنے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

کھانے کی میز انواع و اقسام کے پکوانوں سے سجی ہوئی تھی۔ ان سب کی لائی ہوئی اشیاء تو محض ایک رسم کے طور پر ایک جانب پڑی ہوئی تھیں۔ خود مسز شیخ نے بے پناہ اہتمام کیا ہوا تھا۔

اس کا احساس کمتری اس قدر عود کر آیا تھا کہ اسے ایک کونے میں پڑے اپنے کباہوں سے بھی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنا لباس اٹھا کر فی الفور وہاں سے چلی جائے۔ کہیں کوئی ان کے متعلق استفسار نہ کر لے۔

”کم آن زینب!“ رملی نے اسے ٹھوکا دیا تھا۔ ”کہاں گم ہو کھانے کی جانب تمہارا بالکل دھیان نہیں ہے۔ یہ فرائیڈ چکن ٹیسٹ کرو۔“

”ہمیں پسند آئے گی۔ مسز شیخ کا کک کمال کے کھانے بناتا ہے۔“

وہ اس کی پلیٹ میں چکن پیس ڈال گئی۔ زینب بے دلی سے ٹوٹے دیتی رہی۔

تمام خواتین بیٹھیں بھرے پیپی اور اسپرائٹ کے ٹھنڈے گھونٹوں سے بڑے بڑے لقمے اپنے اندر اتار رہی تھیں۔ مختلف موضوعات پر اظہار خیال ہو رہا تھا۔ قہقہے لگ رہے تھے۔

زینب خود کو اس ماحول سے بالکل علیحدہ کئے بیٹھی رہی۔ وہ اپنے وہاں چلے آنے پر شرمندہ تھی۔ اسے رملی سے شکایت تھی۔ اسے کم از کم زینب کو بتانا چاہیے تھا کہ وہاں کس قسم کی، کس کلاس سے تعلق رکھنے والی خواتین ہوں گی۔

”اور رملی جان۔“ کسی عورت نے یکا یک اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔ ”یہ اپنے میر صاحب کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”کسی دیوان میں ڈھونڈیے۔“ برجستہ جواب آیا تھا۔

ایک قہقہہ پڑا۔ سب سے نمایاں خود اسی عورت کی آواز تھی۔ اسے رملی نے غالباً مس روزیہ کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ یادہ مسز شیر آگن تھی۔ زینب کو یاد نہ آیا۔

”دیکھو، یوں چھپا چھپا کر نہ رکھا کرو انہیں۔ تم نے تو انہیں پرسل پر اپنی سمجھا ہوا ہے۔“ وہ شکوے سے بولی۔

”اچھا چلو کچھ اس مت کرو۔“ رملی نے اسے جھڑک دیا۔ ”دیکھو بریانی میں مسالہ کتنا تیز ہے۔“

وہ سب کی سب پھر ہنس دی تھیں۔ زینب کی نگاہ دیوار کی گھڑی پر پڑی اور پھر ہٹنا بھول گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں گیارہ بج رہی تھیں۔

وہ بے حد پریشان ہو کر خوش گپیوں میں مصروف ان خوش باش عورتوں کو دیکھنے لگی۔



پونے بارہ کا وقت تھا جب وہ دونوں گاڑی کی سمت بڑھ رہی تھیں۔

رملی بے حد خوشگوار موڑ میں تھی۔ کی رنگ انگلی میں گھماتے ہوئے وہ کسی گانے کے بول گنگنا رہی تھی۔ اسے نہیب کی پریشانی کا رتی برابر احساس نہ تھا۔

”میں نہ کہتی تھی نہیب جان!“ وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولی تھی۔ ”ایسی پارٹی ہوتی ہے کہ مزہ آ جاتا ہے۔ مہینہ بھر کے لئے موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ آج سے پہلے کبھی ایسی کسی گیت تو گیدر میں شرکت کی ہے تم نے؟ کھانا کیا لا جواب تھا۔ مسز شخ کا لگ زندہ باد۔ قسم سے میرا جی اپنی انگلیاں چبا لینے کو کر رہا تھا۔“

”رملی! بہت دیر ہو گئی ہے۔“ پریشانی کے عالم میں اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ لگی تھی۔

”ہاں، دیر تو ہو گئی ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”آج گنگنا ہی اتنے مزے کی رہی۔ میرا تو انھنے کول ہی نہیں کرتا تھا۔ خیر، گھر جا کر سونا ہی تو ہے۔“

وہ گاڑی مین روڈ پر لے آئی تھی۔

”اور یہ ٹریک دیکھو تم! یہ سب لوگ بھی تو اپنے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں۔ کون سی رات بیت چلی ہے۔“

”میرا مسئلہ دوسرا ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولی۔ ”میں احسن سے پوچھے بغیر ہی چلی آئی تھی۔“

”کم آن یار! تم دودھ پیتی پچی ہو کیا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہونا چاہیے۔ میاں بیوی کو ہر وقت ہی ایک دوسرے کے سر پر سوار نہیں رہنا چاہیے۔“

وہ اس کی بات سنجیدگی سے بالکل نہیں لے رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کیسٹ پلیئر بھی آن کر دیا۔ اور گاڑی میں یک لخت گونج انھنے والے گانے کے بول خود بھی گنگنا نہ لگی۔

گیت کے شوخ بولوں سے نہیب کی ٹینشن بھی کچھ کم ہو گئی۔ پھر سڑک پر ٹریک کارڈ دیکھ کر اس کے دل کو بھی ڈھارس سی ہونے لگی واقعی ابھی تو شہر میں رات اپنے جو بن پر آئی تھی۔

”کچھ بولونا زینی!“ رملی آواز کم کرتے ہوئے بولی۔ ”راستہ کیسے کئے گا۔ کیا تم نے پارٹی کو انجوائے نہیں کیا؟“

”ہوں!“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”اچھی تھی۔ دراصل مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم مجھے اتنے امیر و کبیر لوگوں کے درمیان لے جا کر بیٹھا دو گی۔ میں پزل ہو گئی تھی۔“

”سو واٹ؟“ رملی حیرانی سے بولی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہاں پیسوں کی بات کون کر رہا تھا؟ کیا سب اپنے اپنے پرس کھول کر دکھا رہی تھیں جو تم پزل ہو گئیں۔“

”یہ بات نہیں ہے رملی! تم سمجھ نہیں سکو گی۔ انسان عجیب سا محسوس کرتا ہی ہے۔“

”کسی نے کچھ کہا تمہیں؟ کسی نے برا بیوی کیا؟“ رملی نجانے کیا سمجھی تھی۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”یہ بات نہیں۔ بس میں وضاحت نہیں کر سکتی۔ ہر آدمی اپنے جیسے لوگوں میں زیادہ سکون محسوس کرتا ہے۔“

”ہاں تو وہاں سب تمہارے جیسے ہی تھے۔ کسی کے سر پر دوسینگ بھی تھے کیا؟ مجھے تو دکھائی نہیں دیے۔“ نہیب کو ہنسی آ گئی۔

”اور کچی بات تو یہ ہے زینی! کہ وہاں کوئی تمہارے جیسا نہیں تھا۔“ پھر وہ قدرے شوخی سے بولی۔ ”قسم سے کوئی علیحدہ ہی شگ لگ رہی

تھیں۔ مسز شراٹگن تو بار بار میرے کان میں سرگوشی کرتیں۔ ہائے رملی! اس کی اسکن، ہائے رملی! اس کی آنکھیں، ہائے رملی! اس کے بال۔“ وہ تہتہ

لگا کر نس دی۔

”بیگم نسیم آ رہے تھے مجھ سے دس دفعہ کہا کہ ان کے گھر پارٹی ہوگی تو وہ ہر حال میں تمہیں انوائسٹ کریں گی۔ بقول ان کے، محفل میں روشنی تمہارے دم سے ہو رہی تھی۔“

”اچھا!“ اس کے لہجے میں قدرے اشتیاق در آیا۔۔۔ میں نے تو خود میں کسی کی دلچسپی محسوس نہ کی۔ سچ کہو رلی!“

”قسم لے لو یار! تمہیں دیکھ کر مر رہی تھیں سب کی سب۔ اور تم ہو کہ خود ساختہ کمپلیکس کا شکار ہو کر محفل کو انجوائے بھی نہ کر پاؤں۔“

انسوس ہو رہا ہے مجھے۔“

”رلی! تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں..... میں واقعی کمپلیکس کا شکار ہوں۔ مسزش کا گھر دیکھ کر میں تو دنگ ہی رہ گئی تھی۔ ایسے گھر بھی ہوتے ہیں لوگوں کے؟ شیش محل جیسے۔“

رملی نس دی۔

”اگلی مرتبہ میں تمہیں ثریا آفندی کے گھر لے کر جاؤں گی۔“ آفندی ہاؤس۔“ دیکھ کر تو تم اسے تاج محل کا خطاب دے ڈالو گی۔ شاہجہان کو پیچھے چھوڑ دیا ہے حضرت حیات آفندی نے۔“

”ہائے سچ۔“ وہ اشتیاق سے بولی۔ ”کیا کرتے ہیں وہ؟“

”مشہور اسٹار ہیں۔“ رملی نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔ ”ایسے تاج محل شاہجہان کے بعد تو اب اسٹارز ہی بنا سکتے ہیں۔ کالے دھن سے سفید، ابلے محل کھڑے کر لیتے ہیں راتوں رات۔“

”میرا جی چاہتا ہے رملی! اتنا امیر بنے کو۔“ وہ خواب کے سے عالم میں بولی تھی۔ ”کیسا اعتماد آ جاتا ہے نا انسان میں۔ کیسا غرور، کیسا طنز۔ گردن اٹھا کر انسان جہاں جی چاہے جا سکتا ہے۔ جو دل چاہے کر سکتا ہے۔“

”رلی نے مسکرا کر ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”تو پھر کتنی تھی نا کسی شیر انگن یا حضرت حیات آفندی سے شادی۔ یہ احسن صاحب کہاں سے نکرا گئے تمہیں؟“

نہیں گہری سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ اپنے خوابوں سے نکل کر وہ ایک مرتبہ پھر احسن تک پہنچ گئی تھی۔ رلی نے اسے گھر کے دروازے کے سامنے اتارا تھا پھر گاڑی بڑھا لے گئی تھی۔

نہیں تھکی ماندہ، بکھری سوچوں کو مجمع کرتی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ سرخ، بو بھل آنکھیں اور بے تاثر چہرہ لئے احسن اس کے سامنے تھا۔ نہں کو چند لمحوں تک گھورتے رہنے کے بعد اس نے ذرا سا ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ بظاہر بے نیاز بنی اندر چلی آئی۔ کباہوں کا خالی ڈبہ میز پر رکھ کر اس نے سینڈلیں اتاریں پھر ایک نگاہ گھڑی پر ڈالی۔ ساڑھے بارہ کا وقت تھا۔

”جلدی جلدی کرتے بھی اتنی دیر ہو گئی۔“ اس نے وضاحت کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ ”آدھے پون گھنٹے کا تو راستہ ہی تھا۔“

”کس سے پوچھ کر گئی تھیں تم؟“ اس کا انداز حد درجہ سرد اور اجنبی تھا۔

”جی؟“ وہ چونکی۔

”میں نے پوچھا ہے کس کی اجازت سے گئی تھیں تم؟ میں نے غالباً تمہیں جانے سے صاف صاف منع کیا تھا۔“

”میں نے رات کو آپ سے پوچھا تھا.....“ وہ اٹکنے لگی۔ ”آپ نیند میں تھے..... آپ نے اجازت دے دی تھی.....“ اس نے جھوٹ کا

سہارا لینے کی کوشش کی۔

”کواس مت کرو زنب!“ وہ یک لخت ہی دھاڑ اٹھا۔ ”میں نے نہ جانتے میں تمہیں اجازت دی تھی، نہ نیند میں۔“

”اجازت..... اجازت..... کیا رٹ لگای ہے آپ نے۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی ہوں جو ہر جگہ آپ کی اجازت سے جاؤں؟“ زنب کا بارہ یک دم ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔ ”کسی غلط جگہ تو نہیں گئی تھی میں۔ عورتوں کی ایک محفل تھی۔ اگر بغیر اجازت چلی بھی گئی تو کیا آسمان آگر اس پر؟ قیامت ٹوٹ پڑی۔ معمولی معمولی باتوں کو ایسا بٹا کر جھگڑنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ آپ کو احسن!“

”عورتوں کی محفل۔“ اس نے دانت پیسے۔ ”یہ وقت ہے عورتوں کی محفلیں اٹینڈ کرنے کا؟ یہ شریف عورتوں کے گھر لوٹنے کا وقت ہے؟“

”مطلب کیا ہے آخر آپ کا؟“ وہ چیخ پڑی۔ ”میں شریف نہیں ہوں، باکر دار نہیں ہوں؟ مجھے آپ سے اس ذہنیت کی امید نہیں تھی

”احسن!“

اس کی سانسیں منتشر ہو گئیں۔ ہاتھ کا پنے لگے۔

”امید؟ امید کی بات کرتی ہو زنب؟ تم نے تو میری ہر امید پر پانی پھیر دیا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا تھا۔ ”کیا کیا خواب دیکھے تھے میں نے ایک نیک سیرت، گھر اور شوہر سے محبت کرنے والی بیوی چاہی تھی جسے ہر شے سے زیادہ اپنے شوہر کی خوشی عزیز ہو، جسے اپنے گھر اور گھر کے سکون سے محبت کی عادت ہو، جو ہر حال میں بھمانا اور صبر شکر کرنا جانتی ہو لیکن تم! تم محض اپنی خواہشات کے گرد گھومتی، اپنے خوابوں کی قید میں ہو۔ تمہیں گھر نہیں، محض اپنی ذات عزیز ہے۔ تمہیں شوہر کے آرام اور اس کی خوشی سے کوئی غرض نہیں۔ محض اپنی ذات اس کی ضروریات، اس کی خواہشات، اس کی ترجیحات۔ یہی تمہارا کل ہے زنب بی بی!“

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہ احسن، یہ طعنے دینا، تیر برساتا احسن کتنا مختلف تھا۔ اس احسن سے جو کبھی اس سے شادی کی خواہش دل میں بجائے، دیوانہ اور اس کے گھر کے چکر لگایا کرتا تھا۔ جسے صرف اور صرف زنب شاہ کو حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ اور اس سے آگے اسکی سوچ نہ جایا کرتی تھی۔ جس نے اسے کیا کیا خواب دکھائے تھے۔ اس کی ہر خواہش پوری کرنے، ہر خواب کی تعبیر دینے کا عزم کیا تھا۔

”نیک سیرت؟ گھر اور شوہر سے محبت کرنے والی بیوی چاہتے ہیں آپ؟“ وہ پھنکاری۔ ”اور میں..... میں بد سیرت ہوں؟ احسن صاحب! آپ تھے اس قابل کہ میں..... میں آپ سے شادی کرتی؟ بھیک تھی رشتوں کی؟ میری عمر ڈھل رہی تھی؟ میرا شباب ماند پڑ رہا تھا جو تم نے مجھ سے شادی کر کے مجھ پر کچھ احسان کیا؟ میں نے احسان کیا تم پر، میں نے۔ تم میرے دیوانے بنے تھے، تم نے اپنا خالی دامن پھیلا یا تھا میرے آگے۔ اپنا قیمتی وجود میں نے تمہاری ہتھیلی پر سجا دیا۔ آج مجھ میں کیڑے نظر آ رہے ہیں تمہیں؟“

”غلط تھا میں۔“ وہ ٹکست خوردہ انداز میں بولا۔ ”غلط تھی میری سوچ۔ سرورق سے متاثر ہو کر کتاب خرید لی تھی میں نے۔ ایک سطحی سوچ کی عکاس تحریر کے سوا کچھ نہ لکھا۔ مجھے اعتراف ہے، مجھے غلطی ہوئی زنب کا دل چاہا دیواروں سے ٹکریں مارے، خود پر پاس پر تھپڑوں کی بارش کر ڈالے۔ اتنا پیچھے، اتنا پیچھے کہ ہر گھر سے لوگ نکل آئیں۔ اس قدر تذلیل، اتنی توہین کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

”ایک بد سلیقہ، بے ڈھنگی، پھوڑ عورت، یہی تعریف ہے تمہاری، غلط تھے وہ لفظ جو آج تک تمہاری مدح میں کہتا رہا۔ ہم مرد، عورت کا چہرہ دیکھتے ہیں، اس کی سوچ کو پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس ہی نہیں کرتے۔ اس کے ہاتھوں کی بناوٹ اور رنگت کے تعہیدے پڑھتے ہیں۔ یہ جاننے کی رحمت کے بغیر کہ آیا یہ ہاتھ زندگی کی ڈورا لہجاتو نہ دیں گے۔ صد حیف، ہنق ہے مجھ پر اور مجھ سمیت ایسے تمام مردوں پر.....“

وہ کزور لہجے اور مدھم آواز میں جیسے خود کلائی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

وہ گرنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

یہ الفاظ، یہ پیکھلا ہوا سہمہ بھی منتظر تھا اس کے کانوں کا۔ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ یہ احسن ایسا تھا۔ اسے یقین نہ آیا تھا۔ آنسو بار کے اس کے گالوں پر لکیریں بناتے گئے۔ وہ ساکت بیٹھی دیوار کو گھورتی رہی۔ بے یقینی اس کے وجود کو گھیرتی گئی۔ تذلیل اور توہین کا احساس بارش بن کر

اسکے وجود پر برستار ہا۔ احسن کے الفاظ دیواروں سے ٹکرائے گئے۔ اس کی صورت اس کے ارد گرد گرتے رہے اور وہ وہیں بیٹھی رہی۔ ساکت اور بے جان۔ اسی حالت میں اس نے اپنے اندر درد کی لہروں کو اُمڈتے ہوئے محسوس کیا۔ سانسوں کو منتشر ہوتے ہوئے دیکھا۔ اپنی کراہوں کو سنا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلی۔

اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ درد اس شدت سے ہونے لگا تھا جیسے جان نکل کر ہی دم لے گا۔ پھر بھی اس نے احسن کو نہ پکارا۔ وہ اس وقت اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ اس کا رتی برابر احسان اپنے سر لینا نہ چاہتی تھی۔ وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے اندر اٹھتے اس درد کے طوفان کو برداشت کرتی رہی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے پوری رات بتا دی تھی۔ اس کا وجود جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ اٹھنا چاہے گی تو اٹھ نہیں پائے گی۔ بولنا چاہے گی تو بان ہلنے سے انکار ہی ہو جائے گی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ساری عمر یوں ہی بیٹھی اس درد کا مقابلہ کرتی رہے گی۔ صبح اٹھ بچے احسن نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ اس پر نگاہ ڈالے بغیر وہ کچن میں گیا تھا۔ وہاں سے پانی کا گلاس پی کر وہ اس کی جانب دیکھے بغیر گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے گھر سے نکلتے ہی زنب کی کراہوں کو رستہ مل گیا۔ اس کی آہیں آزاد ہوئے لگیں اسکے آنواک مرتبہ پھر روانی سے بہنے لگے۔

نوبے جیلہ گھر میں داخل ہوئی تو وہ چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔
 ”جینو بی بی! جینو بی بی!“ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی اس کے قریب آئی۔ ”کیا ہوا ہے جی؟“
 ”جیلہ.....“ اس نے بمشکل اپنی سانسوں اور کراہوں پر قابو پایا تھا۔ رملی کو بلا کر لاؤ۔ کہنا گاڑی لے کر آئیں۔ مجھے..... ہسپتال جانا ہے۔ جلدی کرو۔“



ہر چند کہ اس نے رملی کو سختی سے منع کیا تھا لیکن رملی نے غماز سے اس وقت جا کر احسن کو کون کر آئی تھی۔ وہ سبہ پہر کا وقت تھا جب وہ ہسپتال کے روم نمبر سات میں داخل ہوا تھا۔

سفید چادر سینے تک پھیلائے۔ ٹیکوں کے سہارے وہ ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر اسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل آ بیٹھا تھا۔ کافی دیر تک جب وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی تو وہ دوسری کرسی پر بیٹھی رملی کی جانب متوجہ ہو گیا۔
 ”کیا ہوا تھا؟“ اس کی آواز مدہم اور لہجہ سپاٹ تھا۔

”ڈاکٹر کہتی ہے۔ ہم نے آنے میں دیر کی۔ حالانکہ زنب نے مجھے جس وقت کہلوا لیا، میں لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر گھر سے نکل آئی تھی۔ یہاں تک آنے میں نصف گھنٹہ لگا ہوگا۔ بس اتنی تاخیر ہوئی ہے۔“ وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے، اس کی طبیعت رات بھر خراب رہی ہے۔ کیا اس نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟“
 وہ کتنی دیر تک خاموش رہ کر خود پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا پھر جب بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”رات تو اس نے بہت کچھ کہا تھا۔ بس یہی نہیں کہا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔“
 ”آپ ہسپتال والوں سے بچے کی نقش وصول کر لیں۔“ رملی نظر چرا کر بے حد حیر سے بولی تھی۔ ”لڑکا ہوا تھا۔“

ایک بے حد گہری سانس اس کے سینے سے نکلی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

رملی کچھ دیر اداسی سے اپنی جگہ پر بیٹھی رہی تھی۔ پھر اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔
 ”زینبی! کچھ کھالو۔ سوپ پی لو۔“

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلادیا۔

”تمہارے اندر کمزوری گھر کر لے گی۔ خدمت کرو، تھوڑا سا سوپ پی لو۔“

”رملی.....“ اس کی لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی آواز نکلی تھی۔ ”مجھے تنگ مت کرو۔ پلیز۔“

آنکھیں بند کر کے اس نے نیچے پر سر ڈال دیا۔ آنسو بند پکلوں سے راستہ ڈھونڈ کر نکل آئے تھے۔



دوسرے دن وہ گھر چلی آئی تھی۔ رملی اسے اپنی گاڑی میں لے کر آئی تھی۔ احسن ہسپتال کے بلوں کی ادائیگی کے بعد کسی ضروری کام کا کہہ کر چابیاں رملی کو دے گیا تھا۔

تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو اسے پورے گھر میں ایک عجیب سا سناٹا کھرا ہوا محسوس ہوا، لیکن اس سے کہیں گھر اسناٹا اس کے اپنے وجود کے اندر بول رہا تھا۔

”تم آرام کرو۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ کل سے تم نے کچھ کھایا نہیں ہے۔“ وہ ہمدردی سے کہہ کر بچن کی جانب چلی گئی تھی۔

وہ خاموشی سے لیٹ کر دھیرے دھیرے گھومنے پھرنے کو دیکھنے لگی۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ ہر سوچ سے عاری۔ وہ خود بھی کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ چھت اور دیواروں کو تنکے کے بعد اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس طرح لیٹے لیٹے اسے یزدا آگئی تھی۔ نجانے وہ کتنی دیر سوئی رہی پھر باہر ہونے والی باتوں کی آواز پراسکی آنکھ کھل گئی تھی۔ خالی الذہنی کے عالم میں وہ کچھ دیر تک یونہی بڑی چھت کو گھورتی رہی پھر الفاظ اس کے ذہن کی گرفت میں آنے لگے۔

وہ رملی کی آواز تھی۔

”اسے آپ کی ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے۔ اس وقت اسکی جو حالت ہے.....“

”اپنی اس حالت کی وہ خود مددگار ہے۔“ احسن کی سپاٹ آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس نے نہ صرف خود کو، بلکہ مجھے بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے جو ڈاکٹر سے ساری تفصیل پوچھی ہے۔ اگر ہم وقت پر ہسپتال پہنچ جاتے تو بچے کی جان بچ سکتی تھی۔ اس نے ذرا سی ضد کی خاطر، ذرا سی ضد کی خاطر اپنے بچے کی جان لے لی۔“

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ گلہ مند نہ گیا تھا۔

”اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہوگا۔“ رملی نے کمزور سے لہجے میں مدافعت کی تھی۔ ”کوئی ماں جان بوجھ کر ایسا نہیں کر سکتی۔ بس وہ اپنی کیفیت کو سمجھ نہ سکی ہوگی۔ اس کا یہ پہلا تجربہ تھا۔“

”اور وہ اپنے پچھلے تمام تجربات کی طرح اس میں بھی ناکام ہوگئی۔“ احسن عجیب کھوکھلی ہنسی منس دیا۔ ”بہر حال، آپ کا بہت شکریہ۔ پچھلے کچھ دنوں میں آپ نے جس طرح سے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ بہت اپنے، بہت قریبی لوگ ہی ایسا کر پاتے ہیں۔ آپ سے درخواست کرتا ہوں، کچھ دن اور اس کا خیال رکھیں۔ میں آج کل اپنے آفس میں کچھ ضروری کاموں کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ اسے زیادہ وقت نہ دے پاؤں گا۔“

”میں بھی آپ سے درخواست کر رہی ہوں۔ آپ اس کے شوہر ہیں، آپ اس کا خیال رکھیں گے تو بات دوسری ہوگی۔ وہ بہت نینس ہو

رہی ہے۔“

”ہوں۔ اچھا، میں ذرا ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ یہی بتانے آیا تھا۔ رات کو دیر سے لوٹوں گا۔ کیا آپ میری واپسی تک زینب کے پاس رک سکیں گی؟“

”وائے ناٹ۔“ مہلی بولی تھی۔ ”لیکن آپ کھانا تو کھالیں۔ میں نے بنالیا ہے۔“

”میں کھالوں گا۔ اچھا، خدا حافظ۔“

زینب آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ رہلی کچن میں تھی۔ اس کے لئے ٹرے میں کھانا رکھ رہی تھی۔

”تم اٹھ گئیں۔ میں کھانا لارہی تھی۔ تم چاہو تو منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔“

”نہیں، ٹھیک ہے۔“ وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

”سوپ تو مجھے بنانا آتا ہے۔ ساتھ میں پکچن فرانی کر لی ہے۔ بس اتنا ہی سلیتہ ہے میرا۔ چپ چاپ کھا لو اور دل ہی دل میں مجھے کوٹنا

مت۔“

وہ فریش انداز میں مسکراتی ہوئی ٹرے اٹھا کر اس کے قریب چل آئی۔ ٹرے اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر اس نے سوپ کا بڑا سا پیالہ اسے

تھمایا۔

”سارا ختم کرنا ہے۔ کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ باشعور ہو، سمجھ دار ہو۔ تمہیں خود اپنا خیال رکھنا ہو گا۔ اندر سے بالکل ختم ہو جاؤ گی

ورنہ۔“

وہ خالی الٹنی کے عالم میں پیالہ تھام کر بیٹھی رہی۔ رہلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر پیالہ اس کے ہاتھ سے لے کر خود اسے سوپ پلانے

لگی۔

”ابھی تمہارے ہسپتال آئے تھے۔ کسی ضروری کام سے گئے ہیں، رات تک لوٹیں گے۔ میں تب تک تمہارے پاس ہوں۔“ وہ اسے

انجان سمجھ کر اطلاع دینے لگی۔

”اتنی خاموش کیوں ہو؟ کچھ بولو، بات کرو۔“ وہ پھر بولی تھی۔

”کیا بولوں؟ کیا بچا ہے بولنے کیلئے؟“ وہ آزدگی سے بولی۔

لحاف

عصمت چغتائی اردو زبان میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے..... منو کی طرح عصمت کا قلم بھی معاشرے کے حساس موضوعات کی نشاندہی کرتا رہا اور اس پر بھی اکثر اوقات فحش نگاری کا الزام لگتا رہا۔ لیکن اسکے باوجود عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول اردو ادب کا لازمی جز ہیں۔ **لحاف** عصمت کے 11 بہترین منتخب افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں جوانی، لحاف، پہلی لڑکی، باندی، ایک شوہر کی خاطر بنی دہلیز، تل، عورت، خریدو، بھو بیٹیاں اور ڈاکن افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے افسانے سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

”کیوں نہیں، پوری زندگی پڑی ہے تمام کرنے کو۔ اس طرح اسٹریس کا شکار ہو گئیں تو کیسے فیس کرو گی زندگی کو؟ میاں بیوی کے درمیان اختلافات تو زندگی میں کبھی بھی، کسی بھی موڑ پر پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ موڑ آکر گزر جاتا ہے تو سب کچھ پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ اور بچے پیدا کرنے کو تو عمر پڑی ہے۔ ٹھیک ہے، وقتی طور پر صدمہ ہونا تو لازمی ہے لیکن ساتھ ساتھ خود کو سمجھاتی بھی رہو۔ بڑے سے بڑا صدمہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان فراموش کرتا چلا جاتا ہے۔ وقت کی وصولی دل پر پڑی ہر خراش کو ڈھانپ لیتی ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ تمہارے اور بچے ہوں گے، ان میں کھو کر تم اس پہلے حادثے کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ گی۔“

”احسن سمجھتے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے بچے کی جان لی ہے۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”نہیں، نہیں۔ ایسا کچھ نہیں۔“ زملی جلدی سے بولی تھی۔ ”میں کہہ رہی ہوں تا یہ سب وقتی جذبات ہیں۔ پانی کے دھارے کی طرح آکر گزر جانے والے۔ پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ وہ بھی شدید شاک کا شکار ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ سنبھلیں گے تو اپنی جذباتیت پر انہیں بھی ندامت ہوگی۔ وہ پہلے سے زیادہ تمہارا خیال کریں گے۔“

”مجھے ان کی ندامت سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔“ وہ قدرے تنفر سے بولی تھی۔ ”یہی الزام میں بھی اسی شدت سے ان پر عائد کرتی ہوں۔ نہ وہ مجھے ذہنی تناؤ کا شکار کرتے، نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ آخر میرا تصور کیا تھا جس کی پاداش میں انہوں نے وہ سب کچھ کہا جواب میں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔ میں بھولنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”تم وقتی جذباتیت کا شکار ہو رہی ہو اور کوئی بات نہیں ہے۔ لو، یہ سوچ پی لو۔“

”میرا کچھ کھانے کو دل نہیں کرتا زملی!“ وہ آکٹا ہٹ سے بولی۔

”لیکن زبردستی کھاؤ۔ یہ سوچ کر کہ تمہیں اس وقت اسکی اشد ضرورت ہے۔ اپنے آئندہ کو بہتر بنانے کے لئے۔“ وہ بے دلی سے سوپ پیئے گی تھی۔

”کبھی کبھی سوچتی ہوں سارا تصور میرا ہے۔“ کچھ دیر کے بعد زملی بولی تھی۔ ”نہ میں تمہیں ساتھ لے کر جانے پر اصرار کرتی، نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ لیکن زہنی! مجھے کیا خبر تھی۔“

زینب نے اسکی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا تھا۔



زملی رات تک اس کے پاس رہی تھی پھر احسن آیا تو وہ اگلے دن پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

وہ تقریباً سارا دن ہی سوئی رہی تھی۔ اسلئے اسے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بلا جواز ہی بیٹھی رہی۔

احسن کچھ دیر تک خاموشی سے اپنے کام منہا تھا رہا۔ وہ اگلے دن آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنے کپڑے پر لیس کر کے اس نے الماری میں لٹکائے۔ جوتے پالش کئے پھر آفس بیگ میں کچھ ضروری کاغذات رکھنے لگا۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ بستر تک آیا تو وہ اسی انداز میں بیٹھی تھی۔

”مجھے لاہور جانا ہے۔“ وہ بولا تھا۔ ”مل والے ہیڈ آفس کے کسی کام سے بھیج رہے ہیں۔ تین چار دن لگ سکتے ہیں۔“

زینب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”جی اچھا۔“ اس نے محض اتنا کہا تھا۔

”کل میں بارہ بجے تک آکر اپنا ضروری سامان لے جاؤں گا۔ اگر تم کہو تو میں فرخندہ آپا کے پاس چھوڑ دوں تمہیں؟“

”نہیں۔“ وہ فوراً سے پیشتر بولی تھی۔ ”میں اپنے گھر میں زیادہ سکون سے رہوں گی۔ آپ جائیں، مجھے کوئی پریشانی نہ ہوگی۔“

”لیکن تم اکیلی کس طرح رہو گی؟ یا تو میں فرخندہ آپ کو یہاں چھوڑ دیتا ہوں۔“

وہ شدید کوفت کا شکار ہوئی۔ انہیں تو وہ دس منٹ مشکل سے برداشت کرتی تھی، کجائیں چار دن کا ساتھ۔

”میں رملی سے کہہ دوں گی۔ وہ یہاں میرے پاس رہ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔“ اس نے اعتراض نہ کیا۔

پھر وہ لائٹ بند کر کے لیٹ گیا۔ نینب کی جانب سے اس نے کروٹ لے لی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر بیٹھی الٹی سیدھی سوچوں کا شکار رہی پھر اسے اسی حالت میں نیند آگئی تھی۔



اس کی آنکھ احسن کی کمرے میں آمد سے کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر رہ گئی۔ اپنی حالت پر غور کیا۔ وہ ہنوز بیٹھی ہوئی تھی۔ گویا وہ ساری رات اسی کنڈیشن میں سوئی رہی تھی۔

پھر اس نے احسن کو دیکھا۔ وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ اس کے لئے ناشتہ بنا کر لایا تھا۔

ٹرے میں دودھ کا گلاس، فرائی انڈے اور سکے ہوئے توست تھے۔

”اٹھ کر منہ دھو لو۔“ وہ بولا تو اس کی آواز بے حد نرم تھی۔ ”ناشتہ کر لو تو میں چائے لادیتا ہوں۔ دم پر کچی ہے۔“

نینب چند لمحوں کے لئے اس کے لہجے اور انداز پر غور کرتی رہی۔ چند دنوں سے جو اجنبیت، سختی اور برہمی اس کے انداز اور طرز گفتگو میں تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔ شاید اس کی ناراضی ختم ہو چکی تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر ہاتھ روں میں گھس گئی۔ لائٹ جلا کر اس نے واش بیسن کے اوپر لگے ہوئے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو اسے دھچکا لگا۔ گہرے حلقے، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، بکھرے، الجھے بال اور سنولائی ہوئی رنگت۔ وہ برسوں کی سریفہ معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس کی یہی حالت دیکھ کر احسن کو اس پر ترس آ گیا تھا۔

وہ باہر نکلی تو احسن کمرے میں نہ تھا۔ وہ چپ چاپ ٹرے کے سامنے آکر بیٹھ گئی اور ناشتہ کرنے لگی۔ آج اسے کتنے دنوں کے بعد بھوک محسوس ہوئی تھی۔ وہ ہر چیز کھا چکی تھی۔ ٹرے خالی کر کے وہ ہاتھ دھونے کے لئے دوبارہ ہاتھ روں میں گئی تھی۔ باہر نکلی تو وہ اس کے لئے چائے کا کپ لے آیا تھا۔

”چائے پی لو۔ میں آفس چلتا ہوں۔“ اس نے رسٹ واج پر نظر ڈالی۔

”آپ نے ناشتہ کر لیا؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”ہاں، چائے ادھر ہی بیوں گا۔“ وہ چند لمحوں کے لئے کھڑا رہا۔ ”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ پھر اس نے پوچھا تھا۔ نینب کی آنکھیں میلی ہو گئیں۔

”بہت جلدی خیال آیا۔“ وہ کہے بنا رہ نہ سکی۔

”جو کچھ بھی ہوا، مجھے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”لیکن بہر حال، ہمیں آئندہ کے لئے اپنے اپنے رویوں کی سست متعین کرنی ہوگی۔ غور کرنا زینی! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اب تک جو نقصان ہو چکا ہے وہ ہر چند کہ بہت ہے۔ پھر بھی دیکھا جائے تو ابھی کچھ نہیں

بگڑا۔ بس ذرا سی محبت اور دلوں میں وسعت کی ضرورت ہے۔ محبت اعلا طرف ہوتی ہے اور اتنا تو ملے ہے تاکہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے۔“
اس نے قریب آ کر دھیرے سے اس کا گال چھوا۔ ”چلتا ہوں۔ رملٹی کو جلدی بلوایا۔“
وہ باہر نکل گیا تھا۔ زینب چائے پینے کے دوران اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی۔ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر اپنے دل کو ٹٹولا۔ نجانے کیوں وہ احسن کی طرف سے اب تک پتھر کا ہو رہا تھا۔



تو بجے کے قریب جیلہ آگئی تھی۔ زینب کو گھر پر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔
”دو دن سے آتی رہی ہوں۔ گھر پر تالا ڈالا ہوا تھا۔“ اس نے بتایا۔
”ہاں، ہاسٹل سے کل شام ہی واپسی ہوئی تھی۔“ زینب نے مختصراً کہا۔
”مجھے تو آپ کا بہت دکھ ہے جی۔“ وہ انفرود ہی ہوگئی۔ ”بس اللہ کے کاموں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“ زینب خاموش ہی رہی۔
”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے جی؟“
”میں ٹھیک ہوں بالکل۔ جیلہ! ایسا کرو، جا کر رملٹی بی بی کو بلا لاؤ۔ کہنا بی بی اکیلے ہیں۔“
”اچھا جی۔“ وہ اسی وقت اٹھ کر رملٹی کو بلانے چل دی۔
زینب پڑمردگی کے سے عالم میں بیٹھی اپنی زندگی میں در آنے والے حادثے پر غور کرتی رہی۔ ڈور ٹیل کی آواز نے اسے یکا یک اس کے خیالات سے کھینچ نکالا تھا۔ جیلہ دروازہ کھلا ہی چھوڑ گئی تھی، پھر ٹیل بجانے والا کون ہو سکتا تھا۔ وہ یہی سوچتی ہوئی دروازے تک پہنچی تھی۔
باہر کوریر سروس کا کارندہ کھڑا تھا۔
”سمز زینب شاہ؟“ اس نے استفسار کیا۔
”میں ہی ہوں۔“ وہ قدرے حیرانی سے بولی۔
”یہاں سائن کر دیں۔“ اس نے رسید آگے کر دی۔
اس سے مطلوبہ جگہ پر سائن کر دیا کہ وہ اسے سفید پھولوں کا خوبصورت سا بکے تھا گیا۔ وہ حیران پریشان سی بکے لئے اندر چلی آئی۔ پھول بے حد خوبصورت تھے اور ان کی خوشبو جا دو اثر لیکن کس نے بھیجے تھے؟ اس کی نگاہ پھولوں کے درمیان میں رکھے چھوٹے سے کارڈ پر گئی۔ دو انگلیوں کے درمیان دبا کر اس نے کارڈ نکالا اور کھول کر دیکھا۔ ”گیٹ ویل سون“ کے الفاظ جھلما رہے تھے۔
زینب کا دل دھڑکنے لگا۔ کارڈ پر ایک بار پھر کسی کا نام نہیں تھا۔ لیکن اس بار وہ الجھی نہیں۔ اسے پلک جھپکنے خبر ہوگئی تھی کہ کارڈ اور پھول کس نے بھیجے تھے۔

”میر سکندر علی۔“ اس کے لب دھیرے سے پلے تھے۔

اسی وقت دروازہ کھول کر جیلہ اور رملٹی اندر چلی آئیں۔ رملٹی کا چہرہ گھبرا ہوا تھا۔ وہ شاید منہ دھو کر بنا پونچھے ہی چلی آئی تھی۔

”ہیلو ہیلو، کسی طبیعت ہے؟“ وہ بنش انداز میں گویا ہوئی۔

”اب تو ٹھیک ہوں بالکل۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”ہوں، گڈ۔ ارے یہ پھول کتنے خوبصورت ہیں۔ تو جناب ہو صلیح صفائی؟“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”صلح صفائی؟“ زینب غائب دماغی سے بولی تھی۔

”ہاں، احسن صاحب ہی لائے ہوں گے۔“ وہ ہنسی۔ ”سفید پھول تو دو قی کا پیغام دینے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ دیکھتے ہی امن، صلح اور محبت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“ وہ اس کے برابر ہو کر دیکھنے لگی۔ کارڈ اب تک زینب کی انگلیوں میں کھلا رہا تھا۔ رملی کی نگاہیں اس کی تحریر پر پڑیں پھر اس کا چہرہ یکا یک سفید ہو گیا۔

”یہ..... یہ.....“ وہ ہٹکا کر رہ گئی۔

”یہ احسن نہیں لائے۔“ زینب نے گہری سانس بھر کر کارڈ بند کر دیا۔ ”کسی نے بھجوائے ہیں۔ کس نے؟ میں خود نہیں جانتی۔ کیونکہ اس پر کسی کا نام تحریر نہیں۔“

رملی خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”میرے ذہن میں ایک نام ہے لیکن لینے سے ڈرتی ہوں۔ مبادا تم ناراض ہو جاؤ۔ ایک مرتبہ پہلے بھی تو.....“ وہ دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ رملی بہت دیر بعد گویا ہوئی تھی۔ ”میں ناراض نہیں ہوں گی۔ میں جانتی ہوں۔ یہ میرا سکندر رملی نے بھجوائے ہیں۔ کسی کی خبر گیری کرنے کا اس کا انداز ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔“

زینب کچھ دیر پھول ہاتھ میں لئے کھڑی رہی پھر اس نے رملی کی جانب دیکھا۔ ”کیا کروں ان کا؟“

اس نے کندھے اچکا دیے۔

”میں اپنے لئے ایک کپ چائے بناؤں گی۔“ یکا یک وہ ٹون بدل کر بچن کی سمت چل دی تھی۔ ”جیلہ بی بی کو دیکھ کر میں چائے کا گرم گرم کپ یوں ہی چھوڑ آئی ہوں۔“

اس کے بچن میں چلے جانے کے بعد زینب آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈروم میں آئی۔ تھوڑی دیر تک کھڑی وہ پورے کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے پھول اپنی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔



رملی اور اس کے درمیان پھر اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ رملی اپنے رویے میں کوئی بھی تبدیلی لائے بغیر اسی طرح اس کے چھوٹے موٹے کامنشتاکی، اس کی دل جوئی میں لگی رہی تھی۔ زینب نے بھی اس سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ کی تھی، بلکہ وہ بے حد مطمئن نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ان پھولوں کو اپنے کمرے میں رکھ کر اسے ایک غیر معمولی طاقت کا احساس ہوا تھا۔ اسے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح پرکشش تھی، اس میں اب بھی کوئی ایسی بات تھی کہ وہ دلوں پر حکومت کر سکتی تھی۔ اس کا حسن محض احسن ایاز کی مدح سرائی کا ہی مرہون منت نہ تھا۔ وہ بہت دنوں کے بعد اپنے اندر ایک گہرا اطمینان محسوس کر رہی تھی۔

شام کو فرخندہ آ پا چلی آئیں۔ اس مرتبہ صوفیان کے ہمراہ نہ تھی۔

”مجھے تم لوگوں نے اطلاع دینی بھی ضروری نہ سمجھی؟“ وہ بہت دکھی تھیں، انہیں سخت گلہ تھا۔ ”وہ تو کل میں نے احسن کے آفس فون کیا تو وہاں اسکے کسی کو لیگ نے مجھے بتایا۔“

زینب خاموش بیٹھی لب لاقاتی رہی۔ وہ بھلا ان کی شکایتوں کے جواب میں کیا کہہ سکتی تھی؟ اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ہر معاملے میں فرخندہ آ پا کو نویت دینے والے احسن نے اس واقعے کی اطلاع انہیں کیوں نہ دی؟ اس کی اور احسن کی تو اس موضوع پر کوئی بات تک نہ ہوئی تھی۔

”یہ سب کچھ ہوا کیونکر بیٹھی؟ کون سی پیچیدگی ہو گئی تھی عین وقت پر؟“ وہ ہٹکی ہٹکی آنکھوں کے ساتھ پوچھ رہی تھیں۔

”مجھے نہیں پتا آپ!۔“ وہ قدرے بیزار سی بولی۔ ”آپ چائے پیئیں۔ ان باتوں سے بھلا حاصل بھی کیا۔“
فرخندہ آپا خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے زینب کی نخوت اور بیزار کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ دکھ کے ایک گھمبیر احساس کے ساتھ خاموش بیٹھی رہیں۔

پھر شام کو ان کے شوہر انہیں لینے چلے آئے۔ فرخندہ آپا جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

”محبت کی پہچان کرنا سیکھو بیٹی۔“ انہوں نے جاتے جاتے دھیرے سے کہا تھا۔ ”محبت، خلوص، رواداری، انسیت۔ زمانے نے ان چیزوں کو بہت کیاب کر دیا ہے۔ جہاں کہیں بھی یہ دکھائی دیں، ان سے دامن بھر لیتا چاہیے۔“
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی آپا؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

”تمہاری مرضی ہے بیٹی! سمجھنا چاہو یا نہ سمجھنا چاہو تو.....“ انہوں نے گہری سانس بھری۔ ”میں بس اتنا کہوں گی کہ تم سے ملنے میں میری اپنی کوئی غرض پوشیدہ نہیں۔ میں بہت خلوص اور بے غرضی سے اب تک احسن اور تمہیں چاہتی رہی ہوں۔ ملنے آتی رہی ہوں۔ خلوص اور بے غرضی کو پہچانا سیکھو بیٹی! جو لوگ فی زمانہ اس جنس کی قدر نہ کریں، وہ بہت کم قتل ہوتے ہیں۔“

وہ بہت عرصے بعد اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہی تھیں۔ زینب کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ انہیں کوئی سخت سی بات کہتے کہتے رہ گئی۔
”احسن کو میں نے اپنے سگے بیٹوں کی طرح چاہا ہے۔ اس کا دکھ مجھے اپنی ذات کا دکھ لگتا ہے۔ اس کی ہی حوالے سے مجھے تم بھی عزیز ہو۔ تمہاری تکلیف سے مجھے بھی تکلیف پہنچی ہے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو، میں ہر لحظہ تم لوگوں کے لئے دعا گو رہتی ہوں۔ کہ تم لوگ خوش رہو، آباد رہو۔“
”آپ یہ سب کچھ کیوں کہہ رہی ہیں آپا؟“ وہ بول پڑی۔

”کیوں کہہ رہی ہوں؟“ وہ افسردگی سے بولیں۔ ”یقین دلانا چاہتی ہوں اپنی چاہت اور خلوص کا۔ مبادا تم سمجھو کہ آپا کسی مقصد سے آتی ہیں۔“

”آجایا کریں۔ جب آپ کا جی چاہے۔“ وہ قطعاً بے تاثر لہجے میں بولی۔

”چلتی ہوں۔ احسن کو پیار کہنا میرا۔“

وہ بہت لمول ہو کر گئی تھیں۔ زینب کے اکھڑے ہوئے رویے سے انہیں شدید قسم کی ٹھیس لگی تھی۔ لیکن زینب کو اپنے احساسات کسی پتھر کی مانند خمد لگتے تھے۔ اسے اپنے دل میں فی الوقت کسی کے لیے بھی رتی برابر جگہ محسوس نہ ہو رہی تھی۔ وہ احسن اور اس کا حوالہ لیے ہر شخص سے برگشتہ تھی۔ اسے زندگی میں کوئی کشش محسوس نہ ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ وہ خاتون تھیں جنہوں نے اول روز سے احسن کو اس سے متنفر کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اسے ان کے لفظوں پر یقین نہ آتا تھا۔ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ سوان کے جانے کے بعد وہ بہت سکون سے دروازہ بند کر کے اندر چلی آئی تھی۔



چار دن کے بعد وہ چلا آیا تھا۔ رویے میں بے حد تبدیلی کے ساتھ۔ ایک مرتبہ پھر پہلے جیسا احسن بن کر۔

”کیسی ہوزینو؟“ وہ بڑی محبتوں سے پوچھ رہا تھا۔

”میں، ٹھیک ہوں بالکل۔“ اس نے آنکھوں سے کہہ کر نظریں جھکا لیں۔

”کیسے گزرے یہ دن؟“ وہ پوچھ رہی تھیں؟“ وہ سانس بھر کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں پھیلائے والے انداز میں سیدھی کر لیں۔

وہ بے حد تھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

”چائے بنا کر لاؤں آپ کے لیے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”اُس.....“ اس نے آنکھیں ملیں۔ ”نہیں، کھانا کھاؤں گا۔ راستے میں کچھ کھایا نہیں کہ گھر آ کر تمہارے ساتھ کھانا کھانا تھا۔“ وہ

مسکرایا۔

”پہلے ایک گلاس پانی پلا دو۔ پھر نہادھو کر اطمینان سے تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا۔“

”لیکن میں کھانا کھا چکی ہوں۔“

”اچھا۔“ اسے مایوسی ہوئی۔ ”چلو، خیر ہے۔“

وہ اس کے لیے پانی کا گلاس بھر کر لے آئی۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ صوفے کی پشت سے سر نکائے وہ غنودگی کے عالم میں تھا۔

”آپ سو رہے ہیں؟“ اس نے گلاس میز پر رکھا۔

”اُس، نہیں۔“ وہ سیدھا ہا کر بیٹھ گیا۔ ”تھکن ہو گئی ہے۔ چار دن بہت مصروفیت رہی ہے کل صبح کا جاگا ہوا ہوں۔ پہلے آفس کا کام نمنانا

رہا پھر شاپنگ کرنے چلا گیا۔ تمہارے لیے کچھ چیزیں خریدی ہیں۔ وہاں سے سیدھا اسٹیشن گیا۔ ٹرین پکڑ لی تھی۔ اور ٹرین میں مجھے نیند نہیں آئی۔

آج صبح یہاں پہنچ گیا ہوں تمہارے پاس۔ یہ ہے کل رام کہانی۔“

وہ بالکل پہلے والے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ ہلکا ہلکا ٹکلفتہ سا انداز تھا۔

”چلیں پھر نہیں۔ کھانا کھا کر سو جائیں۔ شام تک فریض ہو جائیں گے۔“ وہ سادہ سے انداز میں بولی۔

”ہاں میرا بھی یہی پروگرام ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”یہ بیک ہے نا۔ اس میں تمہاری چیزیں ہیں۔ لیکن دیکھنا مت، میں خود کھاؤں گا ہر چیز،

ٹھیک ہے؟“

نہب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ تویہ اٹھا کر باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ نہب وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ صلح ہو گئی تھی لیکن اس مرتبہ کی صلح میں وہ پہلے کا سا مزہ نہ تھا۔ وہ بے

قراری نہ تھی۔ ہر بات اپنی دلکشی کھو بیٹھی تھی۔

لفظوں کی چوٹوں سے دل پر جو نیل پڑتے ہیں۔

ان کے نشان اتنی آسانی سے نہیں جاتے احسن صاحب۔“ اس نے سوچا۔ ”اس مرتبہ کی ضرب تو اتنی کاری ہے کہ مجھے اپنا دل ہی مردہ

محسوس ہوتا ہے۔ ایک بدسلطہ، بے ذہنگی، پھو ہڑ عورت۔ یہی تعریف ہے تمہاری۔ غلط تھے وہ لفظ جو آج تک تمہاری مدح میں کہتا رہا۔“

اس کے ذہن میں تپتے سگلتے الفاظ ابھرے۔ اس نے اپنا پورا وجود جلتا ہوا محسوس کیا۔

”چلیں جناب۔“ وہ باتھ روم سے سرگڑتا ہوا برآمد ہوا۔ ”نیکایا کیا ہے؟“

وہ ہڑا کر اپنے خیالوں سے باہر نکلی تھی۔

”جیل نہ نہیں آئی کیا؟“ وہ بیک کھولتے ہوئے مصروف سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”آئی تھی، کام ختم کر کے جلدی چلی گئی۔“ وہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔

کھانے کے دوران ابھی وہ مسلسل بولتا رہا۔ نہب کچھ حاضر، کچھ غائب دماغی سے سنتی رہی نہ جانے احسن اس کا کھنچاؤ محسوس نہیں کر رہا تھا

یا محسوس کر کے بھی انجان بن رہا تھا۔

کھانے کے بعد اس نے چائے کی فرمائش کی اور جب وہ چائے بنا کر لائی تو وہ اپنی خریدی ہوئی چیزیں نکال نکال کر میز پر رکھ رہا تھا۔

”ادھر آؤ جانم! اور سراو میری پسند کو۔“ اس نے چائے ٹیبل پر رکھی۔ نہب کا ہاتھ کھینچ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ ”یہ دیکھو چزی کا سوٹ اور

اس کے ساتھ پہننے کے لیے یہ کھسے۔“

اس نے میرون اور بلیک چنری کا سوٹ اور اسی کمبیشن میں کڑھائی والا کھسہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

”کیسا ہے؟“ اس نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”اچھا ہے۔“ وہ نیم دلی سے بولی۔

”اچھا ہے۔ بس؟ بہت اچھا نہیں؟“

”بہت اچھا ہے۔“

”چلو یہ دیکھو۔ سفید موتیوں کا سیٹ۔“ اس نے چھوٹا سا ڈبہ اسے تھمایا۔ ”یہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ بہت مہنگا ہے لیکن میں لیے بغیر نہ رہ

سکا۔“

”مہنگا تھا تو کیوں لیا۔ نہ لیتے۔“ اس کا انداز بے حد سادہ تھا۔

”کیوں نہ لیتا۔ میرے لیے تو دنیا کی سب سے مہنگی اور قیمتی چیز تم ہو زینو!“ وہ لگاوٹ سے بولا۔ زینب نگاہ نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔

”اچھا یہ شال دیکھو۔“ اس نے سیاہ کشمیری کڑھائی والی شال اس کے سامنے پھیلائی۔

”اچھی ہے نا۔“

”جی، بہت اچھی ہے۔ آپ چائے تو پی لیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”زینب! تم اب تک خفا ہو؟“

”نہیں، میں نے ایسا کب کہا؟“

”کیا میں محسوس نہیں کر سکتا؟“ وہ آزر دگی سے بولا۔

”آپ کچھ محسوس نہیں کر سکتے۔“ اس نے تنگی سے سوچا تھا۔ ”آپ میں محسوس کرنے والی حس ہی نہیں ہے۔“

”آپ بلاوجہ ہی غلط اندیشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں تو بالکل ناراض نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ نہ لاتے تب بھی

نہیں۔“

”میں یہ سب کچھ اپنی خوشی سے لایا ہوں۔ کسی قسم کے لالچ کے لیے نہیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”چائے پی کر کچھ دیر آرام کر لیں۔ میں ذرا کھانے کے برتین دھو لوں۔“

وہ کچن میں چلی آئی تھی۔



دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار

واقعات سے بھرپور، سٹفلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی خوشنایوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گردنت میں لے کر

ایک ان دیکھی دنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ

گمراہی اور ان دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے۔**

دوسرے روز وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب زینب سو کر اٹھی تھی۔

”سنیں، ایک کام کر دیں۔“

”ہاں، بولو۔“ وہ ٹائی کی ناٹ درست کر رہا تھا۔

”آمنہ کو میرا پیغام پہنچا دیں۔ میرا جی اس سے ملنے کو چاہ رہا ہے۔ اگر وہ آج مجھ سے ملنے آجائے تو۔“

احسن نے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بڑی آس سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ آمنہ کا گھر اس کے آفس کے لحاظ سے بالکل مخالف سمت میں تھا۔ اسے آفس سے کم از کم گھنٹہ بھر کی دیر ہو سکتی تھی۔

”اچھا۔“ لیکن وہ مان گیا تھا۔ ”میں کہتا جاؤں گا۔“

”شکریہ۔“ وہ وہاں سے ہٹ کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

اسے دراصل شدت سے کسی ساتھی، کسی ٹمکسار کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے خود اپنی کیفیات سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ ایسے میں اسے سامع کی ضرورت تھی جو اسے اس کی کیفیات کے حوالے سے کچھ سمجھا سکتا۔ اسے سکون کی ضرورت تھی اور اسے علم تھا کہ آمنہ کی قربت میں اسے سکون ملتا تھا۔

اسے یقین تو نہیں تھا کہ آمنہ آئے گی لیکن وہ دوپہر میں چلی آئی تھی۔ زینب کو اسے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

”میں سوچ رہی تھی شاید تم نہ آسکو۔“ وہ اس سے لپٹ کر بولی تھی۔

”کیسے نہ آتی۔“ آمنہ بولی۔ ”مجھے تو صبح احسن بھائی نے بتایا کہ..... وہ زینب! میں..... میں کیا کہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”کچھ نہ کہو آمنہ!“ وہ اداسی سے بولی۔ ”آج دوسری باتیں کریں گے۔ یہ بات سوچ سوچ کر دماغ تھک گیا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو زینب!“ وہ اپنے بچے کو بستر پر لانے لگی۔

”کیسے آئیں؟ انوار بھائی چھوڑ گئے ہیں؟“ زینب نے موڈ بدلنے کی خاطر پوچھا تھا۔

”نہیں، وہ تو آفس جا چکے تھے۔ میں ٹیکسی میں آئی ہوں۔“

”بہت شکریہ آمنہ! آج مجھے تمہاری بہت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔“

”میں تمہارا درد محسوس کر سکتی ہوں۔“ وہ ہمدردی سے اس کے قریب آگئی تھی۔

زینب کو یکا یک نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”ارے..... ارے..... زینب! زینب!“ آمنہ بے طرح گھبرا گئی۔ ”بھئی اس طرح مت کرو، ورنہ میں بھی رو دوں گی۔ میں تمہارے

لیے پانی لاتی ہوں۔“

”نہیں۔“ اس نے آمنہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پلیز میرے پاس رہو۔“

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ آمنہ نے جیسے اسے دلاسا دیا۔ ”چلو، یہاں آکر بیٹھو۔“ وہ اسے لے کر بنگ تک آگئی۔

”آمنہ! میں بہت ٹینشن کا شکار ہو گئی ہوں۔ نجانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ کوئی شخص مجھے اپنا نہیں لگتا، کوئی

بات مجھے خوش نہیں بخشتی۔“

”ٹھیک ہو جائے گا زینب! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”اچانک پیش آنے والے اس حادثے نے تمہارا ذہن

ماؤف کر دیا ہے لیکن یہ کیفیت عارضی ہے۔ ماشاء اللہ تمہارا اتنا چاہنے والا شوہر تمہارے ساتھ ہے۔ بہت جلد تم اس صدمے کے اثرات سے باہر نکل

آؤ گی۔“

”شوہر؟ شوہر کی بات کرتی ہو؟“ وہ چہرہ اٹھا کر تلخ لہجے میں بولی۔ ”مجھے احسن سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔“

”کیا؟“ آمنہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ مجھے تم سے کم از کم اتنی شدت پسندی کی توقع نہیں تھی۔ احسن بھائی کا اس سارے قصے میں کیا تصور ہے؟ ایسا حادثہ تو اکثر عورتوں کے ساتھ پیش آ جاتا ہے۔ یہ تو قدرت کے کھیل ہیں۔ کبھی بے تحاشا نواز دینا، کبھی یکا یک سب کچھ چھین لینا۔ انسان کو تقدیر کے فیصلوں کے آگے صابر و شاکر رہنا پڑتا ہے۔ جو صبر نہیں کرتا وہ صرف خود کو نقصان پہنچاتا ہے۔“

”احسن نے مجھے بہت دکھ دیا ہے آمنہ! تم نہیں جانتیں۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”پہلے عرش پر بٹھایا تھا۔ وہاں سے اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ تذلیل کے احساس میں گھر کریں اتنا بڑا نقصان کر بیٹھی تو کیا اس میں میرا تصور ہے؟“

”ایسا کیا کیا ہے احسن بھائی نے؟“ آمنہ الجھن میں پڑ گئی۔ زینب نے اسے ساری داستان سنا ڈالی۔

”تم کتنی نادان ہو زینبی! کتنی نادان۔“ وہ ساری بات سن کر تاسف سے سر ہلانے لگی تھی۔ ”مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر تمہارا رویہ ایسا ہی رہا تو تم خالی دامن، خالی ہاتھ رہ جاؤ گی۔ مرد کا کبھی کچھ نہیں بگڑتا۔ سارا خسارہ عورت کے حصے میں آتا ہے۔ یہ ایسی ہی شراکت داری ہے۔“

”چنانچہ آمنہ! کیوں ہم دونوں روز بروز ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔“

”صرف تم دور ہو رہی ہو زینب! احسن بھائی تو اپنی جگہ پر کھڑے ہیں۔“

”تم میری دوست ہو کر ان کی وکالت کر رہی ہو؟“ وہ اس سے جھگڑنے والے انداز میں بولی تھی۔

”تمہاری دوست ہوں اسی لئے حقائق کے آئینے میں تمہیں تمہارا چہرہ دکھا رہی ہوں۔“ آمنہ رسائی سے مسکرا دی۔ ”اپنے شوہر کو سمجھو، اس کا دل جیتو، اس کی پسند میں سر تا پا ڈھل جاؤ، یہی تمہاری کامیابی ہوگی زینب! اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کو طعنے دے کر اور اس کے طعنے کھا کر صرف یہی ہوگا جواب تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔“

”لیکن آمنہ! پہلے تو وہ ایسے نہ تھے۔“ وہ رنجیدگی سے بولی۔ ”میری کڑوی باتیں سن کر بھی مسکرا دیا کرتے تھے۔ کبھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے میرا دل دکھے۔ ہمیشہ میری مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا کرتے تھے۔“

”اور تم اتنی مغرور ہو گئیں کہ انہیں اپنے آگے سجدہ ریز دیکھنے کی خواہش مند ہو گئیں؟“

”نہیں آمنہ! اس نے کہنا چاہا۔“

”ایسا ہی ہے زینب، ورنہ تم ان کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتیں۔ دیکھو زینب! آدمی آدمی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مردم شناس بنو۔ کم از کم اپنے جیون ساتھی کی نیچر مکمل طور پر سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے خیال میں تو احسن بھائی بہت انا پرور شخص ہیں۔ وہ تمہارے لئے اتنا ہی جھکیں گے جتنا وہ خود جھکنا چاہیں گے۔ جہاں تم نے اپنی مرضی کا دباؤ ڈالنے کی کوشش کی وہاں سے معاملہ نقصان دہ ہونا شروع ہو جائے گا۔ یا تو وہ ٹوٹ جائیں گے یا تم ٹوٹ جاؤ گی۔“

”وہ بدل گئے ہیں آمنہ! تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔“ وہ زچ ہو گئی۔ ”انہوں نے وہ وہ الفاظ کہے ہیں جو ساری عمر میرے دل سے نہیں نکل سکتے۔ میں ان کا چہرہ دیکھتی ہوں اور وہ باتیں میرے دماغ میں گردش کرنے لگتی ہیں۔“

آمنہ تاسف سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”فائدہ کہا کرتی تھی کہ مرد، عورت کو حاصل کرنے کے لئے ہر جنن کر گزرتا ہے۔ اسے اپنا خدا بھی مان لیتا ہے اور پھر جب وہ اسے مل جاتی ہے تو اس کا نام اپنے غلاموں کی فہرست میں سب سے اوپر لکھ لیتا ہے۔ سارا چکر دسترس کا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا آمنہ! اسی احسن ایاز نے مجھے کیا کیا خواب نہ دکھائے تھے۔ کیا کیا وعدے نہ کئے تھے۔ میری زندگی کو پھولوں بھری شاہراہ بنانے کا عزم کیا تھا۔ آج وہی احسن کہتا کہ میں محض عامیانہ تحریر سے بھی ایک کتاب ہوں جس کا بس سرورق ہی اچھا ہے۔ کیا یہ تو جین کی انتہا نہیں؟ میں اسے حاصل ہو گئی تو اب وہ

میری اس طرح تذلیل کر رہا ہے۔“

”غصے میں آدی کے منہ سے نہ جانے کیا کچھ نکل جاتا ہے نہ نب! اپنے شوہر سے محبت کرنی ہو اور اس کی محبت پانی ہو تو دل میں ایک قبر کھودنی پڑتی ہے۔ ہر تلخ بات، ہر تلخ یاد، ہر اختلاف، اپنی ہر بار اس قبر میں دفناتے جاؤ اور دل کو صاف رکھو۔ یہی بہترین اور پرسکون زندگی گزارنے کا اولین اصول ہے۔“

’جہاں قبریں ہوں وہاں گلستان نہیں کھلتے آمنہ! قبرستان بنتے ہیں۔ اور میرا دل قبرستان بنتا جا رہا ہے۔ خاموش، ویران اور اداس۔ ہاں، میرے دل میں ہو کا سا عالم ہے۔“

وہ پھر رونے لگی تھی۔ آمنہ ہمدردی سے اس کا ہاتھ تھپکتے لگی۔

”میں کہہ رہی ہوں نازنب! اس حادثے کے اثرات سے باہر نکلنے نکلنے وقت لگے گا۔ تم دینی تناؤ کا شکار ہو۔ ایسے میں انسان خود سے منسلک ہر رشتے سے بیزار ہو جاتا ہے۔ تقدیر کی خرابی کا الزام کسی نہ کسی پر عائد کر کے تھوڑی سی تسلی چاہتا ہے۔ بے گناہ لوگ بھی اسے گناہ گار نظر آتے ہیں۔ بس تمہارے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ اس کنڈیشن سے نکلو گی تو اپنی اپنی سوچوں پر انفس ہو گاتھیں۔ تمہارا شوہر تمہیں بہت چاہتا ہے۔ یہ بات سچی، کھری اور اٹل ہے۔“

پھر وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”تمہیں خدا نے بہت کچھ دیا ہے نہ نب!“ وہ بولی تھی۔ ”بہت خوش قسمت بنایا ہے۔ اپنی خوش قسمتی کا ادراک کرو اور شکر ادا کیا کرو۔“

”خوش قسمت؟“ نازنب ہنس دی۔ ”میں تمہیں کہاں سے خوش قسمت نظر آتی ہوں؟“

”ایک مکمل زندگی، ایک چاہنے والا جیون ساتھی، عورت کے لئے اس سے بڑھ کر بھی کوئی خوش قسمتی ہے؟ تمہیں اور کیا چاہیے؟“

آمنہ کی نظروں میں اس کی طنزیہ ہنسی سے بہت سے حیران کن سوالوں نے جنم لیا تھا۔

”زندگی کو لو نہیں ہے آمنہ! جس کے گرد بیل بن کر چکراتے ہی رہو۔“ وہ تلخ ہوئی۔ ”تم بہت سادہ مزاج ہو، بہت کم پر قناعت کر سکتی ہو۔ میرا تو جی چاہتا ہے۔ قہقہے پھیلا کر دنیا اس پر رکھ لوں۔ کبھی گھر سے نکل کر، آنکھیں کھول کر دیکھو، دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔ کتنی مقابلے بازی ہو رہی ہے یہاں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کتنی کوشش کرتے ہیں لوگ۔ میں اس دوڑ میں کس قدر پیچھے ہوں۔ مجھے تو یہ احساس سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ تمہارے اندر اتنا سارا سکون کہاں سے اتر آیا ہے آمنہ؟“

آمنہ مسکرا دی۔

”مجھے دنیا اور اس کی مقابلے بازی سے کچھ غرض نہیں۔ میں نے اپنے گھر کو اپنی دنیا مان لیا ہے اور میری اس چھوٹی سی دنیا میں بہت سکون ہے۔ دل میں جب ان گنت خواہشات اور تمنائیں بھری ہوں تو سکون کو جگہ نہیں ملتی۔ دل کو ان آلودہ چیزوں سے پاک کرو، نیک سوچوں سے سجاؤ تو سکون خود یہاں عبادت کرنے چلا آتا ہے۔ میری باتوں پر غور کرنا نہ نب! سکون تمہاری دسترس سے دور نہیں۔ ان پارہ صفت سوچوں سے اپنے دماغ کو چھپکا کر ادلاؤ۔“

نازنب حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔

”آمنہ! میں تمہارے جیسی نہیں بن سکتی، بالکل بھی نہیں بن سکتی۔“ پھر اس نے کہا تھا۔



احسن کی مصروفیت دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ شام کو اکثر دیر سے آنے لگا تھا۔

”ہاں کام کچھ زیادہ ہے ان دنوں۔“ ایک مرتبہ زنب کے استفسار پر اس نے بتایا تھا۔ ”اور غلام بھی کر لیتا ہوں۔ جو قرض لیا ہوا ہے لوگوں سے اس کا بہت بوجھ ہے میرے سر پر۔ چاہتا ہوں جلد از جلد ادا ہو۔ ابھی مہینہ دو مہینہ بھی روٹین رہے گی۔“

زنب کو ذت کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ جیلہ شام تک کام ختم کر کے چلی جاتی تھی۔ پھر کوئی مخاطب کرنے والا بھی نہ ہوتا تھا۔ وہ ٹی وی لگائے بیٹھی رہتی اور بے چینی سے پہلو بدلاتی۔

کبھی کبھار اسے بچے کا خیال آ جاتا تو تنہائی آزار بن جایا کرتی۔

اس روز بھی وہ کتنی دیر تک تنہا بیٹھی رہی تھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ احسن بھی دیر سے لوٹنے کا کہہ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک بے مقصد ہی ٹھٹھکی رہی پھر اسے رملی کا خیال آ گیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اور وہ کسی کی ہمراہی میں کھانا کھانا چاہتی تھی۔ دروازہ ہلاک کر کے وہ رملی کی طرف چلی آئی۔ وہاں پہنچ کر اسے مزید مایوسی ہوئی۔ گھر پر رملی کی بوڑھی ملازمہ اکیلی تھی۔

”بی بی تو شاپنگ کرنے گئی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اس وقت؟“ اسے بے تحاشہ ذت ہوئی تھی۔

”بہت دیر کی گئی ہوئی ہیں۔ لوتی ہوں گی۔ آپ بیٹھیں، میں چائے بنا لاتی ہوں۔“

”نہیں اماں! میں کھانا کھاؤں گی۔ لیکن رملی کے ساتھ۔“

”اچھی بات ہے۔ میں روٹیاں ڈال لیتی ہوں تب تک۔“ وہ کچن میں چلی گئی۔

زنب وہیں بیٹھ گئی۔ بے دلی سے رملی کے گھر کی آرائش پر غور کرنے لگی۔

اسی وقت دروازہ کھول کر رملی اور میر سکندر علی ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں کے چہرے چمک رہے تھے۔ ان کی نگاہ تب تک

زنب پر نہ پڑی تھی۔

”بہت شاپنگ کر لی۔ تھک گئی ہوں۔“ رملی نے بیک صوفے پر پھینکے۔

”میں نہیں تھکا اور کچھ خریدنا چاہتا ہوں.....“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا، جب اس کی نگاہ زنب پر پڑی تب تک رملی بھی اسے دیکھ چکی تھی۔

”اوہ زنب! تم کب آئیں؟“ وہ لمحہ بھر کو یوں ٹھٹھکی تھی۔ جیسے زنب نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

”میں بس ابھی، کچھ دیر ہوئی۔“ وہ سکندر علی کی موجودگی سے کنفیوز ہو گئی تھی۔

”کھانا لگاؤں بی بی۔“ ملازمہ کچن سے نکلی تھی۔

”نہیں اماں۔“ رملی چونکی تھی۔ ”ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔“

”لیکن بی بی تو آپ کے ساتھ کھانا کھانے آئی تھیں۔“ بوڑھی ملازمہ نے مسکرا کر اطلاع کی۔ ”میں نے روٹیاں بھی ڈال لی ہیں۔“

”تو پھر ہم ضرور کھانا کھائیں گے۔“ یکا یک میر سکندر علی مسکرایا تھا۔ ”رملی کھانا لگواؤ۔ معزز مہمان کے لیے ہم دوبارہ کھانا کھا سکتے

ہیں۔“

رملی جیسے جبراً مسکرائی تھی۔

”ٹھیک ہے اماں! ٹیبل لگاؤ۔“

زنب نے اسے منہ بھی کرنا چاہا، لیکن نہ جانے کیوں وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”میں ذرا ایک فون کر لوں“ سکندر علی معذرت کر کے اندر چلا گیا تھا۔

وہ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہیں پھر رملی اٹھ کر اسے اپنی شاپنگ دکھانے لگی۔

”کتنی ساری چیزیں لینی تھیں۔ میں بہت دنوں سے مارکیٹ نہ جا سکی تھی پھر آج سکندر آگیا تو میں نے کہا اگلے ہاتھوں یہ کام بھی ہو جائے۔ اکیلے شاپنگ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے یا! نہ کوئی مشورہ دینے والا، نہ سامان اٹھانے والا۔“ وہ ہنسی۔

”سکندر کے ساتھ شاپنگ کرنے کا ایک پلس پوائنٹ اور بھی ہے۔“

زینب نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

”بندے کو بس چیزیں پسند کرنا ہوتی ہیں، پرس نہیں کھولنا پڑتا۔ سکندر کا والٹ ہر دکان پر از خود کھلتا، بند ہوتا رہتا ہے۔ اشیاء کی پے منٹ ہوتی رہتی ہے۔ ہے نامزے کی بات۔“

اس نے قہقہہ لگایا تھا۔

”اچھا یہ کپڑے دیکھو۔ پے منٹ سکندر نے کرنی تھی تو میں نے دل بھر کر کپڑا اکٹوایا۔ لان کے آٹھ سوٹ ہیں۔ یہ دو سوٹ بریزے سے لائی ہوں۔ اور تیرے فریوم دیکھو، صرف شیشی کھلنے کی دیر ہے اور پورا کرہ مہک اٹھا ہے۔ سکندر کہنے لگا، یہ میری طرف سے گفٹ ہے۔ میں نے کہا۔ یہ باقی گفٹس پھر کسی کی طرف سے ہیں۔“ وہ پھر ہنسی۔

”کہنے لگا، یہ تو بس عام سی شاپنگ ہے نا۔ اچھا زینب! یہ سینڈل دیکھو۔“ اس نے سیاہ نازک سی سینڈل اس کی جانب بڑھائی۔

”بہت خوب صورت ہے، بہت نازک۔“

زینب نے لاشعوری طور پر ہی اپنا پیراس میں ڈال دیا تھا۔

”ہائے تمہارے پیر میں تو قیامت ڈھا رہی ہے۔ اتنے حسین پیر۔“ رملی چیخ اٹھی۔ ”کم بخت تو کیا چیز ہے؟“

”زینب نے جھینپ کر اپنا پیر جوتی سے باہر نکال لیا۔

رملی کی چیزوں نے اس پر ایک حراسطاری کر دیا تھا۔ اسے اپنا دل مٹھی میں دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”ہائے شاپنگ تو یہ ہوتی ہے۔ بازار سے تو یوں لوٹتے ہیں۔ ایک بازار میں جاتی ہوں۔ روتے ہوئے جاؤ، روتے ہوئے لوٹو۔ مہنگائی بہت ہے۔ قرض سر پر پڑھا ہے۔ مہینے کا آخر ہے۔“

وہ رملی کی چیزیں دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔

”کیسی اعلیٰ چیزیں خرید کر لائی ہے۔ لان ایسی نفیس کہ دیکھ کر چھوٹے کو اور چھوٹے کو بچنے کو جی پھل جائے، اور یہ بریزے چمک کا سوٹ۔ یہ تو میرے لئے ایک خواب سے زیادہ نہیں، اور پر فریوم۔“

نہ جانے کیوں اس کا جی جل کر خاک ہو گیا۔ اسے تو کبھی کسی نے اتنا قیمتی، اتنا مہنگا تحفہ نہ دیا تھا۔

”میں سکندر کے لئے کافی تیار کر لوں۔“ رملی کھڑی ہوئی تھی۔ ”میں جانتی ہوں وہ فوراً..... کافی کا قفا خا کرے گا اور اب تو اس کا حق بھی ہے کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر پلاؤں۔ آجاؤ، کچن میں چلتے ہیں۔“

وہ لاؤنچ سے نکل گئی۔ زینب بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھی، جب وہ کھنکھارا۔

”معزز خاتون، کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ وہ نجانے کب دے قدموں چلا آیا تھا۔

”جی ضرور بیٹھیں۔“ وہ کھڑی ہوئی۔ ”میں رملی کے پاس کچن میں جا رہی ہوں۔“

”پلیز زینب! اسٹ ڈاؤن۔ کچھ دیر گفتگو میں کوئی حرج ہے کیا؟“ اس کا لہجہ بے حد شائستہ تھا۔ وہ کچھ تذبذب کے ساتھ دوبارہ بیٹھ گئی۔

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ آپ کچھ کمزور ہو گئی ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ پھولوں کے لئے شکر یہ۔“ وہ نجانے کس دھیان میں کہہ گئی۔

سکندر علی کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”آپ کو برا تو نہیں لگا تھا؟“

زینب چند لمحے سوچتی رہی۔ اسے وہ پھول پا کر اچھا لگا تھا۔

”نہیں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تھینک یو۔ اس کا سنڈنٹس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ کیا آپ مجھ پر ایک اور مہربانی کریں گی؟ پلیز۔“ وہ التجائیہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ زینب نظروں میں الجھن بھر کر اسے دیکھنے لگی۔

میر سکندر علی نے پینٹ کی جیب سے ایک ٹمبلین ڈیا نکالی تھی۔

”ایک چیز ہے۔ بے حد خوبصورت اور نازک۔ اسے دیکھ کر آپ کا خیال آیا تھا مجھے اپنے دل میں کچھ غلط خیال مت کیجئے گا۔ یہ ایک نذرانہ ہے۔ بس ایک نذرانہ۔ بنا کسی لالچ یا برائی کے خیال کے۔ اس نے نازک سی دہانہ گولڈ کی چین میں جگمگاتا ہیرے کا لاکٹ اس کی نظروں کے آگے کر دیا۔ روشنی کی لہریں اس سے ٹکرا کر یوں منعکس ہو رہی تھیں کہ زینب کو اپنی آنکھوں میں تارے بھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ لاکٹ اس کی نظروں کے آگے جھول رہا تھا۔ زینب ایک خواب کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔

”یہ ایک چھوٹا سا..... نذرانہ ہے زینب!“ سکندر علی نرم آواز میں بول رہا تھا۔ ”اگر آپ کو شرف قبولیت بخش دیں تو میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھوں گا۔“

”نہیں۔“ اس نے خنک لبوں پر زبان پھیری۔ ”میں..... میں یہ کیسے لے سکتی ہوں۔ بھلا کس رشتے کے تحت۔“

”بعض رشتے بس ذرا سی خوشی کے ہوتے ہیں۔ یہ دوستی کے رشتے ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی مطلب، کوئی غرض نہیں ہوتی۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے کہا نا، بس اس کی خوبصورتی اور نزاکت کو دیکھ کر مجھے آپ کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے سوچا ایک پیاری شخصیت کے پاس ضرور پہنچنا چاہیے۔ پلیز زینب!“

زینب کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے وہ لاکٹ اپنی منہ میں بھر لیا۔



گھر کا دروازہ کھول کر وہ بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اس کا دل پوری طاقت کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ حلق کسی انجانے خوف سے بالکل خشک ہو رہا تھا۔

چند لمحوں تک وہ دروازے سے ٹک لگا کر کھڑی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ احسن کی آمد اب تک نہ ہوئی تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔ زینب اپنی کیفیت اس سے کسی طور نہ چھپا پاتی۔ بیڈ کے کنارے تک کر وہ خود کو سوچنے سمجھنے کے قابل کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

نجانے اس بل اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ جیسے میر سکندر علی کی نظروں کے ظلم اور لہجے کے فوس سے پنا مانز ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہ رہی تھی۔ ایک انجان، غیر مرد سے نہایت قیمتی تحفہ وصول کرنا حد درجہ کی حماقت تھی اور زینب جیرانی سے اپنی حماقت کا جواز تلاش کر رہی تھی۔

”یا..... یا شاید ایسا ہوا تھا کہ میں رملی کی جیزس دیکھ کر جس جھنجھلاہٹ، مایوسی اور ادا سی کا شکار ہوئی تھی اس کے تدارک کا کافی الفور مجھے یہی طریقہ سوچا کہ میں ان ساری چیزوں سے کئی گنا زیادہ قیمتی اور خوب صورت چیز حاصل کر لوں۔ شاید..... شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے سوچے سمجھے

بغیر۔۔۔“

اس نے مٹھی کھولی۔ نم ہتھیلی پر پڑا ہیرا پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ اس میں سے پھوٹی روشنیاں اس کے بیش قیمت ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ اس کی سفید کبوتری ہتھیلی خود پر نازاں لگتی تھی۔ زینب نے مٹھی پھر سے بند کر لی۔

وجہ کوئی بھی تھی۔ جواز کچھ بھی نہ تھا۔ یہ طے تھا کہ اب وہ ہیرا زینب شاہ کی ملکیت تھا۔ اسے لینا وہ اپنی حماقت گردان رہی تھی۔ لیکن اسے واپس کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھی۔

”اور پھر وہ کہہ تو رہا ہے کہ اسے مجھ سے کوئی مطلب، کوئی غرض نہیں۔ محض ذرا سی خوشی کا رشتہ۔“ اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

”خوشی؟ رشتہ؟“ کوئی اس کے اندر بولا تھا۔ ”مرد اور عورت کا ذرا سا رشتہ اور وہ بھی خوشی کا وقتی خوشی؟ جانتی ہو زینب ان الفاظ کا مطلب؟ اپنے اندر ایک ہولناک تباہی ایک آتش فشاں سیٹھ ہوئے ہیں یہ الفاظ۔“

وہ پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بازو سینے پر پلپٹ کر ادھر ٹپٹے لگی۔ اندر ایک جنگ سی جاری ہو گئی تھی۔

”ایک غیر مرد، ایک غیر عورت کو بھلا کیوں اتنا قیمتی تحفہ دے گا۔ کیا اس کے پاس اس قدر فالتو دولت ہے کہ یوں ہی اپنے دل کی خوشی کے لیے تحفے بانٹتا پھر رہا ہے۔۔۔۔۔ بنا غرض کے تو کوئی کسی کو اپنا گناہ نہیں دیتا اور مجھے کیا ہوا تھا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اب وہ کیا سوچے گا؟ کیا خیال کرے گا میرے بارے میں کہ بس یہی وہ پارسائی کا دعو تھا جو ایک ہیرے کی تپش نہ سہہ سکا۔ موم بن کر بہہ گیا۔ یہ کیا کیا میں نے۔۔۔۔۔“

وہ تاسف سے سوچتی رہی۔ بے چینی سے ٹپٹتی رہی۔

”اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ رملی۔۔۔۔۔ وہ ایک جگہ ٹھہر گئی۔ ”رملی کو اگر معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ حرکت کی ہے۔ اوہ خدا میرے خدا!“ وہ شدید پریشانی کا شکار ہو چکی تھی۔

”وہ کیا سوچتی ہوگی، میں اس کو بتائے بغیر، کچھ کہے سے بغیر ہی کیوں چلی آئی۔ اس نے سکندر علی سے استفسار کیا ہوگا کہ زینب کیوں چلی گئی۔۔۔۔۔ تو کیا اس نے رملی کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ کیا اس نے رملی سے کہہ دیا ہوگا کہ میں نے اس کا تحفہ قبول کر لیا ہے۔۔۔۔۔ کتنا تسخر ہوگا رملی کی مسکراہٹ میں اب میں اس کا سامنا کیسے کروں گی۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر مٹھی کھول کر دیکھا۔ اس کی ہتھیلی پسینے سے بیگم چکی تھی۔ وہ تھک کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ پھر اسے احسن کا خیال آیا۔ ایک بارگی اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

”احسن! اور اگر احسن کو علم ہو جائے۔۔۔۔۔ یا خدا احسن یا تو مجھے قتل کر دیں گے۔۔۔۔۔ میں جو اتنی گھٹیا حرکت کر آئی ہوں تو کیا سوچ کر؟ کیا میں یہ لاکھ پہن سکوں گی؟ اگر پہنوں گی تو احسن سے کیا کہوں گی؟ یہ کہ میری کسی سبیلی نے مجھے اتنا قیمتی تحفہ دیا ہے، یا یہ کہ آپ جو حمد و داد و قلیل رقم ہر ماہ مجھے دیتے ہیں اس میں سے پس اندازہ کی ہوئی رقم سے یہ بیش قیمت ہیرا خرید لائی ہوں۔۔۔۔۔ یا یہ کہ یہ ہیرا میری مری ہوئی غریب ماں کی آخری نشانی ہے۔ اوہ! یہ میں نے خود کو بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں مبتلا کر لیا ہے۔“

وہ ہونٹ چہرہ لئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں تک وہ کھڑی ایسے عکس کو دیکھتی رہی پھر اس نے مٹھی میں دبے اس لاکھ کو غور سے دیکھا۔

”ایک نازک اور خوب صورت چیز ایک بیماری شخصیت کے لئے۔“

اسے میر سکندر علی کے الفاظ یاد آئے۔ نجانے کیوں ایک خوب صورت سی مکان نے اس کے لبوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس نے مٹھی میں دبالاکٹ گھلے لگا کر دیکھا اور پھر پہن لیا۔

صراحی دار گردن جگمگاتی تھی۔ وہ لاکھ واقعی اس کی خوب صورت، سانچے میں ڈھلی گردن کے لئے ہی بنا تھا لاکھ کا عکس آئینے سے

روشنیوں کی صورت منعکس ہو رہا تھا۔ زینب کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا پورا وجود روشنیوں کی زد میں ہے۔ وہ اس کی بوچھاڑ میں بھیگ رہی ہے۔ وہ کتنی دیر تک کھڑی خود کو دیکھتی رہی۔ اس منظر نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ میر سکندر علی اسکے لئے کیا سوچ سکتا ہے۔ زمینی اس بات کو بنیاد بنا کر اسے کس کس طرح خوار کر سکتی ہے اور احسن غصے میں آکر کیا کچھ کر سکتا ہے..... اسے کچھ یاد نہ رہا۔ اسے صرف اپنا خوب صورت سراپا نظر آ رہا تھا اور اس پر سجا وہ قہقہے ہیرا۔

کال بیل کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لائی تھی۔ وہ بے طرح چونک اٹھی۔ وال کلاک کی جانب دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اس وقت احسن کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

اس نے جلدی جلدی لاکٹ اتارا اور الماری کی جانب بڑھی۔ اپنے زیورات کے ڈبے میں وہ لاکٹ رکھ کر اس نے الماری کا وہ خانہ لاک کر دیا۔ پھر تیزی سے باہر کی جانب بڑھی۔ اتنی دیر میں کال بیل دو تین مرتبہ بج چکی تھی۔

”کمال ہے یار!“ وہ تھکا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ ”کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں۔ کیا کر رہی تھیں تم؟“

”کچھ کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں.....“ اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ کے لئے کھانا لاؤں؟“

”آں.....“ وہ صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا تھا۔ ”ہاں ہاں کھانا بھی کھاتے ہیں۔ اتنی جلدی کیا ہے انی الحال تو ایک گلاس پانی پلا

”وہ“

”جی اچھا!“ وہ کچن کی جانب لپک گئی۔

احسن نے حیرانی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا رویہ کچھ ناقابل فہم سا تھا۔ وہ قدرے گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔

”کیا بات ہے..... بڑی تیزی میں ہو۔“

وہ نائف پانی کا گلاس بھر لائی تو اسے تھامتے ہوئے وہ حیرانی سے گویا ہوا تھا۔

”نن..... نہیں!“ وہ چہرے پر سے بال ہٹانے لگی۔

پھر بے اختیار ہی اپنی گردن کو ٹٹولنے لگی جیسے وہ لاکٹ اب تک اس کی گردن میں جھول رہا ہو۔ اسے اب تک اس کا لمس اپنے گلے پر محسوس ہو رہا تھا دل کے چور نے پہلی مرتبہ اپنا ڈیرہ جمایا تھا۔ وہ عجیب گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے احسن کا بار بار اپنی جانب دیکھنا بھی وہم میں مبتلا کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس کے چہرے سے سب کچھ جان لے گا۔ جیسے اس کے چہرے پر ساری کہانی لکھی ہوئی ہے۔

احسن کپڑے تبدیل کرنے گیا تو وہ کچن میں چلی آئی۔ کھانا گرم کر نے لگی۔ اس کا ذہن مسلسل انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی مایوسی اور اداسی اس کے وجود کا حاظ کر رہی تھی جو اسے بار بار یقین دلاتی تھی کہ اس نے جو کچھ کیا وہ صحیح نہیں تھا۔

کھانا گرم کر کے وہ ہیرائی تو احسن حسب عادت ٹی وی کے سامنے صوفے پر لیٹا تھا وہ کچھ کہے بنا کھانا میز پر رکھنے لگی۔ یوں ہی اس کی نگاہ بھی تو اس نے دیکھا وہ لیٹے لیٹے سوچا تھا۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے بمشکل پانچ منٹ ہی ہوئے تھے اور وہ سو بھی گیا تھا۔ اس کے آفس میں کام بے حد زیادہ تھا۔ وہ بہت زیادہ تھک جاتا تھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ لیٹتے ہی سو جاتا تھا۔

زینب تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی اس کے چہرے پر اس کی وہی ازلی نئی تھی۔ جو اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ پرسکون انداز میں بند کی ہوئی آنکھوں سے اس کے اندر جیسے سکون اور ٹھنڈا کا پتا چلتا تھا۔ بندہ ہونٹوں کے گوشوں میں ایک عجب مصوویت جھپی بیٹھی تھی۔ زینب کے اندر بیٹھے چور نے کسی نامعلوم اذیت سے گھبرا کر چلنا شروع کر دیا۔ وہ پریشان ہو کر اسے پکار بیٹھی۔

”احسن..... احسن۔“

”آں۔“ وہ چونک کر غنودگی کی کیفیت سے باہر نکلا۔ ”زیو! کیا ہوا؟“

”کیا ہونا ہے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے..... اٹھ جائیں۔“ جگڑے جگڑے انداز میں کہہ کر وہ پھر کچن کی جانب چل دی۔ فرنیج سے ٹھنڈے

پانی کی بوتل نکال کر لے آئی۔

”آؤ بیٹو! کھانا کھا لو تا.....“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”مجھے بھوک نہیں۔“

”بیٹھو یا رکھانے سے کیسی ضد؟“

”نہیں ضد کی کیا بات!“ وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور سر جھکا کر کھانا کھانے لگی۔

”کہیں گئی تھیں؟“ اس نے اچانک ہی پوچھا تھا۔ نرنب بے طرح چونک اٹھی۔

”جی؟“ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ ”نہیں تو۔“

احسن نے میز کے کنارے رکھی ہوئی چابی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ جب دروازہ کھول کر اندر آئی تھی تو گھبراہٹ میں چابی جگہ پر رکھنا بھول گئی تھی۔ وہ چابی اب تک میز کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ اب وہ کم از کم یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ چابی خود بخود اپنی جگہ سے اڑ کر میز تک چلی آئی تھی۔

”وہ.....“ وہ گڑبڑا گئی۔ ”ہاں وہ میں رملی کی طرف گئی تھی..... وہ تو گھر پر تھی ہی نہیں مارکیٹ گئی ہوئی تھی۔ میں اسی وقت واپس آ گئی تھی۔“

احسن نے اسے بغور دیکھا۔ آج اس کا رویہ حقیقتاً قابل فہم تھا۔ اتنی صفائیاں پیش کرنے کی تو اسے عادت ہی نہیں تھی۔ گڑبڑاہٹ سے تو اس کا دور کا واسطہ نہ تھا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”اس میں اتنا گھبرانے والی کون سی بات ہے۔“

پچھلے چند دنوں میں رملی کے بارے میں اس کی رائے میں بے حد تبدیلی آ چکی تھی۔ رملی نے جس طرح اپنی دیگر مصروفیات ترک کر کے نرنب کا دن رات خیال رکھا تھا وہ قابل تعریف تھا۔ رملی کے متعلق اب اس کا رویہ تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ نرنب اب اس کا نام لیتے ہوئے کیوں گھبرا رہی تھی۔

”آپ کے لئے چائے بناؤں؟“ کھانے کے برتن اٹھانے سے قبل ہی اس نے پوچھ لیا تھا۔

”نہیں یا نرنب غائب ہو جائے گی۔ اتنا تھکا ہوا ہوں کہ لیٹنے ہی سونا چاہتا ہوں۔“

وہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ نرنب ایک گہرا سانس خارج کر کے برتن سیٹھ گئی۔

.....

دوسرے دن رملی چلی آئی تھی۔ نرنب اسی وقت سوکر اٹھی ہی تھی۔ رملی کو دیکھ کر اس نے گھڑی پر نظر دوڑائی جو گیارہ بج رہی تھی۔

”کمال ہے تم آج اس قدر جلدی اٹھ گئیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تمہاری صبح تو ایک ڈیڑھ بجے ہوتی ہے۔“

درحقیقت وہ رملی کا سوڈا بھانپنا چاہ رہی تھی۔ پھر اسے دیکھتے ہی اس کے دماغ میں بجلی سی کوئندی تھی۔ رملی اتنی جلدی اٹھ کر کیونکر آئی تھی۔

”ہاں بس! آج نرنب جلدی ٹوٹ گئی۔ کتنی دیر بستر میں پڑی رہی پھر بیزار ہو کر تمہاری طرف آ گئی۔ چائے پلو! او! اچھی سی۔ اسٹرونگ اور خوشبودار۔“

وہ صوفے پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کا انداز نہ بے حد گرم جوتھا نہ بہت ہی سرد مہر۔ نرنب قطعاً کچھ اندازہ نہ کر سکی۔ رملی کا رویہ کچھ مست اور مبہم تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ قریب پڑے میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی تھی۔

جیلہ اب تک نہ آئی تھی سو وہ خود ہی کچن میں جا کر چائے بنانے لگی۔ تھوڑی دیر میں رملی بھی اٹھ کر وہیں آ گئی۔

”ناشتہ بنا دو؟“ نرنب نے اسکی جانب دیکھا۔ ”اوں ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”صرف چائے۔ وہ بھی اسٹرونگ سی ہو۔ چینی کم

ڈالنا۔“

”میری اماں کہتی تھیں، خالی پیٹ چائے پینے سے کلیجہ جلتا ہے۔“ نرنب کو نجانے کیوں یاد آ گیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ”کیوں اپنا کلیجہ جلاتی ہو؟ ایک کپ دودھ ہی پی لیا کرو۔“

رملی بے اختیار ہنس پڑی۔

”وہ تو جل جل کر پہلے ہی سیاہ ہو چکا ہے۔ کونسلے پر چائے ڈالو یا دودھ، ایک ہی بات ہے۔ کون سا اس نے کوہ نور بننا ہے۔“
 نزنب کو اپنے چہرے کا رنگ خود ہی بدلتا محسوس ہوا۔ وہ خفیف سی ہو کر کپ میں چیچہ ہلانے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ رملی باخبر ہے یا
 بے خبر۔ اس نے نزنب پر طنز کیا ہے یا یونہی ایک بات کہہ دی ہے۔

”ارے ہاں زین۔“ پھر رملی کپ تھامے ہوئے بولی تھی۔ ”یہ تم کو کل کیا ہو گیا تھا؟“

”کیا..... کیا۔“ نزنب کا ہاتھ کانپ گیا۔ تھوڑی سی چائے چھٹک کر ساسر میں گری۔

”کھانا کھانے آئی تھیں پھر بنا کچھ کبے، بغیر بتائے وہاں سے بھاگ آئیں۔ یا! میں سکندر کے لیے کافی بنا رہی تھی..... میرا مقصد تمہیں
 نظر انداز کرنا ہرگز نہ تھا، تم نے مانسڈ کیا تھا کیا؟“

”ارے نہیں!“ اس کے معذرت خواہانہ انداز سے نزنب کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ”یہ تم نے کیوں کر سوچا۔ اس میں بھلا مانسڈ کر نیوالی

کون سی بات تھی؟ بس مجھے ذرا احسن کا خیال آ گیا تھا۔ میں گھر کو لاک کر کے آئی تھی نا..... میں نے سوچا، احسن آفس سے آ کر پریشان ہوں گے۔“

”میری پریشانی کا خیال نہ آیا تمہیں۔“ رملی نے اسے گھورا ”میں تمہیں وہاں نہ پا کر سوچتی ہی رہ گئی کہ نزنب کو کیا ہوا۔ سکندر کہنے لگا،

تمہیں اس کو کہنی دینی چاہیے تھی، تم کچن میں گھس گئیں۔ کافی تو میں پھر کبھی پی لیتا۔ اماں بے چاری نے بھی صرف تمہاری خاطر ٹیبل لگائی تھی۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ وہ جھض اتنا ہی کہہ سکی۔

”تمہاری سزا ہے کہ آج تم پھر آؤ گی۔ میں نے اماں سے کہا ہے رات کو کوئی مزید اسی چیز بنائیں۔“

”نہیں نہیں رملی! روز روز کا آنا اچھا نہیں ہوتا۔ پھر کبھی سبھی۔“ نزنب نے پر زور انکار کیا۔ رملی نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا تھا۔ وہ چپ

چاپ چائے پیئے گی اور نزنب فی الحال، بہت دنوں تک اس کے گھر جانے کے موڈ میں نہ تھی۔



جو چلے تو جاں سے گرا گئے

ماہلک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے
 جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف
 ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت
 کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خمیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشش غالب ایسے شاعر سے کھلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میر
 نہیں انساں ہوتا۔

آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ”انسان“ درحقیقت وہی ہے جس کا ”شر“ اس کے ”خیر“ کو
 نکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ”خیر“ کا لاؤروٹھن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ جو چلے تو جاں سے

گرا گئے کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”نہیں خاتون پلیر ایہ آپ کے لئے ہے اور میں اپنے ہاتھوں سے آپ کو پہنانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ انکار کر کے میرا دل توڑ دیں گی؟“
میر سکندر علی نظروں میں اپنائیت اور لگاؤ کا بحر سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہیرے کا وہ لاکٹ جھول رہا تھا۔ نہیب نے پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”نن..... نہیں۔“ وہ بولی تو اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”میں یہ نہیں لے سکتی۔ میرا دل نہ توڑیں نہیب.....“ وہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ ”میں یہ پہنانے ہی آیا ہوں۔“ نہیب انکار میں سر ہلاتی پیچھے ہٹنے لگی لیکن وہ اس کی جانب بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ نہیب پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی۔ وہ چند لمحوں میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔
”نہیں، نہیں۔“ اس نے پھر شدت سے انکار کیا۔

لیکن میر سکندر کے ہاتھ اس کے گلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر یکایک اس نے نہیب کی گردن زور سے پکڑ لی۔
”نہیں!“ ایک چیخ کی صورت اس کے لبوں سے نکلی اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر پر لیٹی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اسے اپنا پورا وجود پسینے میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ حلق میں خشکی کا ننوں کی صورت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے سر کو ستوا ترافی میں ملارہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر ہانے رکھا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا اور چند لمحوں میں خالی کر گئی۔ یوں ہی بے خیالی میں اس نے گردن گھمائی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئی۔ احسن اپنی جگہ پر موجود نہ تھا۔

اس نے فوراً ہاتھ روم کی جانب دیکھا۔ لائٹ آف تھی جس کا بھی مطلب نکلا تھا کہ احسن ہاتھ روم میں بھی نہیں تھا۔ وہ بستر سے اتر آئی۔ نجانے کیوں اسے ایک انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ایک تو خواب عجیب سادہ دیکھا تھا پھر احسن بھی اپنی جگہ پر موجود نہ تھا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی۔

برابر والے کمرے میں اس نے جھانکا اور پھر وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ اندر احسن موجود تھا۔ وہ کمرے میں فرش پر پیچوں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد بے شمار چیزیں بکھری ہوئی تھیں وہ دراز اور آگے کو ہوئی اور دروازے سے لگ کر اندر کا منظر دیکھنے لگی۔ احسن بچے کے لئے خریدی گئی تمام اشیاء نکال کر بیٹھا ہوا تھا۔ کپڑے، کھلونے اور سب چیزیں جو وہ بڑے شوق اور چاہ سے خرید کر لایا تھا اس کے آس پاس یوں جمع تھیں جیسے اس سے جو گفتگو ہو۔ وہ کبھی کوئی کپڑا اٹھا کر دیکھنے لگتا تھا، کبھی کوئی کھلونا اٹھا کر بیاہر سے ہاتھ پھیرنے لگتا تھا۔ نہیب سکتے کے عالم میں کھڑی اس کی کیفیات و حرکات دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے احسن کے بجائے کوئی جنوبہ الحواس شخص لگا جو رات کے ڈھائی بجے اس طرح کی کیفیت کا شکار تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کوئی آواز کہے بنا پلٹ جائے اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لے۔ لیکن اسی لمحے احسن کو اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر چند لمحوں کے لئے سن سارہ گیا۔ نہیب کے قدم بھی جیسے زمین پر جم گئے تھے۔
”زینو!“ وہ کچھ دیر کے بعد بولا تھا۔ ”اندر آ جاؤ نا۔“

اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا۔ آواز قطعاً صاف اور واضح تھی۔ یعنی وہ پوری طرح سے اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ نہیب چند لمحہ قہر ذہن میں پیدا ہونے والی سوچ کے اثر سے آزاد ہو گئی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھائی وہ اندر چلی آئی۔
”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”چائیں!“ وہ بے چارگی سے بولا۔ ”اچانک آنکھ کھل گئی اور میرا جی چاہا میں یہ سب چیزیں نکال کر دیکھوں۔ ان کی خوشبو کو محسوس کروں، ان سے باتیں کروں..... نہیب! اس حادثے سے میں بہت ہرٹ ہوا ہوں، بہت زیادہ۔ میرے ذہن میں دور دور تک کوئی گمان بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی دریا کے کنارے پہنچ کر بھی پیسا سارہ جاتا ہے..... بادل گھر کر آتے ہیں اور پھر ایک یونہی برسائے بغیر پلٹ جاتے

ہیں..... ایسا بھی ہوتا ہے نہ ب؟“

وہ بے حد دھکی لہجے میں بول رہا تھا۔ نہ ب کی آنکھ سے ایک قطرہ ٹپکا اور اس کی ہاتھ کی پشت پر پٹھر گیا۔

”روڈ مت زینو! میں جانتا ہوں..... میں نہ صرف خود ہرٹ ہوا ہوں، بلکہ میں نے تمہارا بھی دل رکھا یا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک روا رکھا، وہ غلط تھا..... یہ تو ہماری تقدیر میں رقم تھا اس میں بھلا تمہارا کیا تصور تھا۔ کون ماں ایسی ہوگی جو جان بوجھ کر ایسا کرے گی..... میں غلطی پر تھا زینو! مجھے معاف کر دو..... لیکن ایک بات کا یقین رکھنا کہ میں اس وقت خود بھی نارمل نہیں تھا۔ اپنا دل شخص کے رویوں کا برا نہیں مانا کرتے بلکہ اس سے ہمدردی رکھتے ہوئے اسے معاف کر دیتے ہیں۔“

”مجھے کوئی شکایت نہیں۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ احسن نے اس عرصے میں پہلی مرتبہ سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر ایک پھینکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھلنے لگی۔

”زینو! تمہارے سارے انداز از بر ہیں مجھے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے نا اس کے رویوں کے سارے عہد جاننے لگتا ہے۔ پکلیں اٹھنے اور گرنے کے عمل سے سوچوں کے مد و جزر کو بھانپ لیتا ہے اور..... اور مجھے تو تم سے عشق کا دعویٰ ہے۔ تم کہو یا نہ کہو، میں جان سکتا ہوں کہ تمہارا دل میری جانب سے صاف نہیں۔ تمہیں میری جانب سے جو بدگمانی ہو گئی ہے، وہ تمہارے دل سے نکالے نہیں نکلتی۔ تم میری باتیں جبراً سنتی ہو، بمشکل مسکراتی ہو، خوش نظر آنا چاہتی ہو مگر ہر بات تمہاری کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ کوچ کوچ کہہ رہا ہوں نا۔“

زینب سر جھکائے بیٹھی رہی وہ جانتی تھی، احسن کا حرف صحیح تھا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہاں، اس کا دل احسن ایاز کی جانب سے صاف نہ تھا۔ اس میں بال آ گیا تھا جو کسی طور صاف نہ ہوتا تھا اور اس سلسلے میں زینب نے کوئی خاص کوشش بھی نہ کی تھی۔ کوشش تو احسن کرتا تھا اور نا کام ہو جاتا تھا نہ ب کا دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔

”بولو نا زینو! کیا تم مجھے کبھی معاف نہیں کرو گی؟ یہ ان دیکھی خلیج جو ہم دونوں کے مابین حائل ہو گئی ہے..... اسے ختم کرنا مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں تمہیں بھی میری جانب بڑھنا ہوگا۔ جو جو شکوے تمہارے دل میں ہیں وہ سب مجھ سے کہہ ڈالو، ہر شکایت کر لو اور پھر ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ کہ کبھی ہمارے بیچ کچھ ایسا بھی ہوا تھا۔“

”احسن!“ وہ ناچار گویا ہوئی تھی ”میں نے کہا نا مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرا رویہ اگر آپ کو کچھ تبدیل لگ رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں آپ سے ناراض ہوں۔ بس فی الحال میرا مودہ ہی کچھ ایسا ہو رہا ہے، میرا دماغ ماؤف سا رہا ہے۔ کھوئی کھوئی سی طبیعت رہتی ہے۔ آپ اتنا خیال نہ کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”چلو۔“ وہ کچھ دیر کے بعد بولا تھا۔ ”چل کر سوتے ہیں۔ رات کے تین بج رہے ہیں اور ہم دونوں نجانے کیا کچھ بولنے جا رہے ہیں۔“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنس کر کھڑا ہو گیا تھا۔ زینب بھی اس کی تھلید میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہر چند کہ احسن کی باتیں سن کر اس کا دل کچھ ہلکا ہوا تھا پھر بھی اس نے کچھ کہنا مناسب نہ جانا۔ فی الحال وہ اس سے کچھ بھی کہنا سننا نہ چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ احسن کو اس کے تکلیف دہ رویے کا مزید احساس ہو۔ وہ مزید شرمندہ ہو۔ وہ اتنی آسانی سے اسے معاف کرنے پر تیار نہ تھی۔ بلکہ اس کا دل ہی آمادہ نہ ہوتا تھا۔

احسن نے پھر اس سے مزید کچھ نہ کہا۔ وہ اپنے دل کی بات کہہ چکا تھا۔ سو ہلکا ہلکا ہو کر سو گیا۔ لیکن زینب کی نیند جواڑی تو پھر نہ لوٹی۔ ”میرا دل سلیٹ نہیں ہے احسن کے کچھ بھی لکھ کر مٹالیں آپ۔“ اس نے احسن کی پشت دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ ”میرا جی جلانے کا تہیہ تو آپ نے نجانے کب سے کیا ہوا تھا اس حادثے کو ذمہ دار کیوں ٹھہراتے ہیں۔ آپ نے عشق کا دعویٰ کیا ہے نا تو پورا بھی کر کے دکھائیں۔ زینب شاہ کا وجود اس قدر ازراں نہ تھا جسے ایک وعدے کی زنجیر میں باندھ کر لے آئے تھے آپ..... دور تھی تو چاند کی مانند تھی، دسترس میں آئی تو عامیانہ تحریر

شہری۔ ہائے الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیدہ اب مجھے آپ کے لبوں سے نکلا کوئی لفظ سنائی نہیں دیتا، میں بہری ہو چکی ہوں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ باہر کسی درخت پر کول کو کی تھی۔ اسے رات کے بیت جانے کا احساس ہوا۔ کروت بدل کر اس نے آہستہ سے آنکھیں موند لی تھیں۔



وہ بہت دنوں کے بعد آمنہ کے گھر آئی تھی۔ اس بات کا احساس اسے آمنہ کے بیٹے کو دیکھ کر ہوا۔ وہ اب بیٹھنے لگا تھا اور بہت صحت مند ہو رہا تھا۔ خود آمنہ کا وجود بھی اس کی دلی خوشی کی گواہی دے رہا تھا۔ اس کا رنگ صاف ہو رہا تھا اور گالوں پر سرخی تھی۔ وہ زنب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

”میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔ بہت زیادہ یقین جانو، تم مسلسل میرے خوابوں میں آ رہی تھیں۔“

”پھر بھی تم نے آنے کی زحمت نہیں کی۔“ زنب نے اسے مصنوعی خشکی سے گھورا ”یہی سوچ لیا ہوتا کہ میں کسی مشکل میں تو مبتلا نہیں ہو گئی جو بار بار مدد مانگتے تمہارے خوابوں میں آ رہی ہوں۔“

”خدا نہ کرے۔“ آمنہ نے اسے جھڑکا ”میں تو ہمیشہ تمہارے متعلق اچھا لگام رکھتی ہوں اور خدا سے تمہاری بہتری کی دعا بھی مانگتی ہوں۔“

زنب مسکرا کر اس کے بیٹے کو پیار کرنے لگی۔

”یہ پیارا ہو رہا ہے آمنہ! اس کی کچھ نظر و طرا تارا کرو۔“

آمنہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”میں تمہارے لیے بھی بہت دعا کرتی ہوں کہ خدا زنب کو چاندی بیٹی دے بالکل زنب جیسی پھر میں اسے احمد کے لیے مانگ لوں گی۔“

بے حد دعا میں بات تھی اور آمنہ نے یقیناً مذاق میں کہی تھی۔ لیکن زنب کا دل بے اختیار ”خدا نہ کرے“ بولا تھا اس نے لاشعوری طور پر ایک نگاہ آمنہ کے گھر پر ڈالی تھی۔ اگر اس کی کوئی بیٹی ہوتی بھی تو وہ اسے ایسے گھر میں بیٹھنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔

توبہ..... توبہ۔ اسے۔ جبر جبری الگ۔ میری بیٹی اور بیاہ کر ایسے گھر میں آئے، میں سر نہ جاؤں وہ دن دیکھنے سے پہلے ہی۔

”اچھا یہ بتاؤ چائے پیو گی یا ٹھنڈا..... کھانا کچھ دیر بعد کھائیں گے.....“ آمنہ اس کی کیفیات سے بے خبر بول رہی تھی۔ ”اماں عمرہ ادا کرنے گئی ہیں، مصروفیت دو چند ہو گئی ہے اس لئے روٹی ہانڈی سے تو میں سویرے سویرے فارغ ہو لیتی ہوں۔ پھر تمام دن کتنا ہی کام ہو، کھانے کی فکر نہیں ہوتی۔ کھانا اگر تیار نہ ہو تو میری روح جیسے سولی پر ہی تنگی رہتی ہے۔ لگتا ہے گھر کے سارے کام ادھورے پڑے ہیں..... ارے! تم کیا سوچنے لگی ہو؟“

اس نے زنب کو بھوکا دیا تو وہ چونک اٹھی۔

”میں نے پوچھا ہے چائے پیو گی؟“

”آں..... ہاں۔ چائے تو ضرور پیوں گی۔“ وہ اپنے خیالات کے حلقے سے باہر نکلی۔ ”احسن ناشتہ کر رہے تھے۔ جب میں نے ان سے

کہا کہ آمنہ سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے۔ وہ بولے، فوراً کپڑے بدل لو میں جاتے جاتے چھوڑ دیتا ہوں۔ نہار منہ بی چلی آئی ہوں۔“

”اچھا!“ آمنہ نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ”تو کہا تو ہوتا زنب! میں جب سے بیٹھی کا تیں کئے جا رہی ہوں۔ اچھا تم احمد سے کھیلو، میں تمہارے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ احمد آرام سے بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ زنب نے ایک آدھ بار اسے جنگی بجا کر متوجہ کیا، مسکرا کر دیکھا لیکن اس نے زنب کی موجودگی کا کچھ خاطر خواہ نوٹس نہ لیا۔ وہ اپنا جھنجھنا زور زور سے بجا رہا تھا اور اسی میں اس کا تمام لطف پنہاں تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھتی رہی، لیکن آمنہ کے کمرے میں دیکھنے والی کوئی شے تھی ہی نہیں۔ زیادہ تر مختلف جگہوں پر بچوں کا سامان رکھا نظر آتا تھا۔ کنری کی کتابیں، احمد کی دوایاں، احمد کے کپڑوں کی ٹوکری۔ وہ بور ہو کر باہر نکل آئی۔ آمنہ کچن میں تھی۔

”ارے تم اندر بیٹھتیں۔“ اس نے زینب کو دیکھ کر کہا۔ ”یہاں کچن میں گرمی بہت ہوتی ہے۔ دھوپ کا رخ سارا دن اسی طرف رہتا ہے۔ آگ بگولہ سارہ بتا ہے میرا کچن۔“

وہ تیزی سے سلاکس توے پر سینک کر خستہ کر رہی تھی۔ دوسرے چولہے پر چائے دم پر رکھی ہوئی تھی۔ زینب نے محسوس کیا وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ باورچی خانے کی تیش باہر تک محسوس ہو رہی تھی۔

”اف آمنہ! اتنی گرمی میں کیسے کھڑی رہ لیتی ہو۔ یہاں۔ بندہ بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے تبصرہ کیا۔

”ٹھیک کہتی ہوں!“ آمنہ مسکرائی۔ ”شروع شروع میں میں بے حد گھبرا گئی تھی۔ رمضان میں تو جیسے دانتوں تلے پسینہ آ جاتا ہے۔ میں واقعی دوسرے بے ہوش ہو گئی تھی۔“

”پھر؟“ زینب کی آنکھیں پھیلیں۔

”بس! پھر عادت ہو گئی۔ اب تو اتنا محسوس بھی نہیں ہوتا۔“

”اتنا کام ہوتا ہے گھر کا۔ تم کام کاج کے لئے کوئی عورت کیوں نہیں رکھ لیتیں؟“

آمنہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور متانت سے مسکرا دی۔

”چلو، اندر چلتے ہیں۔ ناشتہ تیار ہے۔ پراٹھا اس لئے نہیں بنایا کہ پھر تمہیں دیر تک بھوک نہیں لگتی۔“

وہ دونوں اندر آئیں تو آمنہ ”ہائے“ کر کے رہ گئی احمد صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے پیشاب کر چکے تھے۔ اس کے سارے کھلونے اور وہ خود بھی گندا ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ بڑے مزے سے بیٹھا جھنجھٹا ہلا رہا تھا۔

”تم بیٹھو زینبی ناشتہ کرو میں آتی ہوں۔“

وہ احمد کو اٹھا کر باہر لے گئی۔ زینب بیڈ پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ آمنہ احمد کو نہلا کر لائی پھر اسے زینب کے پاس چھوڑ کر اس کے کھلونے دھونے کے لئے لے گئی۔

”کتنا مشکل کام ہے۔“ زینب حیرانی سے سوچنے لگی۔ ”یہ ننھا سا وجود اور اس کے لامتناہی کاموں کا سلسلہ عورت تو تک کر بیٹھنا بھول جاتی ہوگی۔“

آمنہ سے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو آمنہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”صرف بیٹھنا ہی نہیں، لیٹنا، سونا، کھانا پینا..... سبھی کچھ ادھار کا لگتا ہے۔ جیسے آرام کسی دوسرے کی شے ہو اور ابھی لوٹنا ناہوا ایسا ہی دھڑکا کاگا رہتا ہے دل کو۔ اپنا وجود اور اسکی ضروریات تو پھر کبھی کبھی یاد آتی ہیں۔“ وہ احمد کو کپڑے پہنا رہی تھی۔

”اچھا میں ذرا اس کا فیڈر بنالادوں۔ بے چارہ کب سے بھوکا ہے۔“ وہ پھر باہر نکل گئی تھی۔ زینب بور ہونے لگی۔ اس نے احمد کو دیکھا۔

”اتنی بڑی ذمہ داری ہے یہ ننھا وجود۔“ اس نے حیرت سے سوچا ”میں کہاں ابھی اس قابل ہوں..... خدا جو کرتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ مصلحت ہوتی ہے۔ میں تو آمنہ جیسا ایسیٹنا ہرگز نہیں رکھتی۔ ابھی گھر کا کام، ابھی شوہر کا، ابھی بچے کا تو ابھی ساس کا۔ اچھا ہی ہوا جو مجھے پھر سے یہ فراغت حاصل ہو گئی..... ورنہ میں بھی آمنہ کی طرح گھن چکر بن جاتی۔ بچے کا تو تین چار سال بعد ہی سوچوں گی اب۔“

وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔



احسن آفس جانے سے قبل جلدی جلدی چائے پی رہا تھا۔ جب اچانک ہی اسے یاد آیا تھا۔

”ادا چھایا دیا؟“ اس نے پیالی ٹیبل پر رکھ کر ہاتھ رومال سے پونچھے۔ ”زینو آج شام فرخندہ آپا کی طرف چلنا ہے کل آفس میں ان کا فون“

آیا تھا۔“

”کیوں؟“ اسے ناگواری محسوس ہوئی تھی۔ ”ان کے ہاں کیوں جانا ہے؟“

”محفل میلاد ہے انہوں نے پر زور اصرار کیا تھا کہ تمہیں ضرور لے کر آؤں۔ تم تیار رہنا میں پانچ بجے تک آ جاؤں گا۔“ وہ مصروف انداز

میں اپنا آفس بیگ چیک کر رہا تھا۔

زینب چند لمحے منہ بنائے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا۔

”سنیں! احسن! میں نہیں جاؤں گی۔“

”کیا؟“ وہ چونکا۔ ”کیا کہہ رہی ہو۔؟“

”میں نہیں جاؤں گی فرخندہ آپا کے ہاں!“ وہ ضدی انداز میں بولی تھی۔

”کیوں؟“ وہ کچھ دیر کے لئے گم صم رہ گیا تھا ”کیا بات ہے؟ انہوں نے بڑے پیار سے بلایا ہے تمہیں۔“

”بس احسن! میرا موڈ نہیں ہے۔“ وہ بات ختم کرنا چاہتی تھی۔

”پلیز زینو! ایسے مت کرو۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”ذرا سے موڈ کی خاطر تم ان کا دل توڑ دو گی، کیا سوچیں گی وہ۔ تھوڑی دیر کو چلی چلنا ہم

جلدی واپس آ جائیں گے۔ میں وعدہ کر چکا ہوں ان سے۔“

”احسن! میں نہیں جانا جانتی تو کیوں اصرار کر رہے ہیں آپ! وہاں نجانے کیسے کیسے سوالات ہوں گے، میں فی الحال کسی الٹے سیدھے

سوال کا سامنا کرنے کے موڈ میں نہیں۔“

وہ گمڑے ہوئے انداز میں بولی تھی۔ احسن اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا۔

”کون کرے گا الٹے سیدھے سوال؟ وہاں فرخندہ آپا کے سوا جانتا ہی کون ہے تمہیں؟ اور پھر یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جس کے لئے دنیا

سے منہ چھپا کر بیٹھ جائیں، ہوتے رہتے ہیں ایسے کیسر بھی۔“

”منہ چھپانے کی بات نہیں ہے۔ بس فی الحال نہیں اور پھر سب ہی تو جانتے ہیں وہاں۔ فرخندہ آپا اچھا خاصا ریڈیو ہیں۔“

احسن لب بھینچ کر رہ گیا۔

”بہر حال مرضی ہے تمہاری۔“ پھر وہ بولا تھا۔ ”شام تک سوچ لو۔ موڈ تبدیل ہو جائے تو رملی کے یہاں سے آفس فون کر دینا۔“

میں جلدی آ جاؤں گا چلتا ہوں۔“

وہ بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ زینب اطمینان سے بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہی اور اس نے تو صرف نہ جانے کا بہانہ گھڑا تھا۔ وہ کہاں کسی کے

سوال جواب سے گھبراتی تھی۔ بس اسے فرخندہ آپا سے ایک ازلی چڑھتی اور وہ ان سے کبھی ملنا نہیں چاہتی تھی۔

”ہونہ، بہت پیار سے کہا ہے۔ جیسے جانتی نہیں میں ان کے پیار کو!“

وہ کچھ دیر تک بیٹھی رہی پھر جیلہ آگئی تو وہ رملی کی طرف چل دی۔

رملی کے دروازے تک پہنچ کر، نیل بھانے سے قبل ہی اس کی نگاہ سکندر علی پر پڑی تھی۔ وہ گاڑی کی چابی انگلی میں گھماتا چلا آ رہا تھا۔ مسٹرڈ

پتلون اور مسٹرڈ لائٹوں والی لائٹ گرین شرٹ میں وہ حقیقتاً بے حد اسارٹ لگ رہا تھا۔ خوبصورت سن گلاسز اس کی شخصیت کے حسن میں اضافہ کا باعث

تھے۔ وہ یقیناً وجہ بہرہ کھلائے جانے کا مستحق شخص تھا۔

زنہب اطلاع گھنٹی بجاتے بجاتے رک گئی۔ وہ کچھ پزل ہو گئی تھی۔ سکندر علی اسے دیکھ کر گرم جوشی سے مسکرایا۔ اسکے ڈارک گلاسز پر زنہب کا عکس آ رہا تھا۔ اس کی گہری مسکراہٹ کے جواب میں ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبوں تک آ کر دم توڑ د گئی۔ وہ خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔

”ہیلو معزز خاتون!“ وہ فریش انداز میں بولا۔

زنہب کو نجانے کیوں لفظ ”معزز“ اپنا مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا۔

”ہیلو۔“ وہ دھیسے سے بولی۔

”ایسے حسین اتفاقات روز سرزد کیوں نہیں ہوتے؟“ وہ بڑے موڈ میں تھا۔

”حسن کی خصوصیت ہی یہی ہے یہ عام نہیں ہوتا۔“ نجانے وہ کیسی کہہ گئی تھی۔

سکندر علی نے سر تھوڑا سا اونچا کر کے ایک تہقہ لگایا۔

”رائٹ یو آر! آپ نہ صرف حسین بلکہ ذہین بھی ہیں۔ آج اندازہ ہوا کہ آپ بولیں تو قیامت ڈھا دیں اسی لئے کم بولتی ہیں۔“

”آپ روز ہی آتے ہیں یہاں؟“ زنہب اس کے ریمارکس کے ذریعہ اثر آگئی۔ خوش دلی سے بولی تھی۔ ”اور کوئی کام نہیں ہے آپ کو۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟ میں روز یہاں کیوں آتا ہوں؟“ وہ اچانک سنجیدہ ہوا تھا۔

زنہب ہلکی پھلکی بات چیت کے سچ اچانک در آنے والی سنجیدگی سے گھبرا اٹھی۔

”آپ کو خبر ہوگی۔“ اس نے رخ موڑ کر تیل بجا دی۔

”کبھی پوچھے گا ہم سے زنہب خاتون!“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”پھر ہم بتائیں گے آپ کو کہ ہم روز یہاں کس کے لئے آتے ہیں۔“

اسی لمحے دروازہ کھل گیا تھا۔ دروازہ خورد ملنی نے کھولا تھا۔ وہ ان دونوں کو ساتھ کھڑا دیکھ کر قہقہہ مچا رہی تھی۔

”ہیلو ملنی یارا اچھی میزبان ہو راستہ دو۔“ سکندر علی اسے ہنساتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

زنہب بھی آگے بڑھی تو ملنی سائیڈ میں ہو گئی۔ وہ کبھی سکندر علی کو تو کبھی زنہب کو دیکھ رہی تھی۔ سکندر علی سیدھا رملنی کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جب کہ زنہب اب تک وہیں کھڑی تھی۔

”تم دونوں.....“ رملنی نگاہوں میں الجھن بھر کر اسے دیکھ رہی تھی۔ ”ساتھ آئے ہو؟ میرا مطلب ہے..... سکندر۔“

”میں دروازے تک پہنچی تو یہ آ گئے۔“ زنہب آہستگی سے بولی تھی۔ ”اور بھلا کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”ہوں!“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

”سکندر!“ پھر رملنی نے وہیں سے آواز لگائی تھی۔ ”کانی بناؤں؟“

”نیکل کرنے سے پہلے پوچھا نہیں کرتے رملنی جان!“ شگفتہ لہجے میں جواب آیا تھا۔ رملنی جھینپ گئی۔

”بہت شرارتی ہے یہ سکندر کا بچہ!“

”یہ تم سے چھوٹے ہیں یا بڑے؟“ زنہب مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”آں؟“ رملنی ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ”بڑا ہے مجھے سے۔“

پھر وہ دھیسے لہجے میں بولی تھی۔

”آؤ کانی بناتے ہیں۔“ وہ کچن کی جانب چل دی تھی۔

زنہب بھی اس کے پیچھے چل دی۔ نجانے کیا بات تھی۔ آج اسے گھر میں سکندر علی کی موجودگی سے خوف محسوس نہ ہو رہا تھا۔ شاید وہ اس کے وجود کو تسلیم کر چکی تھی۔ شاید وہ اسے ایک شاسا لگنے لگا تھا۔

”تم دونوں میں کیا گفتگو ہو رہی تھی؟“ یکا یک رملی نے پوچھا تھا۔

زنوب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں استغباریہ کیفیت تھی۔

”میرا مطلب ہے جب میں نے دروازہ کھولا تو تم لوگ کچھ بات کر رہے تھے۔“ وہ بے حد متحس نظر آرہی تھی۔

”پتا نہیں؟“ زنوب انجان بن گئی۔ ”یونہی دعا سلام ہو رہی تھی اور کیا؟ آں ہاں! میری طبیعت کا پوچھ رہے تھے۔“

”تم پھولوں کا شکر یہ ادا کر دیتیں۔“ رملی مسکرائی۔ نجانے اسے طنز کیا تھا یا واقعی یہ ایک مشورہ تھا یا محض ایک سرسری مذاق! زنوب کو اس کا رویہ کچھ ناقابل فہم سا لگا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر وہ کہتی بھی کیا۔ اب یہ تو کہہ نہیں سکتی تھی۔ کہ پھولوں کا شکر یہ وہ ادا کر چکی ہے۔ اب تو ایک اور چیز کا قرض ہے اس پر۔

”یہ لو۔“ رملی نے کافی کا گلاسے اٹھایا ”میں سکندر کو کافی دے کر آتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ میرا صاحب خود حاضر خدمت ہیں۔“ وہ دروازے میں نمودار ہوا۔ رملی تم تخت قسم کی ٹکی ہو صرف کافی کے تین

کپ تیار کرنے میں تم نے پچیس منٹ لگائے ہیں۔ اگر تمہیں تین آدمیوں کا بیچ تیار کرنا پڑ جائے.....“

”میری توبہ!“ رملی نے اسے گتھاتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ ”خدا نہ کرے جو کبھی مجھ پر ایسا برا وقت آئے۔“

”ہوں ملاتا ہوں کال تمہارے ہسپتال کو بتاتا ہوں، تمہاری ایول رپورٹ پورے سال میں دس بارہ کپس کافی اور تین چار کپس چائے یہی

کو کھک ہے تمہاری۔“

”زنوب سے پوچھو۔“ رملی مسالے دار چہس چباتے ہوئے بولی تھی۔ ”اسے کتنی مرتبہ سوپ بنا کر دیا ہے۔ کتنی مرتبہ کھانا بنایا ہے اس کے

لئے کیوں زین؟ میں ایک بری لک ہوں؟“

”نہیں بری تو نہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ میں تم سے اچھی لک ہوں۔“ زنوب نے مسکرا کر کہا تھا۔

”ہاں تو یار! تم نے کیا ہو گا نا بچپن سے کام لڑکیاں عادی ہو جاتی ہیں۔ میں نے تو کبھی مل کر پانی نہیں پیا بچپن سے بھی پھولوں کی طرح

رکھا اور اب ہسپتال وہ تو پھولوں کے عرق کی طرح رکھ رہا ہے۔“ وہ اپنی بات پر خود ہی بے تاشا بنی تھی۔

میر سکندر علی محض مسکرا دیا تھا۔ جب کہ زنوب مسکرا بھی نہ سکی تھی۔ نجانے کیوں اسے احساس ہوا تھا کہ رملی نے اسے اس کی کلاس کا طعنہ دیا

تھا۔ ہر چند کہ اس کے جملے میں اور اس کے لہجے میں ایسی کوئی بات نہ تھی پھر بھی کچھ ایسا تھا جو زنوب کو برا محسوس ہوا تھا کافی پی کر وہ وہاں سے جلد ہی

چلی آئی تھی۔ سکندر کا وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہ لگتا تھا سو اس نے ہی اپنی ملاقات مختصر کر دی۔ ویسے بھی رملی کے سوال جواب نے اسے مشکوک

کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی سکندر کی موجودگی میں وہاں رک کر وہ اس کے شک کو مزید ہوا دے۔ سو وہ جلد واپس آ گئی تھی۔



ہٹلر

ہٹلر جیسی متنازع شخصیت پر اس کتاب کی تالیف کا مقصد روایتی انداز میں لکھی تاریخ سے ہٹ کر تاریخ میں نئے اور تجزیاتی

(Analytical) زاویے روشناس کروانا اور آج کے قاری کو تاریخ کے موضوع کی وسعت کے بارے میں باور کروانا ہے۔ ہٹلر کی زندگی،

اسکے فلسفہ، قوم پرستی اور ظلم و بربریت جیسے موضوعات پر ایک مفصل کتاب جسکی تالیف میں کئی ایک دیگر کتبوں سے مدد لی گئی ہے۔..... ہٹلر کی

تاریخ آپ کتاب گھر کے تحقیق و تالیف سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

شام کو وہ اس کے فون نہ کرنے کے باوجود جلدی آگیا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ زینب اس کی بات مان کر چلنے پر رضامند ہو جائے گی۔

”ہیلو“ وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں“ وہ ہنسا کر نکلی تھی۔ ”گیلے بال انگلیوں سے سنوارتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔“ چائے بنالائوں؟ یا کھانا کھائیں گے؟“

”فی الحال کچھ نہیں۔“ وہ رست و اوج اتار کر رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے کپڑے نکال دو۔ نہاؤں گا۔ چلنے کا کیا پروگرام ہے؟“

وہ جان کر انجان بن گئی جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ الماری میں سرگھا کر کھڑی ہو گئی۔

”زینو!“ اسے جیسے اس حرکت سے دکھ ہوا تھا۔ ”میں نے کچھ کہا ہے یا؟“

”احسن!“ اس نے دونوں ہنٹ ایک ساتھ بند کئے۔ ”آپ آخر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں؟ اگر فرخندہ آپا کے آج نہ بھی گئے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟“

”یہی تو میں جانتا چاہتا ہوں کہ اگر ہم چلے بھی جائیں تو کیا نقصان ہو جائے گا تمہارا؟“ وہ زچ ہو گیا تھا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں وعدہ کر چکا ہوں وہ کیا خیال کریں گی؟ ہماری ان سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔ جب سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں ایک مرتبہ انہیں پلٹ کر نہیں پوچھا۔ وہ بے چاری ہر مرتبہ خود ہی چلی آتی ہیں، کتنا بڑا ظرف ہے ان کا۔“

زینب کو محسوس ہوا، اس کی شریانوں میں خون کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی تھی۔ پھر وہی فرخندہ آپا کا جھگڑا تھا۔ پھر وہی تذکرہ۔

”تمہیں آخر ان سے ایسی کیا شکایت ہو گئی ہے جو تم ان کی صورت دیکھنے کی روادار نہ رہیں، وہ تو اتنی اچھی خاتون ہیں کہ کسی سے رتی برابر برائی کرنے کا سوچ نہیں سکتیں۔“

”احسن..... احسن پلیز!“ وہ چیخ پڑی۔ ”خدا کا واسطہ ہے آپ کو خاموش ہو جائیں۔ بس بھی کریں آخر ان کی مدح سرائیوں کی کوئی انتہا بھی ہے آپ کے نزدیک یا نہیں؟“

”زینب!“ وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

وہ منہ پھیر کر کمرے سے نکل گئی۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا وہ فرخندہ آپا کا نام احسن کی زبان سے، دل اور دماغ سے کھرچ کر پھینک دے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے احسن محض اسے چڑانے کے لئے یہ ذکر نکالتا ہے۔ محض اسے خفت زدہ کرنے کے لئے فرخندہ آپا کی تعریفوں کے پل باندھتا ہے۔

وہ غصے میں جلتی بجھتی دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ بسز پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔

کچھ دیر بعد اسے اپنے شانے پر ہاتھ کے لُس کا احساس ہوا تھا۔ وہ احسن تھا۔

”زینو! خاموش ہو جاؤ یا بس کرو۔“

وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ نجانے کب سے جمع شدہ آنسو آنکھوں میں بھرے چلے جا رہے تھے۔

”زینب! تم نہیں جانتا چاہتیں نا، نہ سہی۔ یوں اپنی انرجی کیوں ضائع کر رہی ہو۔ دیکھو، اس طرح رونا، جلنا کڑھنا تمہاری صحت کے لئے نہایت نقصان دہ ہے۔ پلیز زینو! تم خوش رہو اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

وہ اسے بے حد زنی سے سمجھا رہا تھا۔

”تم روتی ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے تمہارے ساتھ شادی کر کے میں نے تم سے زیادتی کی ہے۔ میں تمہارے معیار تمہاری توقعات پر پورا نہیں اترتا۔“

”ہاں تو اس میں کیا غلط ہے۔“ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا تھا۔ ”میری کس امید کو پورا کیا ہے۔ کس توقع پر

پورے اترے ہیں۔ آپ وہی روایتی شوہر بن مانی چاہی کرنے والے، میرے ساتھ شادی کر کے زیادتی ہی کی ہے آپ نے۔“
وہ سوچے جارہی تھی۔

”اچھا چلو کہیں اور چلتے ہیں۔ پکر لگا کر آتے ہیں تمہاری طبیعت فریض ہو جائے گی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”نہیں احسن!“ وہ بے دلی سے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میرا سر درد کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے میں جانے سے انکار کر رہی تھی۔ جیلہ سے کہہ کر چائے بنوالیں۔“

وہ گہرا سانس بھر کر کمرے سے نکلا تھا۔

زینب دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں مروڑتے ہوئے نجانے کیا کچھ سوچتی چلی جارہی تھی۔ نجانے آج کل کیوں اسے ہر لمحے اس بات کا پیچھا تارہنے لگا تھا کہ اس نے احسن کی کن باتوں سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر لی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کے دل پر احسن کی محض ایک پرچھائیں سی پڑی تھی جو حقائق کی ذرا سی روشنی پڑنے پر غائب ہو گئی تھی۔ اس کے دل کا آئینہ پہلے کی طرح خالی پڑا تھا۔
یوں ہی بیٹھے بیٹھے اسے میر سکندر علی کا خیال آیا اس روز وہ رملی کے یہاں ملا تھا..... کیسا شاندار لگ رہا تھا! ہر ادا سے جھلکتی امارت..... ہر ہر نظر سے جھلکتی محبت۔

وہ گہرا سانس بھر کر گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ یہ اسے کیا ہو رہا تھا..... خیالات گھنے دھنوں کی مانند ذہن میں بگولوں کی طرح گھوم رہے تھے، اس کا دل بغاوت پر آمادہ کیوں ہو رہا تھا۔

”ہائے! مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ”میں کیا کروں۔“

وہ کمرے کے پیچوں بچ کھڑی پھر سے رو رہی تھی۔



فارحہ کا خط آیا تھا۔ کتنے دنوں کے بعد زینب لفافہ پا کر خوشی سے جھوم ہی اٹھی۔ دنور شوق سے اس نے لفافے کو چوم لیا تھا۔
”میری اچھی دوست! کہاں غائب ہو گئی تھیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کرنے لگی لکھا تھا۔
”بیاری زینب!“

ہمیشہ خوش رہو۔

”امید کرتی ہوں کہ تمہارے دن بہت خوب صورت بہت پر مسرت گزر رہے ہوں گے۔ تم سوچتی ہو گی کہ شاید فارحہ تمہیں بھول گئی۔ اجنبی دیس کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر اپنے ماضی کی ہر بات فراموش کر گئی۔ نہیں میری دوست! ایسا کچھ نہیں۔ میں اجنبی دیس کی نہیں اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں کچھ عرصہ بھٹک کر باہر نکلی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں وہی پہلے والی فارحہ ہوں۔ یہ درمیان کے کچھ سال جیسے آئے بغیر ہی گزر گئے ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے تو یہ عالم ہے کہ میں ہر وقت، ہر لمحہ اپنے گھر، اپنے محلے، اور اپنے کالج کی سڑکوں پر پھرتی رہتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں انگلینڈ میں نہیں پاکستان میں ہوں۔ ایسے میں کوئی مجھے چونکا دے تو کتنی ہی دیر مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں درحقیقت کہاں ہوں۔

اسی صورتحال سے گھبرا کر سوچتی ہوں، کچھ عرصے کے لئے واپس پاکستان چلی آؤں۔ اپنا ملک، اپنی سرزمین اور اپنے لوگ دیکھنے کے لئے میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔

خاص کرتے مجھے بہت یاد آتی ہو۔ تم سے ملنے اور تادیر گفتگو کرنے کو جی چلتا ہے لیکن ہر بات بندے کے بس میں کہاں ہوتی ہے، تقدیر نے اگلی ملاقات کہاں، کس موڑ پر لکھی ہے، کسے خبر ہے! اور تم کیسی ہو؟ میرا بھانجا یا بھانجی یا جڑواں کیسے ہیں؟ تم ایسی بے مروت ہو مجھے خط لکھ کر خبر تک

نہیں دی۔ کم از کم اس کی کوئی تصویر ہی بھیج دو اور تمہارے عاشق صادق کیسے ہیں؟ کیا بدستور عشق کی جولانیاں اسی عروج پر ہیں؟ کبھی سوچتی ہوں زینب تو خیال آتا ہے تم کس قدر خوش قسمت ہو۔ خدا نے تمہیں حسن، محبت، قدر، سکون، اطمینان سبھی نعمتیں کتنی وافر مقدار میں نوازی ہیں۔ یہ سب نصیب کے کھیل ہوتے ہیں۔ میری تو یہی دعا ہے کہ خدا تمہیں اور خوشیوں سے نوازے۔

”تم بھی میرے لئے دعا کرنا کہ اللہ مجھے سکون دے۔ اطمینان قلب عطا فرمائے۔ ہو سکے تو جواب دینا۔

تمہاری دوست فارحہ۔

خط پڑھ کر وہ کتنی ہی دیر تک ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ فارحہ کی تحریر میں نجائے کسی خلش تھی جو سطر سطر سے جھانک رہی تھی۔ کیسی چہین تھی جو دل تک محسوس ہوتی تھی۔

”کیا فارحہ خوش نہیں ہے؟“ اس نے سوچا

اس کے پچھلے خط سے بھی زینب نے یہی اندازہ لگایا تھا اور اس بار پھر وہ ایک عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو چکی تھی۔

”کیا کیا ہے فارحہ کی زندگی میں؟“ اس نے سوچا۔ ”چاہنے والا جیون ساتھی، دولت کی فراوانی، سرال کے جھگڑوں سے مکمل آزادی، نئی دنیا کا چارم پھر بھی پھر بھی اسے میری قسمت پر رشک آتا ہے؟ ایسا ہے کیا میرے پاس جس پر کوئی رشک کر سکے سچ ہے۔ دور کے ڈھول سہانے ہی لگتے ہیں۔“

گہرا سانس بھر کر اس نے خط ایک طرف ڈال دیا۔

کچھ دن اسی طرح بے دلی کے عالم میں گزر گئے تھے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح کرنے کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی کام نہ تھا۔

اس روز وہ ذرا دیر تک سوئی تھی۔ اٹھ کر کمرے سے نکلی تو شام کے چھن رہے تھے۔

”بی بی جی! چائے لاؤں۔“ جیلہ فارغ بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ہوں! اچھی ہی!“ وہ وہیں بیٹھ گئی۔

نیل جی تو وہ کتنی ہی دیر کشمندی کے عالم میں بیٹھی انتظار کرتی رہی کہ شاید جیلہ دروازہ کھول دے لیکن جیلہ کا ایسا کوئی ارادہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ کچن سے بدستور اس کے گنگنائے کی آواز آرہی تھی۔

زینب سستی سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

”ارے آپ!“ احسن کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ”آج تو بڑی جلدی آگے ہیں۔“

پھر مزید حیرت اسے احسن کے ہاتھ میں پھولوں کا بکے دیکھ کر ہوئی۔

”خیر تو ہے!“

”پہلی برتھ ڈے ٹویو۔“ وہ اس پر جھک کر مسکرایا تھا۔

”اوہ!“ وہ جھینپ کر پیچھے ہوئی۔ ”کیا واقعی؟ ارے ہاں! مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔“

”تب ہی یوں سو گواروں کا ساحلیہ بنائے بیٹھی ہو۔ چلو، نہاؤ فٹنٹ اچھا سا میک اپ کرو۔ پیاری سی شکل نکالو پھر کہیں گھومنے چلتے ہیں۔“ اس نے پھول اسے تھمائے۔

”پہلے یہ بتائیں میرا گفٹ کہاں ہے؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑنے والے انداز میں بولی تھی۔ ”بس یہ پھول؟“

”میں خود سارے کا سارا تمہارا گفٹ ہوں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا آگے کو جھکا تھا۔ ”جی نہیں یہ گفٹ بہت پرانا ہو چکا ہے ہر سال

یہی ایک گفٹ پیش کر دیتے ہیں۔ اس مرتبہ مجھے کچھ بہتر گفٹ چاہیے۔“

احسن ہنس پڑا۔

”کچھ شرم کرو۔ شوہر نامدار کے متعلق یہ خیالات؟ اچھا اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ وہی کپڑے پہننا جو میں تمہارے لئے لاہور سے لایا تھا۔ ساتھ موتیوں کا سیٹ۔“

”جو حکم سرکار!“ وہ ناز سے کہہ کر کمرے میں گھس گئی۔

آج کتنے لمبے عرصے بعد ایلیہ جات آئے تھے۔ زینب خوش تھی۔ دل و دماغ پر چھائے رخ و الم کے بادل جیسے یکدم ہی چھٹ گئے تھے۔ محبت کی چمکی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بلیک اور میرون کا سنی نیشن کا چنری سوٹ اس پر خوب سجا تھا۔ ساتھ ہم رنگ کھسے پیردوں کی شان بڑھا رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکلی تو احسن چند لمحوں کے لئے اس پر سے نگاہ نہ ہٹا سکا۔

”پلیس جناب!“ وہ اترائی۔

وہ مسکرایا اور گہری سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔ اس روز دونوں نے خوب انجوائے کیا تھا۔ شہر بھر کی سیر کے بعد ایک بہترین ریسٹورانٹ سے کھانا کھا کر وہ رات گئے لوٹے تھے۔ رملی کے دروازے کے آگے سے گزرتے ہوئے زینب نے دیکھا۔ سکندر علی کی لمبی چمکی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ رملی کے یہاں موجود تھا۔

”احسن!“ دونوں اپنے دروازے کے آگے اترے تو وہ بولی تھی۔ ”کتنا مزہ آتا ہمارے پاس بھی گاڑی ہوتی۔ بڑی شاندار سی۔ اس میں بیٹھ کر جہاں سے گزرتے لوگ رشک بھری نظروں سے ہمیں نکا کرتے۔“

”ہمیں یا ہماری گاڑی کو؟“ وہ دروازہ ان لاک کرتے ہوئے مسکرایا۔

”ایک ہی بات ہے۔ شاندار سی گاڑی ہوتی تو رشک تو ہم پر ہی کیا جاتا تھا۔“ اس نے منہ بنایا۔

”جیسی سکندر صاحب کی ہے؟ رملی کے برادر محترم کی؟“ وہ قدرے طنز سے بولا تھا۔

زینب دھک رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ احسن ایسی بات کرے گا۔ اسے یہ بھی گمان نہ تھا کہ احسن نے رملی کے دروازے کے سامنے کھڑی گاڑی پر اتنا غور کیا ہوگا۔

”ہاں۔“ وہ قدرے لاپرواہی سے بولی تھی۔ ”آدمی وہ کیسا ہی کسی گاڑی البتہ زبردست ہے۔“

”میں کپڑے بدل لوں۔“ وہ ہاتھ روم میں گھس گیا تھا۔

وہ مچالاب دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔



وہ رملی کے گھر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ جب جیلہ چلی آئی تھی۔

”بی بی! وہ احسن صاحب بلارہے ہیں۔“

”احسن؟“ اسے بے تحاشا حیرت ہوئی۔ ”خیر تو ہے؟ احسن اتنی جلدی کیسے چلے آئے؟“

پھر اس نے کھڑی کی جانب دیکھا۔ صبح کے سوا گیارہ بجے تھے۔ ابھی کچھ دیر قبل تو وہ انہی تھی۔ ناشتہ کر کے رملی..... کی طرف چلی آئی تھی۔ پیچھے سے احسن کا بلاوا آ گیا۔

”پتا نہیں جی شاید کچھ لینے آئے ہیں۔“ جیلہ نے لالعلی کا اظہار کیا۔

”اچھا چلو چلتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہے زین! میں نے چائے کا پانی رکھا ہوا ہے۔“ رملی نے منہ بتایا تھا۔ ”پھر آؤ گی نا؟“

”دیکھتی ہوں۔ پتا نہیں احسن کو کیا کام پڑ گیا۔“

وہ سوچتی ہوئی اسکے گھر سے نکلی تھی۔

گھر میں داخل ہوئی تو احسن کہیں نظر نہ آیا۔

”احسن..... احسن۔“ وہ سے الماری میں سرگھسائے کھڑا ملا۔ ”یہ لا کر کی چابی کہاں ہے؟“

”لا کر کی چابی؟“ اس نے ایک لمبے کے لئے سوچا پھر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

اسے یاد آیا تھا۔ لاکٹ کو لا کر میں چھپا کر اس نے چابی میٹر لیس کے نیچے رکھ دی تھی۔ اتنے دنوں میں وہ یہ بات جیسے فراموش ہی کر چکی

تھی۔

”ہاں، ہاں بولو نا مجھے جلدی ہے یا۔..... بارہ بجے تک دفتر واپس پہنچنا ہے۔ میرا ایک دوست انتظار کر رہا ہے۔“

”لیکن لا کر سے آپ کو کیا کام ہے؟“ وہ مری مری آواز میں بولی تھی۔

”تم چابی تو لاؤ۔“ وہ قدرے جھنجھلا گیا۔

زینب نے بادل نحو استہ اسے چابی نکال کر تھادی۔

”ایک دوست کو پیسوں کی اشد ضرورت پڑ گئی ہے۔“ وہ لا کر کھولتے ہوئے بتانے لگا۔ ”میں نے سوچا فرخندہ آپا کی رقم اب تک پڑی

ہے، اچھا ہے جب تک کوئی ضرورت منداپنی ضرورت پوری کر لے کہاں ہیں پیسے؟“ وہ اندر جھانک کر بولا۔ پھر اس نے زیوروں والا ڈبا نکال لیا تھا۔

زینب کی روح جیسے کسی نے جسم سے کھینچ لی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے ساکت ہی رہ گئی۔ اسے یاد آیا تھا۔ رقم واقعی اسی ڈبے میں تھی۔

احسن نے ڈبا کھول کر دیکھا اور رقم نکال کر جیب میں رکھ لی۔ پھر وہ ڈبا بند کرنے لگا۔

”ارے۔“ وہ یکا یک ٹھٹھا کا تھا۔ ”یہ..... یہ کس کا ہے؟“

وہی ہوا تھا جس سے وہ ڈر رہی تھی۔ ہیرے کا وہ خوب صورت لاکٹ اس کی انگلیوں کے درمیان جھول رہا تھا اور وہ استغنامیہ نگاہوں

سے زینب کی جانب دیکھ رہا تھا۔



چند لمحوں کے لیے وہ بری طرح شٹلہ کر رہ گئی تھی۔ فوری طور پر قطعی کوئی فیصلہ نہ کر پائی کہ اسے کیا کہنا ہے اور صورتحال سے کس طرح بچنا

ہے۔

احسن اس کی طرف سے دھیان بٹا کر لاکٹ کو نوٹوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ نہ پایا۔

”بہت قیمتی ہے!“ پھر وہ ستائشی لہجے میں بولا تھا۔

”کس کا ہے زینب؟“

اس کے سوال نے زینب کی مشکل کو آسان بنا دیا۔

”رملی کا!“ وہ جھٹ بول پڑی۔ ”اس روز وہ اتار کر مجھے دکھا رہی تھی پھر ڈریسنگ ٹیبل پر ہی بھول گئی..... میں نے اٹھا کر لا کر اس میں رکھ

”دیا۔“

اس نے آگے بڑھ کر وہ لاکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ احسن کی تعریف نے اس کی آتش شوق کو کچھ اور بھڑکا دیا تھا، وہ اسے پہن کر احسن کو دکھانے لگی۔

”دیکھیں..... کیا لگتا ہے؟“ وہ اترا کر پوری گھوم گئی۔

احسن زیر لب مسکرا دیا تھا۔

”تمہاری طبیعت کا بچپنا کب جائے گا زینو؟“ پھر وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔ ”کچھ اندازہ ہے تمہیں اس کی قیمت کا؟ بلکہ یوں کہا جائے کہ تم اس کی قیمت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ تم نے پرانی چیز کو اٹھا کر اپنے لاکر میں رکھ لیا۔ خدا خواستہ کہیں ادھر ادھر ہو جائے تو کون ذمے دار ہوگا۔ فی الفور واپس کر دو رملی کو..... ابھی کر کے آؤ!“

زینب بات کے یوں بن جانے پر اب قدرے مطمئن تھی۔ اس کے دل کا خوف تقریباً زائل ہو چکا تھا۔ وہ آرام سے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اب تو میں یہ لاکٹ کچھ دن بعد ہی واپس کروں گی اسے۔“

”کیوں؟“ لاکر بند کرنا حسرت کا چوٹک اٹھا۔

”خیریت؟ اس نے تمہارا کچھ ادھار وغیرہ چکنا ہے۔ کیا؟“

وہ ہنس پڑی۔

”میں نے اس سے کہا ہے کہ یہ لاکٹ کچھ دن میں پہنوں گی۔ مجھے بہت شوق ہے اصلی ڈائننگ پیسنے کا۔ اور رملی تو ایسی باتوں کا بالکل مائنڈ نہیں کرتی۔ اس کے پاس تو بہت قیمتی قیمتی چیزیں پونہمی پڑی رہتی ہیں۔“

”کہاوت ہے کہ پرایا گھنا پہن کر عورت اپنا روپ بھی کھودیتی ہے۔“ وہ گہری سانس بھر کر اس کے قریب چلا آیا۔ ”اور رملی مائنڈ کرے یا نہ کرے میں بہر حال مائنڈ کروں گا۔ میں تمہیں اتنی قیمتی چیزیں خرید کر نہیں دے سکتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم دوسروں سے ادھار مانگ کر پہنتی پھر دو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“

”کیسا لگ رہا ہے میرے گلے میں؟“ وہ اس کی ہر بات کو نظر انداز کر کے مسکرا کر پوچھنے لگی۔

احسن نے نگاہ اس کی صراحی دار، حسین گردن پر ڈالی اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”بہت اچھا لگ رہا ہے خدا سے دعا کرو، وہ ہمیں بھی نوازے اور جب تک صبر شکر کی توفیق عطا فرمائے، جاؤ۔ اسے واپس کر آؤ، شاہاں!“ وہ اس کا گل تھپتھا کر باہر نکل گیا۔ زینب ایک بار پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہ اس قدر آسانی سے احسن کو بے وقوف بنا سکتی ہے۔ اب اس کے دل میں کوئی خوف باقی نہ رہا تھا اور احسن کی باتوں سے تو وہ قطعاً متاثر نہ ہوئی تھی۔ اب وہ کافی دن تک اس لاکٹ کو پہنے رہنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

”اور رملی سے کہوں گی کہ مجھے میرے شوہر نے گفت کیا ہے میری ساگرہ پر!“ اپنی اس چالاکی پر وہ خود ہی خوش ہو کر مسکرا دی تھی۔



شام کو وہ نہادھو کر تیار ہو گئی تھی۔ بہت دنوں کے بعد اس کا کہیں باہر جانے کا موڈ بنا تھا اور نہ اب تو اس نے احسن سے کوئی فرمائش کرنا تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔

جیلہ کو چھٹی دے کر وہ کچن میں چلی آئی۔ چائے کا پانی رکھ کر دوسرے چولہے پر کباب تلنے لگی۔ ہولے ہولے گنگنا تے ہوئے وہ بے حد فریش موڈ میں شام کی چائے کی تیاری کر رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ احسن کے آنے کا غام ہو چکا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم۔“ باہر کھڑے احسن کو دیکھ کر اس نے سر جھکا کر سلام کیا تھا۔
جواب دینے سے قبل ہی اس کی نگاہ اس کے گلے پر پڑی۔ اس کی پیشانی پر پتل پڑ گئے۔
”وعلیکم السلام!“ وہ اندر چلا آیا۔ ”یاب تک تمہارے گلے میں جھول رہا ہے؟“
آفس بیک میز پر رکھ کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔
”چائے لاؤں؟ کباب بھی تلے ہیں ساتھ!“ وہ اس کا تلخ سوال نظر انداز کر کے خوش دلی سے پوچھنے لگی۔
”ہوں۔ میں ذرا نہا ہوں!“ واضح طور پر اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

مزید کچھ بھی کہے بنا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ عموماً وہ آفس سے واپسی پر بڑے خوشگوار موڈ میں ہوا کرتا تھا۔ مزاج کے خلاف باتوں کو بھی مسکرا کر نظر انداز کر دیتا تھا۔ لیکن آج بجائے کیوں اس کا منہ بن گیا تھا۔
نہ ب چند لمحوں کے لیے سوچتی رہی پھر اس نے کندھے اچکا دیئے۔ جھوٹ تو اس نے بولا تھا لیکن اب وہ حقیقتاً تو وہ لاکٹ رملٹی کو واپس نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کچھ روز بہن کر پھر کہیں چھپا دے گی۔ لیکن احسن تو بری طرح سے اس کے درپے ہوا تھا۔
وہ نہا کر نکلا تو وہ چائے کی ٹرے اٹھا کر لے آئی۔ وہ ٹی وی آن کر کے صوفے پر دراز ہو گیا۔
”کباب لے لیں نا۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے!“ وہ اسے رام کرنے کی کوششیں کرنے لگی۔
”چائے نکال دو بس!“ وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوا۔
”میں نے آپ کے لیے ہی تو بنائے تھے۔“
”تمہیں کیوں میری اتنی پروا ہوئی؟“ وہ ناراضی سے بولا۔
”کیا مطلب؟“ اس نے پلیٹ واپس میز پر رکھ دی۔ ”مجھے آپ کی پروا کیوں نہیں ہے؟ کس بات پر یوں منہ بگاڑ کر بیٹھے ہیں؟ اچھا خاصا ماحول خراب کر رہے ہیں!“
وہ خود بھی منہ پھیلا کر بیٹھ گئی۔

چنگیز خان

چنگیز کی زندگی اور فتوحات تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے پڑھے بغیر تاریخ کا سفر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کا شمار انسانی تاریخ کے عظیم فاتحین میں سے ہوتا ہے۔ گو اس کا تعلق وحشی قبائل سے تھا لیکن وہ ایک ممتاز درجے کا وحشی تھا۔ وہ صرف تلوار کی زبان ہی نہ جانتا تھا بلکہ از روئے ضرورت ٹریک ٹوڈ پلوشی بھی بروئے کار لاتا۔ 1219 سے 1225 تک کے درمیانی عرصے میں چنگیز نے ترکستان کے راستے ایران اور افغانستان، دوسری طرف پامیر کی پہاڑی چوٹیوں سے سندھ کے کناروں تک آذربائیجان، کاکس اور جنوبی روس کے علاقے کی مہمات سر کیں۔..... چنگیز خان کی تاریخ آپ کتاب گھر کے تحقیق و تالیف سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

احسن نے ذرا خشکی سے اس کی جانب دیکھا۔

”میں تمہارا شوہر ہوں نہ نب! میرا کتنا حق بنتا ہے تم پر تمہیں شاید اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ میری کسی تنبیہ کو کسی حکم کو تم خاطر میں ہی نہیں لاتیں۔“

”حکم؟“ وہ ہنس دی۔ ”ایسا کون سا حکم نامہ جاری کیا تھا آپ نے جسے میں نے پھاڑ کر پھینک دیا، حاکم صاحب! ایک یہ لاکٹ واپس کر نے کو کہا تھا تو میں آج رملی کی طرف جانے لگی۔ ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی؟ مجھے ہر وقت سرزنش کرتے رہتے ہیں اور خود راسی رائی کا پہاڑ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کہا جو ہے کر دوں گی واپس۔ آپ تو یوں فکر مند ہیں جیسے یہ میرا گلای کاٹ دے گا۔“

”جانہ سکیں!“ وہ بڑبڑایا۔ ”ویسے تو دن بھر میں دس چکر لگ جاتے ہیں۔ آج اسے واپس کرنے کو کہا تو تم جانہ سکیں۔ کم از کم اتار کر رہی رکھ دو۔ یوں اپنے پھر رہی ہو جیسے تمہاری ملکیت ہو جانتی ہو، یہ اس کے شوہر نے اسے لا کر دیا ہو گا تم اپنے گلے کی زینت بنا کر..... کتنا برا محسوس ہو رہا ہے مجھے۔ تمہیں اندازہ ہو جائے تو ابھی اسے اتار پھینک دو۔“

”ایسے ہی پھینک دوں، خواہ مخواہ!“ وہ بڑبڑائی ”عجیب منطقیں بھاڑتے ہیں۔ مت اتنا سیریس لیا کریں ہر بات کو۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں فساد کا باعث بن جاتی ہیں۔ ہر وقت مجھ سے نلڑا کریں احسن اتنا استغناء نہیں ہے مجھ میں۔“

احسن ریورٹ ایک طرف پھینک کر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ وہ چند لمحے بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ پھر غصے سے انھی اور ٹرے اٹھا کر کچن میں چلی آئی۔

”ہونہ! سمجھتے کیا ہیں خود کو۔ ٹھیک ہے! ضد ہے تو ضد سہی! میں بھی دیکھتی ہوں کب تک اس بات پر بگڑتے ہیں۔ اب مہینہ بھر نہیں اتاروں گی اسے۔“

اس نے مصمم ارادہ کر کے لاکٹ منشی میں بھرا تھا۔



پھر شام ڈھلنے لگی تھی جب وہ سو کر اٹھا تھا۔ نہ نب کچن میں تھی۔ رات کے کھانے کے لیے روٹیاں پکا رہی تھی۔ احسن نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ خاموشی سے روٹیاں پکاتی رہی۔ وہ چپ چاپ کلر کی جانب بڑھ گیا۔

”چائے لا دو!“ پانی پی کر اس نے کہا تھا۔ لہجہ سپاٹ سا تھا۔ نہ ناراضی تھی نہ رضامندی کا اظہار۔

نہ نب نے روٹیاں پکڑے میں پیٹیشیں اور کیتلی میں پڑی شام کی چائے گرم کرنے لگی۔ چائے کا کپ بھر کر اس نے احسن کو تھمایا تو وہ غور سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ وہیں بیٹھ گئی۔

”دیکھ رہا ہوں..... کہ..... تم بہت نرم و نازک سی لگتی ہو۔“

”پھر؟“ وہ اندر سے خوش ہوئی تھی۔

”لیکن کتنی خود سراسر اور ٹیٹی ہو، کسی چٹان کی جیسی!“ وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔

”اپنے بارے میں کیا خیال ہے جناب کا؟“ وہ سلگ ہی گئی تھی۔

”جیسا نظر آتا ہوں ویسا ہی ہوں۔“ وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”خوش فہمی، ہنری خوش فہمی۔ آپ مجھ سے پوچھیں۔ کیسے ہیں تو میں بتاؤں۔“

”ہوں۔“ وہ اسے دیکھنے لگا۔

”بیاضیے ہیں۔ خول پر خول اترتا چلا جاتا ہے اور اصل ہاتھ نہیں آتا۔ میں تو یہ پرتیں اتارنا تار کر تھک گئی ہوں۔“

بڑی بے نیازی سے کہہ کر وہ ٹانگیں ہلانے لگی تھی۔

احسن کچھ دیر تک اس کی بات پر غور کرتا رہا پھر مسکرا دیا۔

”چلو۔ تم بہتری کی امید تو کر سکتی ہو۔ نجانے کون سی پرت اصل نکلے۔ لیکن ایک پتھریلی چٹان سے میں کیا امید رکھوں؟“

زینب ہلن بنی اس کی بات کا مطلب سوچتی رہی۔

”میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔“ وہ چائے کا کپ خالی کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”کھنڈے ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹوں گا۔ دروازہ لاک کر لو۔“

انگلیوں سے بال سنوار کر وہ کپڑے درست کرتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ شام کے گھٹی اپنی تیاری پر کف افسوس ملتی رہ گئی۔



اس روز اتوار تھا۔ وہ دونوں ہی کافی دیر سے اٹھے تھے۔ نہادھو کر وہ ناشتے کے انتظار میں بیٹھا تھا اور زینب جلدی جلدی چیزیں رُے میں رکھ رہی تھی۔ جلد اکچڑ کچڑے دھوئے میں مصروف تھی سو آج یہ ڈیوٹی زینب نے اپنے ذمے لے لی تھی۔

”آپ کہیں جا رہے ہیں؟“ اس کے آگے رُے رکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹا کر سائیڈ میں رکھا اور سلاکس اٹھا کر کھانے لگا۔ ”کچھ کام ہے ہو سکتا ہے دیر بھی ہو جائے۔“

”لیکن آج تو اتوار ہے!“ اس نے احتجاجاً کہا تھا۔

”کم از کم آج کے دن تو فارغ رہا کریں۔ میرا آمنہ سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔“

”تم تیار ہو تیس تو میں چھوڑ دیتا۔“ اس نے ایک نگاہ اس کے گلچے کپڑوں پر ڈالی۔ ”اب اگر تمہاری تیاری کا انتظار کیا تو میں لیٹ ہو جاؤں گا۔ مجھے ایک آدمی سے ضروری ملنا ہے۔“

”نہیں ابھی نہیں۔ میں تو شام کے لیے کہہ رہی ہوں۔ چار بجے تک آ جائیں گے۔ میں تیار ہوں گی۔“

”اوں ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ناممکن۔ شام کچھ دوستوں کے ساتھ پروگرام ہے تم کسی اور دن پر رکھو۔ میں سات آٹھ بجے سے پہلے نہیں آ سکتا۔“

اس نے کپ خالی کر کے رُے میں رکھا اور اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”دروازہ لاک کر لو!“

اس کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر کھڑی دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ کتنی بے دردی سے اس کی

بات کو رد کر گیا تھا۔

”ہے کون میرا اس دنیا میں۔“ ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ جیسا چاہے سلوک روا رکھیں۔ جانتے ہیں نا، کوئی

پوچھنے والا نہیں ہے۔ کاش میرا بھی کوئی اپنا ہوتا۔ کسی سے حال دل کہہ سکتی۔“ وہ کڑھتی ہوئی پکن میں چلی آئی تھی۔

”ہیلو..... کیا ہو رہا ہے؟“

برتنوں کو سیٹ کر سنگ میں جمع کرتی زینب رملی کی آواز پر چونکی تھی۔

”تم اچھا کیا چلی آئیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”بہت دل گھبرا رہا تھا۔“

”خیریت؟“ وہ مسکرائی ہوئی اندر چلی آئی۔ ”دل کیوں گھبرا رہا تھا، چھٹی کا دن ہے، شوہر نامدار تو گھر پر ہوں گے۔“

نہ سب تلخی سے مسکرائی تھی۔

”ایک زمانہ تھا احسن چھٹی کے دن نہ خود کہیں جاتے تھے نہ مجھے جانے دیتے تھے۔“

”اب؟“ اس نے گہرا سانس بھرا۔ ”اب وہ شام کو بھی جلدی آنے پر تیار نہیں ہوتے۔“

”ارے غم نہ کرو میری جان! یہ نسل ہی ایسی ہے۔“ رملی نے اسے پکارا۔ ”سانپ پر غصہ نہیں ہوتے کہ اس نے کیوں ڈسا؟ اس کی فطرت میں ڈسا ہے وہ ضرور ڈے گا۔ کبھی بار بار بیٹھے تو اس پر جھنجھلا نا نہیں چاہیے کہ اس کی فطرت ہے۔ جب ایک مرتبہ دوسرے کی فطرت سے واقفیت ہو جائے تو اس سے سمجھوتا کر لینا چاہیے۔ پھر غصہ نہیں آتا۔ اپنا جی بہلا کر دوسرے کے دن کو تباہی آشنا کرنا ان مردوں کی فطرت ہے۔ یہ اس سے باز نہیں آسکتے۔ ان کی فطرت سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے سمجھیں؟“

نہ سب نے عجیب سی الجھن کے ساتھ اسے دیکھا۔

”چنانچہ کیا کہہ رہی ہو!“ وہ سانس پین دھونے لگی۔ ”چائے پیوگی؟“

”ہاں بالکل۔“ جیسے تمھارے گھر آکر چائے پینا میری فطرت میں لکھا ہے۔ تمہیں مجھ سے پوچھنا نہیں چاہیے۔“

نہ سب کو ہنسی آگئی۔ چائے کا پانی چوبے پر رکھ کر وہ چائے کی پتی کینٹ سے نکال رہی تھی جب یکا یک رملی بولی تھی۔

”سکندر نے تمہیں ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔“

نہ سب جہاں تھی وہیں رک گئی۔ پھر اس نے پلٹ کر بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا؟ کیا کہا تم نے؟ سکندر نے مجھے انوائٹ کیا ہے؟ ڈنر پر؟ کیا کو اس ہے؟“ پھر وہ قدرے خشکی سے بولی۔

نہ سب الجھن سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ رملی بظاہر بڑی بے نیازی سے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی لیکن لگتا تھا۔ اندر سے کوئی کچھ دے رہا ہو۔

اس کا چہرہ بار بار رنگ بدلتا تھا۔

”اس نے مجھے بلایا ہے۔ تمہیں نہیں؟“ وہ پھر بے یقینی سے بولی۔

”مجھے بھی بلایا ہے۔“ وہ کوکھلی سی ہنسی بنی۔

”لیکن درپردہ اس نے یہ سارا اہتمام تمھارے لیے کیا ہے۔ خیر، اس میں حرج بھی کیا ہے۔“

”تمھارے بھائی کا دماغ مجھے اپنے ٹھکانے پر نہیں لگتا۔“ وہ قدرے خشکی سے بولی۔ ”میرا اس کا کیا تعلق جو میں اس کی سالگرہ مناتی

پھر دوں۔ میرا میاں شوٹ کر دے گا مجھے۔“

رملی کے چہرے کے رنگ بحال ہونے لگے تھے۔ وہ مسکرا دی۔

”اور تمہیں مجھ سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ پھر اس نے رملی کو جھانڈا۔ ”وہ بے عقل ہے لیکن تم تو اچھی خاصی سمجھ دار ہو۔ کیا کہنا

چاہیے کیا نہیں، تمہیں اندازہ ہونا چاہیے۔“

”مسووری زمین! دراصل سکندر اتنے یقین بات کر رہا تھا کہ میں..... خیر لیواٹ! لاؤ میرا کپ دو۔ چائے پینے کا دل چاہ رہا ہے۔“

اس نے جہازی سائنگ اٹھا کر لیوں سے لگا لیا۔

نہ سب نے خشکی کا اظہار تو کر لیا تھا لیکن اندر سے وہ بالکل چور ہو رہی تھی۔ سکندر کا رملی سے اس کے بارے میں یوں یقین سے کہنا اسے

چور بنا ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے رملی کو ہر بات کا علم ہو۔ جیسے وہ اسے ابھی طعنہ دے ڈالے گی کہ جب تم اس سے اتنا قہمتی

تخفہ وصول کر سکتی ہو تو اس کی سالگرہ بھی مناسکتی ہو۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آخر تمہارے بھائی کو سوچھی کیا؟“ وہ ایک بار پھر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر بولی تھی۔ ”میرے اس سے ایسے کون سے دوستانہ روابط ہیں جو وہ مجھے انوائٹ کرے۔ یونی ایک آدھ مرتبہ تمہاری نسبت سے ملاقات ہو گئی ہے۔“

”میں اسے خوب سناؤں گی۔“ رملی مسکرائی تھی۔ ”شاید وہ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔“

”اور تم بن بھی گئی ہو۔“

”اچھا میں چلتی ہوں۔“ پھر رملی کپ خالی کر کے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”آج اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ گھر کا کچھ کام کروں گی۔“

”تم جاؤ گی شام کو؟“ وہ یونی سرسری سے انداز میں بولی تھی۔

”آں..... شاید! بلکہ یقیناً۔“ وہ سوچ کر بولی۔

”سکندر کہہ رہا تھا، لینے آئے گا۔ ویسے اگر تم چلنا چاہو تو کچھ حرج بھی نہیں۔ میری طرف سے دعوت سمجھ کر چلو۔“

اب کے وہ بڑے پر غلوس انداز میں کہہ رہی تھی۔

”نہیں، نہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔“ وہ رواداری سے مسکرا دی۔

اچانک ہی رملی کی نگاہ اس کے دوپٹے میں سے جھانکتے لاکٹ پر پڑی۔

”زین!“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا دوپٹہ ہٹا دیا۔

”یہ..... یہ.....“

وہ ہٹکا کر رہ گئی تھی۔ زینب بھی ایک لمحے کو گڑبڑا گئی۔

”آں..... ہاں..... کیا ہوا؟“

”یہ اصلی ہے نا؟“

”احسن لائے تھے..... میری سالگرہ پر۔“ وہ جلدی سے بول پڑی۔

”واؤ۔ بڑے امیر ہیں تمہارے احسن صاحب!“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ ”بڑے قیمتی تحفے دیتے ہیں بیگم کو۔“

زینب عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ رملی نے گہرا سانس بھرا تھا۔

”چلتی ہوں۔“

”خدا حافظ۔“ وہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئی تھی۔

”آدی ہے کہ الجھن ہے۔“ پھر وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی آئی۔ ”ہرموز پر میرے لیے کوئی مشکل کھڑی کر دیتا ہے۔ میرے لیے ایک معمہ

بنادیتا ہے صورت حال کو.....“

وہ کچن میں گھس گئی تھی۔



شام تک جیلہ بھی چلی گئی۔ وہ اکیلے گھر میں اداسی سے بھرتی رہی۔ نجانے زندگی کو کیا ہو گیا تھا۔ ہر امنگ، ہر خوشی، ہر تنہا جیسے روختی جا رہی تھی۔ ایسے ہی چلتے چلتے وہ ذرا دیر کو ڈرینک ٹیبل کے سامنے جا کر رکی تھی۔ اپنا تھکا ہوا، پڑا ہوا وجود دیکھ کر اس کی مایوسی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ شادی سے پہلے والی زینب شاہ کو کھو جانے لگی۔ تازہ دم اور زندگی سے بھرپور۔ جس کے رخساروں کی تمازت چاند سورج کو ماند کرتی تھی۔ جو ہر دم اجلی اجلی، نکھری نکھری رہتی تھی۔ جسے اپنی آئندہ زندگی سے بہت سی توقعات، بہت سی امیدیں تھیں اور یہ زینب شاہ جو اس وقت آئینے کے سامنے تھی، یہ تو کوئی اور تھی۔ زرد، جھکی ماندہ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور رخساروں پر نمایاں ہوتی کمزوری کی لکیریں۔ اس کا لباس ملگجا ہوا ہاتھ اور بال چٹیا سے نکل کر چہرے اور گردن سے چپکے ہوئے تھے۔

کتنی ہی دیر وہ اپنا عکس دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی۔ کال ٹیل کی آواز نے اسے اس کے خیالات کی دنیا سے کھینچ نکالا۔ دیوار گیر گھڑی پر ایک نگاہ ڈال کر وہ دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

”ہیلو“ باہر ملنی کھڑی تھی۔

سبز رنگ کے قیمتی لباس میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ زمرہ کا سیٹ لباس کا ہم رنگ تھا اور عجب بہادر کھلا رہا تھا۔ سلیقے سے بنائے ہوئے بال اور نفاست سے کیا گیا میک اپ اسے بڑا بادقار بنا گیا تھا۔ وہ اس قدر اچھی لگ رہی تھی کہ زینب کا فی دیر تک اسے دیکھتی ہی رہی۔ اس سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”اندرا سکتی ہوں؟“ بالآخر وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

زینب جھینپ گئی۔ ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ وہ اندر چلی آئی۔

”اکیسی ہو؟ احسن بھائی ابھی تک نہیں آئے؟“

اس نے ایک نگاہ گھر پر دوڑائی تھی۔

”چنانچہ کہاں رہ گئے؟“ زینب نے ایک نگاہ آٹھ بجاتی گھڑی پر ڈالی تھی۔ ”بیٹھو۔ تیاری کہاں کی ہے؟“

”جیسے تمہیں خبر نہیں۔“ اس نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”میں تو تمہیں بھی لینے آئی ہوں۔ بتایا تو تھا نا سکندر کے انوی ٹیشن کا۔“

”ہاں..... لیکن.....“ وہ الجھ گئی۔ ”میں نے تو تمہیں منع کر دیا تھا۔“

”بس تو! عجیب سے انداز میں مسکرائی۔“

”سکندر نے بھی پروگرام کی نسل کر دیا، باہر جانے کا، اب گھر میں ہی کچھ اہتمام کر رہے ہیں تم بھی چلو۔“

”نہیں ملنی!“ وہ بے حد اداس تھی۔ ”تم جاؤ، میری وجہ سے تم لوگ اپنا پروگرام خراب مت کرو۔ میری طبیعت بھی کچھ اچھی نہیں ہے اور احسن بھی گھر پر نہیں ہیں۔“

”احسن گھر پر ہی ہیں.....“ پیچھے سے اچانک ہی آواز بھری تھی۔

وہ دونوں ہی چونک کر مڑیں۔ احسن مسکراتا ہوا اندر آ رہا تھا۔

”کوئی مسئلہ ہے؟“ ان دونوں کو یوں بچ رہے تھے کہ وہ استفسار کرنے لگا۔

زینب گڑبڑا کر رہ گئی جبکہ ملنی نہایت اطمینان سے بولی تھی۔

”مسئلہ کیا ہوتا ہے احسن بھائی۔ میری کچھ فریڈز آئی ہوئی ہیں۔ زینب سے ملنا چاہ رہی تھیں۔ میں اسے لینے آئی ہوں۔ اگر آپ کی

اجازت ہو تو۔“

”نہیں..... نہیں.....“ زینب ہکا کر رہ گئی۔ ملنی کے یوں فراموشی سے جھوٹ بولنے پر وہ حیران رہ گئی تھی۔

”ہاں، ہاں۔ چلی جاؤ۔“ احسن کلانی پر سے گھڑی کا اسٹریپ کھولتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ ”کھانا میں کھا کر آیا ہوں، کچھ دیر آرام کروں گا۔ تم جاؤ، میری طرف سے پوری اجازت ہے۔“ وہ کمرے میں ٹھس گیا۔ زنب نے کچھ فگلی سے رملی کو دیکھا تھا۔ وہ کاندھے اچکا کر مسکرا دی۔

”بائیں ہاتھ کا کھیل ہے چلو بھی اب۔ سکندر انتظار کر رہا ہے۔“ اس نے آواز دھبی کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔
 ”رملی!“ زنب بے طرح خوفزدہ ہو گئی۔ ”آہستہ بولو۔“
 ”چینج کرنا چاہو تو کرلو۔“ رملی نے اس پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔

اسے رملی پر، سکندر، احسن پر، ہر کسی پر غصہ آ رہا تھا بلکہ اسے خود اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ عجیب بے بسی کی کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔ رملی کے ساتھ وہ اس کے گھر پہنچی تو خلاف توقع وہاں کسی قسم کی تقریب کے کوئی آثار نہ تھا۔ میر سکندر رملی کے بیڈ پر اوندھالیا ٹائی دی دیکھ رہا تھا۔

رملی نے اسے مخاطب کیا تھا۔

وہ چونک کر سیدھا ہوا اور اسے رملی کے ہمراہ دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا۔

”ہیلو..... معزز خاناتون!“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”کیسی ہیں آپ؟ ہماری اس چھوٹی سی محفل کو رونق بخشنے پر ہم تہہ دل سے مشکور ہیں آپ کے۔“
 وہ سر جھکائے خاموشی سے گھڑی رہی۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ چلی آئی تھی۔ تک سک سے تیار سکندر رملی اور بڑے قرینے سے سچی سچائی رملی اسے خفت میں مبتلا کرنے لگے۔

”محفل؟“ رملی طنز سے ہنسی تھی۔ ”بہت ہی اعلا پائے کی محفل سچائی ہے آپ نے سکندر صاحب! ایسی ہوتی ہیں محفلیں؟ گلتا ہے مجھے اتنی تیاری کے ساتھ کچن میں ٹھس کر کھانا پکانا پڑے گا۔“

”ارے رملی جان! تم ناراض بہت جلد ہو جاتی ہو۔“ سکندر نے اسے چکارا۔ ”میں نے ڈرائیور کو بھیجا ہے، ابھی آتا ہی ہوگا، ہر طرح کا سامان لے کر خوش ہو جاؤ گی تم۔ شہر کے بہترین ہوٹل سے کھانا منگوایا ہے۔“

”چلو شکر ہے! اتنا احساس تو ہوا تمہیں۔ اچھا پھر میں برتن وغیرہ سیٹ کرتی ہوں ٹیبل پر، تم لوگ جب تک باتیں کرو۔“

وہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ زنب نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔

”تشریف رکھیں!“ سکندر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

”آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے؟“ کچھ دیر بعد وہ آہستگی سے بولی تھی۔

”میں سمجھا نہیں..... کیسا؟“ وہ سامنے پڑے صوفے پر دراز ہوا۔ ”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو سگار پی سکتا ہوں میں؟“

”شوق سے۔“ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سگار سلگانے لگا۔ پھر سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

”آپ نے یہ لاکٹ پہن لیا۔ آپ میری دلی مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ تجھے کی قبولیت کا صحیح انداز یہی ہوتا ہے۔ ویسے آپ کی نازک گردن پر یہ بے حد خوب صورت لگ رہا ہے۔“

زنب گہرا اٹھی۔ اس کے رخسار تپ کر سرخ ہو گئے۔

”ویسے آپ نے وضاحت نہیں کی۔ میری کس حرکت پر سرزنش کرنا چاہتی تھیں آپ؟“ وہ حقیقتاً بڑے دلکش انداز میں بات کر رہا تھا۔ آواز کی گہرائی، لہجے کی میٹھر تاقیقیناً دل پر اثر کرتی تھی۔

زنب نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ صوفے کی پشت پر بازو پھیلانے لگا دھناؤ نے اسے سکون سے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

”آپ کو اس طرح مجھے پیغامات نہیں بھجوانے چائیں۔ میں آپ کی دعوت پر آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاسکتی۔ یہ آپ کو سوچنا چاہیے۔ پھر مجھے یوں یہاں بلا بھیجنا! اچھا نہیں لگتا۔ رملی کیا سوچے گی۔ اگر میرے شوہر کو اس بات کا علم ہو گیا۔ ان باتوں کا انجام بہت خطرناک ہوتا ہے اور مجھے تو آگ سے کھیلنا بالکل پسند نہیں ہے۔“

”ارے!“ وہ ہنس دیا۔ ”آپ اتنی بزدل ہیں؟ ہم تو آپ کو بہت بہادر تصور کیے بیٹھے ہیں اور یہ کیا کہا آپ نے کہ آگ سے کھیلنا آپ کو پسند نہیں۔ پھر ہمارے اندر یہ آگ کیوں بھڑکائی آپ نے؟“ وہ ہنسنے لگا تھا۔ زینب نے غصے سے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے، میں نے آپ سے تحفہ لے کر غلطی کی۔ آپ غالباً اس کا خراج چاہتے ہیں۔“

”ارے..... رے..... رے..... زینب خاتون!“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”بخدا دل میں میل مت لائیے۔ نجانے کیا کچھ بیٹھی ہیں آپ۔ اجی ہم تو دیوی کی پجاریوں کی طرح ہیں۔ نذر پر چڑھا کر دیوی سے اس کا بدلہ مانگنا پجاریوں کا شیوا نہیں ہوتا۔ آپ بدگمان نہ ہوں۔ آپ کہیں تو ہم آپ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ سوئپ دیں۔“

”مجھے ایسا کچھ کہنے یا سوچنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔“ وہ بے بسی سے سر ہلا کر بولی تھی۔

میر سکندر علی مسکرایا۔ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر سگار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر بولا۔

”زینب! آپ کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا، سوا ایک بہانا نکال لیا، ہم سے دیوانوں سے اس سے آگے کی کچھ توقع نہ کریں۔ آپ شدید غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں۔“

”مجھے دیکھنے کو بھلا آپ کا جی کیوں چاہ رہا تھا؟“ اس نے اسے جھپتی نظر سے دیکھا۔

”اس سلسلے میں مجبور ہے یہ دل۔“ وہ دلکشی سے مسکرا دیا۔ ”اس روز آپ نے پوچھا تھا نا..... میں روز یہاں کیوں آتا ہوں؟ آج جواب سن لیجئے۔ آپ کے جلتے بھڑکتے حسن کے آگے تسلیم خم کر کے میرا دل سورج کبھی کا پھول بن گیا ہے۔ بس اتنا گناہ ہے اس دل کا۔ جہاں آپ ہیں یہ اپنا رخ ادھر ہی رکھنا پسند کرتا ہے۔ ہاں! اس سے زیادہ کی اس کی تمنا نہیں۔ نجانے آپ اتنی خفا خفا کیوں ہیں؟“

”میری دنیا میں ان سب باتوں کی گنجائش نہیں ہے سکندر صاحب۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں یہ کہوں گی کہ آپ ناحق خود پر ظلم کر رہے ہیں۔“

”شکر ہے، آپ نے یہ نہیں کہہ دیا کہ میں آپ پر ظلم کر رہا ہوں۔“ وہ شرارتاً مسکرایا۔

”یہ کہوں تو بھی سچ ہوگا۔“ وہ منہ پھیر کر بولی تھی۔

”چچ چچ چچ..... دیوانے دل پر اتنا بڑا الزام تو نہ لگائیں۔ ہم اور آپ کا برا چاہاں! ہو ہی نہیں سکتا۔ بس کبھی کبھار کی یہ سرسری سی، رکی سی ملاقات! آپ اتنا بھی نہیں کر پائیں گی؟“

اس کے انداز میں عجب التجا تھی۔ زینب بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اسے بڑی گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے اختیار کنتیوز ہو کر نظریں جھکا گئی۔

”زینب! ایک بات کہوں.....؟“ دفعتاً وہ بے حد ہنسی آواز میں بولا۔

”کہیے!“

”آج آپ کا یہ روپ کسی کے بھی ہوش و حواس اڑا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ بے پردہ، بکھرا نکھر، خفا خفا ساجھن! آپ کیوں بچتی سنو رتی ہوں گی۔ آپ تو یوں بکھر کر بے پناہ حسین نظر آتی ہیں۔“

اس کی تعریف نے نضرب کو بے پناہ چل کر دیا۔

اس کا چہرہ بالکل سرخ ہو گیا۔ اتنے کلمے، بے باک الفاظ تو اس نے کبھی احسن کے لبوں سے نہ سنے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔ اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

”یہ بکھرے بکھرے بال، یہ شکن آلود لباس، یہ بھجا بھجا، دبا دبا سا انداز! کاش میں اس لمحے کو محسوس کر سکتا۔“

”پلیز سکندر صاحب!“ وہ مدھم آواز میں محض اتنا ہی کہہ پائی۔

”چلیں بھی۔“ مصروف سے انداز میں رملی اندر داخل ہوئی تھی۔ ”تیار کی مکمل ہے۔ ارے آپ دونوں تو یوں خاموش بیٹھے ہیں جسے کسی نے فرد جرم پڑھ کر سنائی ہو۔“

”کہاں غائب ہو گئی تھیں تم؟“ نضرب نے اسے گھورا۔

”میں نیل لگا رہی تھی، کبھی..... اگر تم بورہوری تھیں تو باہر آ جاتیں۔“ اس کے لہجے میں جتانے کے تمام انداز نمایاں تھے۔ ”چلو سکندر!

ایک کاٹو۔ تمہارا ڈرائیور سامان دے گیا ہے۔ ویسے ماننے والی بات ہے۔ آج کا ڈنر زبردست ہوگا۔“

”تم تو کھا کر بھی نہیں مانو گی۔“ اس نے رملی کے سر پر چپٹ لگائی تھی۔ ”کچھ نمک حرام ہو۔“

رملی چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے پلٹ کر سکندر کو دیکھا تھا۔

”نہیں سکندر! میں نمک حرام نہیں ہوں۔“

نجانے کیوں نضرب کو لگا جیسے اس کی آواز رندھی ہوئی ہو۔ اس نے چونک کر رملی کی جانب دیکھا لیکن وہ اپنی کیفیت پر قابو پا چکی تھی۔

سکندر علی نے ایک کاٹا اور پورا پیس اٹھا کر رملی کے منہ میں ٹھونس دیا تھا۔ وہ منہ بھرا ہونے کے باعث احتجاج بھی نہ کر پائی تھی۔ بس فوں غاں کر کے رہ گئی۔ دوسرا پیس اس نے نضرب کی جانب بڑھایا تھا۔ نضرب نے رسائیت سے پلیٹ بڑھا کر اس میں رکھ لیا۔

پھر باقی کا سارا وقت وہ دونوں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی سراتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ کھانا انہوں نے کھایا کم اور ضائع زیادہ کیا۔ نضرب بھی جھجک کے باعث زیادہ نہ کھا سکی تھی۔ پھر وہ جلد ہی جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”میں اب چلوں گی۔“ اس نے بے تحاشا ہنستی ہوئی رملی کو مخاطب کیا تھا۔

”نضرب..... پلیز بیٹھیں!“ میر سکندر علی بولا تھا۔ ”ابھی تو کپ شپ رہے گی۔“

”ہاں زین! ابھی گھنٹہ بھر تو ہوا ہے تمہیں آئے۔“

رملی بھی بولی۔

”احسن انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”اچھا..... چلتی ہوں۔“

میر سکندر علی کی گہری نظروں نے دروازے تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو احسن ٹی وی لگائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ریوٹ سے ٹی وی آف کر دیا۔

”مل آئیں رملی بی بی کی سہیلیوں سے۔“ وہ خوش گوار موڈ میں تھا۔

”جی.....“ وہ چوری بن گئی۔

”پوچھا نہیں انہوں نے کون سا واشنگ پاؤڈر استعمال کرتی ہو۔“ اس نے مسکراہٹ دہائی تھی۔

”جی؟“ وہ ایک لمحہ گوڑ بڑائی پھر شرمندہ ہو گئی۔

وہ یقیناً اس کے حلیے پر چوٹ کر رہا تھا۔ آج صبح سے اس نے نہ تو کپڑے تبدیل کیے تھے نہ بال بتائے تھے۔

”ایک ڈرامہ چلا کرتا تھا وی وی پر۔“ وہ مزید بولا۔ ”عینک والا جن“ قسم سے اس میں ایک جڑیل کا بالکل یہی حلیہ بناتے تھے۔ کم از کم بالکل تو بالکل کیسے.....“

نہنہن قریب رکھا کشن اٹھا کر اسے مارنے والے انداز میں بڑھی تھی۔



رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ نیند اس کی نگاہوں سے کوسوں دور تھی۔ کھلی آنکھوں سے چھت پر گھومتے ہوئے بچے کو دیکھ کر وہ نجانے کیا کیا کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔

میر سکندر علی سے ملاقات، اس کی باتیں، اس کا انداز..... وہ جتنا سوچتی جا رہی تھی، ذہن الجھتا چلا جاتا تھا۔ اندر ایک کشش چھڑی ہوئی تھی۔ وہ بے چین تھی۔ بے حد بے چین، کسی کل قرار نہ آتا تھا۔ ضمیر تھا کہ ملامت کیے چلا جاتا تھا۔ دماغ الگ دلیلیں پیش کرتا تھا۔ دل الگ تجتیں کرتا تھا۔

”کیوں چلی گئی تھی وہ اس کے بلاوے پر، کیوں جا بیٹھی اس کے مقابل، کیوں اس کے الفاظ سے اپنی سماعتوں کو آلودہ کیا، کیوں اس کی نگاہوں سے اپنے حسن کا خراج وصول کیا..... کیوں..... کیوں..... کوئی اس کے اندر چلائے جاتا تھا۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدل لی۔“

”لیکن اس میں ہرج بھی کیا ہے۔“ پھر کہیں کوئی چپکے بولا تھا، سرگوشی میں۔ ”اس بے رنگ، بے کیف، سپاٹ انداز میں گزرتی زندگی میں اگر کہیں سے کچھ انوکھے، پچھلے، شوخ رنگ آکر ملتے ہیں تو ملنے دو۔ زندگی کا بہتار یا ان رنگوں سے آلودہ نہیں ہوتا۔ ذرا آگے گیا اور پھر وہی صاف شفاف پانی، پھر وہی ہموار سپاٹ، ایک سی زندگی اور تم نے کیا ہی کیا ہے۔ حسن تو قدرت کی دین ہے۔ اس نے جی بھر کر نوازا ہے۔ اور سر ہٹا انساناں آنکھ کی مجبوری، وہ سراپے گی۔ بیچ میں تمہارا تصور کہاں نکلتا ہے۔ بس ذرا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اندر سکون سا اترتا ہے۔ مٹیالے پانی میں کچھ رنگ آکر ملتے ہیں، منظر بدل بھر کو بدلتا ہے، تو س قزح کچھ دیر کو نمودار ہوتی ہے اور بس! اس سے زیادہ کی خواہش تو نہ تمہیں ہے نہ اسے۔ یہ معصوم سی خطا اگر سرزد ہوتی بھی ہے تو ہوتا رہنے دو۔ زندگی بھر میں بس اتنی سی خطا، بس ذرا سی بے ایمانی سب ہی کرتے ہیں۔ تم کیوں بے چین ہو نہنہن؟“

اس نے ذرا سامر خ بدل کر بے خبر سوئے ہوئے احسن کو دیکھا۔

”یہ وہ شخص تھا جو کہتا تھا کہ نہ تمہارے بغیر نیند آتی ہے اور نہ تمہارے پاس ہوتے ہوئے سو سکتا ہوں۔ آخر میں کیا کروں زینو! اور آج یہ میرے بغیر بھی اطمینان کی نیند سو سکتا ہے اور میری قربت بھی اس کے سکون پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ آتش فشاں ٹھنڈا ہو چلا ہے۔ جوار بھانا اتر گیا ہے۔ بس اب سکون ہی سکون ہے اور میرا جی اس شہر خوشیاں جیسے سکون میں گھبرا رہا ہے۔ کچھ سوچنے کو نہیں، کچھ کرنے کو نہیں۔“

وہ بستر سے اتر آئی۔ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، وہ گھر سے بھی نکل جائے۔ باہر ٹھنڈی سڑک پر نیچے پیر چلتی دور چلی جائے اور وہ راہ گزر کسی جھگڑا جاتی ہو۔ وہ رستہ بیک جائے اور مدقوں بے مقصد یہاں سے وہاں پھرتی رہے۔ اس کا کسی سے کوئی سمبندھ کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کا کوئی شہ سا کوئی آشنا نہ ہو کچن میں جا کر اس نے فرخ کھولا اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر غٹ پانی چڑھا گئی۔

”زینو!“ اپنے پیچھے احسن کی آواز پر وہ بے طرح چونکی تھی۔

”جی..... جی.....“ احسن نے گویا اسے کسی ظلم سے آزاد کیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے اندر آکر کچن کی لائٹ جلائی۔ ”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“

”جی ہاں..... پانی پینے آئی تھی..... نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔“

وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

”دن میں کم سویا کر دنا۔ دن بھر سوتی رہتی ہو۔ رات بھر کہاں نیند آئے گی۔“ وہ بڑبڑا ہاتھا۔



دل پر بے تحاشا بوجھ تھا۔ وہ بوجھ تھا۔ وہ پھر آمنہ کے ہاں چلی آئی تھی۔

آمنہ حسب معمول اسی خوشی اور گرم جوشی سے ملی۔ زینب اس کے ہاں آکر ایسا محسوس کرتی تھی جیسے آمنہ کی عید ہو گئی ہو۔

”ہاں تو تم عید کا چاند ہی تو ہو میرے لیے۔“ اس کے اظہار پر آمنہ بے تحاشہ ہنسی۔ ”کبھی کبھار اترتی ہو میرے آنگن میں۔“

”کبھی پردا کا جھونکا بن کر تم بھی گزر جایا کرو، میرے آنگن سے۔“ زینب مسکرا دی۔ ”تم پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی ہوئی انوار بھائی

نے؟“

”ارے نہیں۔“ آمنہ بڑی محبت سے ہنسی تھی۔ ”انوار کی تو میں جتنی بھی تعریف کر دوں کم ہے۔ وہ بہت اچھے، نیک سیرت انسان

ہیں۔ مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔“

”اچھا۔“ زینب نے سانس بھری تھی۔ ”نجانے تم دونوں میں سے کون جنتی ہے۔ کوئی ایک تو ضرور ہے۔“ آمنہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

”انوار ہی ہیں۔ مجھے یقین ہے لیکن تمہارے لیے میں یہ طر کیا؟ احسن بھائی کا شمار تو بہت اچھے شوہروں میں ہوتا ہے۔“

”شاید میرا شمار اچھی بیویوں میں نہیں ہوتا۔“ زینب نے بے پروائی سے کانڈھے اچکا دیے۔

”ایسا تم کہو!“ آمنہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم تھوڑی سی بدھ ضرور ہو لیکن دل کی بہت اچھی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ، کیا پکاؤں تمہارے

لیے؟ آج تو انوار بھی دو پہر کا کھانا گھر پر ہی کھا گئے۔ کہہ کر گئے تھے۔ میں تم دونوں کے لیے کوئی اچھی سی چیز بنانا چاہتی ہوں۔“

”مجھ غریب کا نام درمیان میں کیوں لاتی ہو؟“

زینب نے اسے شرارت سے دیکھا۔ ”یہ کہو نا کہ اپنے شوہر نامدار کے لئے کوئی اچھی سی چیز بنانا چاہ رہی ہو۔“

آمنہ ہنس دی۔

”تمہارے سامنے مجھے وضاحتوں کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انوار جب کبھی گھر کھانا کھانے آتے ہیں میرا جی چاہتا ہے ان

کے لیے اچھی اچھی چیزیں بناؤں۔ وہ دسترخوان پر بیٹھیں تو انہیں کھانا نہیں میری محبت چنی ہوئی نظر آئے۔ لیکن تمہارے لیے بھی میں ایسا ہی چاہتی

ہوں محترمہ! بتاؤ نا کیا پکاؤں؟“

زینب جو اس کی بات سن کر کچھ سوچنے لگی تھی، چونک اٹھی۔

”آں۔ کچھ بھی بناؤ آمنہ..... اچھا ایسا کرو پلاؤ بناؤ۔ تمہیں پتا ہے ناں مجھے تمہارے ہاتھ کا پلاؤ کتنا پسند ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آمنہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ساتھ میں قیہ فرانی کر لیتی ہوں اور حیدر آبادی بیگن..... انوار کو بہت پسند ہیں۔ ٹھیک

ہے نا؟“

”اتنا کچھ؟ تم تو کچن میں سارا دن لگا دو گی۔“ زینب بور ہوئی۔

”سارا دن؟“ آمنہ حیران رہ گئی۔ ”گھنٹہ ڈیڑھ میں سارا کام ہو جائے گا۔ ایسے ہی تو نہیں میں پورے گھر کا کام چند گھنٹوں میں منٹا لیتی

ہوں۔“

زینب پھر تیلی ہی آمنہ کو مختلف کام انجام دیتے دیکھتی رہی۔ وہ واقعی بہت جلد کام ختم کر لیتی تھی۔ احمد کے سوکر اٹھنے سے پہلے پہلے وہ اپنا

آدھ سے زیادہ کام ختم کر چکی تھی۔

گھر سیٹ کر اس نے جھاڑو لگائی تھی۔ پھر کچن میں گھر گئی تھی۔ دونوں چولہوں پر مختلف چیزیں چڑھا کر اس نے منٹوں میں برتن دھو لیے تھے۔ ساتھ ساتھ نہب سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

انوار بھائی کے آنے سے پہلے پہلے وہ بالکل فارغ ہو کر اس کے ساتھ کمرے میں آ بیٹھی تھی۔

”اماں حج سے لوٹ آئیں تو ذرا مجھے احمد کی طرف سے اطمینان ہو جائے گا۔ وہ اسے سنبھال لیتی ہیں۔“ وہ احمد کو لٹا کر فیڈر تھما رہی تھی۔

”تم تو بہت تھک جاتی ہوگی آمنہ۔“ نہب نے اسے تاسف سے دیکھا تھا۔ ”کیسی گھن چکر بنی رہتی ہو۔“

”اپنا گھر تھکا تا نہیں ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”سکون بخشتا ہے۔“

نہب غور سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ آمنہ بہت بناوٹی سی محسوس ہوئی تھی۔

”ہر وقت پر سکون مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھے اوڑھے آمنہ بیزار نہیں ہو جاتی؟“ اس نے سوچا تھا۔ ”اس قدر بے تحاشا کام جو گدھے کو بھی

ہاپنے پر مجبور کر دے اور یہ دھان پان سی لڑکی کتنی ہے کہ یہ سب کچھ کر کے اسے سکون ملتا ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔“

دوپہر تک کنزٹی بھی اسکول سے آگئی تھی۔ آمنہ اسے لباس تبدیل کروانے لگی۔

”اب آپ منہ ہاتھ دھو کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ابو آتے ہی ہوں گے۔ پھر ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔“ اس کا لہجہ حقیقی ماؤں جیسا شفیق

اور نرم تھا۔

”جی امی! ٹھیک ہے۔“ وہ سعادت مندی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ آمنہ گہرا سانس بھر کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

متفاد سی سوچوں کا شکار نہب چونک اٹھی۔

”کچھ نہیں!“

”بور ہو گئی ہو یقیناً!“ آمنہ قدرے شرمندگی سے مسکرائی تھی۔

”نہیں، نہیں..... بس ایسے ہی ذرا سستی ہو گئی ہے۔“ اس نے خود کو سنبھالا دیا۔

”حقیقت یہی تھی کہ آج وہ یہاں آکر بہت بوریت اور کوفت کا شکار ہوئی تھی۔ اپنے گھر اور گھر کے افراد پر آمنہ کی بے پناہ توجہ اور یکسوئی

اسے بیزار کر گئی تھی۔

”شاید آمنہ مجھے اپنے سلیقے اور گھڑا پے سے متاثر کرنا چاہتی ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔ نہایت بیزار کی حالت سے عالم میں۔ ”لیکن اس کی

ضرورت کیا ہے۔ میں تو پہلے ہی معترف ہوں۔“

”وہ اطمینان سے بیٹھ کر آمنہ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنے کے لئے آئی تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ آمنہ کے پاس اسے دینے کے لیے بالکل

وقت نہ تھا۔ اس کا سارا وقت اب اس کے گھر کے کاموں کے لیے تھا۔

انوار علی آگئے تو آمنہ نے دسترخوان لگایا۔ کمرے کے صاف ستھرے فرش پر چھوٹی سی دری بچھا کر اس نے کھانا چٹا تھا۔ وہ سب لوگ نیچے

ہی بیٹھ گئے۔

انوار علی شائستہ مزاج کے نفیس سے انسان تھے۔ نہایت کم گو۔ انہوں نے نہب سے دعا سلام کرنے کے بعد محض احسن کا حال احوال

پوچھا تھا۔ پھر سر جھکا کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

آمنہ وقتاً فوقتاً انہیں مختلف چیزیں بوہا بوہا کر دے رہی تھی۔

”آپ یہ پلاؤ اور ڈالیں نا..... بس ذرا سا ڈال کر بیٹھے ہیں۔“

”یہ چینی ڈالیں..... چاولوں کے ساتھ بہت مزہ دیتی ہے۔“

”یہ بیٹگن دیکھیں۔ کیسے بنے ہیں۔“

”سلا داد لیں۔“

ایسا نہ تھا کہ وہ نہیب کی جانب متوجہ نہ تھی۔ نہیب کے ساتھ بھی اس کا حسن میز بانی ہی تھا لیکن انوار علی کے سامنے وہ بھیجی بھیجی جا رہی تھی۔ جواباً وہ ایک آدھ رکمی سا جملہ بول دیتے تھے۔

”جی..... میں لے لیتا ہوں۔“

”آپ اپنی دوست کا بھی خیال کریں نا۔“

”میں ٹھیک سے کھا رہا ہوں آمنہ..... آپ فکر نہ کریں۔“

نہیب ان دونوں کے اس رکمی انداز سے چڑھی گئی۔

”بھلا میاں بیوی کا اس قدر پر تکلف انداز میں گفتگو کیا جواز؟“ اس نے سوچا تھا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد اس نے آمنہ سے ذکر بھی کیا تھا۔

”آمنہ! یہ تم دونوں آپس میں اتنے تکلف سے کیوں بات کرتے ہو؟ میاں بیوی کے بجائے دور پرے کے رشتے دار معلوم ہو رہے

تھے۔“

آمنہ کلکھلا کر ہنس پڑی۔

”انوار نے شروع سے ہی اسی انداز سے بات کی تھی مجھ سے۔ پھر مجھے بھی عادت پڑ گئی۔“

”ہونہ۔ نرا تکلف۔ بیچ میں محبت تو کہیں دکھائی نہیں دیتی۔“

لمحہ بھر کو آمنہ کا چہرہ اتر اٹھا۔ پھر وہ ستانت سے مسکرا دی تھی۔

”انوار کے دل میں میری بہت قدر ہے نہیب! وہ اعتراف کریں یا نہ کریں۔ ان کا رواں روال یہ اعتراف کرتا ہے اور یہی وہ حاصل ہے

جو میں چاہتی ہوں۔“

نہیب نے چائے بناتی آمنہ کو نگاہ بھر کر دیکھا تھا۔ سادہ اور معمولی لباس، ہاتھوں میں چند ایک کانچ کی چوڑیاں، گلے میں پڑی زنجیر اور

کانوں کی وہی موٹی موٹی بالیاں جو وہ ہمیشہ پہنے رہتی تھی۔ آمنہ کا یہ حلیہ اسے ابر تھا۔ بس کبھی کبھار وہ آنکھوں میں کا جل ڈال لیا کرتی تھی۔ اس سادہ

معمولی سی لڑکی نے ہمیشہ ایسی ہی معمولی معمولی خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

”انوار علی کے دل میں اس کی خدمتوں کی قدر ہو بس اس کے علاوہ آمنہ کو کچھ اور نہیں چاہیے۔“ نہیب کو آج نبھانے کیوں اس پر غصہ آ رہا

تھا۔ ”آج احساس ہو رہا ہے کہ یا تو تم خود کو دھوکا دیتی ہو یا دنیا کو..... بڑی ولی اللہ ہونا۔“ اس نے گہرے طنز سے سوچا تھا۔



”مل کے کام سے لاہور جانا ہے۔“ رات کے کھانے کے بعد اسے احسن نے اطلاع دی تھی۔

برتن بیٹنی نہیب چونک اٹھی تھی۔

”کتنے دن کے لیے؟“ اس کے لہجے میں ناگواری کی جھلک نمودار ہوئی تھی۔

”چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔ ایک آدھ دن زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔ کیونکہ تم بھی میرے ساتھ چلو؟“ پھر دفعتاً وہ بولا تھا۔ ”کچھ گھوم

پھر بھی لیں گے۔“

”میں؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”لیکن آپ تو مل کے کام سے جا رہے ہیں۔ ٹھہریں گے کہاں؟“

”ہوئی میں۔ لیکن اگر تم ساتھ ہوئیں تو میرا ایک دوست رہتا ہے ماڈل ٹاؤن میں، وہاں رکیں گے۔“

”رہنے دیں!“ وہ ہیزار ہو گئی۔ ”آپ سارا دن ہیڈ آفس میں جان بھائیے گا اور میں انجان لوگوں کے گھر بیٹھی بور ہو رہی رہوں گی۔“

”اس کی بیوی سے گپ شپ لگایا کرنا۔ شام کو گھوما پھرا کریں گے۔“

وہ برتن اٹھا کر کچن میں چل آئی۔

”ہونہ۔ جب گھومنے پھرنے کے دن تھے تب صاحب بہادر کے مزاج نہیں ملا کرتے تھے۔ ابھی پیسے نہیں ہیں۔ ابھی تمہاری طبیعت

ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی یہ مسئلہ ہے ابھی وہ۔ اب مل کے کاموں سے جا کر احسان میرے سر لادنا چاہتے ہیں۔ میں ایسے ہی بھلی ہوں۔“

گزرے دنوں کی یاد نے اسے تلخ کر دیا۔ کتنا شوق تھا اسے احسن کے ساتھ کہیں جانے کا۔ دم نکلتا تھا اس کا لیکن کتنی بے دردی سے اس

معصوم خواہش کا قتل کر ڈالا تھا۔ اس نے اور اب۔

”پھر..... جواب نہیں دیا تم نے؟“

وہ کچن سیٹ کر نکلی تو وہ پھر ذکر نکال بیٹھا۔

”سوچوں گی۔ فی الحال تو موڈ نہیں۔“ اس نے روکھے پن سے جواب دیا تھا۔

”سوچنے کا وقت نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں بھی خشکی در آئی۔ ”مجھے سیٹوں کی بنگل کرانی ہے اور موڈ نہیں ہے تو رہنے دو..... پھر سہی۔“

”ٹھیک ہے پھر سہی!“ وہ سر جھٹک کر کمرے میں آگئی تھی۔ ”مجھے کیا ضرورت ہے اب یہ احسان سر لینے کی۔ اب میں ہر خواہش سے

دستبردار ہو چکی ہوں۔ میرا دل خالی کر ڈالا ہے تم نے احسن ایازا“



کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔ اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADS کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپ کی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

اس نے رملی کو بتایا تو وہ خاموش سی ہو گئی تھی۔

”ایکلی کیسے رہو گی اتنے دن؟“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا تھا۔

نہیں چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔ شاید رملی کا خیال تھا کہ وہ اسے ساتھ رہنے کا کہے گی حالانکہ اس بار اس کا اپنا ارادہ رملی پر یہ بار ڈالنے

کا نہ تھا۔

”میں جیل سے کہوں گی..... وہ کچھ دنوں کیلئے میرے ساتھ رہ جائے گی۔“

”ہاں! اگر ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔ ویسے تم احسن بھائی کی بات مان کر چلی کیوں نہیں جاتیں؟ اس میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ اچھا ہے

تھوڑی آہ ہو اور کی تبدیلی ہو جائے گی۔ طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ آدمی خود بخود منفی خیالات کے اثر سے باہر آ جاتا ہے۔“

نہیں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کون سے منفی خیالات کی بات کر رہی تھی۔ شاید اس نے احسن سے نہیں کی ناراضی کو یہ نام دیا تھا۔

”منفی خیالات تو خیر ایسے کوئی خاص نہیں۔“ وہ متانت سے بولی۔ ”بس فی الحال میرا موڈ نہیں ہے سفر کرنے کا۔ بھاگتے ہوئے جاؤ،

دوڑتے ہوئے واپس آ جاؤ۔ یہ کون سا طریقہ ہوا آہ و ہوا بدلنے کا۔ ہاں، کچھ دن بعد کہوں گی احسن سے۔ کچھ دن کی چھٹی لے کر اطمینان سے

جائیں گے۔“

اس نے اپنی طرف سے بات صاف کر دی تھی۔ رملی کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ احسن سے ناراض نہیں ہے۔

کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ رملی کا رویہ آج کل اس کی فہم سے بالاتر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں وہ بہت اچھی

اور ٹانس لگتی تھی۔ پھر جب سے سکندر علی والا معاملہ شروع ہوا تھا وہ کچھ روڈ ہو گئی تھی۔ لیکن اب تو وہ پل میں تو لہ میں ماشہ والا حساب کتاب کر رہی

تھی۔ کبھی نہایت مہربان نظر آتی تو دوسرے ہی لمحے بدتمیزی کی حد تک بے مہر۔

”اس کا بھائی اگر مجھ میں مسلسل انٹرسٹ لے رہا ہے تو اس میں آخر میرا کیا قصور ہے؟“ اس نے سوچا تھا۔ ”اسے چاہیے کہ اپنے بھائی کو

سمجھائے۔ اس کے آگے تو بیسگی بلی بنی رہتی ہے اور مجھے نہ جانے کیا کچھ جتنا چاہتی ہے اور پھر یہ خود ہی تو تھی جس نے مجھے اس سے متعارف کرایا

تھا۔“

آج کل اس کا یہ حال تھا کہ وہ گزرتی ہواؤں سے بھی بدگمان ہو جایا کرتی تھی۔



تین روز بعد وہ چلا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اسے جاتے سے بہت اداس محسوس ہوا تھا۔

”تم بھی عجیب ہو زینو!“ اس نے اپنا بیگ اٹھا کر اسے خدا حافظ کہنے سے قبل کہا تھا۔ ”کس کس طرح سے آزمائے چلی جاتی ہو۔ کیا تمہاجو

مان جاتیں میری بات۔“

نہیں نہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

”میں نہیں چاہتی تھی، میری وجہ سے آپ کے کام میں کوئی حرج ہو۔“ اس نے کہا۔ ”گھومنا پھرنا، سیر و تفریح تو فراغت کے ساتھ ہی بھلے

معلوم ہوتے ہیں۔“

اس نے دل کی بات جنادی تھی۔ احسن اداسی سے مسکرایا۔

”کچھ بھی ہو، مجھے تم سے جدا ہونا بہت برا لگتا ہے۔“

”کبھی کبھی کی جدائی سودمند ہوتی ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرا دی تھی۔

”مت اتنا آزما کر مجھے!“ اس نے جھلا کر اس کی چٹیا کھینچی تھی۔ ”سارے کس بل نکل جاتے ہیں میرے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ وہ چلا گیا تو اس کے جانے کے بعد گھر اسے بھی کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ وہ کچھ دیر چھوٹے موٹے کام نہناتی رہی پھر اس کا جی بری طرح سے گھبرا گیا۔

”کیوں نہ چلی گئی میں بھی۔“ اس نے سوچا۔ ”اب کیا کروں گی ہفتہ بھر.....؟“

جیلہ کچن میں دوپہر کے کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔ نینب اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی اس کو نہ جانے کیوں رہ رہ کر ایک ہی سوال پریشان کر رہا تھا۔

وہ احسن کے ساتھ لاہور کیوں نہیں گئی تھی؟ کیوں؟“ اپنے رویے کی وجہ خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اپنے انکار کے جتنے جواز اس کی سمجھ میں آتے تھے ان میں سے کوئی بھی قابل تسلیم نہ لگتا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ سخت خوفزدہ۔ خود سے، اپنی سوچوں سے، اپنے خیالات سے، اسے ہر چیز سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”جب انسان کا خود پر اختیار نہ رہے تو وہ اپنے آپ سے ڈرنے لگتا ہے۔“ اس نے آزر دگی سے سوچا تھا۔ ”ڈرنا چاہیے۔“



رملی دوسرے دن ہی چلی آئی تھی۔ خلاف توقع بے حد خوشگوار موڈ کے ساتھ۔

”ہوں۔ تو تہائی منائی جا رہی ہے۔“ اس نے اکیلی نینب کو بستر پر لیٹے دیکھ کر کہا تھا۔

پھر وہ آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ نینب اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”راوی جبین ہی چین لکھتا ہے؟ شوہر کو لاہور بھیج کر؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

نینب مسکرا دی۔

”کیا پروگرام ہے پھر؟“ وہ دفعتاً پوچھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“ وہ نا سنجھی سے بولی۔

”چلتی ہو بہترین ڈنر کے لئے؟ سکندر کہہ رہا ہے، وہ آفر ابھی تک برقرار ہے۔“

نینب کو غصہ آ گیا۔ رملی کا مطلب پوری طرح سے اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

”کیا سمجھ رہی ہو رملی تم؟“ وہ خنکے سے بولی۔ ”کیا میں اس لئے احسن کے ساتھ نہیں گئی کہ تمہارے بھائی کے ساتھ گھومتی پھروں گی؟“

رملی لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو گئی۔ اسے نینب سے اتنے تلخ جواب کی توقع نہ تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی

رہی پھر بولی۔

”سنو نینب! کوئی ایک فیصلہ کر لو۔ انسان بیک وقت دو کشتیوں کا سوار نہیں ہو سکتا۔“

نینب قہر رہ گئی۔

”کک..... کیا مطلب؟“ وہ ہکلائی۔

”مطلب یہ.....“ اس نے گہرا سانس بھرا۔ ”کہ یہ لاکھ جہتم اتنے دنوں سے پہنچے گھوم رہی ہو..... یہ میں اچھی طرح سے پہچانتی ہوں۔

یہ اسی ڈائنڈ شاپ سے خرید آ گیا ہے جہاں سے سکندر نے مجھے اکثر جیولری خرید کر گفٹ کی ہے۔ تمہارے سپینڈ جیسے اوسط درجے کے لوگ اس کو

محض باہر سے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں ہی بھر سکتے ہیں۔ اس کے اندر گھسنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔“

نہن کا چہرہ پہلے سرخ ہوا اور پھر بالکل زرد پڑ گیا۔ ”اور سکندر کو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ وہ اپنی بات کا پکا ہے۔ بالآخر اس نے تمہیں گھٹے مینے پر مجبور کر ہی دیا۔“

”تم..... تم..... غلط سمجھ رہی ہو رملی۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ کہنا چاہا۔
حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اپنی صفائی کسی طور پیش نہ کر سکتی تھی۔
”یہ درست ہے کہ یہ لاکھ مجھے سکندر نے ہی دیا ہے..... لیکن..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ میں.....“
رملی اس کی صورت دیکھ کر طنز سے مسکرا دی۔

”اس بات کا کوئی بھی مطلب نکل سکتا ہے، میری جان!“
”یوں میری تذلیل نہ کرو رملی!“ وہ سگ اٹھی تھی۔
”خیر!“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”اب لا حاصل بحث سے چلا جائے تو بہتر ہے۔ میں تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ رات کو تیار رہنا۔ آٹھ بجے سکندر آئے گا۔ پھر کسی اچھی سی جگہ سے ذکر کریں گے۔“

”لیکن میں جانا نہیں چاہتی۔“ اس نے احتجاج کیا۔
”تمہیں جانا چاہیے۔“ وہ بولی۔ ”آج تو ضرور جانا چاہیے۔ سکندر تم سے بڑی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔ بے حد ضروری۔ آج کی ملاقات تم دونوں کے لیے بے حد اہم ثابت ہو سکتی ہے۔“

”خاص بات؟ ضروری بات؟“ وہ گھبرا گئی۔ ”کیا بات ہے رملی؟ بتاؤ مجھے!“
”یہ تو میں نہیں جانتی۔ منج بس اتنا ہی تھا۔“ اس نے کانڈھے اچکا دیئے۔ ”خیر رات کو خود ہی جان لو گی۔ تیار رہنا۔“
وہ باہر کی جانب بڑھ گئی۔
”رملی..... رملی..... سنو تو۔“
اس نے رملی کو پکارا لیکن وہ رکی نہیں تھی۔



رملی کو آوازیں دیتے دیتے دروازے تک چلی آئی تھی لیکن رملی شدید غصے کی کیفیت میں تھی۔ وہ اس کی ہر آواز کو نظر انداز کرتی، زور سے دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

نہن کچھ دیر تک وہیں دروازے کے قریب کھڑی رہی پھر ایک گہری سانس بھر کر اس نے اپنی پیشانی بند دروازے سے ٹکادی۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو رہی تھیں۔ شدید ترین خجالت کا احساس اب خوف میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ حقیقتاً خوفزدہ ہو گئی تھی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بات اس طرح کی صورت حال اختیار کر لے گی۔ یہ بہم، بے معنی ساطعلق یوں اچانک اس طرح سے معنی خیزیت اختیار کر لے گا، اس کے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر لاکھ کو اپنی گرفت میں لیا اور پھر ایک جھٹکے سے کھینچ کر خود سے علیحدہ کر لیا۔ چند لمحے وہ اسے منٹھی میں بھر کر بے دلی سے دیکھتی رہی۔ پھر زور سے فرش پر دے مارا۔

یہی لاکھ تو سارے فساد کی جڑ تھا۔ جب سے اس کی ملکیت میں آیا تھا اسے ذہنی طور پر انتشار میں مبتلا کر دیا تھا اور اب تو نوبت یہاں

سک آ پہنچتی تھی۔

”آج رملی کو اس تعلق کی خبر ہوئی ہے، کل کسی اور کو ہوگی اور پھر بالآخر احسن کو!“ اس نے لب بھینچ کر سوچا۔ ”اور پھر کیا انجام ہوگا اس

سارے قصبے کا.....“

اسے میر سکندر علی پر تاؤ آنے لگا۔

”کیا چاہتا ہے آخر یہ شخص؟ کیا یہ میری زندگی تباہ کر کے رہے گا؟ یہ چند ملاقاتیں، چند بے معنی باتیں اس کے لئے تو کوئی حقیقت نہیں رکھتیں لیکن میں کہیں کی نہ رہوں گی..... اگر احسن کو اس سارے معاملے کی ہینک بھی پڑ گئی تو میں ساری عمر کے لیے ان سے نظریں ملا کر بات کرنے کے قابل نہ رہوں گی۔ کوئی تصفیہ ہونا چاہیے اس جھگڑے کا۔ ہاتھ جوڑ کر کہوں گی کہ بابا، میرا چچا چھوڑ دو..... دونوں بھائی بہن!“ وہ زمین پر پڑے لاکٹ پر نظریں جمائے کتنی ہی باتیں سوچتی گئی۔

”پہلے ہی زندگی کیا کم بیزار کن ہے جو اس میں مزید الجھنیں در آئی ہیں۔ ذہن ہر لمحہ ہر لمحہ الجھا ہی رہتا ہے۔ اف! یہ میر سکندر علی! ایک مسلسل خوف بن کر رہ گیا ہے یہ نام!“

”آج کی ملاقات تم دونوں کے لئے بہت اہم ثابت ہو سکتی ہے۔“ اسے رملی کے الفاظ یاد آئے۔

”وہ تم سے بے حد ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔“

وہ گھبراہٹ کے عالم میں کمرے میں چلی آئی۔ اسے بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر قبل رملی اس سے جس انداز میں بات کر کے گئی تھی اس نے اسے عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسکے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور رگوں میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ دماغ کسی کتے پر مرکوز ہونے پر آمادہ نہ تھا۔

منتشر خیالی کے عالم میں وہ آ کر اپنی الماری کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پٹ واکر کے کپڑوں پر نگاہ دوڑانے لگی۔ وہ ہر وقت احسن سے کپڑوں اور دیگر اشیاء کی کاروبار دوتی رہتی تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس کے پاس کپڑوں کی کمی نہ تھی۔ احسن اسے ہر موسم اور ہر موقع پر کپڑے بنا کر دیتا تھا۔

”کیا مجھے جانا چاہیے۔ کپڑوں پر نگاہ دوڑا کر اس نے سوچا۔“ کیا یہ ٹھیک لگتا ہے؟ ایک اجنبی مرد کے ہمراہ.....“

”لیکن رملی کہہ رہی تھی کہ یہ ملاقات ضروری ہے۔“ پھر اس نے خود کو ایک بودی سی دلیل پیش کی۔ ”اور پھر میں اس کے ساتھ تنہا تو نہیں

ہوں گی..... رملی ہمارے ساتھ ہوگی۔ اس کی بہن۔ اس کی موجودگی میں وہ بھلا مجھ سے کیا کہہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جانا چاہیے۔“

وہ ایک مرتبہ پھر الماری کے پاس چلی آئی۔ پھر سے کپڑوں پر نگاہ دوڑانے لگی۔

”اور پھر اس روز روز کی منت نئی باتوں سے جان چھوٹی چاہیے اور یہ تب تک ممکن نہیں جب تک میر سکندر علی سے ایک فیصلہ کن ملاقات نہیں ہو جاتی۔ میں رملی کے سامنے اس سے کہہ دوں گی کہ اب یہ تماشہا بہت ہو گیا۔ مزید سنبھلنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ میری ازدواجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ آج رملی اتنا کچھ کہہ کر گئی ہے، کل کو کوئی اور مجھے یوں ہی ذلیل کرے گا اور میں کچھ نہ بول پاؤں گی۔ بہتر ہے کہ اس قصبے سے جان چھڑائی جائے۔ ہاں، مجھے جاننا ہی ہوگا۔“

اس نے زرد رنگ کا وہی لباس نکالا جو احسن کو بہت پسند تھا۔ پھر نجانے کیوں اسکے دل کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے وہ لباس واپس رکھ دیا۔ ہلکے سبز رنگ کا ایک اور لباس منتخب کر کے اس نے بستر پر ڈال دیا۔ پھر کمرے سے نکل آئی۔ اس کا پھینکا ہوا لاکٹ اب تک وہیں پڑا تھا۔ اس نے لاکٹ اٹھا لیا تھا۔

”آج یہ بھی میر سکندر علی کو لوٹا دوں گی۔ اس کے بل بوتے پر وہ مجھے پیغامات بھیجتا رہتا ہے۔ خراج وصولنا چاہتا ہے۔ اس کی بہن کے

سامنے اس کے منہ پر باردوں کی۔“

وہ غم و غصہ میں گھری سوچے جارہی تھی۔ اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ آٹھ بجنے میں بہت دیر تھی۔ وہ مزید منسوبے بنانے لگی۔



ٹھیک آٹھ بجے تیل بجی تھی۔ آئینے میں اپنے عکس کو گھورتی ہوئی نینب چونک اٹھی۔ اس نے گھڑی کی جانب دیکھا جو پورے آٹھ بجارہی تھی۔ اسے اپنے دل کی دھڑکنیں تیزی سے بڑھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بنانے وہ کیا کرنے جارہی تھی۔ خود اسے پوری طرح سے علم نہ تھا۔ پھر اس نے ایک مرتبہ پھر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ہر چند کہ اس نے تیاری میں بہت سادگی اور احتیاط کو ملحوظ رکھا تھا۔ پھر بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بہت دن بعد اس نے کہیں جانے کے لئے خود پر توجہ کی تھی اور یہ توجہ اس کے وجود سے پوری طرح واضح ہو رہی تھی۔ سادہ مگر دیدہ زیب لباس، ہلکی سی میچنگ جیولری اور پرفیوم کی محرکیز خوشبو اس کے پورے سراپے کو نہایت قابل توجہ روپ بخش رہے تھے۔

وہ تیسری تیل ہونے سے قبل ہی کمرے سے نکل آئی۔ جیلہ لاؤنج میں ٹی وی لگاے بیٹھی تھی۔

”سنو جیل! میں ملٹی بی بی کے ساتھ جارہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گی۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لو!“

”اچھا جینو بی بی!“ وہ سادگی سے بولی۔

”کھانا کھا لینا اور پڑکسو جانا میں چاہی ساتھ لے جا رہی ہوں، خود ہی دروازہ کھول لوں گی۔“ وہ باہر نکلتے نکلتے پھر بولی تھی۔

”جی بی بی۔“ اس نے شخص انتخابی کہا پھر اس کے عقب میں دروازہ لاک کر لیا تھا۔

نینب اپنا چھوٹا سا پرس سنبھالتی گاڑی تک چلی آئی۔ ملٹی تیل بجا کر پھر گاڑی سے ٹیک لگا لے کھڑی تھی۔ اسے آٹا دیکھ کر اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

”ہیلو۔“ نینب کے قریب آنے پر اس نے لہک کر کہا تھا۔ ”تو تم تیار ہو!“

نینب خاصا جزیبہ ہوئی مگر کچھ کہہ نہ پائی۔

”اچھی لگ رہی ہو..... بائی داوے!“ اس نے نینب کیلئے اگلا دروازہ ہوا کر دیا۔ ”بیٹھو!“

”میں؟ تم آگے بیٹھ جاؤ!“ نینب قدرے بوکھلائی۔

میر سکندر علی کے برابر بیٹھنے کا بھلا اس کے پاس کیا جواز تھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے یار۔“ اس نے زور دے کر کہا اور نینب کا بازو پکڑ کر اسے سیٹ سے نزدیک کر دیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ سکندر بہت شریف

ہے۔“

اپنی بات پر اس نے خود ہی ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس سے پیشتر کہ نینب کچھ کہتی وہ پچھلا دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گئی۔ نینب نے مزید تماشا لگانے کے بجائے آگے بیٹھ جانا ہی مناسب جانا۔ ہر چند کہ اسے ملٹی کی یہ حرکت نہایت ناگوار محسوس ہوئی تھی۔ لیکن فی الوقت بات بڑھانے سے کچھ حاصل نہ تھا اور پھر وہ تو بات ختم کرنے کے ارادے سے ان دونوں کے ساتھ آئی تھی۔

گاڑی میں بیٹھے ہی اسے میر سکندر علی کے وجود سے اٹھتی زبردست مہک کا احساس ہوا تھا۔ اس نے کوئی نہایت قیمتی اور نفیس پرفیوم استعمال کیا تھا۔ پوری گاڑی کی فضا خوشبو سے بوجھل تھی۔

”خوش آمدید۔“ نینب کے بیٹھے ہی وہ چپکتی ہوئی آواز میں بولا تھا۔ ”اس گاڑی کی صحیح قیمت تو آج محسوس ہو رہی ہے، ہمیں نینب

خاتون جب آپ نے اسے عزت بخشی!

نہیں خاموش رہی۔ میر سکندر علی کی اس قدر قربت اسے پوری طرح سے محسوس ہو رہی تھی۔ اسے بہت برا محسوس ہو رہا تھا۔ رملی پر وہ رگڑا کر غصہ آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ کچھ دیر کے بعد بولا۔ ”آپ اتنی خاموش ہیں کہ خفا گئی ہیں کچھ تو بولیں۔“

”کہنا تو بہت کچھ ہے۔“ وہ قدرے جل کر بولی۔ ”لیکن آرام سے بیٹھ کر۔“

”ضرور۔“ وہ بولا۔ ”ویسے میں آج تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ میری گاڑی بہت اچھی اور آرام دہ ہے۔“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا رملی بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوئی لیکن نہ تب مسکرا بھی نہ سکی۔ نجانے کیوں اسے میر سکندر کا انداز مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ جیسی آواز میں بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں کہوں، اسے آپ پورے اطمینان اور توجہ سے سنیں۔ ہر بات پر سے توجہ ہٹا کر اور فی الحال آپ کا دھیان سامنے سڑک پر ہونا چاہیے۔“

”آئی ایم سوری مادام! آپ شاید برا مان گئیں۔ بہر حال اسے واؤٹ لی آجوک۔“ آج وہ کچھ زیادہ ہی خوش دلی اور شگفتگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”تمہارے جو کس کی عادت آہستہ آہستہ ہی پڑتی ہے سکندر۔“ رملی نے گویا اسے پچکا رہا تھا۔ ”نہ تب کو بھی پڑ جائے گی۔“

میر سکندر علی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا جبکہ اس کی اس بات پر بھی نہ تب تملتا کر رہ گئی تھی۔ آج اسے رملی پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔

گاڑی فائبر اسٹار ہوٹل کی عالی شان عمارت کے سامنے جا کر کی۔ نہ تب گاڑی سے اتر کر لمحہ بھر کے لئے پزل ہو گئی۔ باوردی دربان نے منسوب انداز میں ان کے لئے گلاس ڈور وا کیا تھا۔ خوبصورت، جھللاتے فانوسوں سے سجے لاؤنج کے گزرتے ہوئے وہ لوگ ڈائننگ ہال میں جا کر بیٹھے تو نہ تب کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ ایسی جگہ پر آتا تو اس کے لئے ایک خواب تھا۔ ایک محرانگیز خواب۔ ایسا خواب جس سے اس کی پگلیں عرصہ ہوا رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو گئی تھیں۔ ایسی ہی زندگی کی خواہش تو کبھی اس نے، لمبی، جگمگاتی گاڑی، روشن چمکدار راتیں جو دن کو ماند کرتی ہوں، قیمتی اشیاء سے سچی دوکانیں جہاں ہر شے دسترس میں لگتی ہو اور فائبر اسٹار ہوٹلوں کے مدھم مدھم خوابناک روشنی سے بوجھل ماحول والے ڈائننگ ہال، جہاں مقابل بیٹھے افراد صرف ایک دوسرے کے وجود کو محسوس کرتے ہوں اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوں۔ نگروں سے آزاد، ہواؤں میں اڑتی زندگی، ایسی ادھار کی خوشیوں پر وہ کب تک خوش رہ سکتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ سوچ کر چند لمحوں کے لیے افسردہ ہو گئی تھی۔

مقابل بیٹھے میر سکندر علی نے بغور اس کا چہرہ بڑھا تھا۔

”آپ کے چہرے پر مسکان بھلی معلوم ہوتی ہے نہ تب خاتون.....“ اس کی جانب قدرے جھکتے ہوئے وہ بولا تھا۔ ”مسکرائیے! ہر غم کو بھول کر۔“

”میں ذرا دواش روم سے ہو کر آتی ہوں۔“ رملی کھڑے ہوتے ہوئے بولی تھی۔

نہ تب نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ضرور، ہم تب تک آؤر دیتے ہیں۔“ میر سکندر نے مسکرا کر رملی کو دیکھا تھا۔

رملی کے جانے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے مینو کارڈ دیکھنے لگا۔ نہ تب نے ایک نگاہ فسون خیز ماحول پر اور سامنے بیٹھے میر سکندر علی پر ڈالی تھی۔ آرام دہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، ابرو قدرے اوپر کھینچا، وہ مینو کارڈ پر نگاہ دوڑا رہا تھا۔

زینب کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ آدمی وہ حقیقتاً شاندار تھا یا شاید اس کے وجود کے روئیں روئیں سے جھلکتی امارت کا احساس تھا۔ جو اسے متاثر کن شخصیت کے روپ میں پیش کرتا تھا۔

”ارے۔“ پھر وہ قدرے چونکا۔ ”آپ اسی طرح بیٹھی ہیں۔ بھی دیکھیں کارڈ ڈسٹر سلیکٹ کیجئے مہمان تو آپ ہیں۔ ہم آج آپ کی پسند کا کھانا کھائیں گے۔“

زینب اسی طرح بیٹھی رہی۔

”میں..... میں یہاں کھانا کھانے نہیں آئی ہوں سکندر صاحب!“ پھر وہ آہستگی سے بولی۔ ”کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”ضرور، ضرور۔ بہت سی ضروری باتیں ایسی ہیں جو مجھے بھی کہنی ہیں۔ لیکن سب کہنی سننی کھانے کے بعد۔ آپ یقین کیجئے، ایک ضروری میٹنگ میں الجھ کر آج لُچ تک نہ کر سکا۔ اب خالی پیٹ مجھ سے نہ کچھ کہا جائے گا، نہ سنا جائے گا۔“

زینب خاموش ہو گئی۔ پھر سکندر علی نے خود ہی آرڈر دیا تھا۔ نہایت لمبا چوڑا آرڈر۔ دیگر کو اس نے کتنی ڈشز کے نمبر نوٹ کر وائے تھے وہ اندازہ نہ کر سکی۔ منہ کھولے حیرانی سے وہ سکندر علی کو دیکھتی رہی جواب دینے کو یہ بتا رہا تھا کہ کھانے کے بعد وہ کون کون سے ڈیزرٹ لیتا پسند کرے گا۔

”آپ اتنا کھاتے ہیں؟“ دیگر کے جانے کے بعد وہ حیرانی سے بولی۔

وہ مدھم سروں سے ہنسنے لگا۔

”میں نے آپ سے کہا نا، آج آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہم اپنے مہمانوں کی تواضع ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔“

زینب سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا تھا۔

”یہ رٹلی کہاں رہ گئی؟“

”میرا خیال ہے، وہ واپس چلی گئی ہے۔“ میر سکندر علی بے حد اطمینان سے بولا تھا۔

”کیا؟“ زینب کو جھنک لگا، واپس؟ کہاں..... کہاں چلی گئی؟“

”گھر.....“ وہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہوا، ہنسنے لگا پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے بولا تھا۔

زینب کی سمجھ میں تھوڑی دیر کے لیے کچھ بھی نہ آ سکا۔ وہ اسے حیرانی بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”وہ گھر چلی گئی ہے زینب۔“ پانی کا گلاس آدھا خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔ ”دراصل ہم دونوں کے درمیان اپنی پوزیشن اسے آکر ڈلگ رہی تھی۔ میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“

زینب جواب تک قدرے اطمینان سے تھی، یکا یک پریشان ہوا بھی۔

”اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا میں، میں اس پر بھروسہ کر کے آئی تھی یہاں وہ مجھے بتائے بغیر کیسے چلی گئی؟“

”ایزی کی زینب ایزی!“ سکندر علی گن گنہماتا سے بولا۔ ”میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ آپ کو کسی اور کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ پریشان مت ہوں پلیرز دیکھئے! آپ کی پریشانی ماحول کے حسن کو بری طرح سے ڈسٹرب کر رہی ہے۔ ماحول کی خوب صورتی، اس مدھم سروں میں بجتی، اپنا پاتا بتی تنہائی کو محسوس کیجئے۔ آئندہ کی زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دیجئے۔ ہم اسی لئے تو یہاں مل کر بیٹھے ہیں۔“

”آئندہ زندگی؟“ زینب ہر بات بھول کر اسے دیکھنے لگی۔ ”کیا مطلب؟“

”میرا خیال ہے زینب! ہمیں اپنے تعلق کو ایک فیصلہ کن موڑ دینا چاہیے۔“

”تعلق؟“ وہ تانکھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔

”میں سمجھتا تھا زینب۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا کہ ”میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ جیسے کہ میں ہر حسین چیز کو پسند کرتا ہوں کیاری میں

کھلے کسی گلاب کو کسی نئی جھیل کے پانیوں پر تیرتے گلابی کنول کو، بارش کی نرم بوندوں کو، میں سمجھتا تھا زینب کہ میں آپ کو صرف پسند کرتا ہوں۔ آپ کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور بس، لیکن میں غلط سمجھتا تھا زینب!“

وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا۔ زینب اسے ساکت بیٹھی دیکھتی رہی۔

”..... اور..... اور..... میں یقیناً غلط ہی سمجھتا تھا۔ کیونکہ مرد اتنی سچائی اور غلوں سے بے جان چیزوں کو تو پسند کر سکتا ہے لیکن ایک جیتی جاگتی عورت کو نہیں۔ پسندیدگی کا جذبہ بہت جلد خواہش اور خواہش سے جنون میں بدل جاتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں، میرا جذبہ بدل چکا ہے۔ زینب! میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ضرور اور ہمیشہ کے لیے۔“

زینب کا دل ایک لمبے کور کا اور پھر پوری تیزی سے دھڑکنے شروع ہو گیا۔ وہ آنکھیں پھیلانے لگی۔ اس کی گفتگو سن رہی۔

”اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا ساتھ کسی بھی عورت کے لیے خوشی اور فخر کا باعث ہو سکتا ہے۔ اسے خوش فہمی مت سمجھنا! میں نے عورتوں کو اپنی جانب اس طرح مائل ہوتے دیکھا ہے جیسے لوہا مٹا پس کی جانب مائل ہوتا ہے۔“

”وہ عورتیں اور ہوتی ہیں سکندر صاحب!“ وہ ہنسنے لگی۔ ”جنہیں آپ کے ساتھ کی خواہش ہوتی ہوگی..... وہ، جنہیں یقین ہوتا ہوگا کہ وہ آپ کو اپنا بنا سکتی ہیں۔ میں تو..... میں تو ایک شادی شدہ عورت ہوں میرا ایک شوہر ہے..... ایک گھر ہے۔“

”کم آن زینب!“ اس نے قدرے ناگواری سے جیسے ناک پر بیٹھی کبھی اڑائی تھی ”ان فرسودہ، دقیا نوسی بندھنوں کو میں قطعاً اہمیت نہیں دیتا۔ وہ ڈول اور چٹا زے جیسے الفاظ پر مشتمل نصیحتوں والے زمانے بیت گئے۔ یہ نیا دور ہے۔ مشینی دور۔ کٹنا کٹ نئے نئے فیصلے کرنے اور ان پر عمل کر گزرنیکا دور۔ پڑھے لکھے لوگوں کا دور۔ زندگی میں کہیں کوئی فیصلہ غلط کر بھی لیا تو اس پر ملال کیا؟“

”مجھے..... مجھے اپنے کسی فیصلے پر کوئی ملال نہیں ہے!“ اس نے جیسے احتجاج کیا تھا۔ ”آپ، آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش ہوں۔“

”وہ زینب!“ اس نے بے حد برا منہ بنایا تھا۔ جیسے کوئی بے حد کڑوی شے نگلی ہو۔ ”جھوٹ مت بولو..... فارغا ڈسک..... جھوٹ مت بولو۔ یہ منافقت تم جیسی لڑکی پر سوٹ نہیں کرتی۔ تم ان باتوں سے بہت اوپر ہو۔ میں جانتا ہوں، تم اس شخص کے ساتھ خوش نہیں ہو۔ کیسے خوش ہو سکتی ہو تم؟ تمہاری زندگی میں کچھ بھی تمہارے شایان شان نہیں، ایک چیز بھی نہیں۔ کبھی اس کے ساتھ خود کو آئینے میں دیکھا ہے؟ تمہارا شو فرنگتا ہے وہ۔“

زینب خفت سے لوں کو کاٹنے لگی۔ سکندر علی کی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”میرے پاس چلی آؤ۔ میں شدت سے تمہارا منتظر ہوں!“

”ایسا ممکن نہیں۔“ وہ سخت خوفزدہ تھی۔

”اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے سوئٹ ہارٹ!“ وہ سرور لہجے میں بولا۔ ”اتنا مشکل مت لو اس بات کو۔ صرف یہ کہو کہ تم ایسا چاہتی ہو۔“

”نہیں، میں ایسا نہیں چاہتی!“ وہ بے حد کمزور لہجے میں بولی۔ ”میں اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش ہوں۔“

”ہاں!“ اس نے اپنا ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ ”پھر منافقت!“

ویٹر بیل پر کھانا چننے لگے تھے۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سکندر گلدان سے ایک پھول نکال کر اسے بخور دیکھنے لگا تھا۔ زینب اپنی مرعش انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ کسی بات کو اٹل قرار دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ سکندر کی باتوں نے اس پر بہت نہیں تو تھوڑا اثر ضرور کیا تھا۔ وہ جو کچھ کہنے اور کرنے آئی تھی، اب خود میں اس کی ہمت نہیں پاتی تھی۔

ان دونوں نے کھانا قدرے خاموشی کے عالم میں کھایا تھا۔ شاید سکندر علی کھانے کے دوران زیادہ گفتگو کا عادی نہ تھا۔ اپنا نیپن گھٹنوں پر پھیلا کر وہ بڑے نفیس انداز میں کانٹے چھری سے کھانا کھانا شروع ہو گیا تھا۔ زینب کی بھی بھوک مریچکی تھی۔ اس کا دماغ انتشار کا شکار تھا۔ طرح طرح

کی ڈشز دیکھ کر بھی اس کی ہموک نہ چکی۔ اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر وہ بے دلی سے پیچھے چلاتی رہی۔ کبھی کبھی پانی کا گھونٹ بھر لیتی۔
”یہ لاہوری چکن ٹیسٹ کرونا..... بڑی عمدہ ڈش ہے۔“

اس کی بے دلی اور کھانسی رغبت نہ دیکھ کر سکندر علی نے خود ہی اسے مختلف چیزیں دینا شروع کیں۔

”یہ فرائیڈز رائس لو..... یہاں کا براؤن میٹ بہت عمدہ ہوتا ہے ٹیسٹ کیا تم نے؟“

نہیب اس کے ہاتھ سے ڈش لے کر واپس ٹیبل پر رکھ دیتی تھی۔ اس کے ذہن میں تو تب سے اب تک ایک ہی جملہ اٹکا ہوا تھا۔

”کبھی اس کے ساتھ خود کو آئینہ میں دیکھا ہے؟ تمہارا شو فر لگتا ہے وہ“

کھانے کے بعد بیٹھے کا اور پھر بیک کافی کا دور چلا۔ نہیب کو وقت گزرنے کا احساس تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ پھر اسے سکندر علی کی ہمراہی میں وہاں بیٹھنا برا بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر اور وہاں گزارنا چاہتی تھی جانے زندگی میں پھر کبھی وہاں آنا نصیب بھی ہونا تھا یا نہیں۔

دونوں باہر نکلے تو نہیب کی جھجک قدرے زائل ہو چکی تھی۔ ماربل کے پچھنے فرش پر پھسل کر گر جانے کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس نے کھٹ کھٹ سیڑھیاں اترتی تھیں اور گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ گاڑی آگے بڑھی تو باردی دربان نے براز در در سلام جھڑا تھا۔

”کیا خیال ہے سمندر چلیں“ میر سکندر علی نے گاڑی کو اسپینڈ میں لا کر اس کی جانب دیکھا۔ ”مون لائٹ ناسٹ ہے..... بڑا لطف رہے“

گا۔

نہیب نے اس کی جانب دیکھ کر سر جھکا لیا۔

”پھر سہی“ مدھم سروں میں اس نے کہا تھا۔

اس ”پھر سہی“ میں کئی ان کہے افسانے پوشیدہ تھے۔ سکندر علی نے مسکراتے ہوئے گاڑی کو گھر کے رستے پر ڈال دیا۔



سکندر نے اسے گھر کے سامنے اتارا تھا اور گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔ نہیب بڑے اطمینان اور سکون سے دروازہ ان لاک کر کے اندر داخل ہوئی اور اندر سے پھر لاک لگا لیا۔

”میں ہوں جیلہ سو جاؤ!“ وہ لائٹ جلا کر کچن میں چلی آئی۔ کولر سے پانی کا گلاس بھرنے لگی۔

”بی بی جی۔“ جیلہ اٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ ”کہاں رہ گئی تھیں آپ..... میں تو جی ڈر گئی تھی۔“

”کیوں؟“ اس نے گلاس لبوں سے ہٹا کر برد چڑھا کر پوچھا۔ ”ڈرنے کی کیا بات تھی؟“

”رات کا ایک بج رہا ہے جی..... رملی بی بی تو کب کی گھر آگئیں..... میں سوچ رہی تھی..... آپ نہ جانے کہاں رہ گئی ہیں۔“

نہیب کا حلق کڑوا ہو گیا۔ اسے رملی کی حرکت یاد آئی اور اس پر اسر نور غصہ آنے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔ اب تو میں آگئی ہوں نا۔ آرام سے سو جاؤ!“ وہ قدرے رسائیت سے بولی۔

جیلہ پلٹ گئی تو وہ کچھ دیر وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ پھر لائٹ بجھا کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ بند کر کے وہ اپنے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

جانے سے قبل اس کا دل جتنا بوجھل اور ان گنت دوسوں کا شکار ہو رہا تھا، اب اتنا ہی ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔

وہ خود میں بے حد تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔

”کیا شاندار زندگی ہے میر سکندر علی کی!“ واپس اتار رہے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ”آدی ہے کسی دیس کا راجا۔ کیسی آن بان ہے۔ کیسے

ٹھاٹ باٹ ہیں۔ آہ، یہی سب کچھ تو چاہتا میں نے، ایسے ہی شہزادے کا انتظار کرتی تھی۔ لیکن اماں! ہائے، انہیں بہت جلدی تھی۔ کیا تھا جو میں چند سال اور کنواری رہتی تو آج میرے سارے سنے میرے اپنے تو ہوتے۔ ستارے بن کر میرے آنچل میں بھر جاتے اور میں اپنا تاروں بھرا آنچل آسمان پر پھیلا دیتی۔ ایک دنیا مجھے دیکھتی، میرے نصیب کو سراہتی کم از کم کوئی مجھے یہ تو نہیں کہتا کہ، کہ وہ شخص میرے ساتھ کھڑا میرا شو فر لگتا ہے! ہائے!

دل کو نہیں ہی لگتی تھی۔ وہ پیروں کو سینڈلوں کی قید سے آزاد کر کے بستر تک چلی آئی۔ بستر پر کہنی کے بل دروازہ ہو کر سنجیدگی سے سوچنے لگی۔
 ”اور وہ کہتا ہے کہ زندگی میں سب ہی کچھ ممکن ہے۔ میں کہتی ہوں ضروری نہیں کہ جو ممکن ہو، وہ ہل بھی ہو، کبھی کبھی مشکل، ناممکن کا روپ ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ جو وہ چاہتا ہے اگر ناممکن نہیں تو بھی بے حد مشکل ہے بے حد مشکل۔“
 اس نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبے کیلئے اس مشکل کو آسان بنا کر سوچا۔ ناممکن کو ممکن بنا کر دیکھا پھر دوسرے ہی لمبے آنکھیں کھول دیں۔
 اسے جھرجھری سی آئی تھی۔

اسے بچپن میں کبھی سنی ہوئی اپنی ماں کی دعایا آگئی۔ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہوئی تھیں۔ زینب اکثر انہیں جائے نماز پر بیٹھا دیکھتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتی تھیں۔

”اے اللہ! میرے مالک! تو نے ایک مرد کا منہ دکھایا ہے..... بس اب قبر کا منہ دکھائیو۔“
 زینب کا خلق خشک ہو گیا۔ اسے لگا بستر پر کانٹے آئے ہوں۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گئی تھی۔



دوسرے دن صبح ہی رملی چلی آئی تھی۔ جیلہ بچن میں مصروف تھی جب دروازہ بجا۔ زینب سو کر اٹھی، ہی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سیٹھی ہوئی وہ دروازے تک چلی آئی۔
 ”اوہ تم ہو!“ دروازے پر کھڑی رملی کو دیکھ کر اس کا انداز قدرے روکھا ہو گیا۔ ”آ جاؤ۔“ وہ ہٹ کر اس کو راستہ دینے لگی۔ رملی کا انداز بھی اکھڑا کھڑا سا تھا۔ وہ چند قدم ہی اندر آئی۔
 ”ابھی ابھی ہو؟“

”ہوں۔“

”رات خاصی دیر ہو گئی ہوگی۔“

زینب نے پلٹ کر اسے خشکیں نظروں سے گھورا تو اس نے کاغذ سے اچکا دیے۔

”ابنی وے میں کہنے آئی تھی کہ تمہارے مسینڈ کافون آیا ہے لاہور سے.....“

”احسن کافون.....“ زینب چونک اٹھی۔ ”کیا کہہ رہے تھے کوئی میسج؟“

”میسج یہی ہے کہ وہ آدھے گھنٹے بعد فون کریں گے آکر سن لیتا۔“

”اچھا!“ زینب سوچتے ہوئے بولی۔ ”خیر آدھے گھنٹے بعد ہی کریں گے نا..... آؤ تم تو بیٹھو۔ چائے پی لو۔“

”نہیں میں چلوں گی اب! اماں گھر پر نہیں ہیں، اس لئے مجھے آنا پڑا۔ دروازہ بھی لاک نہیں کیا ہے میں نے۔ تم آؤ گی تو چائے وہیں پی

لیں گے!“

وہ جانے کے لئے مڑ گئی۔ بظاہر دونوں ہی قدرے رواداری اور مروت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ لیکن لہجے دونوں کے بے تاثر ہو رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے سے سخت نالاں نظر آتی تھیں۔

رملی چلی گئی تو نینب کچن میں آکر جیلہ کو کھانے کے متعلق ہدایات دینے لگی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ تو دل میں بہت دن تک رملی کے گھرنہ جانے کا ارادہ باندھے ہوئے تھی۔ وہ اس سے قطعی طور پر بات چیت بند کر لینا چاہتی تھی لیکن یہاں تو اُلٹا اسے اپنا ہی کام آن پڑا تھا۔ پھر اسے احسن کے فون کا سن کر بھی عجیب سی بے چینی لاحق ہو گئی تھی۔ نجانے اس نے فون کیوں کیا تھا۔ پہلے تو اس نے کبھی اس طرح کا پیغام نہیں چھوڑا تھا۔ بس خیر خیریت کی اطلاع کھلوادیتا تھا۔ اسے وہاں سے ایسی کون سی ضروری بات یاد آگئی تھی۔ دل کا چور خواہ وہ ہی نینب کو پریشان کرنے لگا تھا۔ آدھا گھنٹہ اس نے بمشکل کاٹا تھا۔ بال سنوار کر ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر وہ کچھ پہلے ہی رملی کی طرف چلی آئی تھی۔

”ابھی تو دس منٹ باقی ہیں۔“ رملی اسے دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ ”بڑی جلدی ہے شوہر نامدار کا فون سننے کی!“ اس کا لہجہ بظاہر شرارتی تھا لیکن نینب جانتی تھی کہ وہ طنز کر رہی ہے۔

”تم مجھے چائے کی آفر کر کے آئی تھیں۔“ وہ سادہ لہجے میں بولی۔ ”میں نے سوچا، شاید تم چائے بنا کر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“

”ہاں ضرور تم بیٹھو، میں چائے بناتی ہوں۔ اماں کو تو میں نے چند ضروری اشیاء لینے کے لئے مارکیٹ بھیجا ہوا ہے۔ جب تک فون بھی آ جائے گا۔“

وہ ہمیشہ نینب کو اپنے ساتھ کچن میں ہی لے جایا کرتی تھی۔ لیکن آج وہ اسے وہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئی تھی۔ نینب صوفے کی پشت سے سرکا کر اس کے رویے کے متعلق سوچنے لگی۔

ٹیلی فون کی بیل نے اسے خیالات سے چونکا یا تھا، وہ فوراً ہی اٹھ کر فون تک پہنچی تھی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو..... زیو! کیسی ہو؟“ دوسری جانب سے احسن نے اس کی آواز پہچان کر کہا تھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ وہ آہستگی سے بولی۔

”بس جناب! چلا رہے ہیں کام!“ وہ قدرے بشاشت سے بولا۔ مزدور لوگ ہیں..... ہر حال میں خوش۔“

”کیسے فون کیا..... خیریت ہے نا۔“

”ہاں..... خیریت ہی ہے۔ دراصل کام کچھ طویل ہو گیا ہے۔ لگتا ہے چند دن مزید لیٹ ہو جاؤں گا۔ تمہاری جانب سے فکر ہو رہی ہے۔ اکیلی کیسے گزار دی یہ دن؟“ اس کے لہجے میں تشویش درآئی تھی۔

”اوہ احسن!“ اسے شدید قسم کی کوفت نے آن گھیرا۔ ”کچھ تو میرا خیال کیجئے کس قدر بوریٹ ہے اور آپ مزید دیر سے آنے کی نوید سنا رہے ہیں۔ میرا تو کوئی میکہ بھی نہیں جو اس قسم کی کسی صورت حال میں وہاں چلی جایا کروں۔“

”یار! تم سے کہا تو تھا چلو میرے ساتھ..... لیکن یہ جھڑپے نا تمہارے اندر، یہ سارا کام خراب کر دیتی ہے اب دیکھو، میں یہاں بور ہو رہا ہوں اور تم وہاں۔ سا تھل کر بور ہونے میں جو مزہ ہے وہ علیحدہ علیحدہ کہاں۔“

نینب ہلے سے ہنس دی۔

”خیر یہ کہو، کسی طرح کی کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا؟“

”نہیں، نہیں..... سب ٹھیک ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“

”کیا لاؤں تمہارے لیے؟“

”جو آپ کا جی چاہے!“

”اچھا، پھر میں وہی بھلے اور سری پائے لیتا آؤں گا..... پھر شکایت مت کرنا۔“

”اچھا،“ وہ ہنس دی۔ ”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔ بہت سایہ دار!“

لائسنس منقطع ہو گئی تھی۔ وہ فون رکھ کر پٹلی تو چونک اٹھی۔ رملی چائے کے برتن میز پر رکھے، صوفے پر بیٹھی تھی۔ نجانے وہ کب چلی آئی تھی۔ اس کے وال ٹووال بچھے دبیز قالین کسی کی آمد کا پتہ نہ چلنے دیتے تھے۔

”ہو گئی بات؟“ وہ ناخن دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ہاں ہو گئی۔“ وہ گہرا سانس بھر کر بیٹھ گئی۔

”کوئی خاص بات“

”نہیں، خاص بات کیا ہوئی ہے۔ کہہ رہے تھے کچھ دن اور لگ سکتے ہیں۔ فکر مند نہ ہوں۔“

”فکر مند!“ رملی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”تم نے بتایا نہیں کہ تم بالکل فکر مند نہیں ہو..... بلکہ بہت خوش ہو، ہاں ٹھیک ہی ہے۔ سکندر علی ایسی ہی شے ہے۔ بندہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا ہے۔“

”رملی.....“ نینب تنبیہی آواز میں بولی۔ ”یہ مت سمجھو کہ میں تمہاری الٹی سیدھی ہر بات کو خاموشی سے سہلوں گی آخر تم کیا سوچ کر یہ سب کچھ بول رہی ہو جس کا مطلب شاید تمہیں خود بھی نہیں پتا۔“

”نہیں نینب!“ رملی بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ ”میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں۔ اس کا مطلب میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ لیکن میں کیا غلط کہتی ہوں۔ کب تک تم چہرے پر جھوٹی پارسائی کا یہ نقاب ڈالے رکھو گی۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ تم اور سکندر میری نظروں میں دخول جھونک کر میرے گھر میں ہی محبت کی پینٹیکس بڑھاتے رہے ہو۔“

”جھوٹ..... سراسر الزام!“ نینب چیخ اٹھی۔

”کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ وہ ہر ہر موقع پر تمہیں کارڈز پھول اور نجانے کیا کیا کچھ دیتا رہا اور تم اس کے تحائف خوش دلی سے وصول کرتی رہیں۔“

”میں نے ہمیشہ تمہیں آگاہ کیا تھا رملی اس کی سچی ہوئی ہر چیز دکھائی تھیں۔“ وہ احتجاجا بولی۔

”ہاں۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”بعد اس لاکٹ کے جسے تم اپنے شوہر کا دیا ہوا گفٹ قرار دے رہی تھیں..... میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جانتی ہو نینب بیگم! کسی مرد کی تحفہ دہی ہوئی چیز کو عورت قبول کرے اور اسے پہن کر گھومے تو اس کا کیا مطلب نکلتا ہے؟“

اس بار نینب کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

”میرے ذہن میں کوئی غلط خیال نہ تھا رملی۔“ پھر بالآخر وہ کمزور لہجے میں بولی تھی۔ ”میرا یقین کرو!“

”ہاں..... بہت خوب!“ رملی طنز سے مسکرائی۔ ”بہت صاف دل ہے نا تمہارا..... ویسا ہی صاف ستھرا ذہن پھر تو تم نے اپنے شوہر سے کوئی بات نہ چھپائی ہوگی۔ اسے بھی سکندر کے تحائف کے متعلق بڑی صفائی سے بتایا ہوگا اور اس نے خوش دلی سے تمہیں اجازت بھی دی ہوگی یہ تجھے برتنے کی، ہیں نا!“

نینب غصے سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا پور پور کانپ رہا تھا۔ رملی کے الفاظ پر چھیاں بن کر اس کے اندر گزر رہے تھے۔

”رملی تم اچھی طرح سے جانتی ہو تمہارا بھائی ہی میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ تب تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آتا تھا۔ تم اسے بہت پاکباز اور دیوتا جانتی تھیں۔ پھر وقت نے تمہیں دکھایا کہ میں سچ کہتی تھی اور آج بھی میں تم سے کہتی ہوں کہ مجھے تمہارے بھائی سے یا تم سے کچھ لینا دینا نہیں

میرے خواب ریزہ ریزہ

”آپ کو اس طرح یہاں نہیں آتا چاہیے۔“ وہ دبے دبے انداز میں بولی تھی۔ ”میرے لیے پرائیمر ہو سکتی ہیں۔“

”ہوں، جانتا ہوں!“ وہ کچھ سوچنے لگا۔ ”سگار پی سکتا ہوں اگر تم مائنڈ نہ کر دو۔۔۔۔۔“

نہیب کی جانب سے کسی جواب کا انتظار کیے بنا وہ سگار رکھ کر نکل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی گہری سوچ کی پرچھائیں تھیں۔ نہیب کو جانے کیوں وہ آج کافی پختہ عمر کا لگا۔ شاید اس کی سنجیدگی کی وجہ سے۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی گئی۔

”میں..... دراصل رملی کی جانب گیا تھا۔“ پھر وہ بولا تھا۔ ”مجھے علم ہوا ہے تم دونوں کے مابین کچھ رنجش وغیرہ ہو گئی ہے۔“

”آپ کی بہن نہایت بدتمیز اور بداخلاق ہے۔“ نہیب سلگ اٹھی تھی ”اے علم نہیں کہ کس سے کس طرح سے بات کرنی چاہیے اور کون سی بات کرنی چاہیے اور کون سی نہیں۔ جو اس کے منہ میں آتا ہے وہ کہتی چلی جاتی ہے۔ آپ کے حوالے سے مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کرتے ہوئے اسے شرم آتی چاہیے تھی۔ بہر حال مجھے بہت افسوس ہوا ہے اور ہے گا۔“

”اوہ..... اوہ..... نہیب پلیز!“ وہ پریشان نظر آیا۔ ”اس کی جانب سے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ رملی بہت احمق لڑکی ہے۔“

”وہ بدتمیز اور بداخلاق ہے۔“ نہیب نے زور دیا۔

”دراصل..... وہ اس ساری صورت حال سے ڈپرےز ہو گئی ہے۔“ وہ شاید اس کی سائڈ لے رہا تھا۔

”کبھی صورت حال؟“ نہیب برہم تھی۔ ”ہر طرح کی صورت حال کے ذمہ دار آپ اور آپ کی بہن ہیں۔ میرا بچ میں کہیں کوئی تصور نہیں

نکلتا۔“

”ریلیکس ریلیکس۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر اسے دھیمہ ہونے کے لیے کہنے لگا۔

نہیب کو احساس ہوا کہ جوش جذبات میں اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ ہو کر خاموش ہوئی۔ اسی دوران جیلہ چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی تھی۔ دونوں نے ہی اس کی موجودگی میں گفتگو سے احتراز کیا۔ جیلہ چائے بنا کر چلی گئی تو نہیب اپنے کپ میں چھپ جاتا ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

”دیکھو نہیب! میں یہ تو نہیں کہتا کہ رملی اپنی جگہ درست ہے یا جو کچھ اس نے تم سے کہا وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ اچانک یہ سب کچھ جان کر اسے دھچکا لگتا لازمی تھا۔ وہ ڈپرےز ہو گئی کہ اس پر اعتبار نہیں کیا گیا۔“

”سکندر صاحب! میری پوزیشن خراب مت کیجئے پلیز!“ اس نے احتجاج کیا۔ ”آپ کے کہنے کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ میں آپ کے

ساتھ انوالوری ہوں..... اس سے چھپ کر!“

”میں تو بہر حال انوالور ہا ہوں۔“ وہ آہستگی سے مسکرایا۔ ”اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تم محض دنیا سے ڈرتی ہو ورنہ تا پسند مجھے تم بھی نہیں

کرتیں۔“

”میں فی الحال کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ نہیب نے سر جھکا لیا۔

”سوچو نہیب! اچھی طرح غور کرو میں تمہیں جبراً قائل نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہاں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

تمہارا یہ مقام نہیں ہے جہاں تم موجود ہو۔ جب کبھی بھی تم نے اس بات کو سمجھ لیا تم مجھے ”لیس“ کہو گی اور پھر اسکے بعد ہمیں رملی کی ضرورت نہیں ہو

گی۔ بس میں تمہیں یہی بات سمجھانے کے لیے آیا ہوں اس سے مخالفت مول مت لو۔“

”یہ بات آپ نے اپنی بہن کو نہیں سمجھائی۔“ وہ تپ کر رہ گئی تھی۔

”سمجھائی ہے بابا! اسے بھی سمجھائی ہے اس سے کہا ہے کہ وہ فوری طور پر تم کو سوری بولے تم سے اسکی سکیو زکرے اور وہ آئے گی۔ مجھے یقین

ہے۔ وہ میری باتوں کو کبھی رد نہیں کرتی۔“

زنوب خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ نجانے کیوں آج میرا سکندر علی کی باتیں اسے ایک ان دیکھے جال کی مانند محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا جال جو اسے چاروں جانب سے جکڑتا جا رہا تھا۔ اسے راہ فرار مل ہی نہیں پاتی تھی۔

”کیوں..... کیوں، یہ مجھے باور کرانا چاہتا ہے کہ میں بھی یہی سب کچھ چاہتی ہوں۔“ وہ پریشانی سے سوچ رہی تھی۔ ”کیا اسے کالا جادو آتا ہے، کیا یہ پچنانا سز کرنا جانتا ہے۔ میں میں کیوں نہیں سمجھ پاتی کہ میری اپنی مرضی کیا ہے۔ میں درحقیقت کیا چاہتی ہوں، میں اس کے کہے پر کیوں چل پڑتی ہوں۔“

”پریشان مت ہو زین! وہی ہوگا جو تم چاہو گی۔“ وہ بولا تو زنوب چونک اٹھی تھی۔
”جی؟“

”میں چلتا ہوں!“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”مٹنی جلد آئے گی۔ پلیز! تم اسے معاف کر دینا۔ وہ احمق ہے اور جذباتی، میں اسے مزید سمجھا دوں گا۔“

وہ باہر نکل گیا۔ زنوب کو ڈر لگنے لگا۔ وہ بری طرح سے خوفزدہ ہو گئی۔ اسے ایک انجانا جال اپنے ارد گرد مستحسوس ہونے لگا۔ آج اسے میرا سکندر علی کے خیال سے ہی خوف آ رہا تھا۔



میرا سکندر علی نے درست کہا تھا وہ دوسرے دن ہی چلی آئی تھی۔ زنوب کو اس کی صورت دیکھ کر دھچکا لگا۔ بڑی ٹیپ ٹاپ سے رہنے والی مٹنی کا آج روپ ہی دوسرا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس شکن آلود تھا۔ اس کی آنکھیں قدرے سوچی سوچی سی تھیں۔ نجانے وہ رات کو سو نہیں پاتی تھی یا روتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل اترا ہوا تھا۔

زنوب سے کچھ بھی کہے بغیر وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اور ایک ہاتھ سے سر تھام لیا تھا۔
”کیا بات ہے بی بی جی!“ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ زنوب کے کچھ کہنے سے پیشتر جیلہ بول پڑی تھی۔
”جیلہ! مجھے ایک گلاس پانی پلاؤ..... پھر ایک کپ اچھی، اسٹرونگ سی چائے!“ وہ بو جھل آواز میں بولی۔
جیلہ اسے پانی پلا کر چلی گئی تو وہ سر اٹھا کر زنوب کو دیکھنے لگی۔

”زین! تم ناراض ہو مجھ سے؟“

”نہیں۔“ وہ کچھ دیر کے بعد قدرے طنز سے بولی۔ ”بہت خوش ہوں۔ تمہارا پرسوں کا رویہ ایسا ہی تھا۔“ مٹنی خاموشی سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ زنوب کو اس کی کیفیت سمجھ میں نہ آئی۔ وہ اس کے سوچے ہوئے پوچھنے دیکھتی رہی۔

”زین..... ایک عورت کو دوسری عورت کے جذبات بغیر کہے سمجھ لینے چاہئیں..... ہیں نا! تمہارا کیا خیال ہے؟“ زنوب کو اس کی بات قطعاً سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس لیے وہ خاموش بیٹھی رہی۔

”تم میرے جذبات سمجھنے کی کوشش کرو تو شاید مجھے تم سے ایسا کمزور کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔“ پھر وہ مزید بولی۔
”میں صرف اتنا کہوں گی کہ تم میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو۔“ زنوب نے لب کھولے۔

”میں بہت بے وقوف عورت ہوں۔“ یک لخت اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ”میں ہمیشہ ہر کسی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہوں اور بعد میں پچھتاؤ ہوں۔ بہر حال زین! آئی ایم سوری میں اپنے سارے اگلے پچھلے رویوں کی معافی چاہتی ہوں اور یہ کہ آج کے بعد میں تمہارے بارے میں کبھی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گی۔ بس؟“

وہ اپنی سوچی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ زینب نے نظریں چرائیں۔

”اور..... اور میں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ میں کبھی، کسی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں گی جو غلط فہمی کا شکار ہو وہ بڑی آسانی سے شکار ہو جاتا ہے۔ زین! تم تو کہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو؟“

زینب نا کبھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ رملی اس وقت کوئی مخبوط الحواس عورت لگ رہی تھی۔ وہ قطعاً سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کر رہی تھی۔ زینب نے ہمدردی سے اس کے شانے کو چھوا۔

”تم شاید ٹھیک طرح سے سوئیں پانی ہو رات کو، تمہارا ذہن پریشان ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لو، یہیں لیٹ جاؤ میرے کمرے میں۔“

رملی نے ایک نگاہ سے دیکھا پھر ہنسنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی ہنسی میں شدت آتی گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ زینب احمقوں کی طرح سے منہ کھولے اسے دیکھنے جا رہی تھی۔

”دیکھو زین! مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔“ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی ہنسی پر قابو پا کر بولی۔ ”میں، میں ذرا مختلف عورت ہوں میں کسی دوسری عورت کے کمرے میں نہیں سو سکتی۔ مجھے اسی کمرے میں سونا اچھا لگتا ہے جو میرا ہو پورے استحقاق کے ساتھ میرا اور سنو زین! میں اپنا کمرہ کسی اور کے ساتھ شیئر بھی نہیں کر سکتی!“ دفعتاً وہ آہستگی سے راز دارانہ انداز میں بولی تھی۔

جیلہ ٹرے میں چائے سے بھرے کپ لے آئی تھی۔

”سنو جیلہ!“ رملی نے التجائی انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ”اگر سردرد کی گولیاں ہوں تو مجھے لا دو چ، میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔“

جیلہ نے زینب کی جانب دیکھا۔

”میرے پلنگ کی اوپری دراز میں گولیوں کا پتا پڑا ہے۔ نکال لاؤ۔“

جیلہ گولیاں نکال لائی تو زینب نے رملی کو گولیاں کھلائیں اور چائے کا کپ تھما دیا۔

”میرا خیال ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کے چائے پی لینے کے بعد اس نے کہا تھا۔ ”اب تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ اندر چل کر کمرے میں لیٹ جاؤ۔“

”نہیں۔“ اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے کہا تھا کسی دوسری عورت کے بستر پر نہیں لیٹ سکتی۔ میں، میں یہیں لیٹ جاتی ہوں۔ یہیں صوفے پر۔“

اس کی دماغی کیفیت بالکل نارمل نہیں تھی۔ زینب کو اس پر ترس آنے لگا۔

”ہاں ہاں یہیں لیٹ جاؤ۔ جیسے تمہاری مرضی!“

رملی بچوں کی طرح سمٹ کر لیٹ گئی تو زینب وہیں اس کے پاس بیٹھی رہی۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس کے سانسوں کا زبر و دم سنائی دینے لگا۔ وہ گہری نیند سو چکی تھی۔



احسن کو گئے ہوئے چھٹار روز تھا اور ان چھ دنوں میں کوئی دن ایسا نہ گزرا تھا جب کوئی غیر متوقع بات نہ ہوئی ہو۔ زینب سوچتی تھی تو اسے حیرانی ہوتی تھی۔ نہ جانے یہ کیسے دن تھے۔ نہایت تیز رفتار اور حیران کن۔ ایسے دن اس کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔

اس روز بھی کال بیل کی آواز پر دروازہ کھولنے پر اسے سکندر علی کھڑا نظر آیا تو وہ چند لمحوں کیلئے سوچتی رہ گئی کہ اس کے ساتھ آخر ہو کیا رہا ہے؟

”اندر نہیں بلائیں گی زنبب خاتون؟“ وہ اداسے مسکرایا تھا۔

زنبب کاٹے لگی۔

”چلیں پھر باہر آ جائیں۔“ وہ اسے سوچ میں گم پا کر بولا تو وہ چونک اٹھی۔

”جی؟ میں کبھی نہیں؟“

”میں گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ ہم کہیں جا رہے ہیں۔“

”کہاں؟“ وہ پریشان ہو اٹھی۔ ”سکندر صاحب! میں، میں یہ سب کچھ انور ڈنہیں کر سکتی۔ خدارا میری پریشانیوں میں اضافہ مت کیجئے۔“

سکندر علی خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی بولتی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ کوئی سوچ تھی جو جھجکا رہی تھی۔

”میں..... آج آخری بار آپ سے ملنے آیا ہوں زنبب.....! آخری بار!“ وہ بولا۔ ”میرا یقین کیجئے۔ ہم آج کے بعد پھر کبھی اس طرح

نہیں ملیں گے..... آئی پراس یو!“

”لیکن۔“ وہ زچ ہو گئی۔ ”ہم جائیں گے کہاں؟“

”ہے ایک جگہ۔“ وہ مسکرایا۔ ”جلدی آ جائیں۔ میں گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

وہ مزید۔ زنبب پریشانی کے عالم میں کھڑی سوچتی رہی۔ نجانے یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔ اس ساری کہانی کا انجام کیا تھا۔ یہ راستہ جس پر

وہ کچھ چاہتے ہوئے اور کچھ نہ چاہتے ہوئے چل نکلی تھی۔ اسے کہاں لے جانے والا تھا۔

”بی بی جی۔“ جیلہ اندر سے نکل کر آئی تھی۔ ”کون آیا تھا؟ گھنٹی بجی تھی۔“

”آں۔“ وہ چونک اٹھی۔ ”جیلہ! میں ذرا سے کام سے جا رہی ہوں۔“ دروازہ بند کر لو۔ کچھ دیر میں لوٹ آؤں گی۔“

”کس کے ساتھ بی بی جی؟“

جیلہ نے پوچھا تو وہ چونک اٹھی۔ اس نے آج سے پہلے کبھی اس طرح سے سوال جواب نہ کیے تھے۔

”رہی بی بی..... باہر گاڑی میں بیٹھی ہیں۔“ نجانے کیوں اس کے لبوں سے جھوٹ بات نکلی تھی۔ شاید دل کا چور ہر کسی سے ڈر جاتا ہے۔

وہ مزید کچھ بھی کہے باہر نکل آئی تھی۔ جیلہ نے اس کے عقب میں دروازہ بند کر لیا تھا۔

”اگر تم جانے سے انکار کرتیں تو کوئی ملاقا نہیں تھی زنبب! جو تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں اس گاڑی میں بٹھا سکتی۔“

وہ گاڑی کے قریب آئی تو رملی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج اٹھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے قدم ڈگمگائے۔

سکندر علی نے اس کے لیے اگلا دروازہ دیا کہ وہ اکیلا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی بڑی آہستگی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

”مجھے ایسی ہی عورتیں پسند ہیں۔“ سکندر علی سرور لہجے میں بولا تھا۔ ”خوش اعتماد، باوقار..... اپنے فیصلے آپ کرنے والی..... بہادر

عورتیں!“

اس کے الفاظ جادو اثر تھے۔ ”زنبب.....! آئی ایم ریٹلی امپرینڈ.....“

”ہم جا کہاں رہے ہیں..... بائی داوے!“ اس نے قدرے رملی والے اسٹائل میں پوچھا تھا۔

”دیکھ لیتا آج میں تمہیں ایک سر پرانزدینا چاہتا ہوں پھر ایک چوٹس تمہارے سامنے رکھوں گا۔“

”آپ تو کہہ رہے تھے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔“ زنبب نے اسے کچھ یاد دلایا، کچھ بتایا۔

”ہاں..... بالکل..... چوٹس یہی تو ہوگی تمہارے پاس..... ویسے میں نے کہا تھا..... ”اس طرح“ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی!“ اس

نے ”اس طرح“ پر زور دے کر ہلکا سا قہقہہ لگا دیا تھا۔

زینب خاموش ہو گئی۔ اب وہ اس سر پرانہ کی منتظر تھی۔ سکندر علی کے انداز اور گفتگو نے اسے قدرے تجسس میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں کسی انگریزی گانے کے بول گنت گاتے ہوئے سکندر علی پر سے دھیان ہٹا کر سیاہ سرک کو تیزی سے گاڑی کے قدموں تلے پھٹتے ہوئے دیکھتی رہی۔

زندگی کا یہ انداز اسکے لیے بے حد تعجب خیز اور نیا تھا۔ لیکن یہ امر حقیقت تھا کہ اسے برا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اسے جستجو تھی، کہانی کا اگلا صفحہ مڑنے کی غلت بھی تھی۔ نجانے قسمت کی کتاب میں اس کے لیے کیا کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے دھیان سے اس وقت چوکی تھی جب گاڑی ایک عالیشان کوٹھی کے سیاہ، چوبی، طویل و عریض دروازے کے سامنے جا کر کھٹی۔ زینب نے چونک کر سکندر علی کی جانب دیکھا۔ وہ گاڑی بند کر کے اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”یہ، یہ تو کسی کے گھر لے آئے ہیں آپ مجھے۔“ وہ حیرانی سے بولی۔

سکندر علی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے ایک نگاہ بند دروازے پر ڈالی۔ پھر بولا۔

”کسی کے نہیں، تمہارے ہی گھر لایا ہوں تمہیں۔“

زینب کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے پھیلی تھیں۔

”یہ کوٹھی میں نے خریدی ہے زینب! آج یہ مکمل طور پر میری ملکیت ہے اور میں تمہیں اس محل کی رانی بنا کر لانا چاہتا ہوں۔“

اس نے گاڑی پھر سے اشارت کر کے ہارن دیا تھا۔ چند لمحوں میں چوبی دروازہ واک ہوا۔ قیمتی سیاہ پتھر سے بنی ہوئی عمارت ان کی نگاہوں کے سامنے یوں منکشف ہوئی تھی جیسے آنکھ کھلتے ہی کسی حسین خواب کی تعبیر سامنے آجائے۔ سکندر علی گاڑی کو اندر لے گیا تھا۔ چونکہ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

”آؤ زینب! میں تمہیں کوٹھی دکھاتا ہوں۔“ سکندر علی نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔

وہ کسی خواب کے سے عالم میں گاڑی سے اتر آئی، سیاہ، عالی شان عمارت کی تمام کھڑکیاں سنہری تھیں اور شام کی ڈھلکی ہوئی روشنی میں دھیرے دھیرے سلگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

سیاہ، ٹنڈ گلاس ڈور کھول کر سکندر علی نے اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا تھا۔ زینب کو یوں محسوس ہوا وہ رستہ بھول کر کسی راج محل میں چلی آئی ہو۔ وسیع و عریض ہال فانوسوں کی تیز روشنی سے بے پناہ نور بنا ہوا تھا۔ پورے ہال میں چار جھومر تھے اور چاروں پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ لائٹ گرے دیوار کا پٹ اور سیاہ آئینہ فرنیچر اپنا انتخاب کرنے والے کے ذوق کی بھرپور داد وصول کر رہے تھے۔

زینب حیران پریشان سی کھڑی چاروں جانب دیکھ رہی تھی۔ وہاں اتنی روشنی تھی کہ اس کی آنکھیں چند ہیاریں تھیں۔

”آؤ اوپر چلیں۔ تمہیں کمرے دکھاتا ہوں۔“

سکندر علی نے دھیرے سے اس کی کمر کو چھوا تھا۔..... زینب کسی بحر کے عالم میں اس کے ہمراہ میڑھیاں چڑھنے لگی۔ قیمتی انڈور پلائش جا بجا رکھے نظر آتے تھے۔ دیواروں میں نصب تمام فنیسی لائٹس آن تھیں۔ زینب کو بچپن میں پڑھی ہوئی طلسم ہوش ربا یاد آگئی۔ اس کے ساتھ چلتا ہوا شخص یقیناً کوئی جادوگر تھا۔ اسے مسکور کر دینے کا فن آتا تھا۔

”یہ..... خواب گاہ۔“ سکندر علی نے ایک بند دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھا۔ ”اسے دیکھنے سے قبل باور کر لو کہ اسے خاص تمہارے لیے بنایا گیا ہے۔ میں تمہیں اس گھر میں، اس خواب گاہ میں دیکھنے کا متمنی ہوں، تم ہی وہ عورت ہو جو یہاں سج سکتی ہو۔ یہ درو دیوار بہت حساس اور حس پرست ہیں۔ اپنی ناقدران سے برداشت نہ ہوگی اور ان کی قدر تب ہی بڑھ سکتی ہے جب ان کے درمیان تمہارے جیسا وجود ہو، نادار اور حسین۔“

اس نے دروازہ کھول دیا۔ زینب کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنے لگا۔

”یہ..... یہ سب میرے لیے؟“ وہ دیوانوں کی طرح سوچ رہی تھی ”میں اتنی قیمتی ہوں۔ اتنی نایاب اور مجھے آج علم ہی نہ ہو سکا میں بے قدر رہے ہاتھوں میں لڑتی رہی۔“

وسیع و عریض خواب گاہ کے عین وسط میں بچے خوب صورت اور قیمتی سفید سنہری پلنگ کے چاروں جانب جالی کا باریک پردہ تھا۔ پھر بھی زینب اس بستر کے گداز اور حسن کو محسوس کر سکتی تھی۔ آئینوں سے مزین وارڈرو ب دیوار کے ایک کونے سے شروع ہوتی تھی تو دوسری دیوار کے آخر تک جاتی تھی۔ سفید سنہری نگار میز پلنگ کے عین سامنے بڑی شان سے ایستادہ تھی اور اس کے آئینے میں پورے کمرے میں لگے آئینوں کا عکس در عکس تھا۔ قیمتی اور نایاب ڈیکوریشن پتھر جا بجا ہے اپنے مالک کے ذوق کی داد وصول کر رہے تھے۔ ہر شے میں سفید اور سنہری رنگ کا حسین امتزاج نظر آتا تھا۔

”میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا زینب! تو خیال آیا، مصر کی ملکہ کلوپٹرہ بالکل ایسی ہی ہوگی۔ ایسے ہی جادو اثر حسن کی مالک جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔“

سکندر علی کہہ رہا تھا۔

”اور جب میں نے اس کوٹھی کو دیکھا تو مجھے لگا، میری کلوپٹرہ کے لیے اس سے اچھا تختہ اور کوئی نہیں ہو سکتا اس کی راجدھانی جہاں وہ روز ج سنو کر میری منتظر ہو..... میں نے یہ کوٹھی تمہارے لیے ہی خریدی ہے۔ یہ میری جانب سے تمہارے لیے شادی کا تختہ ہوگا۔“

زینب نے ہر اسامں ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ عجیب انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”بہی چو کس ہے تمہارے آگے..... اس شخص کو چھوڑ کر چلی آؤ میرے پاس، اپنی اس راجدھانی میں ورنہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔“

زینب گم گم کھڑی آئینوں کے عکس در عکس دیکھ رہی تھی۔



وہ گھر پہنچی تو یوں لگ رہا تھا جیسے اپنا دل اسی محل کے کسی گوشے میں چھوڑ آئی ہو۔ عجب احساس زیاں تھا جو اس کے اندر گھر کر رہا تھا۔ غائب دماغی کے ساتھ وہ اپنے کمرے تک پہنچی تھی کہ جیلہ اس کے پیچھے اندر داخل ہوئی۔ زینب نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو بری طرح سے چونک اٹھی۔ دھواں دھواں چہرہ لیے جیلہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر الفاظ اس کے حلق سے برآمد نہ ہو پا رہے تھے۔

”جیلہ.....“ زینب نے حیرانی سے اسے دیکھا ”کیا بات ہے؟“

”وہ جی..... بی بی جی..... وہ..... رملی بی بی آئی تھیں۔“

”ہاں تو پھر؟“

وہ..... میں کیسے بتاؤں جی۔“ وہ ہاتھ ملے لگی۔ اس لمحے رملی آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی۔

”زین، کہاں گئی تھیں تم؟“ وہ گنگرہٹ کے عالم میں بولی پھر اس کی جانب سے کسی بھی جواب کا انتظار کیے بغیر وہ مزید بولی تھی۔ ”احسن بھائی کے آفس سے کسی عاشق نامی آدمی کا فون آیا تھا..... تمہارے لیے ایک بری خبر ہے زینب!“

زینب کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ پلک جھپکاتے بنا رملی کو دیکھ رہی تھی۔

”احسن بھائی جس ٹرین سے واپس آ رہے تھے اس میں ہم دھماکہ ہوا ہے۔ اسی بوگی میں جس میں احسن بھائی تھے۔“ زینب نے دل تمام لیا۔ اگر جیلہ اسے آگے بڑھ کر سہارا نہ دیتی تو وہ یقیناً گر جاتی۔

”کل رات کو یہ حادثہ پیش آیا۔ تمام زخمی افراد اسپتال میں ہیں۔ تمہیں فوراً اسپتال جانا ہوگا۔“

”اوہ خدایا!“ زینب نے کانپتے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ ”رملی..... میں..... میں..... مر جاؤں گی..... یہ کیسی ہولناک خبر سنائی ہے تم نے۔“

”حوصلہ رکھو زین۔“ رملی اس کے قریب چلی آئی اور اس کا سر بہلانے لگی ”احسن بھائی شدید زخمی تو ہوئے ہیں، لیکن زیادہ خطرے کی حالت سے باہر نکل آئے ہیں۔ وہ مختصر انہیں دیکھ کر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے تفصیلی بات کی ہے لیکن تم وقت ضائع مت کرو..... فوراً اٹھو، ہمیں فوراً وہاں پہنچنا ہوگا۔ فون آئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا ہے۔ میں دو تین مرتبہ تمہیں دیکھنے آئی لیکن نجانے تم کہاں تھیں؟“

زینب اچھی طرح جانتی تھی کہ رملی کتنا جاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ وہ جاتے وقت جیلہ سے یہی کہہ کر گئی تھی کہ وہ رملی کے ساتھ جا رہی ہے۔ رملی کو کبھی طرح سے علم تھا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ گئی تھی۔ لیکن فی الحال وہ شاید مروت برت رہی تھی۔ ادھر جیلہ کو بھی علم ہو گیا تھا کہ زینب رملی کے ساتھ نہیں گئی بلکہ اس سے غلط بیانی کر کے گئی ہے۔ لیکن فی الحال وہ ان باتوں پر سوچ کر اپنا وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتی وہ رملی کے ساتھ ہولی۔ اس کی گاڑی باہری کھڑی تھی۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ رملی نے گاڑی شہر کے راستوں پر ڈال دی۔ وہ کافی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہی تھی۔

”احسن خیریت سے ہیں نارملی.....“ زینب نے گلوگیر لہجہ میں پوچھا۔

”مل لیں.....“ وہ مختصر آہولی تھی۔

”پھر بھی وہ آدمی کیا کہہ رہا تھا؟“ وہ اپنی تسلی چاہ رہی تھی۔

”وہ تو یہی کہتا تھا کہ حالت خطرے سے باہر ہے۔“

اس کا انداز بذات خود کسی خطرے کی علامت تھا۔

زینب کا دل بیٹھنے لگا۔ رملی کا ہمہ انداز اسے اندر سے مارے ڈال رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا، وہ اسے بھرپور یقین دلا دے کہ احسن بخیریت ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ لیکن وہ بچلا ب و انتوں سے دبائے، خاموشی سے کارڈ رائیو کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے اسپتال آیا تو زینب جو راستہ ختم ہونے کا شدت سے انتظار کر رہی تھی، عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی۔

”رملی تم اندر چلی جاؤ!“ کپکانی ہوئی آواز میں بولی۔ ”خدا کی قسم میری ناگوں میں کھڑے ہونے کی سکت بھی نہیں ہے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ سنجیدگی سے بولی ”زندگی سے یہ توقع مت کرو کہ وہ تمہارے لیے اچھے برے، تلخ و شیریں سارے ہی موڑ آتے ہیں اور پھر تم اتنی فکر مند کیوں ہو؟“ وہ ناجانے آگے کیا کہنا چاہتی تھی۔ کچھ سوچ کر خاموش ہو رہی۔

”چلو گاڑی سے اترو!“ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔

زینب بمشکل تمام گاڑی سے باہر آئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے پھانسی گھاٹ کی جانب لے چلا ہو۔ کاؤنٹر سے پوچھنے پر علم ہوا کہ حادثے کا شکار ہونے والی ٹرین کے تمام زخمی جزل وارڈ میں ہیں۔ وہ لوگ جزل وارڈ میں چلی آئیں۔ وہاں عجب افراتفری کا عالم تھا۔ تڑپتے ہوئے زخمیوں اور روتے ہوئے عزیز واقربا کو دیکھ کر زینب کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔ رملی نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا پھر وہیں بیٹھا جھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ احسن کا بیڈ تلاش کر رہی تھی۔

چند لمحوں میں ہی وہ وہاں پہنچ آئی تھی۔

”چلو زین! احسن بھائی یہاں نہیں ہیں۔ صبح آپریشن کے بعد انہیں کمرائیوٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے!“

”آپریشن؟“ زینب رونا بھول کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ ”لیکن کیوں؟ کیوں ہوا ہے ان کا آپریشن؟“ رملی نے نظریں چرائیں۔

اس سے نظر چرا کر پھر وہ وہاں کی نہیں تھی۔ باہر نکل گئی تھی۔ نرنب نے مردہ ہوتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ اس کا پیچھا کیا۔ رملی نے ایک مرتبہ پھر کاؤنٹر کا رخ کیا تھا۔ پھر وہاں سے درست معلومات حاصل کر کے وہ اس کی جانب مڑی۔

”روم نمبر سترہ۔ سیکنڈ فلور! چلیں؟“ اس کی جانب سے کسی بھی جواب کا انتظار کیے بغیر وہ آگے چل پڑی۔

نرنب وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کے ذہن میں اتنے سوالیہ نشان بن اور مٹ رہے تھے کہ ذہن مزید کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ ہر سوچ ان ہی سوالیہ نشانوں کے پیچ چکر رہی تھی۔

اپنی دھن میں تیزی سے کارڈور سے نکلتا ایک وارڈ بوائے اس سے ٹکرایا تو وہ حواسوں میں آئی۔ ادھر ادھر دیکھنے پر رملی دکھائی نہ دی۔ وہ شاید نرنب کو اپنے پیچھے آتا تصور کر کے لفٹ میں سوار ہو گئی تھی۔

”سینے!“ نرنب بڑی ہمتوں سے گاؤنٹر پر پہنچی ”سیکنڈ فلور، روم نمبر سترہ میں جس پیشٹ کا آپریشن ہوا ہے..... انہیں..... انہیں کیا ہوا تھا؟“

گاؤنٹر پر موجود نرس نے چشمے کے پیچھے سے اسے بغور دیکھا۔

”ٹرین ایکسڈنٹ؟“

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”ان کی دائیں ٹانگ حادثے میں ضائع ہو گئی تھی..... آپریشن سے علیحدہ کی گئی ہے!“ دھڑ دھڑ دھڑام ہاسپٹل کی ساری چھت اچانک اس پر آگری تھی اور وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر پائی۔ مجدد نظروں سے وہ اس نرس کو کنگے جا رہی تھی جواب فون کی تیل سن کر دوسری جانب مصروف ہو گئی تھی۔ اس کے ہلنے ہوئے لب نرنب کو نظر آرہے تھے لیکن وہ کیا کہتی تھی، یہ سنائی نہ دیتا تھا۔ اسے محض اپنے اندر اٹھتے طوفانوں کا شور سنائی دیتا تھا۔ پر شور لہروں کی آوازیں تھیں، چینی چنگھاڑتی ہواؤں کی روح میں سوراخ کرتی سیٹیاں تھیں، بادلوں کی بے رحم گرج تھی، خاکستر کرڈالنے والی بجلی کی کڑک تھی وہ بڑے شدید طوفان کی لپیٹ میں تھی۔

”نرنب..... زین۔“ رملی نجانے کہاں تک جا کر واپس پلٹی تھی۔ اس کے قریب کھڑی اس کا بازو دھلا رہی تھی۔

نرنب نے پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”رملی..... رملی.....“ پھر وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔



سفید چادر سینے تک اوڑھے ہوئی بے جان سی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ان نگاہوں میں نہ کوئی سوال تھا نہ کوئی کہانی۔ نہ کوئی جستجو نہ کوئی پیغام۔ نرنب کو ایسا لگتا جیسے وہ اس کے آ پار دیکھ رہا تھا۔ وہ نرنب کو نہیں، نرنب سے پرے کچھ دیکھ رہا تھا۔

”جب سے آئی ہو، یونہی خاموش بیٹھی ہو۔“ رملی نے اسے ٹھوکا دیا تھا ”حسن بھائی سے کوئی بات کرو۔“

نرنب نے بہت سے آنسو حلق کے رستے اپنے اندر اتار لیے۔ وہ رملی سے کیا کہتی، اسے کیا بتانی کہ وہ کچھ کہے، کچھ بولنے کے قابل نہ تھی۔ آنسوؤں کا ایک سیل رواں تھا جو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے کے بجائے اس کے اندر گر رہا تھا۔ اس سب سے آہستہ اس کی زبان بند کی ہوئی تھی۔ اس کے لفظوں کا راستہ روکا ہوا تھا۔ وہ اگر بولنے کی کوشش بھی کرتی تو اسے پھندا لگ جاتا، اس کا سانس رک جاتا وہ تو بس ٹکر ٹکر بستر پر لیٹے زرد احسن کو کنگے جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں تو بس یہ کیا ہو گیا، یہ کیسے ہو گیا، یہ کیوں کر ہوا، جیسے الفاظ کی گردان تھی۔ اس سے آگے سوچ کی پرواز جاتی ہی نہ تھی۔ وہ احسن سے کیا کہتی، کیسے کہتی؟

”میں ذرا گہرا ایک فون کر کے آتی ہوں۔“ زملی کھڑی ہوئی تھی ”اماں کو چند ہدایات دے دوں۔ وہ کھانا تیار کر لیں گی تو میں جا کر لے آؤں گی۔“

وہ شاید جان بوجھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کا خیال غالباً یہ تھا کہ وہ دونوں اس کی موجودگی میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ سکن نہ پا رہے تھے۔ ان دونوں کے وہاں آنے سے قبل احسن کا کوئی دوست وہاں موجود تھا انہیں دیکھ کر وہ بھی باہر نکل گیا تھا۔ اور اب زملی کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ان کے درمیان تیسرا کوئی نہ تھا۔ زینب ایک گہرا سانس بھر کر آنکھیں موند کر لینے ہوئے احسن کو دیکھنے لگی پھر اس کی نگاہ اس کے سر ہانے کھلی کھڑکی سے باہر کھڑے درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں سے الجھنے لگی۔ کتنے ہی لمبے پونہی رینگ رینگ کر آگے بڑھ گئے تھے جب احسن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔

”زینو..... زینب!“

”جی..... جی.....“ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔

”ادھر آؤ..... میرے پاس!“ اس کی آواز میں بے تحاشا نفابت تھی۔

زینب ست روئی سے چلتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی۔ احسن نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تو اس نے آہستگی سے ہاتھ لیا۔

”زینو!“ اس نے تھوک نگل کر اپنے لہجے کی نمی پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

”جی!“ اس کی آواز رندہ لگی۔ پھر وہ اپنی سسکیوں پر قابو نہ پاسکی تھی۔

وہ بے بسی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

”پلیز زینب!“ پھر وہ بولا تھا ”میرے شکست خوردہ اعصاب کو مزید اذیت میں مبتلا مت کرو۔ تم روتی رہو گی تو میں..... میں اس ناقابل بیان اذیت سے چھٹکارا حاصل نہ کر پاؤں گا۔ میں تھوڑی سی تسلی چاہتا ہوں زینو! تھوڑا سا حوصلہ میں..... میں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتا کہ خود کو حوصلہ دے سکوں، اپنے اعصاب کو تھپک سکوں میری سوچ کا ہر تار اپنی آخری حد تک کھنچا ہوا ہے۔ میرا سانس رک رہا ہے زینب پلیز، پلیز مجھے تسلی دو، میرا حوصلہ بڑھاؤ میرے، اعصاب کو تھپک کر سوچوں کے اس تناؤ کو ختم کر دو پلیز!“

زینب کی سسکیاں مزید تیز ہو گئیں۔ وہ اسے کیا حوصلہ دیتی، اس کی اپنی حدتیں اس کے اندر دم توڑ رہی تھیں۔ اس کے ذخیرہ الفاظ میں تسلی اور تشفی کے تمام لفظ مٹے ہوئے تھے۔ ذہن میں جا بجا خالی خانے اس کا منہ چڑاتے تھے۔

ایک خوب روڈ اکثر دوزسوں کے ساتھ غالباً راؤنڈ پر اندر آیا تھا۔ زینب خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی تو وہ اس کا چیک اپ کرنے لگا۔

”ڈاکٹر!“ وہ مدھم آواز میں بولا تھا ”مجھے..... نیند کی اشد ضرورت ہے..... میں کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے غافل ہونا چاہتا ہوں..... پلیز! مجھے کوئی ٹرکولائزر دیجیے!“

ڈاکٹر نے اس کا شانہ تھپک کر نرس کو کچھ ہدایات دیں اور کمرے سے نکل گیا۔ نرس اپنی ٹرے سائنڈ ٹیبل پر رکھ کر سرخج میں کوئی انجکشن بھرنے لگی۔ پھر اس نے وہ انجکشن احسن کو لگایا اور باہر نکل گئی۔

”یہ اب سوئیں گے۔ انہیں ڈسٹرب مت کیجیے گا!“ اس نے جاتے جاتے زینب سے کہا تھا۔

وہ تو اپنی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے غالباً سنا بھی نہ تھا کہ نرس نے اس سے کیا کہا تھا۔



دو ہفتے بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ رملی ان لوگوں کو اپنی گاڑی میں اسپتال سے لے کر آئی تھی۔ احسن فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا جب کہ زینب پچھلی سیٹ پر سامان کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دیگر سامان کے علاوہ دو بیساکھیاں بھی تھیں جو اس کے گھٹنوں سے لگی ہوئی تھیں۔ رملی اور احسن ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے مگر زینب جیسے ان کے بیچ نہ تھی۔ اس کا سارا دھیان ان دو بیساکھیوں کی جانب تھا جو اس سے لگی ہوئی تھیں۔

زینب کو ان سے دوزخ کی پیش نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا بدن لہجہ لہجہ پتہ چار ہاتھ، اس کی روح جھلنے لگی تھی۔ ”ساری عمر کا عذاب؟ ساری عمر کا عذاب؟“ اس کی سوچ چلا رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ احتجاج کر رہی تھی۔ وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ ”زینب..... زین.....! کہاں کھوئی ہو؟“ وہ جواسوں میں آئی تو اسے احساس ہوا کہ رملی نجائے کتنی دیر سے اسے پکار رہی تھی۔ ”آں..... کیا بات ہے؟“ وہ بہت چونک کر بولی تھی۔

رملی اور احسن کو اس کی غائب دماغی سے اس کے جذبات کا احساس ہوا۔ وہ دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد رملی بولی تھی۔

”میں کب سے تمہیں پکار رہی تھی۔ سوئی تھیں کیا؟“
 ”نہیں۔“ وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولی ”سو کیسے سکتی ہوں، سولی پر نیند آنا محض محاورہ ٹھہرا اور نہ سولی پر کس کو نیند آتی ہے۔ میں کچھ سوچ رہی تھی۔“

”آج کل تم کچھ زیادہ ہی سوچنے لگی ہو!“ رملی عجیب سے لہجے میں بولی تھی ”خیر یہ بتاؤ گھر پر فروٹ وغیرہ ہیں یا راستے سے لے لیں؟“
 ”گھر پر؟“ وہ سوچنے لگی۔

”رہنے دو یا فروٹ وغیرہ کو۔“ دفعتاً احسن بولا تھا۔ پھر وہ پھکی سی ہنسی دیا۔
 ”فی الحال جتنے پیسے بچتے ہیں، بچانے چاہئیں کیوں زینب؟“
 ”تم گاڑی روکو تو میں اتر کر لے لیتی ہوں۔“ زینب نے اس کی مذاق میں کبھی گئی تلخ بات کا جواب دینے کے بجائے بڑی سنجیدگی سے رملی سے کہا تھا۔

رملی نے ایک جگہ پھل وغیرہ دیکھ کر گاڑی سائیڈ میں کھڑی کی پھر بنا کچھ کہے دروازہ کھول کر اتر گئی تھی۔
 ”بہت ٹاکس عورت ہے!“ احسن بولا ”آج کل کے اس مادہ پرست دور میں کون کسی کا اتنا خیال کرتا ہے۔“
 زینب خاموش ہو گئی۔ نجائے احسن نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ وہ شاید ہر بات کا منفی پہلو دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ رملی کچھ دیر میں پلٹ آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پھلوں کے لفافے تھے جو اس نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیے۔
 ”کتنے پیسے ہوئے رملی؟“ احسن نے شائستگی سے پوچھا تھا۔

”خلوص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی احسن صاحب!“ رملی نے مسکرا کر اسے دیکھا ”آپ کے گھر عیادت کے لیے آنا تو تھا ہی..... اور عیادت کے لیے خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگتا۔“

”بہت پر خلوص خاتون ہیں آپ! میں آپ کے جذبے سے متاثر ہوا ہوں۔“ احسن بولا تھا۔
 ”ہاں۔“ اس نے ہلکا سا تقبہ لگایا ”پر خلوص تو میں ہوں اور اپنی اس کوالٹی پر نازاں بھی ہوں میں اپنے ہر جذبے میں بہت فیر رہتی ہوں..... چاہے وہ جذبہ خلوص ہو یا محبت کا یا نفرت کا میرا ہر جذبہ بہت پیور ہوتا ہے۔ بناوٹ، تصنع اور جھوٹ سے پاک!“
 زینب بری طرح کلس رہی تھی۔ اسے احسن کا رملی کی یوں کھلی تعریف کرنا بہت ناگوار محسوس ہوا تھا۔ دوسری جانب رملی کے الفاظ نے

اے آگ لگا دی تھی۔ اسے احساس تھا ملٹی نے ساری بات اسے سنانے کے لیے کی تھی۔ وہ ملٹی کی احسان مند ضرور تھی لیکن اس کی باتوں ہی باتوں میں اصل بات جتا ڈالنے والی عادت اسے زہر لگتی تھی۔

گھر آیا تو ملٹی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتری۔

”میں سامان اندر کرتی ہوں زین! تم احسن بھائی کو سہارا دے کر اتارو۔ انہیں اندر لے چلو!“ زینب بیساکھیاں لے کر اتری۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اس نے بمشکل احسن کے اترنے میں اس کی مدد کی پھر اسے بیساکھیاں پکڑائیں۔ احسن کے چہرے پر ناقابل بیان اذیت کے تاثرات رقم تھے پھر بھی وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس نے اتنے دنوں میں خود کو حوصلہ دینا، اپنی ہمت آپ بڑھانا سیکھ لیا تھا۔

بیساکھیوں کے سہارے وہ اندر چلا آیا۔ اس کے ہر ہر قدم پر زینب کے دل میں ہرجی گڑی تھی۔ بیساکھی کی ٹک ٹک اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسی تھی۔ احسن کو بیڈنگ پہنچا کر اس کی بیساکھیاں اس نے سائیڈ میں کھڑی کیں۔

”میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔“ پھر اس کی جانب دیکھے بنا وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ بہت دیر تک رونا چاہتی تھی۔



وہ عجیب غائب دماغی کی کیفیت کا شکار تھی۔ دن کس طرح گزر رہے تھے، رات کیسے کٹ جاتی تھی، اسے علم نہ ہو پاتا تھا۔ کسی روبوٹ کی طرح وہ اپنے کام نشانی پھرتی تھی۔ زندگی میں ایک لڑکتہ ایک بہت بڑے خلا کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اس خلا سے زہر بھری تلخ، ناامید سوچیں ہر وقت اس پر یلغار کیے رکھتی تھیں۔

طرح طرح کے سوال اس کے ذہن میں ابھرتے تھے جن میں کسی کا جواب اس کے پاس نہ ہوتا تھا۔

سب سے بڑا سوال تھا ”اب کیا ہوگا؟“ وہ جواب نہ پا کر جھنجھلا جاتی۔

اس روز بھی وہ کسی معمولی سی بات پر جیلہ پر برس پڑی تھی۔ وہ بے چاری سی مسکین عورت تھی۔ سر جھکا کر اس کی ساری بکواس سنتی رہی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ زینب بڑبڑاتی ہوئی کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

بستر پر دراز احسن نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بات ہوئی؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں بات کیا ہوئی ہے۔“ وہ قدرے بیزاری سے بولی ”یہ جیلہ کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکالنے لگی ہے۔ اچھا بھال کام کرتے کرتے بگاڑ دیتی ہے۔ چاولوں میں اس قدر پانی ڈال دیا ہے کہ ان کی لٹی سی بن گئی ہے۔ دال میں نمک زیادہ ہے۔ کبابوں کی صورت بگاڑی ہوئی ہے۔ دن بدن نکمی، ہوتی جا رہی ہے۔“

احسن نے ایک گہری سانس بھری پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھنے بیٹھنے اور بیساکھیوں کے سہارے کھڑے ہونے میں اسے ابھی حد درجہ دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زینب اسے بیٹھتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”زینو۔“ وہ جو داپس مڑنے کا خیال کر رہی تھی، چونک اٹھی۔

”ادھر آؤ ذرا یہاں بیٹھو!“

اس کے لہجے میں خاص قسم کی سنجیدگی تھی۔

زینب اسے محسوس کرتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔

”زینو۔“ وہ اس سے پرے کہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سوچ تھی ”میں چند دنوں سے تم سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ تم میری

بات سمجھنے کی کوشش کرنا اور کسی قسم کا کوئی غلط مطلب اخذ نہ کرنا۔“

”ہوں.....“ وہ اس کا چہرہ سننے لگی ”کہیے!“

”زینب! میری حالت تم دیکھ رہی ہو..... نجانے کب اس قابل ہوتا ہوں کہ روانی سے چلنا پھرنا شروع کروں یا پھر سے جاب پر جانے کے قابل ہو سکوں۔ جمع شدہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تم جانتی ہو..... میرا خیال ہے کہ ہمیں فی الوقت ہر طرح کی بچت کی شدید ترین ضرورت ہے تمہارا کیا خیال ہے؟“ وہ جو اس پر سے نظریں ہٹا کر کچھ سوچنے لگی تھی، چونک اٹھی۔

”جی؟..... جی ہاں۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ بجٹ تھوڑا کم کر سکوں.....“

”کیوں نہ ہم کچھ عرصے کے لیے جیلہ سے معذرت کر لیں؟“ وہ قدرے شرمندگی سے بولا تھا ”یہ سات آٹھ سو جو ہم اسے دیتے ہیں، ہمارے بہت کام آسکتے ہیں۔“

زینب کچھ گم صم ہی ہو کر اس کا چہرہ سننے لگی تھی۔ جیل تو اس کی رائج عادت بن چکی تھی۔ اس کے بغیر گزارا کرنے کا تصور سوہان روح تھا۔

”لیکن..... لیکن.....“ وہ ہکا بگٹی ”جیلہ بے چاری کے گھر کا چلہا ہی ان پیسوں سے چلتا ہے اس کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی۔“

”مجھے اس کا احساس ہے۔ یہ بے چاری تو بہت معصوم عورت ہے، اس کے ساتھ واقعی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ میں عارف صاحب سے کہہ سن کر اسے کہیں کام پر لگوا دوں گا، اس کی تم فکر مت کرو۔ یوں سبھی بندوں کا رزق خدا دیتا ہے۔ ہم تم تو وسیلہ ہوتے ہیں، میں تو اصل تمہاری رضامندی چاہ رہا تھا۔ تم پر کام کا بہت بوجھ آ پڑے گا تا کر لوگی یہ سب کچھ؟“

وہ بے حد تادم نظر آ رہا تھا۔ زینب ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

”جیسی آپ کی مرضی!“ مزید کچھ بھی کہے بنا وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

اس کی اپنی مرضی کیا تھی، یہ اس کا رویہ بربان خود کہہ گیا تھا۔



فرخندہ آ پ، تو صیف بھائی اور صوفیہ آئے تھے۔

کمرے کا منظر بید جذباتی ہو رہا تھا۔ فرخندہ آ پ احسن کو سینے سے لگائے زار و قطار رو رہی تھیں۔ صوفیہ خاموش کھڑی تھی مگر آنسو اس کی آنکھوں سے تواتر سے گر رہے تھے، جنہیں وہ بار بار اپنی سیاہ چادر میں جذب کر لیتی تھی۔ زینب کچھ دیر خود پر ضبط کرتی تھی پھر اس کی سسکیاں لیوں کا قفل توڑ کر ٹکلیں تو بچکیوں میں بدل گئیں۔

صوفیہ لپک کر اس تک آئی تھی۔

”زینب..... زینب..... حوصلے سے کام لیں۔“

اس نے اپنی چادر کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے ”اگر آپ ہمت ہاریں گی تو ان کا حوصلہ کون بڑھائے گا؟“

”یہ کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے ہم پر..... خدا ان قاتلوں کو غارت کرے، اپنا عذاب ان پر نازل کرے جو لوگوں کے گھروں میں آگ

لگاتے پھرتے ہیں۔“

فرخندہ آ پ آنسو پونچھتے ہوئے با آواز بلند بولی تھیں ”میرا گھروں جو ان بھائی..... چلتا تھا تو میں نظر جھکا لیتی تھی کہ کہیں میری ہی نظر نہ لگ

جائے۔“

”آپا..... میری آپا!“ احسن نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے ”اس طرح مت روئیں کہ میں بھی خود پر اختیار کھودوں۔ اپنا

گہرہ، جوان بھائی بچوں کی طرح روتا بلکتا اچھا لگے گا آپ کو؟“ وہ ہنسی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”رولے میرے بچے۔ جی کا بوجھ تو ہلکا ہو گا نا۔“

انہوں نے اسے پچکارا۔

”نہیں آپا!“ اس نے ایک گہری سانس بھر کر بیڈ کی پشت سے کمر لگا لی تھی۔ ”میرے جی پر بوجھ نہیں ہے۔ میرے اندر کوئی بے چینی، اضطراب نہیں۔ ذہن کی سطح پر سوالوں کے سمندر بھی نہیں ہیں۔“ اس نے ایک نگاہ زنب کو دیکھا تھا۔ اس نے نگاہیں چرا لیں۔

”میں پرسکون ہوں۔ بس یہ میرا ساتھ دے اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ اس کا اشارہ زنب کی جانب تھا۔ زنب اس کی بات پر حیران رہ گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ احسن سب کے سامنے ایسی بات کہے گا۔

”ارے یہ تو تیرے سکھ کی دکھ کی سانچھی ہے۔ ایسے ہی رشتے میں بندھی ہوئی ہے تجھ سے۔ اس ڈور کو تو موت ہی توڑتی ہے۔ ایسی پکی اور مضبوط ڈور۔“ فرخندہ آپا نے اسے تسلی دی پھر پلٹ کر زنب کو دیکھا تھا ”زنب! ادھر آؤ پچی چند دنوں میں کیسی صورت نکل آئی ہے دکھ جویا ہے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی پر جم کر اسے اپنے قریب بٹھالیا۔

”دیکھو، کیا کہہ رہا ہے یہ۔“ انہوں نے پیار سے اسے دیکھا ”تمہاری جانب سے تجدید وفا چاہتا ہے۔ محبتوں کی یقین دہانی بیٹی، یہی تو انسان کی اصل طاقت ہے۔ اس کے جینے کا سہارا۔ زندہ رہنے کے لیے سانس کی ذور اتنی ضروری نہیں جتنی کہ پیار محبت کی ذور یہ آدمی کو زندگی سے باندھ رکھتی ہے۔ ورنہ جیتا جاگتا انسان بھی اندر سے مرجائے تو اسے زندہ تو نہیں کہتے اور احسن بیٹا!“ وہ احسن کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

”محبتوں پر کامل یقین رکھنا پڑتا ہے۔ اپنے اعتبار کو مضبوط کرنا پڑتا ہے۔ خود پر بھی اعتبار اور محبوب پر بھی اعتماد زندگی بھل ہو جاتی ہے۔“ جھوٹی موٹی خامیاں، جھوٹے موٹے خلا تو ہر کسی کی زندگی میں ہوتے ہیں۔ حادثات سب کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی خود کو اندر سے ختم کر ڈالے۔ جینے کی امید باقی رہنی چاہیے۔“

زنب نے دیکھا۔ صوفی بڑی خاموشی سے نظر اس جھکائے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو کھوج رہی تھی۔

”شادی کے چند برس گزر جانے کے بعد بھی جب ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی تو فرخندہ بیگم بہت پریشان ہو گئی تھیں۔“ توصیف صاحب نے دیوار پر نگاہ جما کر کہا شروع کیا تھا۔

”لوگ ہمیشہ کمزور پر وار کرتے ہیں۔ مجھ سے کوئی کچھ نہ کہتا لیکن ان سے چپکے چپکے بہت کچھ کہہ دیا جاتا تھا۔ میرے گھر والے، عزیز و اقارب، ملنے جلنے والے ہر ملاقات پر ان سے استفسارات کرتے۔ ان کا دل دکھاتے۔ میری دوسری شادی کر دانے کے مشورے دیتے۔ ایسے میں یہ بہت ڈیر بڈھ ہو گئی تھیں۔ ذہنی پریشانی کا نتیجہ جسمانی بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ بیمار رہنے لگیں۔ ڈر کے مارے مجھ سے کچھ نہ کہتی تھیں۔ ایک دن میں نے قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے مجھے یقین دلایا..... بھر پور یقین..... اپنی محبتوں کا، اپنی وفا کا ساری عمر ساتھ نبھانے کا یقین، اس خامی کو نظر انداز کر کے ہمیشہ دوسری خوبیوں کی نگاہ میں رکھنے اور ان کا اعتراف کرتے رہنے کا یقین۔“

”اور مانو میں مرتے مرتے پھر سے زندہ ہو گئی۔“ وہ سب کچھ یاد کر کے فرخندہ آپا کے لب مسکرانے لگے تھے۔

”اور اب تک اسی یقین کے سہارے زندہ ہوں۔ کچر کبھی میں بیمار نہ پڑی، کچر کبھی مجھے کسی ذہنی اذیت سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ اولاد کی کمی بہت بڑی حقیقت تھی لیکن توصیف کی بے پناہ محبت نے اس کی کا احساس اس قدر زائل کر دیا کہ میں دوسروں کے بچوں کو پیار کر کے ہی نہال ہو جایا کرتی تھی۔ پھر احسن مل گیا تو میرے سینے میں بچتی مست کو قرار آ گیا۔ بہت دل سے چاہا اسے میں نے۔“

”تو زنب بیٹا!“ توصیف صاحب نے اس کا سر ہلایا۔ ”محبت میں بڑی طاقت ہے اور اظہار محبت اس سے بھی بڑی طاقت۔ انسان مرتے مرتے جی اٹھتا ہے۔ اظہار محبت تو عیسیٰ کا تم ہے بچے!“ زنب نے احسن کی جانب دیکھا۔ وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زنب کی

نظریں جھک گئیں۔

وہ لوگ رخصت ہوئے تو وہ چائے کے برتن سیٹے لگی۔

”ایک بات تو بتائیں!“ فرے میں جھوٹے برتن اکٹھے کرتے کرتے اس نے سر اٹھایا تھا ”آپ نے آپا سے یہ کیوں کہا کہ..... کہ.....“

غم غم نہیں یہی نا! وہ اطمینان سے بولا۔

”کوئی خوف ہے آپ کو؟“ وہ آہستگی سے پوچھنے لگی۔

احسن گہری سانس بھر کر چھت کو دیکھنے لگا۔

”زیو!“ پھر وہ بولا تھا ”تم نے سنا تھا، تو صیف بھائی کا جملہ! محبت بڑی طاقت اور اظہار محبت اس سے بھی بڑی طاقت۔ دل میں محبت ہو

تو دوسرے کو بھرپور یقین دلانا پڑتا ہے۔ بس یہی بتانا چاہ رہا تھا تمہیں اور تم اتنی بے وقوف ہو کہ تم سے پہلے میرے دل کی بات فرخندہ آپا اور تو صیف

بھائی نے سمجھ لی۔“

”محبت کا احساس اہم ہے۔“ وہ محض اتنا بولی۔

”پٹیشنل انرجی جب تک کائناتک انرجی میں تبدیل نہ ہو کائنات رواں نہیں ہوتی بے وقوف لڑکی۔“ وہ قدرے شوخی سے بولا تھا۔

زینب برتن لے کر کچن میں چلی آئی تھی۔ آج جیل نہیں آئی تھی۔ وہ برتن دھوئے لگی۔ برتن دھو کر اس نے دھلے برتن شیلف پر رکھے اور گیلی

اسٹنچ سے کاؤنٹر صاف کرنے لگی۔

”تمہاری زندگی میں کچھ تمہارے شایاں شان نہیں۔ ایک چیز بھی نہیں۔“ اچانک ہی اس کے کانوں میں کچھ الفاظ گونجنے لگے۔ وہ گھبرا کر

ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”اس شخص کو چھوڑ کر چلی آؤ۔ میرے پاس اپنی اس راجدھانی میں۔“

زینب کو دل کی دھڑکنوں پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔

گیلا اسٹنچ کاؤنٹر پر پڑا چھوڑ کر وہ کچن سے نکل آئی۔



اس نے رملی سے کہہ کر انوار علی کے آفس فون کروایا تھا۔ آئندہ دوسرے دن ہی چلی آئی تھی۔ وہ زینب کی واحد منوس تھی۔ زینب اس سے

لپٹ کر روئی تو آئندہ کو اس سے علیحدہ کرنا مشکل ہو گیا۔

”بس کرو زینب!“ اس نے زینب کا شانہ تھپکا ”بندوں کے لیے آزمائش ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے ہوتا ہے یہ سب کچھ، ہمت

سے، صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔“

”کرتو رہی ہوں صبر۔“ اس نے آنسو پونچھے ”مر نہ جاتی در نہ۔“

”صبر اور جبر میں بہت فرق ہے زیو!“ احسن آہستگی سے بولا تھا۔ ”اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو صبر کے ساتھ تسلیم کرنا سکھو ورنہ جبر کے ساتھ تو

تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مبرا کا مطلب ہے انسان پر سکون ہو جائے، اسے خدا سے شکایت رہے نہ اس کے فیصلوں سے۔“

”احسن بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ آئندہ نے فوراً تائید کی۔ ”یہ حادثہ ان پر گزرا ہے مگر تم سے زیادہ حوصلے اور برداشت کا مظاہرہ کر

رہے ہیں۔ بالکل نارمل نظر آ رہے ہیں۔ پتا بھی نہیں چل رہا ہے کہ کچھ دن قبل ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔“

”زندگی اسی کا نام ہے آئندہ بی بی۔“ احسن اس کی بات سن کر قدرے افسردہ ہو گیا تھا۔ ”ہم روز اخبار میں اس طرح کی خبریں پڑھتے ہیں

لوگوں پر قیامتیں بیت جاتی ہیں اور ہم سطروں پر سے نظریں گزرا کر مطمئن انداز میں چائے کی پیالی لبوں سے لگا لیتے ہیں۔ علم تو اس وقت ہوتا ہے جب قیامت اپنے سر پر پڑے۔“

وہ سر بیڈ کی پشت سے نکا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

”مجھے جب اس بات کا علم ہوا کہ میری ٹانگ ضائع ہوگئی ہے تو لگا کہ اب میں جی نہیں پاؤں گا..... میں سوچتا تھا کہ میں جس ڈپریشن کا شکار ہوں اس کا انجام پاگل پن یا خودکشی کی صورت میں نکلے گا۔ تیسرا کوئی رستہ بھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نارمل ہوتا گیا۔ میری سوچ میں واضح تبدیلی آتی گئی۔ وجہ جانتی ہیں کیا تھی؟“ اس نے ایک نگاہ آمنا اور زنب پر ڈالی۔

”وجہ وہ ہسپتال اور اس کے مختلف کمروں اور دارڈوں کے مریض تھے، وہاں میں نے جانا کہ دکھ درحقیقت کیا ہوتا ہے اور اسے کیسے برداشت کیا جاتا ہے۔ مجھے علم ہوا کہ اس بھری دنیا میں تنہا دکھی نہیں ہوں، میں پہلا اور آخری شخص نہیں ہوں۔ جس کے سر پر قیامت ٹوٹی ہے یا جس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے اس دنیا میں تو دکھوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ روتے بلکتے، سکتے لوگ قدم قدم پر موجود ہیں جو مجھ سے زیادہ دکھی ہیں، جو مجھ سے زیادہ تکلیف میں ہیں۔ میں نے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس قدر اچھی حالت میں رکھا ہے..... بس پھر..... اس کے بعد اپنی تکلیف بہت معمولی لگی اپنا غم بہت ہلکا لگا جانتی ہوں زنب! اس ٹرین میں ایسی ماں بھی تھی جس کے تین بچے اس حادثے میں جاں بحق ہو گئے اور وہ خود زندہ رہی! ذرا سوچو، اس ماں کا دل کتنے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہوگا کیا زندگی بھر وہ سو پائے گی؟ کیا وہ اس تکلیف دہ منظر کو بھلا سکے گی؟ اوہ گاڈ! ایک ماں کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک بات اور کیا ہو سکتی ہے! پھر بھی وہ زندہ تھی اور اس غم کو سہہ رہی تھی۔“

”بالکل ٹھیک کہتے ہیں احسن بھائی آپ!“ آمنہ کی پلکیں نم ہوگئی تھیں۔ ”اس دنیا کا ہر ذی روح اپنے اپنے حصے کے دکھ اور خوشیاں لکھوا کر لایا ہے خوشیوں کو پا کر تو سب ہی خوش ہو لیتے ہیں، دکھوں پر صبر کرنا اصل حقیقت ہے۔“ احسن نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اپنی پلکوں پر اتر آنے والی نمی کو غیر محسوس طریقے سے چھپایا پھر مسکرا دیا۔

”بہر حال! آپ تشریف لائیں بہت شکریہ! اب ذرا اپنی دوست کو بھی سمجھائیں ذرا سی عقل ادھار دیں یہ تو چہرے پر“ میں بہت غم زدہ ہوں۔“ کا ٹیگ لگائے پھر رہی ہے۔ عیادت کے لیے آنے والا پہلے اس سے مل لے تو سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ میرے لیے تعزیت کرے یا عیادت۔“ وہ ہنس پڑا تھا۔ زنب نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

”اچھا اب اور ذرا ڈاؤنی بن کر مت دکھاؤ..... میں ویسے بھی بستر علالت پر ہوں.....“ وہ سہم گیا۔

آمنہ ہنس پڑی تھی۔

”جاؤ..... اپنی دوست کو چائے وائے پلاؤ..... کچھ خاطر کرو۔ کیوں بھی آمنا! ہمارے دوست نہیں آئے؟“

اس کو دفعتاً انوار علی کا خیال آیا تھا۔

”وہ آفس گئے ہیں نا..... واپسی میں آئیں گے۔“

آمنہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔

زنب اسے لے کر باہر چلی آئی۔ احسن کچھ دیر کے لیے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

آمنہ اور زنب کچن میں چلی آئی تھیں۔ زنب اسے اسٹول دے کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا آمنہ..... اب کیا ہوگا!“

کچھ دیر کے بعد وہ فکر مندی سے بولی تھی۔

”خدا پر بھروسہ رکھو زنب! ایسے کلمات کیوں منہ سے نکالتی ہو؟“ آمنہ رسائییت سے بولی۔

”جو بھی ہوتا ہے وہ خدا کا لکھا ہوا ہے۔ ہم تم اس فکر میں کھلتے رہیں۔ اس نے آزمائش لکھی ہوگی تو ہمارے مقدر میں مبر بھی ہوگا اسی کا عطا کردہ۔ مشکل ہوگی تو راستہ بھی بنایا ہوگا اس مشکل سے نکلنے کا۔ تم بے وقوف لڑکی! احسن بھائی ہی سے سبق سیکھو! کتنے پرسکون اور مطمئن ہیں۔“

”وہ مطمئن نہیں ہیں۔“ وہ آمنہ کی طرف مڑی۔

”وہ ہرگز مطمئن نہیں ہیں۔ محض دکھانے کے لیے یہ اطمینان کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی فکریں ستا رہی ہیں۔ کل کے اندیشے ڈر رہے ہیں۔ جانی ہوا آمنہ! احسن کے کہنے پر میرے خیال میں ہمیں اپنا بجٹ بہت محدود کر لینا چاہیے لیکن بجٹ خواہ کتنا ہی محدود ہو جائے..... انسان جینا تو نہیں چھوڑ دیتا نا، اس کی ضروریات مکمل طور پر تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ آخر کو ایک دن ایسا آئے گا اور پھر پھر کیا ہوگا؟“

”کچھ کچھ نہیں! کیا ہوتا ہے۔“ آمنہ سکون سے بولی۔ ”احسن بھائی تب تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ!“

”بالکل ٹھیک؟“ زنب نے اسے یوں گھورا جیسے اس کی دماغی حالت پر اسے شبہ ہوا ہو۔

”ہاں دنیا میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح کی مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ کام کرتے ہیں، ہر طرح کا کام! نوکریاں کرتے ہیں، اپنی زندگی نارمل لوگوں کی طرح گزارتے ہیں۔ تم کیا سوچے بیٹھی؟“

”یہ نہیں آمنہ!“ وہ لبوں کو کانٹے لگی ”میں، میں شاید بہت کم ہمت ہوں۔ مجھ میں مشکلات کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے، دنیا ختم ہوئی، زندگی بس یہیں تک تھی، اب کوئی امید نہیں، کوئی آسرا نہیں۔“

آمنہ تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے زنب سے شاید اتنی کم عقلی کی امید نہ تھی۔

”زینی! وہ عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کے شوہر سفر پر جاتے ہیں تو پلٹ کر نہیں آتے۔ جن کے ساتھ بچوں کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے..... جو کبھی گھر کے دروازے سے آگے نہیں گئی ہوتیں وہ بھی جیتی ہیں نا! اپنے بچے بھی پالتی ہیں، اصل میں تمہارا ایمان کمزور ہے زنب! تمہیں خدا کی ذات پر کامل بھروسہ نہیں۔“ زنب نے چائے اور دیگر اشیاء مڑے میں رکھیں۔

”اگر ایسا ہے بھی تو میں نے اپنا دکھ خود تو نہیں بنایا؟“ وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولی تھی ”اچھا..... آؤ باہر چل کر چائے پیئیں۔“

آمنہ گہرا سانس لے کر کھڑی ہوئی تھی۔



جیلہ کے چلے جانے سے زندگی بے پناہ مصروف ہو گئی تھی۔ سارا دن اس کے کام ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

ایک کام سے نکلتی تو دوسرا اس کا منظر ہوتا۔ پھر احسن ابھی بیڈ پر تھا۔ اس کے زیادہ تر کام بستر پر ہی سرانجام پاتے تھے۔ زنب چند دنوں ہی میں گھبرا گئی۔ سویرے اٹھ جانا، احسن کی انٹھے میں اس کی مدد کرنا، اسے ہاتھ روم تک لے جانا، پھر اس کا ناشتہ بنانا، اس کی شیدنگ کا سامان اس کے آگے سیٹ کرنا، پھر اٹھانا اس کے کپڑے وغیرہ تبدیل کرنا، میلے کپڑے دھونا ان کاموں میں ہی اس کا آدھا دن نکل جاتا کچن یونہی پھیلا ہوا ہوتا۔ ہانڈی روٹی کرتے کرتے اسے چار بج جاتے۔ وہ تھک کر چور ہو جایا کرتی تھی۔

وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ اس نے سبزی والے سے مٹر لے لیے تھے اور اب تین بجے بیٹھ کر مٹر پھیل رہی تھی۔ ساتھ ہی اپنی عقل کو کوستی جاتی تھی۔

”ضرورت کیا تھی مجھے یہ منخوس سبزی لینے کی۔“ وہ پھیلیوں کے جھٹکے بھنا بھنا کر ادھر ادھر بھیج رہی تھی۔ ”کوئی اور چیز لے لیتی۔ لیکن کیا لیتی ہر چیز مہنگی، آگ لگی ہوئی لوگ پتا نہیں کیسے کم پیسوں میں گزارا کرتے ہیں۔“ ڈور بیل بجی تو وہ گھڑی پر نگاہ ڈال کر بھناتی ہوئی دروازے تک آئی۔ لاک کھول کر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا۔ پھر اس پر منوں اوس پڑ گئی۔

باہر ملٹی اور میر سکندر علی کھڑے تھے۔ ان کے کپڑوں سے اٹھتی پرفیومز کی مسکورتیں مہک رہی تھیں۔ وہ اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتی تھیں۔ سکندر علی تو سدا کا خوش لباس آدمی تھا، آج رات بھی بڑی نفاست سے تیار ہو کر آئی تھی۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گی۔“ رملی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ کسی رو بوٹ کی طرح ایک طرف کو ہو گئی۔ وہ دونوں اندر چلے آئے تھے۔ بے شک انداز میں پھیلا ہوا گہرا، گنداپکن اور سب سے بڑھ کر وہ خود بخوبی، گندے، میلے لباس میں ملبوس، بالوں کو جوڑے کے انداز میں سر پر لپیٹے ہوئے۔

نہیب کو یاد تھا کہ اسے زندگی میں کبھی اتنی شرمندگی ہوئی تھی، جتنی آج ان دونوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ رملی تو اس کے ہر روپ کی عادی تھی لیکن میر سکندر علی! نہیب کو اپنے کانوں کی لوئیں تک سرخ ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ جو اسے کسی دیوی کی طرح پوجتا تھا..... تلو پٹھر کہتا تھا اپنی تلو پٹھر کا یہ روپ دیکھ کر اس نے نجانے کیا سوچا ہو گا۔

”ہم لوگ احسن بھائی سے ملنے آئے ہیں۔“ اسے بالکل خاموش دیکھ کر رملی بولی تھی۔ ”سکندر کو آج میں نے اس سانچے کے متعلق بتایا تو یہ ضد کر کے چلے آئے..... تمہارے مسیڈ سے ملنے۔“

میر سکندر علی ادھر ادھر نہیں دیکھ رہا تھا۔ بس ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا۔ نہیب سے نظر ملی تو چونک اٹھا۔

”آئی ایم ویری سوری نہیب خانو! مجھے یہ سب جان کر افسوس ہوا ہے۔ کہاں ہیں آپ کے مسیڈ؟“ نہیب گہرا سانس لے کر انہیں احسن کے کمرے تک لے آئی تھی۔ احسن بھی تیل کی آواز سے جاگ چکا تھا۔ نہیب نے کمرے کی لائٹ جلائی تو بازو آنکھوں پر سے ہٹا کر دیکھنے لگا۔

”احسن..... رملی اور اس کے بھائی آئے ہیں آپ سے ملنے۔“ اس نے اندر آ کر اسے بیٹھنے میں مدد دی۔ میر سکندر علی نے احسن سے مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

”افسوس ہوا..... آپ کے اس حادثے کے بارے میں جان کر۔“ وہ رسماً بولا تھا۔

پھر اپنا سنگار نکال کر سلگانے لگا۔ نہیب نے احسن کے ناگوار تاثرات کا معائنہ کیا پھر سر جھکا کر کمرے سے نکل گئی۔

کچھ دیر وہ وہیں دروازے کے پاس رکی تھی پھر کچن میں چلی آئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر وہ کچن صاف کرنے لگی اندر جا کر بیٹھنے کے خیال سے اسے ہول آرہے تھے۔ نجانے کھلی کھلی، صاف گفتگو کرنے والا میر سکندر علی احسن سے کیا باتیں کر رہا تھا اور احسن جس کے چہرے کا ہر ہر نقش ناگواری کا واضح اظہار کر رہا تھا..... اسے کیا جواب دے رہا تھا اور رملی! جو آج کل طنز سے بھری، معنی خیز گفتگو کرنے لگی تھی کیا کیا اشارے دے رہی تھی۔

اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔ وہ رہ کر اسے رملی پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر اسے ضرورت کیا تھی سکندر علی کو یہاں لے کر آنے کی۔ وہ سب کچھ جانتی تھی، سب کچھ پھر احسن اور سکندر کی یہ ملاقات کروانے کا آخر کیا جواز تھا۔

”کیا بات ہے کچھ ڈپرے ہو؟“ وہ چونک اٹھی تھی۔ رملی کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔ مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔

”ہم نے تمہیں پریشان کر دیا شاید؟“

”نہیں پریشانی کیسی؟“ نہیب جان بوجھ کر پرسکون لہجے میں بولی ”احسن کی عیادت کے لیے تو دن رات کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا ہے۔ اب تو میں عادی ہو گئی ہوں۔“

”سکندر ہی نے ضد کی ورنہ میں تو۔“

”رہنے دو!“ نہیب نے اس کی بات کاٹ دی ”میں نے کہا تھا میں عادی ہوں۔“ رملی نے بغور اسے دیکھا۔

پھر کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

نہنہب کہوں میں چائے نکال رہی تھی جب سکندر علی اٹھ کر چلا آیا۔

”ویل..... اب ہمیں چلنا چاہیے..... رملی؟“

”چلو!“ وہ فوراً بولی نہنہب نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا۔ آخر وہ اتنی جلدی کیوں اٹھ گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایسی ویسی کوئی بات تو نہیں ہوگئی تھی۔ اسے وہم ستانے لگے۔

”میٹھیں، میں نے چائے بنائی ہے۔ پی کر جائیں۔“ وہ بچن کے دروازے تک چلی آئی۔

”آپ کے گھر آنا ہی ہمارے لیے آزر ہے نہنہب خاتون!“ وہ مسکرا دیا ”چائے کی خاص ضرورت نہیں۔“

”پھر بھی.....“ وہ دبا دبا سا اصرار ہی کر پائی۔

”پھر سی۔“ رملی بولی تھی ”اچھا میں ذرا احسن بھائی سے دعا سلام کر لوں۔“ وہ کھٹ کھٹ کرتی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ نہنہب نے سکندر علی کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ طمانیت سے بھرپور مسکراہٹ۔

”پھر کوئی فیصلہ کیا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”جی..... جی؟“ اپنے گھر میں ہی اس سوال پر ہراساں ہوگئی۔

”میرا خیال ہے فیصلے مزید آسان ہو گئے ہیں تمہارا کیا خیال ہے؟“ نہنہب تھوک نکل کر خاموش ہو رہی۔

”جلد آجاؤ میں منتظر ہوں اور بہت سی خوشیاں۔“

رملی لوٹ آئی تھی۔

”چلیں۔“ سکندر علی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

اس نے محض سر ہلایا تھا۔



فاصلوں کا زہر

طاہر جاوید مغل کا خوبصورت ناول۔ محبت جیسے لازوال جذبے کا بیان۔ دیار غیر میں رہنے والوں کا اپنے دیس اور وطن سے تعلق اور انوث رشتوں پر مشتمل ایک خوبصورت تحریر۔ ان لوگوں کا احوال جو کہیں بھی جائیں، اپنا وطن اور اپنا اصل ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ ناول فاصلوں کا زہر بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

احسن کا موڈ کچھ خراب ہو گیا۔ زینب نے کمرے میں تین چار پکڑے گھر وہ خاموشی سے ٹی وی دیکھا رہا۔ کچھ دنوں پہلے ہی زینب نے ٹی وی کمرے میں سیٹ کر دیا تھا کہ وہ سارا دن کام میں مصروف رہتی تو احسن بور ہو جاتا تھا۔ اب وہ ٹی وی لگا کر بیٹھا رہتا تھا۔

وہ سیب کاٹ کر لائی تو وہ بے تاثر چہرہ لیے ٹی وی اسکرین کو گھور رہا تھا۔

”یہ شخص کیوں آیا تھا؟“ وہ اچانک پوچھ بیٹھا۔

زینب حیران رہ گئی۔ پھر خود پر قابو پا کر بولی تھی۔

”آپ کی عیادت کے لیے اور بھلا اس کی آمد کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟“

”عیادت!“ وہ ہنس دیا۔ ”اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اس قدر گہری تھی زینب کہ اب تک مجھے اپنے جسم پر چھتی محسوس ہو رہی ہے۔“

زینب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ وہ اس بات کی تردید نہ کر سکتی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔

”تم نے انھیں اندر لا کر حیات کی۔ باہر سے ہی نال دیتیں، بہانہ کر دیتیں کوئی۔“ احسن کو جیسے کوئی چھین سی تھی۔

زینب کو احساس ہوا کہ وہ اس سے ناراض نہ تھا بلکہ اسے میر سکندر علی کے انداز نے دکھ پہنچایا تھا۔ ان نظروں میں فتح اور سرشاری کا جو

عجیب سا انداز ہلکورے لے رہا تھا، اس سے احسن کے احساسات کو بھیس پہنچتی تھی۔

”دراصل وہ رملی کے ساتھ آیا تھا اس لیے میں منع نہیں کر سکی۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تم نے رملی کا لاکٹ واپس کر دیا؟“ احسن نے اچانک پوچھا۔ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اس موقع پر اچانک پوچھے جانے والے اس سوال کا

مقصد اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ وہ لاکٹ اب تک اس کے پاس موجود تھا۔ یہ درست تھا کہ اس نے کتنی بار اسے لوٹانے کا قصد کیا تھا لیکن ہر مرتبہ کچھ نہ

کچھ ایسی بات ہو جاتی تھی کہ وہ لاکٹ اس کے پاس ہی رہ جاتا تھا۔

”نہیں کیا؟“ اسے سوچ میں گم دیکھ کر احسن نے آہستگی سے پوچھا۔

”جی؟“ وہ چونکی ”نہیں ہاں کر دیا۔“

نجانے کیوں احسن کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

”زینو۔“ کچھ دیر کے بعد وہ بولا تھا ”ہمارے لیے مشکل دور شروع ہوا ہے۔ نجانے تم ان مشکلات کو فیس کر پاؤ گی یا نہیں، تم بہت کمزور

ہو۔“

زینب خاموش بیٹھی رہی۔

”میری تمام توقعات تم سے وابستہ ہیں۔ زندگی میں اب بس تم ہی تم ہو..... اور کچھ نہیں۔ پہلے بھی ایسا ہی تھا مگر اب اس حقیقت میں

شدت آگئی ہے۔ کبھی کبھی میں اس حقیقت پر غور کروں تو خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے کبھی کبھی اعتبار دلایا کرواپنا، اپنی محبت کا۔“

اس نے زینب کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ وہ بے بسی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو میر سکندر علی نے کہا تھا۔

”فیصلے مزید آسان ہو گئے ہیں۔“

”جلد آ جاؤ..... میں منتظر اور بہت سی خوشیاں۔“

وہ اسے جواباً کچھ بھی نہ بول پائی تھی اور اب احسن ایسا اس سے محبتوں کا اعتبار مانگ رہا تھا۔



عاشق حسین آیا تھا۔ وہ احسن کا بہت اچھا دوست تھا۔ غالباً سب سے اچھا۔ شادی کے بعد ان لوگوں کی سب سے پہلی دعوت بھی اسی نے کی

تھی۔ مل میں وہ احسن کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ زینب سے بھی اس کی اچھی دعا سلام تھی احسن اسپتال میں تھا تو اس شخص نے اس کی بہت خدمت کی تھی۔

بہت ساتھ دیا تھا ان لوگوں کا۔

نہیب نے احسن کے کمرے تک اس کی رہنمائی کی پھر چائے وغیرہ بنانے کے لیے کچن میں چلی آئی۔ اسے عاشر کا انداز قدرے عجیب محسوس ہوا تھا۔ افسردہ افسردہ سا، شرمندہ شرمندہ سا۔

وہ چائے بنا کر کمرے میں آئی تو وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ احسن کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ نہیب نے چائے میز پر رکھی تو احسن نے وہ لفافہ اس کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ سنہیال کر رکھ دو۔ الماری میں۔“

”کیا ہے اس میں؟“ نہیب نے اسے تھام لیا۔

”پیسے ہیں۔“

نہیب نے یونہی ذرا سا کھول کر دیکھا۔ اس میں ہزار ہزار کے کئی نوٹ تھے۔ وہ خوش ہو گئی۔

”یہ ہمارے پیسے ہیں احسن؟“ احسن نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی پھر افسردگی سے مسکرا دیا۔

”ہمارے ہی ہیں۔ مل والوں نے دو ماہ کی تنخواہ اور دیگر واجبات بھجوائے ہیں۔“

احسن نے بے بسی سے عاشر کو دیکھا تھا۔ جیسے اپنی بیوی کی کم عقلی پر متاسف ہو۔

”بھائی! انجانے کیوں آپ لوگوں کو بری خبر سنانے کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ چکی ہے۔“ عاشر شرمندگی سے بولا تھا۔ ”احسن کی جگہ جزل منیجر نے نیا بندہ رکھ لیا ہے۔ احسن کے جوہ واجبات مل کی طرف نکلتے ہیں، یہ وہ رقم ہے۔“

”اوہ!“ اس کی ساری کی ساری خوشی غارت ہو گئی۔

تو گویا وہ اس کے ملازمت سے فارغ کیے جانے کی خبر لے کر آیا تھا۔ وہ رقم نبھانے کتنی تھی، لیکن جس قدر بھی تھی، ایک طویل عرصے کے لیے انہیں ان ہی پیسوں میں گزار کرنا تھا۔

ایک گہری سانس بھر کر وہ الماری تک آئی تھی۔

چند لمحوں قبل اسے جولوفا پھولا پھولا اور بھاری محسوس ہوا تھا، اب ایک دم ہلکا ہو گیا تھا۔ اس میں موجود رقم بے حقیق معلوم ہوتی تھی۔

لفافہ الماری میں رکھ کر وہ بے بسی سے باہر آ گئی۔ وہ دونوں مل کی پالمیوں پر بحث کر رہے تھے۔ نہیب کو ان باتوں سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اس کے دماغ میں چکراتے رہنے کے لیے یہ بری خبر ہی کافی تھی۔

عاشر چلا گیا تو وہ چائے کے جھوٹے برتن کچن میں رکھ کر کمرے میں آئی۔ احسن دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر کچھ سوچ رہا تھا۔

”آپ کے مل والے تو انتہائی خود غرض اور احسان فراموش ہیں۔“ وہ قدرے غصے سے بولی تھی ”آخر کو آپ مل ہی کے کام سے گئے تھے نا۔ انہیں اس بات کا احساس کرنا چاہیے تھا۔ لے کر ملازمت سے ہی فارغ کر دیا۔“

”ہر کوئی اپنا فائدہ، اپنی آسانی دیکھتا ہے نہیب!“ وہ ہولے سے مسکرا دیا ”میرا کام ہی ہر وقت بھاگ دوڑ کرنے والا تھا۔ اب ظاہر ہے، میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ پھر یہ کہ زخم وغیرہ ٹھیک ہونے میں نبھانے کتنا عرصہ لگ جائے۔ اتنے عرصے تک وہ میرا انتظار تو نہیں کریں گے نا! انہیں تو اپنا کام کروانا ہے۔ خواہ میں کروں خواہ کوئی اور۔“

”اب کیا ہوگا؟“ وہ فکر مندی سے بولی ”یہ قلیل رقم بھلا کب تک ہمارا ساتھ دے گی۔“

”اللہ مالک ہے، تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میرے زخم ٹھیک ہو جائیں تو میں کوئی جاب ڈھونڈوں گا۔ بیٹھ کر تو میں اب بھی سارا دن کام کر سکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے، میرے ہاتھ، میری آنکھیں، میرا دماغ سلامت ہے۔“

زینب کو احساس ہوا کہ وہ اس کی باتوں کو ماسٹڈ کر رہا تھا۔ زینب کی پریشانی اسے احساس جرم میں مبتلا کر رہی تھی۔

”آج کل نوکری ملنا کون سی آسان بات ہے۔“ وہ پھر بھی کہہ گئی تھی ”مہینوں خوار ہونا پڑتا ہے۔“

پھر؟“ وہ زچ ہو گیا تھا ”کیا کروں پھر؟ میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے میں ذمہ دار ہوں ان ساری باتوں کا؟“

”میں نے یہ کب کہا؟“ وہ گھبرا گئی ”میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ میں اگر پریشان ہوں تو بے وجہ نہیں ہوں۔“

”پریشان مجھے ہونا چاہیے۔ میں ابھی زندہ ہوں پریشان ہونے کے لیے۔“ وہ تیز آواز میں بولا ”تم فکر مت کرو۔ بھیک بھی مانگنا پڑی تو تمہیں بھوکا نہیں ماروں گا۔“

”اوہ احسن!“ وہ کپکپاتے لبوں سے بولی پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر ہلک ہلک کر رودی۔ احسن ہولے ہولے اپنی پیشانی پر کے

مارنے لگا۔

”تم..... تم کیا کسی کا حوصلہ بڑھاؤ گی۔“ وہ بڑبڑانے لگا تھا ”تم کیا شیئر کرو گی کسی کی فکر کو، تم سے تو یہ توقع ہی عبث ہے۔“

زینب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی سسکیاں بلند تر ہو گئیں۔

”زینب پلیز! مجھے تنگ مت کرو۔“ وہ تنک کر بولا تھا ”ایسے ہی اتم کرنا ہے تو باہر چلی جاؤ۔“

وہ اٹھ کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔



دن اداسیوں سے اتنے بو جھل ہوئے تھے کہ زینب کا سانس رکنے لگا تھا۔ بہت دنوں کے بعد وہ رملی کی طرف آنکلی۔ رملی اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

ڈرائی فروٹ سے بھری ٹرے اس نے نزدیک رکھی ہوئی تھی زینب کو دیکھ کر مسکرا دی۔

”زہ نصیب! آؤ ادھر ہی آ جاؤ۔“ زینب اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

”تم اس طرح اکیلے کیسے رہ لیتی ہو رملی؟ میرا تو دو دنوں میں جی الجھنے لگتا ہے۔“

”بندے کے اندر ہی تنہائی آجی ہو تو اسے باہر کی زیادہ پروا نہیں رہتی۔“ وہ قدرے بے فکری سے بولی۔ ”لو ڈرائی فروٹ کھاؤ۔“

”نہیں شکریہ!“ اس نے اداسی سے سر ہلادیا ”میرا ہی الوقت کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے۔“

”احسن بھائی کیسے ہیں؟“ اس نے بھی ہاتھ جھاڑ کر ٹرے ایک طرف سرکادی۔

”اب طبیعت بہت بہتر ہے۔ کچھ چڑچڑاپن آ گیا ہے مزاج میں.....“ وہ ہر سوچ انداز میں بولی تھی۔

”ہاں یہ تو خیر ایک نیچرل بات ہے، ایک وقتی اثر ہے حالات کا، نارمل ہو جائیں گے۔ میں بھی کبھی کبھی بہت چڑچڑی ہو جاتی ہوں تم نے

فیمل کیا ہوگا۔“

”ان کی جاب بھی چھوٹ گئی ہے نا۔“ زینب آج بے حد افسردہ تھی ”اس کی بھی ٹینشن ہے۔“

”اماں..... چائے تو لے آئیں۔“ رملی نے نکار کر کہا پھر اس کی جانب متوجہ ہو گئی ”ایک بات کہوں زینب۔“

”ہاں کہو۔ باتیں کرنے ہی تو آئی ہوں۔ دل بہت اداس ہو رہا تھا!“

”احسن بھائی کے لیے یہ بے حد کڑا وقت ہے۔ بہت تکلیف دہ۔ بہت اذیت ناک۔ یوں سمجھو، وہ ایک ایسے صحنور میں پھنسے ہوئے ہیں

جہاں سے خود نکلتا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ انہیں کسی کی مدد درکار ہے اور وہ ”کسی“ تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔“

”بھنور؟“ زنب نے اسے دیکھا۔

”ہاں سوچوں کا بھنور..... یہ بھنور بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اچھے بھلے بندے کو پاگل بنا دیتا ہے۔ ایسے میں کسی سچے ہمدرد کی، کسی چاہنے والے ساتھی کی، کسی بے لوث نگہداشت سے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس وقت بھنور کی زد میں ہیں۔“

”میں نے تو ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔“ وہ حیرانی سے بولی۔

”شاید اس لیے کہ تمہارے احساسات آج کل آدھے آدھے بنے ہوئے ہیں۔“ اس نے زنب کی آنکھوں میں جھانکنا تھا زنب کی نگاہیں جھک گئیں۔

”میں بہت تجربہ کار عورت ہوں زین۔“ زملی صوفی کی پشت سے سر اور میز کے کنارے پر ایڑی ٹکا کر اطمینان سے نیم درواز ہو گئی۔

”ہر طرح کے حالات سے گزری ہوئی ہر طرح کی سچویشن فیس کی ہوئی ہے میں نے، دھوکے بھی کھائے ہیں لیکن ان سے تجربوں کو بچھٹلی گئی ہے، میں تمہیں ایک بالکل سیدھا، سچا مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ ایک سچے ہمدرد کی حیثیت سے۔“

زنب منہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔

”تم خوش قسمت ہو جو تمہیں احسن جیسا جیون ساتھی ملا ہے۔ اس کی قدر کرو اور اپنے دل کی دنیا میں اسے بسا کر باہر، نو چانس، کاسائن بورڈ لگا دو۔ تم بہت حسین ہو بہت زیادہ حسین اتنی کہ تمہیں دیکھ کر عورتوں کا دل بے ایمان ہونے لگتا ہے۔ مرد تو بھر مہر دیں لیکن زین! اپنے تجربوں سے میں نے یہی سیکھا ہے۔ کہ حسن ہمیشہ پارسائی کا محتاج رہتا ہے۔ پارسائی نہیں تو حسن نہیں۔ محض بد صورتی..... داغ داغ چہرہ اپنی زندگی پر خدا کا شکر ادا کرو زنب اور اپنا بسا بسا گھر بسا ہی رہنے دو۔“

زنب چند لمحوں کے بعد سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ زملی اسے کیا یاد کرانا چاہ رہی تھی۔

اماں چائے لے آئی تو ان دونوں کے درمیان چند لمحوں کی خاموشی در آئی۔ چائے کا کپ لے کر زملی سیدھی ہو بیٹھیں۔

”میری تنہائی تمہیں کوفت میں مبتلا کر دیتی ہے نا زین۔“ پھر وہ بولی تھی۔ ”اسی لیے میں تمہیں خوش قسمت کہتی ہوں کہ تمہارا ”اندرا“ آباد ہے۔ تمہیں تمہارے شوہر کی بھرپور توجہ، محبت اور اعتبار حاصل ہے۔ اسے اپنی زندگی کا حاصل سمجھو۔ چاند تاروں کی تمناسات کرو۔ ان سے کسی کی جھولی نہیں بھرتی۔ ہاں دل میں سوراخ ہوتے جاتے ہیں۔“ زنب نے چند گھونٹوں میں چائے ختم کر کے پیالی میز پر رکھ دی تھی۔ ایسی سنجیدہ معنی خیز باتیں اسے ہمیشہ ہی کوفت میں مبتلا کرتی تھیں۔

”میں چلوں گی اب“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”اچھا!“ زملی نے گہرا سانس بھرا اور دھبی پیالی رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

آج خلاف معمول وہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئی تھی۔

”احسن کو میری طرف سے پوچھنا بہت اچھے انسان ہیں وہ۔“

”ہاں ضرور۔“ زنب رسما بولی۔

”اور..... انہیں اس بھنور سے نکالنے میں ان کی مدد کرنا جو میں نے محسوس کر لیا نجانے تم کیوں نہ کر سکیں.....“ آخر میں وہ لمبوں میں ہی بڑبڑاتی تھی۔

زنب تیز رفتار قدموں سے گھر کی سمت چل دی تھی۔



دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ حیران رہ گئی۔ احسن اپنی جگہ پر نہ تھا۔ وہ گہرا کر انہی تھی۔

”احسن..... احسن۔“ وہ آوازیں دیتی ہوئی باہر آئی تو دیکھا۔ وہ لیکن میں تھا ایک بازو کے نیچے بیساکھی دبائے دوسرے ہاتھ سے چائے کا پانی رکھ رہا تھا۔

نہنہ نے جلدی سے برتن اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں اور آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟“

”کیا ہو گیا ایسا؟“ وہ پرسکون انداز میں بولا۔ ”چائے ہی بنا رہا ہوں، کوئی پہاڑ تو نہیں کھود رہا۔ تم گہری نیند میں تھیں۔ دو تین مرتبہ آواز دی لیکن تمہاری آنکھ نہیں کھلی۔ میں نے سوچا، تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔“

”لیکن اتنی صبح کیوں اٹھ گئے آپ؟ منہ بھی دھو چکے ہیں؟ میری مدد کے بغیر ہی؟“ وہ حیران تھی۔ وہ متانت سے مسکرایا۔

”زینو! ساری عمر تم پر بوجھ بنا رہا ہوں گا کیا؟ میں اب ٹھیک ہوں۔ اپنے کام خود کر سکتا ہوں اور مجھے عادت ہوئی چاہیے۔ لوگ تو ہاتھوں سے محروم ہوتے ہوئے اپنے کام سرانجام دے سکتے ہیں، میں تو چھریا ایک ٹانگ سے ہی محروم ہوا ہوں۔“

نہنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اچھا آپ نہیں۔“ اس نے رخ موڑ لیا۔ ”باہر جائیں میں چائے لارہی ہوں۔“

”میں چائے پی کر ذرا کام سے جاؤں گا۔“

”ہائیں۔“ وہ چونک اٹھی۔ ”لیکن کہاں۔“

”ایک دوست کے پاس جاب کی بات کرنی ہے۔“

”لیکن کیسے جائیں گے؟“ وہ حیران تھی۔ ”موٹر سائیکل پر کیسے بیٹھیں گے؟“

”ٹیکسی سے جاؤں گا۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

نہنہ کو احساس ہوا، اس کے سوالات احسن کی دل شکنی کا باعث بن جاتے تھے۔ اسے اپنے رویے کا احساس ہوا لیکن وہ بے ساختگی میں ایسی باتیں کر جاتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر چائے بنانے لگی تھی۔

احسن ناشتہ کر کے اپنی بیساکھی سنبھالنے لگا۔ نہنہ ایک تک اسے دیکھنے لگی۔ کس قدر بے چارگی تھی۔ اس کے انداز میں وہ کتنا ادھورا معلوم ہو رہا تھا۔

”اچھا زینو میں ذرا دیر سے آؤں گا۔“ وہ جارہا تھا۔

نہنہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ بیساکھی کی تک اس کے دماغ پر تھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

”کیا رہ پاؤں گی ساری عمر ایک ادھورے انسان کے ساتھ۔“

وہ سانس روکے سوچ رہی تھی۔

”ایک بہترین آپشن ہوتے ہوئے بھی.....“



سوچنے کے لیے اس کے پاس بہت کچھ تھا لیکن دماغ کچھ سوچنے پر آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔ ایک سنا سنا سا اس کے اندر گھر کر رہا تھا۔ وہ اس ستارے سے خوفزدہ تھی۔

دن بھر یونہی خالی الذہنی کے عالم میں گزرا۔ زندگی بھر کے فیصلوں کی ڈور ہاتھ میں تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی تھی۔ کس ڈور کو ہلانا تھا، کس کو پکڑنا کس کو چھوڑنا تھا، وہ قطعی طور پر سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ہاں، اس قدر طے تھا کہ حالات کے جس حصے سے وہ گزر رہی تھی، وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔ آنے والا وقت اسے ایک تند و تیز سیلابی ریلے کی مانند اپنی جانب بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اپنا وجود کسی نیچے کی مانند حقیر!

زندگی کے لیے بہت خواب بنے تھے اس نے! رات رات بھر جاگ کر اپنے لیے سپنوں کے سندر محل تعمیر کیے تھے۔ وہ سپنے اور ان میں چپکتے و محل اس کے لیے بہت قیمتی تھے۔ لیکن بنانے کیا ہوا تھا۔ اس سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہوئی تھی یا تقدیر کو ہی اس سے کچھ بیز تھا۔ کچھ بھی تھا لیکن سپنے ردشہر ہے تھے۔ ایک ایک کر کے تمناؤں کے محل زمیں بوس ہوئے جاتے تھے۔ سن آنگن سونا، ہوا جاتا تھا اور یہ سونا پن اس کے لیے سونا پن روح تھا۔ ایسی روتی، سسکتی، ہلکتی زندگی جینے سے حاصل بھی کیا تھا۔ اس سے تو بہتر بندہ قبر میں جا کر سکون سے لیٹے۔

وہ کافی دیر کے بعد لوٹا تھا۔ نینب کے گم صم انداز اسے چونکا گئے تھے۔

”خیریت؟“ پانی کا گلاس تھانے کے بعد وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

ہر چند کہ خود اس قدر مشقت سے اس کا سانس پھول رہا تھا اور چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ نینب نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میکا کی انداز میں اس کی بیساکھیاں اٹھا کر سائیڈ میں رکھیں اور خود کمرے سے باہر نکل آئی۔ کچن میں آکر کھانا گرم کرنے لگی۔

کھانا ٹرے میں رکھ کر وہ واپس کمرے میں آئی تو تھکا ہارا، پڑمردہ احسن آنکھوں پر بازو رکھے نیچے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

”کھانا کھالیں!“ اس نے ٹرے اس کے آگے رکھ دی۔

احسن نے چونک کر بازو ہٹایا تھا۔ غالباً وہ کسی بہت گہری سوچ میں تھا۔

”تم نے کھالیا ہے؟“ وہ بیٹھے ہوئے پوچھنے لگا۔

”نہیں، مجھے بھوک نہیں!“ اس کا سابقہ میکا کی انداز پر تقرر تھا۔

احسن ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھنے پر مجبور ہوا۔

”کیا بات ہے زینو؟“ وہ بڑی رسائیت سے بولا تھا ”تھک گئی ہو یا طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہاری؟“

”کیا ہوا ہے مجھے؟ ٹھیک تو ہوں!“ وہ قدرے حیرانی سے بولی ”نجانے کیوں آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔“

احسن کے لبوں پر ایک اداس مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی۔ وہ محبت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”تمہیں کسی کی خبر ہے نہ رہے زینو! مجھے تمہارے ہر انداز کی خبر رہتی ہے۔“

نینب کی نظریں بے اختیار ہی جھک گئی تھیں۔

”زینو! ادھر آؤ میرے پاس آؤ۔“ وہ اسے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”ادھر ہی تو ہوں آپ کے پاس ہی۔“

”نہیں، یہاں آؤ!“ اس نے محبت بھرا اصرار کیا۔

نینب اٹھ کر اس کے برابر جا بیٹھی ہر چند کہ اس کے انداز میں سادہ پن صاف ظاہر تھا۔

”زینو۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”میری جان! میں جانتا ہوں، تم بہت نازک ہو۔ ذرا سی تیز، ذرا سی گرم ہوا تمہیں مر جھا دیتی ہے۔ حالات کی ذرا سی سختی سے تم خوفزدہ ہو جاتی ہو گھبرا جاتی ہو۔ لیکن زینو! زندگی گزارنی ہے تو اپنے اندر حوصلہ بھی پیدا کرنا ہو گا یہ زندگی ہر انسان کے ہاتھ میں ایک سوانامہ ضرور تھماتی ہے اور اس پر کچھ سوال اس قدر مشکل ہوتے ہیں کہ ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے، عقل ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ صرف ہمت اور حوصلے سے ہی اس امتحان سے سرخرو ہو کر گزارا جاسکتا ہے۔ پریشان ہونے سے، دماغ لڑانے سے، خود کو تھکانے

سے کچھ حاصل نہیں ہوتا زینب! وہ لچھ بھر کر کا تھا۔

زینب اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

”اور یہ خیال رکھو کہ تمہاری ہمت، میری ہمت ہے۔ تمہارا حوصلہ، میرا حوصلہ ہے۔ جہاں تمہارے قدم ڈگر گئے میں وہیں ٹھوکر کھاؤں گا، گر جاؤں گا..... میرا ساتھ دو زینو! مجھے اس وقت تمہاری مسکراہٹ کی، تمہاری آنکھوں میں چمکتی روشنی کی، تمہارے ہاتھوں کی پراعتماد حرارت کی ضرورت ہے..... میرا یقین کرو، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں تمہارا سائبان ہوں، مجھ پر بھروسہ رکھو حالات کی گرم دھوپ میں تمہیں جھلنے نہیں دوں گا بس بد قسمتی یہی ہے کہ فی الحال اس سائبان کو تمہارے ہی سہارے کی ضرورت ہے، اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے!“

زینب نظریں جھکائے اپنے دوپٹے کا کونا انگلی کے گرد لپیٹی اور کھولتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر احسن کی تمام گفتگو کے جواب میں کوئی تاثر نہ ابھرا کا تھا۔

”زینو،“ اس نے شہدا آگئیں لچھ میں اسے مخاطب کیا۔

”جی!“

”کچھ سمجھی ہو؟ میں نے کیا کہا ہے تم سے؟“

”جی!“

”ادھر دیکھو میری طرف!“ اس نے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

زینب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہر چند کہ مرجھار ہی تھی مگر پھر بھی محسوس ہوتی تھی۔ یقین مانگتی محبت امید ویم کے سمندر میں کبھی ڈوبتی ابھرتی نظر آتی تھی۔ وہ اس سے کچھ چاہ رہا تھا، کچھ مانگ رہا تھا، دست سوال دراز کر رہا تھا۔ اعتماد، یقین، محبت، حوصلہ اور زینب کو اپنا دامن دل خالی لگتا تھا۔

اس نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا لی تھیں، مبادا وہ اس کے دم توڑتے جذبات کی لاشیں اس کی آنکھوں میں تیرتی دیکھ لیتا! احسن نے ایک گہری سانس بھری تھی۔ اس سانس میں کراہتا دکھ زینب کو محسوس ہوا۔

”زینو!“

”جی؟“

”کھانا ابھی لے جاؤ یا ر! مجھے بھوک نہیں ہے میں کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔“

زینب نے ٹرے اٹھائی تو وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر دراز ہو گیا۔



دن بے حدست رفتاری سے گزر رہے تھے وہ اکتائی ہوئی تھی۔ صبح اٹھ کر روٹین کے کاموں میں لگ جانا اور رات تک لگے رہنا۔ پھر بے خواب آنکھوں کے بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے رہنا۔ اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ احسن بھی کچھ گم صم سا تھا۔ ایک دودو ستوں سے اس نے ملازمت کی بات کی تھی مگر کہیں بھی بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ وہ سارا دن اسے مختلف حیلے بہانوں سے اپنے پاس بلاتا رہتا تھا۔ دو گھڑی پاس بیٹھنے کو کہتا، وہ مزید چڑ جاتی۔

”یا اللہ احسن! ایک ایک منٹ کے بعد آواز لگتے ہیں آپ، مجھے کچھ کرنے تو دیں نا۔ سارا کام سر پر پڑا ہے۔“

”ہو جائے گا کام بھی، کام ہمارے لیے ہے۔ ہم کام کے لیے نہیں ہیں۔ کیوں جان کھپا رہی ہو۔ دو گھڑی ادھر آ کر بیٹھو، میں کب تک ٹی

وی دیکھوں؟“ وہ بے چارگی سے کہتا۔

”جی ہاں۔“ وہ طے کر کے کہتی ”دو گھنٹی بعد آپ تو خواب خرگوش کے مزے لوٹیں گے اور میرا کام وہیں کا وہیں موجود ہوگا۔ میں معافی چاہتی ہوں ایسی گھڑیوں سے۔“

اس دن بھی وہ اس کے کمرے پر پریس کر کے ہنگر میں لگا رہی تھی جب وہ کمرے سے آوازیں دینے لگا۔
 ”جی۔“ وہ اس کی شرٹ تھامے مصروف سے انداز میں کمرے میں آئی تھی ”کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”کیا کر رہی ہو؟“ وہ ٹی وی کا ریوٹ ایک طرف رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”آپ کے کپڑے پر پریس کر رہی ہوں۔“

”یہ ذرا ٹی وی کی آواز کم کر دو۔“

زینب نے پہلے حیرانی پھر قدرے غصے سے اس کی سمت دیکھا۔ اس کے لبوں میں دبی دبی شرارت تھی۔
 ”یہ آپ کے ہاتھ میں کس مرض کی دوا ہے؟“

”یہی تو رونا ہے۔ جو پاس ہے، وہ کسی مرض کی دوا نہیں اور جو دور ہے وہ.....“
 ”احسن پلیر!“ وہ مڑ گئی تھی ”تجک نہ کریں۔“

”ارے بابا، بات تو سنو یا! یہ ریمورٹ کام نہیں کر رہا ہے۔ سیل ختم ہیں۔“
 ناچار وہ ٹی وی تک جا کر آواز کم کرنے لگی۔ پھر دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ وہ پھر پکار بیٹھا۔
 ”ہوں، اب کیا ہے؟“ وہ زچ ہوئی۔
 ”اب!“ وہ بے چارگی سے سوچنے لگا۔

”ہاں، یہ ذرا کھڑکیاں کھول دو، کمرے میں جس ہے۔ کچن میں جو پالک اور میٹھی تم نے چولہے پر رکھی ہوئی ہے اس کی بو پورے گھر میں پھیلی ہے۔“

”اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ وہ لبوں میں ہی بڑبڑاتے ہوئے کھڑکیاں کھولنے لگی۔

دفعتاً ہی اس کے ہاتھ رک گئے تھے۔ میر سکندر علی کی شاندار، چمکتی گاڑی نے ابھی ابھی سڑک کا موڑ کاٹا تھا۔ اس کی ایک جھلک زینب کو نظر آئی تھی۔ سرخ و سپید رنگت پر سیاہ گلاسز لگائے وہ بے حد خود کو دکھائی دیتا تھا۔ وہ کھڑکی کا پٹ تھامے کافی دیر تک وہیں کھڑی سڑک پر اڑتی دھول کے ذروں کو دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اسے احساس ہوا۔ اس کا دل ایک خوشگوار انداز میں دھڑک رہا تھا۔ بیزار کن سنائے سے بھرے ہوئے دل میں کوئی خوب صورت سی دھن دھیرے دھیرے بجنے لگی تھی۔ سنائے کا زور ٹوٹ گیا تھا۔

زندگی پر چھایا بیزاریت کا جو دو ٹوٹا تھا۔ ٹھنڈی مہکتی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرا کر اس کی ساری جھنجھلاہٹ ختم کر گیا۔
 وہ مڑی تو ایک خوب صورت مکان نے اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔
 ”لو جی کھڑکی بھی کھل گئی۔“ احسن سوچنے لگا تھا۔
 ”اب کن سا کام کہوں؟ میرا سرد بادو۔“

”سینے!“ اس نے جیسے اس کی بات سرے سے ہی نہ تھی ”میں ذرا ملنی کی طرف جا رہی ہوں۔“

”ہائیں!“ اسے تعجب ہوا۔ ”یہ ایک ایسی تبدیلی کیسی۔ ابھی تو تمہارا موڈ سخت آف تھا۔ تمہیں بے شمار کام نہ پٹانے تھے۔ میرے پاس بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کی فرصت نہ تھی۔ یہ اچانک ملنی کا خیال کیوں تڑپا گیا تمہیں؟“

زینب نے قدرے خفگی سے اس کی جانب دیکھا۔

”میں اپنی مرضی سے، اپنی خوشی کے لیے بھی کچھ کر سکتی ہوں یا نہیں؟“

احسن چند لمحوں سے دیکھتا رہا پھر اس نے کندھے اچکا دیے۔

”اوکے ایز یو شام! اگر آپ کی خوشی کا سوال ہے تو ضرور جائے۔ آپ کی خوشی کی بات سامنے آئے تو ہر بات پس منظر میں چلی جاتی

ہے۔“

زینب کو شرمندگی کا جھٹکا لگا پھر وہ سنبھل گئی۔

”آپ کو چائے بنا کر دے جاؤں، کھانے میں تو ابھی دیر ہے۔“

”میں بالوں گا۔ تم جاؤ!“ وہ مسکرایا ”خال خال ہی تو تمہیں کسی کی یاد دلاتی ہے۔ خوش آئند بات ہے۔“

وہ چند لمحوں خاموش کھڑی تذبذب کا شکار کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس کی سوچتی ہوئی نظریں احسن سے ٹکرائیں تو وہ چونک گئی۔ وہ بڑے غور

سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا میں جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گی۔“

”جب تک جی چاہے بیٹھی رہنا۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے۔“ وہ خوش دلی سے مسکرا دیا تھا۔

زینب کا ارادہ کپڑے تبدیل کرنے کا تھا لیکن کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اس نے کبھی رملی کے گھر جانے کے لیے

کپڑے تبدیل کرنے کی زحمت نہیں کی تھی پھر یہ اچانک تبدیلی احسن کو متوجہ کر سکتی تھی۔ یوں بھی اس کا حلیہ ٹھیک ہی تھا۔ کل شام ہی نہا کر اس نے

سفید کاشن کا سوٹ پہنا تھا۔ بالوں کو پلیٹ کر جوڑے کی شکل دے کر وہ باہر نکل آئی۔

اس کا انداز درست تھا۔ میر سکندر علی کی گاڑی رملی کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ نیل بجا کر اس کی گاڑی کا جائزہ لینے لگی۔

”شاندار آدمی ہے، چیزیں بھی شاندار رکھتا ہے۔“

دل میں ایک سوچ خود بخود ابھری تھی۔

”اسی لیے تمہارا طلبگار ہے۔“ کسی نے اس کے اندر سرگوشی کی۔

زینب کے گال اپنی ہی سوچ سے سرخ ہوئے تھے۔ اسی لمحے دروازہ کھل گیا۔ زینب کی انھی ہوئی نظریں میر سکندر علی کی نظروں سے الجھیں

پھر اس نے گھبرا کر گھبرا کر جھکا لیں۔

”اوہ خوش نصیبی؟“ وہ ہنستا سے مسکرایا تھا۔

”ویکم!“

”رملی؟“ وہ بس اتنا ہی پوچھ سکی۔

”اندر ہے، تشریف لائیں۔“ وہ ذرا سا ترچھا ہوا تاکہ وہ اندر آ سکے۔

زینب اندر چلی آئی۔ لاؤنج اور کچن میں اسے رملی دکھائی نہ دی تو وہ اس کے کمرے تک چلی آئی۔ رملی کو وہاں بھی نہ پا کر وہ مڑی۔

سکندر علی اپنا ساگڑا سلگائے میں مصروف تھا۔

”رملی کہاں ہے؟“ وہ قدرے پریشان ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا تھا کہ سکندر نے اسے دھوکے سے اندر بلایا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

”شاہد لے رہی ہے۔ آپ تشریف رکھیے، پریشان کیوں ہوتی ہیں، ہمارے لیے آپ بے حد قابل احترام ہستی ہیں۔“ اس کے لبوں پر

ہلکی ہلکی مسکان تھی جیسے وہ لحد بھر میں اس کے دماغ کی تہوں میں ڈوب کر ابھر آیا تھا۔ زنب کو بے حد شرمندگی محسوس ہوئی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں، میں بالکل پریشان نہیں ہوں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔

”آئیے لاؤنج میں بیٹھتے ہیں۔“ سکندر علی نے ہاتھ سے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

زنب اس کے ساتھ لاؤنج میں چلی آئی۔ کشادہ صوفے میں دھنتے ہوئے سکندر علی نے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ زنب اس کے مقابل بیٹھی تو وہ آنکھوں کو قدرے سیکڑ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”مر جھار ہی ہو زنب!“

”جی؟“ وہ چونک اٹھی۔

”حالات کی تیز دھوپ نے تمہارے چہرے کے گلابوں کی شگفتگی کو مٹا کر کیا ہے۔ کیا آئینہ دیکھنا چھوڑا ہوا ہے آج کل؟“

زنب پر منوں اوس آگری یہ وہ شخص تھا جو اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا نہ ٹھکتا تھا۔ جس نے خراب، میلے حلیے میں بھی اس کی اس طرح تعریف کی تھی کہ وہ اپنی ہی ذات پر نازاں ہو گئی تھی۔ جس کے لیے وہ مصری رانی قلو پٹھر جیسی تھی۔ اگر وہ اس کی شگفتگی کے متاثر ہونے کو محسوس کر گیا تھا تو یقیناً اس کا چہرہ کسی حصار کا منظر پیش کر رہا ہوگا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

”کیوں ختم کر رہی ہو خود کو؟ مجھ پر اتنا برا ظلم کرو زنب!“ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا ”میرے پاس آؤ، میں تمہیں گلاب کی مانند کھلا دوں گا، مہک اٹھو گی۔ وہ شخص تو جیسے سلو پوائزنگ کر رہا ہے۔“

زنب کی آنکھ سے ایک قطرہ ٹپک کر اس کی ہتھیلی میں آگرا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ آئینہ دیکھتی تھی تو اپنا آپ پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔ کتنی بدل گئی تھی وہ احسن ایاز کی دسترس میں آکر بلکہ اب تو اس کا من ہی نہیں کرتا تھا کہ وہ آئینہ دیکھے۔

”ویسے..... ایک بات کہوں“ وہ راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

زنب نے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

”میرا خیال بلکہ مجھے یقین ہے کہ تم فیصلہ کر چکی ہو۔ بس اسے لفظوں میں ڈھالنے کی دیر ہے۔ لیکن تم کتنی دیر لگاؤ گی زنب؟“

”بس چند دن اور“ وہ کسی تذبذب سے باہر آکر بولی۔

میر سکندر علی گہری مسکراہٹ لیوں پر سجا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی فاتحانہ چمک نے زنب کو نروس کر دیا۔

”تھینک یو زنب.....! تھینک یو۔ ایک مرتبہ میرے پاس آکر دیکھو، میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کیا کچھ ہے۔“ اتنا بدل جاؤ گی کہ خود

کو پہچان نہ پاؤ گی۔“

کھلکی کی آواز پر دونوں چونک اٹھے تھے۔ ملنی گیلے بال تولیہ سے رگڑتے ہوئے باہر آ رہی تھی۔ ان دونوں کو یوں آنے سانسے بیٹھا دیکھ کر وہ اپنی جگہ پر ہی رک جی گئی۔

”آؤ ملنی مائی ڈیر! رک کیوں گئیں۔“ میر سکندر علی بے پناہ خوش تھا ”یہاں آؤ، ہمارے ساتھ اس خوشی کو تسلیم کر۔“

”خوشی!“ وہ خالی الزانی کے عالم میں چند قدم آگے بڑھ آئی تھی۔

”ہاں خوشی! تمہاری فرینڈ نے آخر میرے حق میں اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر کسی جنگ جیتے ہوئے بادشاہ جیسی مسکراہٹ تھی۔ پرسکون اور فتح کے بھرپور احساس میں ڈوبی ہوئی۔

”فیصلہ!“ ملنی کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ اس کے لبوں نے بے حد معمولی سی حرکت کی تھی۔ پھر اس نے اپنی خالی خالی، بے اعتبار

نظریں زنب کے چہرے پر لٹکا دیں۔

نجانے ان نظروں میں کیا تھا۔ زینب کا سر لحد کے لیے جھک گیا۔

ایک میر سکندر علی اپنی جگہ سے اٹھا اور ملٹی کو دونوں بازوؤں سے تھام کر گھما ڈالا۔

”جیڑاپ ملٹی! جیڑاپ مائی ڈارنگ! تم جانتی ہو کہ میں اس وقت کس قدر خوش ہوں۔ میری خوشی میں حصہ دار بنو۔“

ملٹی نے دونوں بازوؤں کا شکل چھڑائے تھے۔ پھر لبوں پر ایک پیکی اور بے جان سی مسکراہٹ لاکر اس نے سکندر علی کو دیکھا تھا۔

”ٹھیک کہتے ہو سکندر! تمہیں واقعی خوش ہونا چاہیے یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔“ پھر وہ زینب کے پاس آ بیٹھی ”جانتی ہو زین! میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ تم ایسا کوئی فیصلہ بھی کر سکتی ہو۔ سکندر کی ایسی باتوں پر میں اس سے گھنٹوں بحث کرتی تھی۔ خیر تمہیں بھی مبارک ہو جو کچھ تم زندگی سے چاہتی تھیں، تمہیں ملنے والا ہے۔“

”میری لگن کچی تھی“ میر سکندر علی نے ہلکا سا تہقہ لگایا تھا ”اس لیے مجھے یقین تھا، زینب ایک دن میرے پاس ضرور آئے گی۔ تم نے دیکھا ملٹی! کچی لگن کیسے جیتی ہے؟“

”ہاں!“ وہ جیسے کسی صدمے کی سی حالت میں تھی۔ زیر لب بولی ”میں نے دیکھا سکندر! کچی محبت کیسے ہارتی ہے۔“

پھر اس نے ناسف سے زینب کو دیکھا تھا۔

”وہ شخص کچی محبت کرتا ہے تم سے اور تم!“ پھر سے دھیرے سے ہنسی ”میں تو خود کو ہی برا سمجھتی تھی۔“

”کم آن ملٹی!“ میر سکندر علی گے بڑھ آیا۔

صوفے پر بیٹھی ہوئی ملٹی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔

”تم تو ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا لگتا ہے غم کے لشکر سے جا ملی ہو۔“

اپنی بات پر اس نے خود ہی تہقہ لگایا تھا۔ وہ واقعی بے حد خوش تھا۔ اس بات کا اظہار اس کی ایک ایک حرکت سے عیاں تھا۔

ملٹی اب کسی بت کی مانند بے حس و حرکت بیٹھی تھی اور زینب، زینب کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی بند مٹھیوں میں ریت بھری ہوئی تھی

اور اس کے ہاتھ تیزی سے خالی ہوئے جاتے تھے۔



بیز کی پشت سے ٹیک لگائے وہ بڑی دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس وقت تک عموماً وہ دونوں ہی سو جایا کرتے تھے۔ لیکن ٹی وی پر میچ آرہا تھا جو احسن نہایت ذوق و شوق سے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ اس کی تو کیفیات ہی کچھ اور تھیں۔ ارد گرد کے ماحول سے بالکل بے خبر وہ اپنی متضاد سوچوں کا شکار کسی اور سی جہاں میں تھی۔

فیصلہ کر آئی تھی لیکن فیصلہ کرنا اس قدر مشکل نہ تھا۔ فیصلہ سنانا جیسے بل صراط پر سے گزرنا تھا۔ وہ کیسے کہتی احسن سے۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی؟ سب کچھ کہہ کر وہ اس کی جانب کیسے دیکھتی؟ وہ اس کی نظروں سے کس طرح نظر ملاتی۔ وہ ان آنکھوں میں ٹوٹے یقین، بکھرتے اعتبار اور دم توڑتی محبت کو کس طرح دیکھتی کیا وہ دیکھ سکتی تھی؟

احسن نے ٹی وی پر سے لمحے بھر کے لیے نظر ہٹا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ کسی بے جان مورتی کی مانند ساکت و صامت بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھی۔ بکھرے ہوئے بال اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے اور پھیلی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تیر رہی تھی۔

”زینو!“ وہ قدرے پریشان ہوا ”تم ٹھیک تو ہو؟“

”آں۔“ وہ خوفزدہ ہو کر چونکی پھر اسے دیکھنے لگی۔

”جی؟ جی؟ کچھ کہا آپ نے؟“

”میں نے پوچھا ہے، تم ٹھیک ہونا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر فکر مندی سے بولا ”اس طرح کیوں بیٹھی ہو، یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگی ہو۔“

نہنب نے چند لمحوں کے لیے اسے الجھی الجھی نظروں سے دیکھا پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ احسن مسکرا دیا۔

”کیا واقعی نیند میں ہو، قصہ کیا ہے؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے سوچ کے کسی طلسم میں مقید ہو.....“

نہنب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے صحیح کہہ رہا تھا وہ۔ ایک طلسم ہی تو تھا جس میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ اس کو بھائی نہ دیتا تھا۔

”اوہ تم روری ہو زینو۔“ اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا ”کیا بات ہے، دل گھبرا رہا تھا یا کچھ اور بات ہوئی مجھ سے کہتیں تو، ایسی بیٹھی بجائے کیا سوچے جا رہی ہو۔“

”نہیں کچھ نہیں۔“ اس نے آنکھیں رگڑ ڈالیں ”آپ پریشان نہ ہوں۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں۔ ذرا چہرہ دیکھو اپنا، بالکل زرد ہو رہا ہے اور آنکھوں میں کیسی تھکن ہے، کیسی اداسی۔“

”میرے لیے اتنا پریشان مت ہوا کریں۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

یہی تو بیڑیاں تھیں جو اس کے پیروں میں پڑی تھیں۔ یہی تو وہ پنجرہ تھا جس میں وہ اب تک قید تھی کہ اڑان بھرنے کی طاقت ہوتے ہوئے بھی اس پنجرہ سے نکلنے دل کو کچھ ہوتا تھا۔

”نہنب! میری جان!“ احسن نے دوڑوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھرا ”آئی ایم سوری۔ شاید میں تمہیں وہ توجہ، وہ وقت نہیں دے پا رہا جو تمہارا حق ہے..... شاید اپنے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے کے گرداب میں میں ایسا پھنسا ہوں کہ توجہ چاہتی تمہاری نگاہیں مجھے نظر نہیں آتیں۔“

میں واقعی اتنے دن سے تمہیں نظر انداز کر رہا ہوں۔“

اس نے نہنب کو خود سے قریب کر لیا۔

”اچھا چلو یوں کرتے ہیں۔ آج ساری رات جاگتے ہیں۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے، وہ تم کو اور کچھ میرے دل میں ہے وہ میں کہتا ہوں۔ سارے شکوے شکایت جو تم نے چپکے چپکے اپنے دل کی ڈائری میں درج کیے ہوئے ہیں وہ آج سناؤ۔“ میں وہ ساری باتیں کہتا ہوں جو میں آہستہ آہستہ اپنے دل کے کسی خفیہ خانے میں محفوظ کرتا جاتا ہوں اور تم سے کہہ نہیں پاتا۔ آج اپنے اپنے دلوں کو خالی کر ڈالو! میں یقین جانو! بڑا سکون ملتا ہے۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی شرارت درآئی تھی۔

نظروں میں ہلکا سا شمارا اتر آیا۔ اس کا یہ روپ نہنب کے لیے نیا نہ تھا۔ بارہا اس نے احسن کو اس موڈ میں دیکھا تھا۔ اس کے جذباتوں کے پاگل پن کو اس کے رویوں سے جھلکتے دیکھا تھا۔ اس کی دیوانگیوں پر حیران ہو گئی تھی۔

لیکن اس وقت اتنے دن کے بعد اور اس کے ادھر سے پن کے احساس نے بجائے کیسا خوف اس کے اندر بھرا وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے علیحدہ ہوئی اور بستر سے اتر آئی۔

احسن کی نظروں میں حیرت اتنی شدت کے ساتھ نمودار ہوئی تھی کی نہنب کو اس سے نگاہ ملانا دشوار ہو گیا، وہ نظریں جھکا کر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی رہی۔

”نہنب!“ اس کے لبوں سے نکلی آواز کسی سرگوشی سے مشابہہ تھی ”مجھے بتاؤ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“

”حسن! وہ کپکپاتی آواز میں بولی ”پلیز اس وقت مجھے مت چھیڑیں۔ پلیز! میں خود اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ میں..... میں۔“ وہ چند لمحے اس نام کر ڈالنے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے نیکیے پر سر ڈال دیا تھا۔

”لائٹ بند کرو اور دوسرے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔“ کچھ دیر کے بعد اس کی آواز ابھری تھی۔

زینب کچھ دیر کھڑی گہری سانسیں بھرتی رہی پھر دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ سر تھام کر وہ پینک کے کنارے ٹک گئی تھی۔

”یہ کیا ہو گیا ہے مجھے، حسن کا قریب آنا اس قدر ناگوار کیوں گزرا۔ اس کے ادھرے پن کے احساس نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا ہے کہ میں اس سے ہی ڈرنے لگی ہوں..... اوہ خدا!“

وہ سوچے جا رہی تھی۔

”نہیں..... نہیں رہ سکتی میں اس طرح، مر جاؤں گی میں یوں گھٹ گھٹ کر۔ اس سے پیشتر کہ ہم ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں،

ہمیں اپنی راہیں الگ کر لینی چاہئیں۔“

اس کے دل میں ایک مصمم ارادہ ابھرا تھا۔

”میں نے بالکل ٹھیک کیا میرا سکندر علی کو مثبت جواب دے کر۔ زندگی کا صحرا سامنے پھیلا ہوا ہے اور ساتھ ہی پھولوں بھری راہ نظر آتی ہو تو کون بے وقوف صحرا کا انتخاب کرے گا۔ کم از کم میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی۔“

ایک اپانچ انسان کے ساتھ ساری زندگی سسک سسک کر گزار دوں، اس طرح کہ میں خود اپنے آپ کو اپانچ لگنے لگوں، ناممکن! ایک بہترین جیون ساتھی، ایک بہترین زندگی کے ساتھ میرا منتظر ہے۔ تو کیوں نہ بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لوں..... مجھے احسن سے کھل کر بات کرنی ہوگی،

بہت جلدی کرنی ہوگی۔ کہیں خوش قسمتی کی یہ ڈور میرے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔“

وہ بے حد حقیقت پسندی کے ساتھ فیصلے کرتی جا رہی تھی۔



اس کا ارادہ بے حد مصمم تھا لیکن وہ اس سے کچھ بات نہ کر پاتی تھی۔ دوسری جانب وہ بھی بالکل نارمل تھا۔ اس کی باتوں سے بالکل اظہار نہ ہوتا تھا کہ وہ زینب سے خفا تھا یا اس رات والے واقعے نے اسے ہرٹ کیا تھا۔ شاید وہ اس کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا یا سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہر حال اسے اپنے جذبات پر قابو پانا اور انہیں خود تک محدود رکھنا آ گیا تھا۔ زینب کے ساتھ اس کا رویہ بالکل مناسب اور روئین والا تھا۔ مگر ایک تبدیلی اس میں یہ آئی تھی کہ وہ اپنے سارے کام خود کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر اسے بار بار آوازیں دینے اور جان بوجھ کر تنگ کرنے کی شرارت اس نے ترک کر دی تھی۔

اسے اگر پانی کا گلاس بھی چاہیے ہوتا تو وہ خود کچن میں جا کر لے آتا تھا۔

اس وقت بھی وہ لاؤنج میں بیٹھی بے دھیانی سے دال چاول صاف کر رہی تھی جب وہ کمرے سے نکلا، زینب اس وقت اپنی کسی سوچ میں مگم تھی۔ بیساکھی کی ٹک ٹک پر بھی اس نے سراو پر کر کے نہ دیکھا تھا۔ وہ کچن کی طرف جا رہا تھا جب اچانک ہی راستے میں رکھی چھوٹی تپائی سے ٹکرا کر

بیساکھی اس کے بازو کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ بڑے زور سے اوندھے منہ زمین پر گر رہا تھا۔

زینب ہل بڑا کر اٹھی تھی۔ گود میں رکھا تھا لیکن نیچے گر تھا اور پورے فرش پر چاول بکھر گئے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔

”حسن..... حسن! کیا ہوا ہے؟ انھیں چوٹ تو نہیں لگی کہیں!“ وہ بے اختیار ہی اس کے سراو چہرے پر ہاتھ پھیر کر کسی نادیدہ چوٹ کو

تلاش کرنے لگی تھی۔

اس کے لبوں پر تکلیف میں ڈوبی، کھینچی کھینچی مسکراہٹ ابھری۔ چند گہری گہری سانس بھر کر اس نے خود پر قابو پایا تھا۔
 ”اتنی زور سے گرے ہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی ”چوٹ نہ لگی ہوگی؟ کیا چاہیے تھا آپ کو۔ مجھ سے کہتے درازا سے کام کے لیے بار بار اٹھتے ہیں۔“

اس کے ہاتھ اب تک احسن کے جسم پر چوٹ کا احساس تلاش کر رہے تھے۔
 احسن چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے زنی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں زنیو! پریشان مت ہو۔“
 نرم آواز میں کہا تھا۔
 زنب اُسے دیکھنے لگی پھر اٹھنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں جیسا کھی تھا کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی کرے میں آئی تھی۔
 ”کیا چاہیے تھا آپ کو؟ مجھے آواز دے لیتے۔“
 ”ساری زندگی بستر پر تو نہیں گزار سکتا میں۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا تھا ”اپنے کام خود کرنے کی عادت ہوئی چاہیے۔ تم کب تک دوڑ دوڑ کر میرے کام کرو گی۔“

اس نے بات یوں ختم کی تھی جیسے زنب کی جانب سے اسے کسی جواب کا انتظار ہو۔ جیسے وہ کسی وعدے کا منتظر ہو۔
 ”کب تک؟ کب تک؟ کب تک؟“ اس کے لہجے کی آس زنب کے ارد گرد چکرانے لگی۔ جیسے وہ منتظر تھا کہ زنب اسے جواب دے گی یقین دلائے گی۔ اصرار کرے گی۔
 ”ہمیشہ آخری سانس تک، قیامت تک تمہارے ساتھ رہوں گی، تمہارا ساتھ دوں گی، تمہارا سہارا بنی رہوں گی، تمہیں کسی کی کا احساس نہ ہوگا۔“

زنب سوچوں کے بیچ اکیلی کھڑی تھی جب اس کے پکارنے پر چونک اٹھی۔
 ”زنیو!“ کیا سوچ رہی ہو، ادھر آؤ۔“
 وہ اس کے قریب چلی آئی۔ احسن نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ٹھنڈے سرد ہاتھ اس کے ہاتھوں کی حرارت سے گرم ہونے لگے۔
 ”میرے لیے کتنی فکر مند ہو گئی تھیں تم؟“ وہ محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ”مجھے بہت اچھا لگا۔“ زنب نے بے اختیار ہی نظر چرائی تھی۔

”مجھے اپنے گرنے کا، چوٹ لگنے کا احساس نہ رہا۔ بس یہ احساس رہا کہ تم مجھ سے کس قدر محبت کرتی ہو۔ تمہاری ہر ہر حرکت سے اس بات کا اظہار ہو رہا تھا۔“

زنب کا سانس رکنے لگا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا، کیا سوچ رہا تھا اور وہ کیا چاہتی تھی، کس قدر متضاد باتیں تھیں۔
 ”ارے ظالم لڑکی۔ کبھی تو اقرار کر لیا کرو؟“ اس نے زنب کے بازوؤں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ”اپنے منہ سے نہ سہی، میرے منہ سے سن کر ہی اقرار میں سر ہلادیا کرو۔ تم تو پتھر لگتی ہو کبھی کبھی۔“
 زنب ہاتھ چھڑا کر شرمندگی سے مسکرا دی۔

”کیا لینے گئے تھے آپ کچن میں؟“ اس نے بات ٹالی تھی۔
 ”چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔“ اس نے گہری سانس بھری ”میں نے سوچا، بیگم صاحبہ تو بار بار کی فرمائش سے خفا ہوتی ہیں، میں خود ہی بنا لیتا ہوں۔ لیکن رستے میں جو افتاد ڈوٹی اب تو لگتا ہے گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر پیٹ پڑے گا۔“

زینب نے خشکی سے اسے گھورا۔

”میں کہاں تھا ہوتی ہوں۔ جھوٹا الزام تو نہ لگائیں۔“

”اکتا تو جاتی ہونا میرے کاموں سے۔“ وہ بچانے کیا سننے کا متنی تھا۔

”جی نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”اکتا تو سکتی ہو۔“

زینب نے اسے گھورا اور مڑ گئی۔

”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“



رات اس کی آنکھوں میں نیند نہ اتری تھی۔ جاگ جاگ کر، کروٹیں بدل بدل کر وہ تھک گئی تھی مگر نیند اس سے روٹھ کر بچانے کہاں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ آہستگی سے اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ احسن گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے سانسوں کا مد و جز اس کی نیند پر سکون اور گہری ہونے کی گواہی دیتا تھا۔

زینب کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی، اس کا جائزہ لیتی رہی۔

”کیسے رہ پائے گا یہ میرے بنا۔“ اس کے اندر سرگوشی ابھری تھی۔ ”یہ تو وہ سانس نہیں بھرتا جس میں میرا تصور نہ ہو، نوٹ کر نکھر جائے گا۔“

”ایسا نہ ہوا تو تم اندر ہی اندر گھل کر ختم ہو جاؤ گی۔“ کوئی بولا تھا۔ ”کیا ہوگا، کیا نہیں کے اندیشوں کا شکار ہیں تو کوئی فیصلہ نہ کر پاؤ گی یونہی

شع بن چکلی ر ہوگی، ناقدری کا احساس دیکھ کر بچانے پر ہے گا تمہیں۔ جنہیں آسمانوں میں اڑان بھرنی ہو وہ مڑ مڑ کر زمین کو نہیں دیکھتے ورنہ نہ آسمان تک پہنچ پاتے ہیں نہ زمین کے ہی رہتے ہیں۔ غلامیں معلق دنیا کے لیے تماشا بن جاتے ہیں۔“

”لیکن لیکن یہ! اس کا سہارا کون بنے گا۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں اپنے فیصلے یہ خود کرے گا۔“

”بچ منجھدار میں کسی کو کیلا چھوڑنا ظلم ہے۔“

آتش پرست

وجیہ ہر سحر کے کہنہ مشق قلم سے ایک اور سنسنی خیز اور دلچسپ ناول۔ ماہرین آثار قدیمہ ایک چار ہزار سال پرانی نمی دریافت

کرتے ہیں۔ جسے اس انداز میں خطوط کیا گیا تھا کہ وہ آزاد ہوتے ہی زندہ ہو جائے۔ چار ہزار سال پرانی می کے ہنگامے، خوف و ہراس

اور قتل و غارت۔ آج کی دنیا کو اس نخوس می سے کیسے چمکا کر دلا یا گیا، جاننے کے لیے پڑھیے..... **آتش پرست**

جسے جلد ہی کتاب گھر پر ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔

”بھنور میں پھنسے شخص کا ہاتھ تھامنے کا مطلب آپ بھنور میں جا کرنا ہے۔ بے وقوف لڑکی! جذباتیت کا شکار مت بنو۔ حقیقت پسندی سے کام لو! ابھی سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ حسن تمہارا، جوانی تمہاری، وقت تمہارا ہے۔ کل کو گزرے وقت کو روکو گی اور حسرت و یاس سے زندگی ایک مرتبہ پھر مل جانے کی دعا کرو گی لیکن کچھ ہاتھ نہ آنے گا۔ تم زلیخا نہیں ہو عقل سے کام لو۔ یہ زندگی بس ایک مرتبہ، حسن بس ایک مرتبہ، یہ جوانی بس ایک مرتبہ، یہ موقع بس ایک مرتبہ۔“

اس کی سانسوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

”لیکن یہ سمجھتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“

تم جانتی ہو کہ تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔ اس کو اور خود کو دونوں کو دھوکا مت دو۔ جوچ ہے اسی کا انتخاب کرو۔ اور جو یہ ہے کہ زندگی سے تم نے جو گزر ا مانگا تھا، وہ تمہارے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ ہمت کر کے قدم بڑھاؤ اور جذباتیت کے حصار سے نکل آؤ باہر، یہی بہتر ہے تمہارے لیے!“

نہیب نے گہری سانس بھر کر سائیز لیمپ کی لائٹ گل کی اور آہستگی سے بسٹر پر دراز ہو گئی۔



دوسرے دن وہ بے حد بوجھل بین کا شکار تھی۔

سارا دن اس نے سو کر گزر دیا تھا پھر بھی تھکن اور سستی دور نہ ہوتی تھی۔

شام کو نہا دھو کر اس نے کٹن کا نسبتاً ہلکے رنگ کا لباس پہنا تا کہ طبیعت میں سکون پیدا ہو سکے پھر جائے کا پانی چولے پر رکھ کر احسن کو جگانے کمرے میں چلی آئی۔

وہ جاگ چکا تھا۔ نیم دراز کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔

”چائے بن رہی ہے۔ باہر آ جائیں۔“ وہ رک رک کر بولی۔

وہ اس سے اس موضوع پر گفتگو کا آغاز چاہتی تھی۔

”اچھا! میں ذرا منہ دھو لوں۔“ اس نے رسالہ ایک طرف ڈال دیا۔

نہیب پھر کچن میں چلی آئی۔ دل ان گنت سوالوں کی زد میں تھا۔ کیا کہنا تھا، کیسے کہنا تھا، آغاز کیا ہونا تھا اور اختتام کیا۔ ساری صورت

حال جیسا پزل کی مانند بے ترتیب ٹکڑوں میں تقسیم تھی۔

چائے بنا کر وہ باہر لائی تو احسن لاؤنج میں آچکا تھا۔

نہیب نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔

اس لمحے نیل بیج ابھی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر دروازہ کی سمت بڑھی تھی۔

باہر رملی کی بوڑھی ملازمہ کھڑی تھی۔

”سلام بی بی جی رملی بی بی نے بلا بھیجا ہے آپ کو۔“

”رملی نے؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”اچھا! کوئی خاص کام؟“

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔“

”تم چلو اماں۔ میں ذرا دیر میں آتی ہوں۔“

وہ اسے رخصت کر کے اندر چلی آئی۔ احسن کپ میں چائے نکال چکا تھا۔ گرم چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اسے استفسار طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

”رملی کی ملازمت تھی، رملی نے مجھے بلایا ہے۔“

”خیریت؟“ وہ عام سے انداز میں پوچھنے لگا۔

”یہ تو جا کر ہی پتا چلے گا۔“ وہ ڈسٹرب سے انداز میں بولی تھی۔ ”میں جاؤں؟“

”آں، ہاں جاؤ لیکن ذرا جلدی آجاتا۔ میں اکیلا بور ہو جاؤں گا۔“ نجانے تم عورتیں گھر میں کیسے رہ لیتی ہو۔ میرا تو چند دنوں میں دم گھٹنے لگا ہے۔“

وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا تھا۔ نینب اپنا کپ یونی میز پر پڑا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ رملی کے دروازے پر تھی۔ دروازہ کھلا تھا وہ اندر چلی آئی۔

رملی اپنے کمرے میں تھی۔ بیڈ پر ٹیکوں کے سہارے بیٹھی وہ کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ نینب کو آتادیکھ کر اس نے آواز کم کر دی۔

”آؤ بیہیں آ جاؤ!“ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔

”خیریت! تم نے بلایا ہے؟“

اس کے انداز میں بلا کی سرد مہری تھی۔

”سکندر نے بلایا ہے۔“

”سکندر؟“ نینب نے تعجب سے ادھر ادھر دیکھا۔

”ہاں اس کا فون آیا تھا۔ وہ کچھ دیر میں پہنچ رہا ہے۔“ وہ لافلتی سے اسکرین پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔

”اور اب یہ مت کہنا کہ میں نے تمہیں بلا کر غلطی کی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، وغیرہ وغیرہ۔“

نینب سن ہو کر رہ گئی۔ جواب میں کچھ کہنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔

رملی کی ملازمت چائے لے آئی تھی۔ وہ دونوں کو چائے ڈال کر دینے لگی۔

”گولی بھی لادیں اماں۔“ رملی بولی تھی۔ ”سر میں سخت درد ہے۔“

”کتنی گولیاں کھاؤ گی بیٹی!“ اماں نے تشویش سے اس کی سمت دیکھا ”صبح سے چار پانچ تو کھا چکی ہو۔“

”لادیں اماں! بحث نہ کریں۔“ وہ قدرے جھنجھلا کر بولی تھی۔

نینب اس سارے ماحول میں خود کو بے حد اناہیز محسوس کر رہی تھی۔ رملی کے رویے کا بے حد روکھا پن اگرچہ اس کے لیے غیر متوقع نہ تھا پھر بھی اس سے متضام نہ ہو پارہا تھا۔

وہ خاموشی سے بیٹھی چائے کے گھونٹ زہر کے گھونٹوں کی طرح بھر رہی تھی جب باہر گاڑی کا ہارن بج اٹھا۔ دونوں نے بے اختیار ہی ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ پھر رملی نے نگاہ پھیر لی۔

”اماں!“ اس نے آواز لگائی تھی۔ ”دروازہ کھولیں۔“ سکندر آیا ہے۔“

نینب نے اپنے دل کی دھڑکنوں سے اپنے جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، لیکن اسے کچھ خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ دروازے میں کھڑا تھا۔

”جیلو..... معزز خواتین!“ ہمیشہ کی طرح اس کے لب پر اسرار انداز میں مسکراہے تھے۔

کچھ دیر دروازے میں ہی کھڑا رہ کر وہ اندر چلا آیا۔

”میں نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟“ وہ زنب سے پوچھ رہا تھا۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ محض سر جھکا کر رہ گئی۔ ساری صورت حال فی الوقت اس کے لیے بے حد ندامت سے بھر پور تھی۔ وہ کسی کی بیوی تھی، کسی کا اعتبار!

”مجھے پریشان کیا ہے!“ دفعتاً رملی قدرے جارحانہ انداز میں بولی تھی ”تم دونوں کو جو کرتا ہے، ذرا جلدی کرو۔ میں بیچ کی اس پیغام رسانی سے تنگ آگئی ہوں۔ تم دونوں کو ہونہ ہو، مجھے اس صورت حال سے شرمندگی ہوتی ہے۔“

”شرمندگی!“ سکندر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”واٹ آجوک رملی“

زنب نے دیکھا، رملی کا رنگ تپ کر سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر سکندر علی کو دیکھتی رہی۔

”سکندر!“ پھر اس نے تنبیہی لہجے میں کہا تھا۔

”اوکے ڈیز اوکے!“ وہ ہنستا ہوا قریبی صوفے پر دراز ہوا۔ ”کافی پلاؤ! اچھی سی تہہ ہمارے ہاتھ سے بنی ہوئی کافی۔“

رملی خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

سکندر علی کچھ دیر بیٹھا اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اپنا سا رسلگانے لگا تھا۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا!“ وہ چند لمحوں بعد بے چین ہو کر بولی تھی۔

”ہوں!“ وہ اطمینان سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”پھر کہیں؟“ اس نے پہلو بدلا۔

”اس قدر جلدی کیا ہے۔“ زنب کی کیفیات اسے جیسے کوئی لطف بخش رہی تھیں ”آخر ہم بھی تو کب سے محتاط رہیں۔ ہمارا خیال کیا

آپ نے؟“

”سکندر صاحب پلیز!“ اس کے اندر کوئی تھا جو اسے مسلسل کچوکے دے رہا تھا۔ دل میں جب سے احساس بے وفائی نے جگہ بنائی تھی

اندر کوئی کراہتا رہتا تھا۔

”کچھ پوچھنا ہے، کچھ کہنا ہے لیکن یہ جگہ مناسب نہیں، میرا خیال ہے ہم باہر چلتے ہیں۔“

”باہر.....“

”ہوں کسی خوب صورت سی جگہ پر مثلاً سکندر پر! وہاں سے ہم شاپنگ کے لیے جائیں گے۔ تم اپنے لیے ہر وہ چیز خریدنا جو تمہارا جی

چاہیے..... ہر چیز! پر ہم کسی اچھی سی جگہ سے ڈنر کے واپس آ جائیں گے۔ کیہ پروگرام ہے؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سارا پروگرام کوئی تین چار گھنٹوں پر محیط تھا۔ وہ اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ کہیں جانا چاہتی تھی۔

فریش ہونے کا کوئی بہانہ نہ تھا اسے۔ کب سے گھر میں بند کلوہوں کے تیل کی مانند روٹین میں جتے جتے وہ تنگ آگئی تھی۔

”اتنی دیر تو نہیں کی جاسکتی۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ”بس ایک آدھ گھنٹہ!“

”اب ڈرنے کی کیا بات ہے زنب! جب کہ تم فیصلہ بھی کر چکی ہو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی میں نے اب تک اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”ہوں!“ اس نے راکھ جھڑائی ”تو ٹھیک ہے ہم کہیں سے اچھی سی کافی پی کر آ جاتے ہیں۔“

”یہ مناسب ہے۔“ وہ مطمئن ہو گئی۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے تو رلی کافی کیڑے لیے اندر آ رہی تھی۔ انہیں نکلتا دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔
 ”سکندر! کافی نہیں پیو گے؟“ وہ زینب کو نظر انداز کر کے سکندر سے بولی تھی۔

”ڈارلنگ تم کافی پیو! ہم ذرا باہر جائیں گے اوکے“ اس نے پیار سے رملی کے گال کو چھوا۔
 زینب کے لیے رملی سے نگاہ ملانا دشوار تھا۔ وہ نظریں جھکا کر نکل آئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اپنے حواس بحال کیے اور تیزی سے پیچھے کو دوڑتی سرک کو دیکھنے لگی۔ کتنے دنوں کے بعد وہ گھر سے نکلی تھی۔ ارد گرد بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے اندر اعتماد اور اطمینان محسوس کیا۔
 ”تم پریشان تو نہیں ہو رہی؟“ سکندر نے اس کی جانب دیکھا۔
 ”نہیں!“ وہ مسکرا دی۔

وہ حقیقتاً پریشان نہیں تھی۔ سارے اندیشے اور دباہے فی الوقت اس نے اپنے ذہن سے جھٹک دیے تھے فی الحال وہ صرف ذہنی سکون چاہتی تھی۔ اس نے سکندر علی کو دیکھا۔ بڑی سی، چمکتی، شاندار گاڑی پر غور کیا، اپنی اہمیت کو محسوس کیا اور مطمئن انداز میں سیٹ سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئی۔

یہی تعبیر تھی اس خواب کی جو شعور سنہیالتے ہی اس نے پلکوں سے اٹھا کر عقلی پردیپ کی مانند روشن کیا تھا کب سے اس دیپ کو اپنی نیندوں کا لہو پلا رہی تھی، کس کس طرح اس دیپ کی حفاظت کی تھی اس نے۔
 ”کیا کہنا چاہتے تھے آپ!“ وہ سرور انداز میں پوچھنے لگی۔
 ”تمہارا پردیپ گرام کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے؟“
 ”بس چند دن اور۔ میں احسن سے طلاق کا مطالبہ کرنے والی ہوں آج یا کل میں۔“
 ”اور.....! گروہ نہ مانا تو؟“

”مجھے اپنی بات منوانا آتا ہے۔“ وہ اعتماد سے بولی تھی ”یوں بھی میں احسن کی طبیعت سے واقف ہوں۔ وہ زبردستی مجھے خود سے باندھ کر نہیں رکھیں گے۔“

نجانے کیوں اس کی بات پر سکندر علی نے اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔
 فائبر اشار ہوٹل کے خوب صورت اور طمانیت بھرے ماحول میں بیٹھ کر انہوں نے کافی پی تھی۔ آج زینب کے دل میں نہ کوئی ڈر تھا نہ جھجک۔ وہ ہر بات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ بس اب ہر بات طے شدہ تھی۔
 ”میں آج رات ہی احسن سے بات کر دوں گی۔“

اس نے میر سکندر علی کی چمکتی نگاہوں کو اپنے چہرے پر نکا پا کر دھیرے سے کہا۔
 ”اس سے کبوشرافت سے ڈائی ورس پیپر ز سائن کر دے ورنہ مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔“
 میر سکندر علی کے لہجے میں حقارت درآئی پھر وہ زینب کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھ کر مسکرا دیا۔ ”کب سے تمہارے اس خوب صورت وجود پر تسلط جمائے بیٹھا ہے۔ مجھے تو اب غصہ آنے لگا ہے۔“

پھر اس نے زینب کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”اس حسین وجود کو میں جلد سے جلد اپنی بانہوں میں دیکھنا چاہتا ہوں..... ہوں؟“
 زینب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ وہ بولی تھی۔

گناہ کے شدید احساس نے اچانک ہی اس کے دل و دماغ پر حملہ کیا تھا۔ اندر کوئی کرانے لگا تھا۔ میرا سکندر علی کی آنکھیں مسکرائیں۔

”میں کچھ دیر اور تمہاری ہمراہی میں گزارنا چاہوں گا حسین خاتون!“

”ہمیں ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے کچھ دن بعد۔“

”اوہ کس قدر پر مسرت دن ہوں گے وہ!“ سکندر علی نے خوشی کا اظہار کیا ”تم میری زندگی میں آنے والی ہر عورت سے مختلف ہونے لگا۔“

اتنا بے قرار تو مجھے کسی نے نہیں کیا۔“

نہن کو اس کی بات پر اچھا ہوا وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اب تک اس کی زندگی میں کتنی عورتیں آچکی ہیں لیکن شاید سکندر علی کو خود بھی اپنی کمی ہوئی بات کا احساس ہو گیا تھا۔

”چلو ہم کچھ شاپنگ کرتے ہیں۔“ وہ اچانک ہی کھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔“ نہن گھبرا گئی۔ ”پھر سہی۔ یوں بھی ہمیں گھر سے نکلے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ احسن کو اس بات کا علم ہو کہ میں

آپ کے ساتھ باہر گھومی پھری ہوں۔“

”سو واٹ؟ اب تمہیں میرے ساتھ ساری زندگی گھومنی ہے۔ اس چھوٹے سے گھر میں بسنے والے اس چھوٹے سے آدمی کا خوف کیوں

تمہیں اتنا پریشان کر رہا ہے نہن؟“

نہن خاموش ہو گئی۔ نہ جانے کیوں وہ اداس سی ہو گئی تھی۔

میرا سکندر علی نے اس کی ایک نہی تھی۔ وہ اسے ایک شاندار جیولر شاپ پر لے آیا تھا۔ وہاں رکھے زیورات نے نظروں کو خیرہ کر ڈالا۔

وہ دونوں کافی دیر وہاں بیٹھے مختلف زیورات نکلوا کر دیکھتے رہے۔ کبھی نہن کو کچھ پسند نہ آتا تھا کبھی سکندر علی کو۔ چھ بہرے جڑی ایک

نہایت قیمتی اور خوب صورت انگوٹھی پر دونوں متفق ہو گئے۔

سکندر نے وہیں انگوٹھی اس کے ہاتھ کی انگلی میں ڈال دی۔

واپسی پر وہ خوش تھی بے حد خوش۔ اس کی نگاہ بار بار اپنے ہاتھ پر پڑتی اور تفاخر کے احساس سے اس کی گردن اونچی ہو جاتی تھی۔ اس کے

دل سے فی الحال دوسری ہر بات نکل گئی تھی۔

”رملی کے ہاں چلو گی پہلے؟“ سکندر نے پوچھا تو وہ چونک اٹھی۔

”کیا وقت ہوا ہے؟“

”نو بجنے والے ہیں۔“ وہ قدرے بے فکر سی بولا تھا۔

نہن کا دل نہایت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے گھر سے نکلے تین گھنٹے ہونے والے تھے۔ احسن نے اس کا کس قدر انتظار کیا ہوگا۔ وہ کتنا

بے چین ہوگا۔ اس نے کیا کچھ سوچا ہوگا۔ وہ اس تصور سے پریشان ہو گئی۔

”اے صاف صاف بتا دینا تم کہاں سے آئی ہو۔“

سکندر علی بولا تو وہ چونک اٹھی۔

”ہوں..... جی!“

”اس کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا، عورت ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو مرد اسے چھوڑنے میں دیر نہیں لگاتا۔“

”جی!“ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

گھر کے سامنے وہ اتری تو اس کا دل بے تاب سے دھڑک رہا تھا۔ اب تک وہ خود کو جتنا مضبوط اور بہادر تصور کرتی رہی تھی، اتنی ہی گھبراہٹ اور پریشانی اسے لاحق ہو رہی تھی۔ احسن کا سامنا کرنے کے تصور سے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

دروازہ اسے کھلا ہوا ملتا تھا۔ وہ اندر پہنچی تو احسن اکیلا لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنے عجیب تاثرات رقم تھے جو نہ سب سمجھ نہ پائی۔

”زینو“ اسے دیکھتے ہی وہ پریشانی سے بولا۔ ”کہاں چلی گئی تھیں تم؟“

”میں۔“ اس نے نجائے کیا کچھ سوچا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ بول پائی ”میں ملٹی کے گھر تھی؟“

”ملٹی کے؟ تم ملٹی کے گھر تھیں؟“

”جی..... جی.....“

وہ چند لمحوں سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی ایک گہری کیفیت تھی۔

”تم ملٹی کے گھر نہیں تھیں نہ سب! میں خود گھنٹہ بھر پہلے پوچھ کر آیا ہوں.....“

نہ سب کو احساس ہوا جس طوفان سے وہ بے طرح خوفزدہ ہو رہی تھی، اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ طوفانی ہوا کس چلنے لگی تھیں۔ بیٹیاں سی جیتی سنائی دیتی تھیں۔

”بولو، بولو زینو! مرا جاؤں گا میں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا ”اوہ خدایا!“

”احسن، احسن۔“ وہ اس کی اس بدلتی کیفیت سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔

”نہ سب! مجھے بتاؤ تم کہاں گئی تھیں۔“ پھر وہ زور سے چیخا تھا ”بتاؤ!“

نہ سب کو لگا اس کے گلے کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

”بتاؤ کس کے ساتھ گئی تھیں تم! مجھ سے چھپ کر، مجھ سے جھوٹ بول کر۔“

نہ سب چند لمحوں سے دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس تک پہنچی اور اس کے قریب دوزانو بیٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”احسن! احسن! آپ کو خدا کا واسطہ ہے، خود کو اور مجھ کو مت آزما لے گا۔ جو میں کہوں آپ نے وہی کرتا ہے۔“

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی بے یقین نگاہوں میں حیرانی کا سایہ لہرایا تھا۔

”احسن..... میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے طلاق دے دیں، مجھے طلاق دے دیں، مجھے آزاد کر دیں احسن پلیز!“

پھر وہ اٹھ کر بھاگتی ہوئی کمرے میں پہنچی اور دروازہ بند کر لیا۔



ساری رات جاگتے اور روتے ہوئے گزری تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ بس اسے بے اختیار اور بے تحاشا رونا آیا تھا۔

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ پھر نجائے کب اس کو نیند آگئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے دھوپ اندر آگئی تھی۔ دس ساڑھے دس کا عمل تھا۔ رات کی باتیں اسے کسی خواب کی مانند یاد آنے لگیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سر چمکا رہا تھا اور سوچے ہوئے پونے پوری طرح کھلنے سے انکار کرتی تھی۔ آنکھوں میں بے تحاشا جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا، رات کو کیا ہوا تھا۔ اس نے احسن سے کیا کہا تھا۔ اس کا رد عمل کیا تھا۔ یکا یک اس کو احساس زیاں نے آیا۔ کسی بڑے نقصان کا احساس اب تک کرنے لگا۔

”یہ میں نے کیا کیا۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”یہ کیا کر دیا ہے میں نے۔“

پھر وہ ابھی اور بھاگتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

گھر خالی پڑا تھا۔

”احسن، احسن۔“ وہ آوازیں دیتی پورے گھر میں پھری۔

بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ پھر اس کی نگاہ میز پر پڑے سفید لفافے پر پڑی ایک لمحے کے لیے جیسے اس کی سانس رک گئی تھی۔

وہ مرے مرے قدموں سے لفافے تک پہنچی تھی۔ اس میں دو الگ الگ اوراق تھے۔

”میں احسن ایاز بھائی ہوش و حواس اپنی بیوی زینب شاہ کو طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔“

پہلے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھ کر وہ بہت دیر تک کے لیے گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔



شام کے سنہری پر آہستہ آہستہ رات کی تاریکیوں میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ پرندے کب کے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ فضا میں سناٹا بولنے لگا تھا۔

زینب نے آنکھیں کھولیں تو اسے گھر میں پہلے میب سناٹے اور تاریکی کا احساس ہوا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی بیٹھی خود کو تنہائی کو اور سنانے کو محسوس کرتی رہی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سوچ بچہ بڑ تک جا کر اس نے ساری لائٹس جلا دیں پھر وہیں کھڑی بے دلی سے ایک ایک شے کو دیکھتی رہی۔ صبح سے رات ہو چکی تھی ایک طویل دن اس نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے گزار دیا تھا۔

ایک بار پھر اس نے میز پر پڑے لفافے اور اس کے نیچے سے جھانکتے کاغذوں کو دیکھا۔ ایک بار پھر اسے خالی پن کے احساس نے آیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے پھر وہ کاغذ اٹھائے۔

”میں احسن ایاز بھائی ہوش و حواس اپنی بیوی زینب شاہ کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔“

”آہ!“ اس نے سر دہا بھری تھی۔

کب سے وہ منتظر تھی اس اسم اعظم کی، جو اسے اس قید سے رہائی دلاتا، لیکن نجانے کیا ہوا تھا۔ جتنی مرتبہ اس نے ان لفظوں کو پڑھا تھا ایک جان لیوا تکلیف وہ احساس اسے اندر تک کاٹا چلا گیا۔ یہ چند لفظ اس کے اندر زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔

صبح سے وہ ان الفاظ کو پڑھتی تھی۔ روتی تھی، پھر پڑھتی تھی۔ اس آنکھ بھولی میں گھر میں رات آتی تھی۔

احسن اس کے نام ایک خط بھی چھوڑ کر گیا تھا۔

اسے زینب محض ایک مرتبہ ہی پڑھ سکی تھی دوبارہ اسے پڑھنے کی ہمت وہ اپنے اندر جمع نہیں کر سکی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

زینب!

خوش رہو

ہر چند کہ تمہیں مخاطب کرنے کا اختیار کھودیا ہے میں نے، پھر بھی چند باتیں ایسی ہیں جو تم سے ضرور کہنا چاہوں گا۔

تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں، معذرت خواہ ہوں..... اتنا طویل عرصہ تمہارے اور تمہاری خوشیوں اور تناسلوں کے درمیان حائل تھا۔

بہ خدا زینب! کبھی احساس ہی نہ ہوا کہ میں نے تمہیں، محبت کی نہیں، جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کبھی گمان بھی نہ گزرا کہ اپنی محبت کا طوق زبردستی تمہارے گلے میں ڈال کر تمہارے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر بیٹھا ہوں۔ تمہاری نازک گردن جو بیش قیمت ہیروں سے سجائے جانے کے لائق ہے میرے فرسودہ اور کم قیمت جذبوں کا طوق نہ سہار کی تو یہ تمہاری نہیں میری خطا ہے۔

چاہے جانے والی شے کو ہر کوئی چاہتا لیکن اسے حاصل کرنے سے پہلے چاہنے والے کو اپنی جانب ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ تمہاری محبت کی فسوں خیز روشنی میں، میں خود کو نہ دیکھ پایا، زینب! آسمان پر چمکتے چاند کو اپنی کوٹھڑی میں چھپانے کی تمنا حمایت ہے، دیوانگی ہے۔ میں احمق، دیوانہ تھا، مجھے تسلیم ہے۔ تمہارے سر کوئی گناہ نہیں، الزام نہیں جو کچھ ہمارے مابین ہوا اس کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں آزاد کر دیا ہے۔ تم اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکتی ہو۔ یا شاید شروعات تو تم کر چکی ہو۔ میری جانب سے مبارک باد قبول کرو۔ میری دعا ہے، تمہیں وہ سب کچھ ملے جس کی تم نے تمنا کی اور جو میں تمہیں کبھی نہ دے پایا۔ میری دعا ہے ان چاند تاروں سے تمہاری جھولی بھر جائے جو میری دسترس میں رہ کر تمہاری دسترس سے ہمیشہ دور ہے۔

میں جا رہا ہوں، ہر رشتہ، ہر تعلق تو ذکر، کہاں تک جاؤں گا مجھے بھی علم نہیں۔ لیکن خدا اور تقدیر پر میرا بھروسہ اٹل ہے۔ اتنا طے ہے کہ آئندہ ہم دونوں کبھی نہیں ملیں گے۔ کبھی نہیں اور کہیں نہیں۔ تم اپنے نئے محل میں جانے سے قبل کچھ عرصہ یہیں گزار سکتی ہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی، الماری میں اتنی رقم موجود ہے جو چند ماہ تک تمہارے لیے کافی ہوگی۔

میں نے تمہارے لیے دل سے دعا کی ہے زینب! تو بھی دعا کرنا کہ خدا مجھے سکون دے۔ سکون دے۔ سکون دے۔

احسن ایاز

بتل کی آواز نے اسے سناٹے کی قید سے آزاد کر لیا تھا۔ نجانے کیوں بتل کی آواز نے بھی اس کو اذیت سے دو چار کیا۔ یہ آواز احسن کے آنے کا مژدہ سنایا کرتی تھی۔ اس آواز سے تو احسن کا جیتا جاگتا احساس وجود میں آتا تھا۔ وہ نضی سی چڑیا جو بتل میں سے سر نکال کر چوں چوں کرتی تھی اسے احسن کی آمد کی نوید سنایا کرتی تھی۔

وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی تھی۔ دروازہ کھلنے پر اسے رملی کی صورت نظر آئی تو چند لمحوں کے لیے وہ گم سم ہو کر رہ گئی۔

”اندر آ سکتی ہوں؟“ وہ چند لمحوں کے لیے اسی سے دیکھتے رہنے کے بعد بولی تھی۔

زینب کسی رو بوٹ کی طرح ایک طرف ہو گئی۔ وہ اندر چلی آئی، لاؤنج تک زینب اس کے پیچھے پیچھے چلتی آئی۔ پھر رملی مڑی۔

”میں دراصل دیکھنے آئی تھی کہ تم گھر پر ہو یا نہیں صبح میں نے اماں کو بھیجا تھا وہ دروازہ بجا بجا کر واپس چلی آئی لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا۔“

تم اور احسن بھائی کہاں گئے تھے؟“

زینب نے نظریں جھکا لیں۔

”میں گھر پر ہی تھی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”پھر..... تم نے دروازہ کیوں نہ کھولا؟“

”مجھے خبر نہ ہوئی۔“ اس کے انداز کھوئے کھوئے سے تھے۔

”حیرت ہے، اتنا بڑا گھر تو نہیں جس میں تمہیں بتل کی آواز نہ سنائی دے یا دروازہ نہ بجے کا علم نہ ہو۔ احسن بھائی کہاں ہیں؟“

”وہ..... چلے گئے ہیں۔“

رملی نے بات نہ سمجھنے کے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟ کہاں چلے گئے ہیں؟“

نہیں میرے دونوں خط اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیے۔ رملی نے کچھ سوچتے ہوئے وہ اوراق اس سے لے لیے۔

”اوہ گاڈ!“ اس کے لبوں سے نکلا تھا، وہ چند لمحوں تک اس کو دیکھتی رہی پھر دوسرا خط پڑھنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے دونوں خط میرے

ڈال دیے۔

”میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں کیا کہوں؟“ وہ صدمے سے بیٹھ گئی ”تمہیں..... مبارکباد دوں یا تم سے افسوس کا اظہار کروں۔ تم یہی کچھ چاہتی تھیں نا زینب..... یہ کچھ! لیکن..... لیکن میں تمہیں مبارکباد نہیں دے سکتی، اس تباہی پر میں تمہیں مبارکباد نہیں دے سکتی۔ اوہ گاڈ!“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”معلوم نہیں رملی! میں کیا چاہتی تھی..... اس وقت تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا ختم ہو گئی سب کچھ ختم ہو گیا بس ایک خالی بن بول رہا ہے۔ بس ایک خالی پن، جو کہہ رہا ہے کہ میں اب کبھی بھی مسکرا نہ پاؤں گی۔ احسن کے چلے جانے سے لگ رہا ہے، نقدیر مجھ سے روٹھ کر چلی گئی ہے۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔ رملی نے افسوس سے اس کی صورت دیکھی۔

”سب کچھ تمہارا اپنا کیا دھرا ہے زینب! پھر بھی مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔“

”رملی!“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو دی تھی۔



اگلے دن تک وہ ذہنی طور پر سنبھل نہ سکی تھی۔ اندرونی صدمے کی کیفیت اس قدر گہری تھی کہ اسے اپنے اندر محض ایک خلا کا احساس ہو رہا تھا۔ ذہن ماؤف تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ ایک کہانی شروع ہو کر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن میں تصویریں بن بن کر مٹ رہی تھیں۔ اس کے کنوارے پن کے وہ روشن اور خوشگوار دن، جب دل و دماغ مستقبل کی حسین تصویر میں رنگ بھرنے میں ہمد وقت مصروف رہا کرتے تھے۔ البتہ پن اور بے فکری کے دن، پھر احسن ایاز کا اس کی زندگی میں داخل ہونا اس کے دل و دماغ کا اس کی جانب مائل ہونا، ان دونوں کا ایک جا ہو جانا، اور پھر..... پھر اس کے ذہن میں آندھی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ سب کچھ ٹٹے لگتا تھا برباد ہونے لگتا تھا۔ اور وہ اپنے برباد ہونے کا ماتم کرنے لگتی تھی۔

سکندر علی کا اچا کبھی ہی چلے آنا تو کہ اس کے لیے تعجب کی بات نہ تھی پھر بھی اسے ایک عجیب سے احساس نے آگھیرا۔ نجانے کیوں، اسے کبھی کبھی اپنے اندر سے کراہنے کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ اکیلے گھر اور سکندر علی کی آنکھوں کی چمک نے اسے چند لمحوں کے لیے ہراساں کر دیا تھا۔

”آپ..... آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”وٹس رائٹ! اب تو تمہیں میرے گھر آنا ہے۔“

وہ خوش دلی سے بولا ”میں تو محض بلا مقابلہ ہی جیت جانے کی خوشی کی شہر کرنے آیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے، ہر چند کہ آج میری بہت امپارٹنٹ میٹنگ بھی ہے۔ پھر بھی میں تمہارے پاس چلا آیا تو سزا سناؤں کال کر، کافی پلاؤ اچھی سی۔“ وہ بے فکری سے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

”نہیں پلیز!“ وہ بے چین ہوا۔ ”آپ سمجھنے کی کوشش کریں فی الحال ہمارا ملنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہاں ہاں..... سمجھتا ہوں ہم فوراً شادی نہیں کر سکتے۔ کچھ عرصے کے لیے ہمیں علیحدہ رہنا ہوگا۔ وہ کیا کہتے ہیں..... عدت! ہاں عدت

میں ہونا تم۔“

زینب کو لگا کسی نے اس کا دل مسل کر پھینک دیا ہو، وہ ہونٹ بری طرح سے کاٹ کر رہ گئی۔

”لیکن ڈرائنگ! اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم مل بھی نہیں سکتے، میں نے تو تمہارے لیے ایک علیحدہ گھر کا بندوبست بھی کیا تھا۔ میرا خیال

تھا وہ شخص طلاق دے کر تمہیں گھر سے جانے کے لیے کہے گا۔ لیکن خیر..... تمہاری مرضی ہے تم یہاں سے شفٹ کرنا چاہو تو عدت کے دن اس گھر میں بھی گزار سکتی ہو۔ اس کی نسبت وہ بہت زیادہ آرام دہ اور نگہبانی ہے۔ بہت خوبصورت۔“

”نہیں.....“ وہ آہستگی سے بولی ”میں فی الحال یہیں ٹھیک ہوں۔“

”ابھی تو میری میٹنگ ہے۔“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تھی۔ ”شام کو کہیں چلتے ہیں۔ اس خوشی میں بہترین ساؤنڈ کرتے ہیں ٹھیک ہے۔؟“

”آج نہیں.....“ وہ بے چین ہوا بچی ”پھر کبھی، پلیز کچھ دن تک آپ یہاں مت آئیے گا۔“ سکندر علی نے کاندھے اچکا کر گہری سانس بھری تھی۔

”بے حد مشکل عورت ہو تم، سمجھ میں ہی نہیں آتا کس وقت کیا کہنا چاہتی ہو، بہر حال ابھی تو میں جا رہا ہوں کافی پلانے پر بھی تم راضی نہیں ہو۔ اگلی ملاقات کا وقت بھی نہیں دے رہی ہو۔ یوں کرو..... یہ میرا موبائل رکھ لو..... اور ہاں یہ رکھو۔“

اس نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ بٹے سے نکال کر میز پر رکھ دیے۔

”نہیں نہیں.....!“ وہ گھبرا گئی ”اس کی ضرورت نہیں پلیز۔“

”ارے ڈارلنگ! تکلف مت کرو، اب یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے نا۔“ اس نے پیار سے زینب کا گال چھونا چاہا۔ وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی تھی۔

”اوہ..... شائے گرل!“ وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسا ”خیر..... کبھی تو.....“

وہ پھر ہنسا تھا، اس کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک میز پر بکھرے نوٹوں کو دیکھتی رہی۔ فی الوقت اسے ان میں بھی کشش محسوس نہ ہوئی تھی، کوئی شے اس کے ذہن میں نہ آتی تھی۔ جسے وہ خریدنا چاہتی ہو یا جس کی اسے ضرورت ہو۔ ہر شے سے دل بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ان نوٹوں کو یونہی میز پر بکھرا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اسے احسن کا خیال آیا، وہ کس طرح اسے دروازے کھڑکیاں بند رکھنے کی ہدایت کرتا تھا، وہ گھر کے دروازے بند ہی رکھتی تھی۔ نجانے دل کا دروازہ بند کرنا کیسے بھول گئی۔ کہاں کون سی چور کھڑکی کھلی رہ گئی نقب کیے گئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”جانا ہی تھا تو مجھ سے خوب لڑو لیتے۔ مجھے غلط گالیاں دیتے۔ مجھ پر تھوکتے، میرے کردار پر لعنت بھیجتے، میرے تصور پر لاجول پڑھتے۔ مجھے گھر سے نکال باہر کرتے۔ مجھے اتنی، اتنی زیادہ اذیت تو نہ ہوتی۔ جتنی محبت سے اپنایا تھا۔ اتنی ہی محبت سے چھوڑ گئے ہو..... اور..... کہاں گئے ہو، کہاں..... یوں خالی ہاتھ، خالی دامن، خالی دل لے کر تم کہاں چلے گئے..... یہ تصور کیا مجھے چین سے جینے دے گا؟ کیا اب کبھی مجھے قرار آ پائے گا، کہاں گئے احسن تم۔“

کالی سڑک پر نگاہیں جمائے وہ بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔



وہ دن جو پہلے پرلگا کر اڑا کرتے تھے، اب جیسے کسی کالے دیو کی قید میں آ گئے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں رک رک کر آگے بڑھا کرتی تھیں۔ سورج نکل کر غروب ہونا بھول جاتا تھا، رات آتی تھی تو اپنی ظالم آغوش سے دن کو نکلنے نہ دیتی تھی۔

زینب گھڑیاں گن گن کر تھک جاتی تھی۔ وہ گھر جہاں کبھی کام ختم ہونے میں نہ آتے تھے وہاں اب کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں ایک کمرے سے نکلتی تو دوسرے کمرے میں جا گھتی وہاں سے نکل کر پھر پہلے کمرے میں آ جاتی۔ کسی سے بات کرنے کو اس کی زباں ترس گئی تھی۔ سکندر علی کا موبائل فون اس کے پاس تھا لیکن اس نے بھی اب تک اس کو ایک مرتبہ بھی فون نہیں کیا تھا۔ غالباً اس روز زینب کے رویے نے اسے متاثر کر دیا تھا۔

پھر بے حد اکتا کر اور اس جان لیوا سانحے سے ہار مان کر وہ رملی کی طرف چلی آئی..... رملی اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ پھر بالآخر وہ بولی۔

”تمہیں گھر سے نہیں نکلنا چاہیے نہ ب! تم عدت میں ہو۔“

”آہ!“ اس کے اندر سے خود بخود ہی سرد سانس نکلی تھی ”میں مرجاتی رملی.....! تنہائی کسی بچھو کی طرح میرے سینے میں پنچے گا زری تھی۔ تمہیں اتنا ترس بھی نہ آیا مجھ پر کہ آ کر میرا حال پوچھ جاتیں۔“

”ترس.....“ وہ طنز سے ہنس دی ”ترس مظلوم کے لیے ہوتا ہے ناکہ ظالم کے لیے۔ تم پر ترس کیوں کھاؤں میں، یہ چند دن مجبوری کے ہیں جو تمہیں کاٹنے ہی پڑیں گے، اس میں ترس کی کیا بات ہے۔ پھر تم ہوگی اور تمہاری خواہشات کی تکمیل کا ناختم ہونے والا سلسلہ جو چاہے وہ تمہاری دسترس میں ہوگا میری جان..... بڑی دھوم دھام سے بیاہ کر جانا میرے سکندر علی کی کوشی ہاں.....“

نہیں کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔

”آخر تم مجھ سے اتنا چڑنے لگی ہو رملی!“ پھر وہ بولی تھی۔ ”ٹھیک ہے اگر اپنی زندگی سے متعلق کوئی فیصلہ میں نے کیا بھی تو تمہارے ساتھ کون سا ظلم کیا ہے؟ اگر کچھ غلط بھی ہوا تو اس کا تمہاری ذات پر تو کوئی اثر نہیں پڑا۔ تمہارا کوئی نقصان نہیں کیا میں نے۔ سکندر پہلے بھی تمہارا بھائی تھا۔ اب بھی رہے گا۔“

رملی نے سانس بھر کر منہ پھیر لیا تھا۔

”ہر شخص اپنی زندگی سے متعلق فیصلہ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔“ وہ مزید بولی ”اگر اس فیصلے سے تمہارا نقصان ہوتا تو تمہارا یہ رویہ سچا بھی ہوتا لیکن مجھے تو حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس سارے قصے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں پھر بھی سب سے زیادہ سخت رد عمل تمہارا ہی ہے۔“

”میرا تعلق نہیں؟“ رملی جارحانہ انداز میں بولی ”میرا تعلق کیسے نہیں ہے۔ جتنا نقصان تم نے میرا کیا ہے اتنا تو اپنا بھی نہیں کیا ہے۔“

”رملی ڈارلنگ!“ اچانک ہی میرے سکندر علی کی پرسکون آواز نے ماحول کو یکدم جیسے اپنے زخاں میں لے لیا تھا۔ رملی اور نہیں چوبک کر دروازے کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں جہاں وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون انداز میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”کس بات پر بحث ہو رہی ہے فرینڈز؟“ اور چلا آیا۔

نجانے اس نے طنز کیا تھا یا وہ سنجیدہ تھا۔ نہیں کو اس کا لہجہ سمجھ میں نہ آ سکا۔ رملی خاموش ہو کر گہرا سانس بھرنے لگی تھی۔ سکندر علی اسی کی جانب متوجہ تھا۔

”غصے میں گئی ہو؟“ وہ لب بھینچ کر مسکرایا۔

”نہیں، غصہ کیسا۔“ وہ ٹھنڈی پڑ گئی ”تم بیٹھو میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ سکندر علی اس کے مقابل بیٹھ کر ناقابل فہم انداز میں مسکرانے لگا تھا۔

”دیکھا تم نے نہیں! میزبانی ایسے کی جاتی ہے تم بھی یہ گلس سیکھو رملی، ہر چند کہ وہ خفا ہے پھر بھی کافی پلائے بغیر جانے نہیں دیتی۔“

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں کچھ دیر قبل کہی گئی رملی کی باتیں گونج رہی تھیں سکندر علی بغور اس کو دیکھتا رہا۔

”اور کتنے دن ہیں نہیں؟“ پھر اس نے پوچھا تھا۔

”بس، کچھ دن اور ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”میرے صبر کا اور کتنا امتحان لینا ہے تم نے.....“ وہ مسکرایا۔

زنہب کا دل دھڑکنا بھولنے لگا۔ وہ اسے دیکھ کر تھوک نکل کر رہ گئی۔

”ہم خاموشی سے، چپ کر شادی نہیں کریں گے۔“ وہ بولا ”بڑی دھوم دھام سے ہوگی۔ اس رات میں پورے شہر میں چراغاں کر دوں گا۔ تمہیں شاپنگ کے لیے کب لے چلوں؟“

”شاپنگ؟“ اس نے غائب دماغی سے اسے دیکھا۔

”ہاں ہاں..... جی کھول کر پیسہ خرچ کرنا تم، میری طرف سے کوئی پابندی نہ ہوگی۔ تمہارا عروسی لباس میں اس شہر کی سب سے بہترین ڈیزائنر سے تیار کروا رہا ہوں۔ اس کا کلر کبھی نیشن، اس کی ڈیزائننگ، اس پر کیا گیا کام، سب کچھ تمہارے لیے ایک سرپرائز سے کم نہ ہوگا۔ دیکھو گی تو کھل اٹھو گی۔ اس کے ساتھ کی جیولری بھی میں نے پسند کی ہے۔ باقی سب کچھ تمہاری پسند پر چھوڑا ہے جو کچھ خریدنا چاہو خریدنا۔“

رملی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس نے سکندر علی کی گفتگو کا کچھ حصہ سن لیا تھا۔ وہ زنہب کو دیکھ کر طنزاً مسکرائی۔

”ہاں کیوں نہیں، اسے جی بھر کر ساپنگ کروانا، اسے یوں بھی شاپنگ کا کریز ہے، اس کا غم بھی کچھ غلط ہوگا۔“ وہ بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں بولی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹرے اس نے ان کے درمیان رکھ دی۔

اس نے بے حد عجیب بات کہی تھی مگر زنہب اندر تک سلگ گئی تھی۔ اس نے کڑی نگاہوں سے رملی کو گھورا۔

”سکندر! باقی باتیں تو بعد میں طے ہوتی رہیں گی لیکن پلیز“ آپ اس کو اچھی طرح سمجھا دیں، یہ مجھ پر ہر وقت کی چوٹ کرنا چھوڑ دے..... ورنہ.....!“

”ورنہ.....“ وہ تسخیرانہ انداز میں مسکرا دی ”ورنہ کیا کرو گی زین تم؟ سکندر سے شادی نہیں کرو گی؟ ہاں..... یہ پہلی اور آخری دھمکی ہے جو تم دے سکتی ہو۔“

”رملی!“ وہ چلائی تھی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو دی۔

”اوہ..... اوہ.....“ سکندر علی اس صورتحال سے گھبرا اٹھا ”کم آن زنہب! یہ کیا حرکت ہے۔ رملی! از جسٹ جو کنگ..... رملی! یا راسے چپ کر! تم بھی کبھی کبھی لمٹس کر اس کر جاتی ہو۔ اب بھلا ایسے مذاق کی کیا ضرورت تھی۔“

”نجانے تم کس بات کو مذاق کہہ رہے ہو۔“ اس نے بے پروائی سے کاندھے اچکائے ”میں نے کوئی بات بھی مذاق میں نہیں کہی۔ اپنی دے، اس کو چپ کرانا تمہارا در دسر ہے۔ میں فی الحال اس رد میٹنگ پتویشن میں مغل نہیں ہونا چاہتی۔ میں کچھ دیر سوؤں گی۔“ وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

”زنہب! مائی ڈارلنگ..... بی ایزی!“ وہ اس کا شانہ تھکنے لگا ”آنسو پونچھو..... مسکرا..... شاباش، چیز آپ۔ روتی ہوئی عورتیں بہت عجیب لگتی ہیں مجھے۔“

زنہب نے نٹو سے چہرہ صاف کیا۔ اسے رملی سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

”کانفی لو.....“ سکندر ٹنگ اس کی جانب بڑھا یا۔

”نہیں.....“ اس نے ناگواری سے گ پرے کر دیا۔ ”مجھے نہیں پتہ کیا کانفی۔“

”اوہ.....“ وہ خوش دلی سے ہنسا ”چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”بالکل موڈ نہیں ہے۔“ اس نے نفی سے سر ہلایا۔

”کیسا موڈ ہے پھر بتاؤ! اس حساب سے پروگرام سیٹ کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کچھ شاپنگ ہو جائے۔ آج سے شادی کی تیاریوں کی

شروعات کرتے ہیں۔ چلو، تمہارے لیے ڈریسز وغیرہ پسند کرتے ہیں۔“

نہیں خاموش ہو کر سوچنے لگی۔ ان باتوں کا کتنا شوق تھا اسے، احسن سے شادی سے قبل اس کا کیا کیا خریدنے کے لیے دل چلتا تھا، وہ بازار جا کر یوں لوٹتی تھی، جیسے پیاسا کنویں کے قریب جا کر لوٹ آئے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کی شادی شہزادیوں کی سی آن بان سے ہو۔ جو دیکھے وہ عیش عیش کرے۔

اب اسے یہ سب ارمان پورے کرنے کا موقع مل رہا تھا لیکن دل..... یوں لگتا تھا وہ دل سینے سے نکل کر کہیں روٹھ کر جا بیٹھا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اپنے دل کو ڈھونڈنا اشد ضروری تھا۔

”کیا سوچنے لگیں ڈرائنگ! یہ کپڑوں کا دور ہے۔ سوچنے کے لیے اتنا وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے تمہیں۔ میری طرح فیصلے کیا کرو۔ فوری، جامع اور فائدہ مند فیصلے۔“

نہیں نے چند لمحوں کے لیے سوچا پھر بولی۔

”میرا خیال ہے..... یہ سب باتیں کچھ دن کے لیے منور کر دی جائیں۔“

سکندر علی کا ندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔



بالآخر وہ روتے، اونگھتے دن تمام ہوئے تھے۔ نہن جب باتیت اور مردہ دلی سے اس حصار سے پوری طرح نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور باہر نکل آئی تھی۔ احسن کی یادیں پہلے پہل بارش کی طرح موسلا دھار برسی تھیں پھر انکی شدتوں میں کمی آگئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ دھندلا نا شروع ہو گئی تھیں۔ نئے عکس بننے لگے تھے۔

اس کے اندر سوئی ہوئی چند برس پرانی نہن ابھرائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ جسے چاہتی، شوق تھا، حرص تھی، تمننا تھی۔ ہر شے سے دامن بھر لینے کی۔ ہر خوشی کو چھوڑ کر دیکھنے کی۔ جذباتیت کے اس حصار سے نکلنے میں میر سکندر علی نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ اس کے منع کرنے کے باوجود اس سے ملنے آتا رہا تھا۔ اسے فون کرتا رہا تھا۔ اس کی باتوں نے اسے سوچوں کے اس گرداب سے باہر نکالا تھا جس میں وہ گلے گلے تک جا پھنسی تھی۔

”بھول جاؤ کہ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی معمولی، بے نام شخص بھی گزرا تھا، بس ایک ڈراؤنے خواب کی مانند سمجھو اس کی یادوں کو، جو ذہن میں تو رہتا ہے مگر اس کا سوچوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، یوں سمجھو، تمہاری آنکھ ابھی ابھی کھلی ہے پیچھے جو کچھ تھا وہ محض خواب تھا۔ آگے جو کچھ ہے وہ حقیقت ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ تم نہن سکندر علی بننے جا رہی ہو۔“

سکندر علی نے فون پر اس سے کہا تھا اور وہ واقعی پھچلا سب کچھ ایک خواب سمجھ کر بھلانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ احسن کی تمام چیزیں اس نے ایک الماری میں بند کر دی تھیں اس لفافے سمیت جس میں اس کا خطا اور طلاق نامہ تھا۔ اس نے اپنے استعمال کے لیے وہ رقم بھی خرچ نہیں کی تھی جو احسن چھوڑ گیا تھا اب وہ میر سکندر کی رقم خرچ کرتی تھی۔ وہ ہر طور احسن ایاز کو بھلا دینا چاہتی تھی۔



”آج میری عدت ختم ہو گئی۔“ اس نے سکندر علی کو بتایا ”میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کر رہی ہوں۔“

وہ اس کے موہاں پر اس سے باتیں کر رہی تھی۔

”گنڈ!“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”گویا ہم دونوں ہی آزاد ہیں۔ آئی ایم ریلی پیسے تمہیں لینے آؤں گا۔“

”جی! اس نے گہرا سانس بھرا ”آج تو..... آج تو واقعی مسکرانے کو جی چاہ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے عرقید بھگتائی ہو۔ کوئی پروگرام بنائیں نا..... اچھا سا..... جو موڈ کو ایک دم ٹھیک کر دے۔“

”ہوں..... میں آرہا ہوں تمہیں لینے، پروگرام ساتھ مل کر بنائیں گے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

نہنوب مو بائل ایک طرف رکھ کر تیار ہونے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ آج کا دن اس کے لیے بے حد اہم تھا وہ اپنے کپڑے دیکھنے لگی۔ پچھلے دنوں سکندر علی اس کے لیے ایک بے حد قیمتی ساڑھی لایا تھا۔ نہنوب نے وہی ساڑھی اپنے لیے منتخب کی۔ نہادھو کر اس نے اپنے لائے، سیاہ خوبصورت بال دل لگا کر سنوارے پھر تیار ہونے لگی۔ گہری ہنر، باریک ساڑھی میں اس کا سر پاپا کی مورتی کی طرح سج اٹھا تھا ہلکی سی جھلک دیتی گوری، نازک کر اور ہاف سیلیو ز میں جکڑے چپکتے باز و قیامت ڈھانے لگے۔

گہرے رنگ کی لپ اسٹک کی تہہ ہونٹوں پر بجا کر اس نے چہرہ چمکایا اور گلے میں ہیرے والا وہی لاکٹ ڈال لیا جو سکندر علی کی جانب سے اس کے لیے پہلا تحفہ تھا، ہائی نیل کی سینڈل نے اس کی خوش قسمتی میں اضافہ کیا تو وہ ناقابل یقین حد تک حسین نظر آنے لگی۔

سکندر علی آیا تو کچھ دیر کے لیے مسکرا کر اسے دیکھتا رہا۔

”پروگرام کیسے تبدیل ہو چکا، تمہیں یوں دیکھ کر محض ایک ہی پروگرام بن سکتا ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ وہ قدرے چونکی تھی۔

”چلو..... گاڑی میں بیٹھو، پھر بتاتا ہوں۔“ وہ کوٹ کی جیب سے رگڑ نکال کر لگانے لگا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ منتظر رہی کہ وہ اسے کیا پروگرام بتاتا ہے مگر وہ خاموشی سے ڈرائیوگ کر رہا تھا، اس کے چہرے پر گہری سوچ کا عکس تھا۔ نہنوب نے دو تین مرتبہ اسے دیکھا پھر اسے مہربان پاکر خود بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

گاڑی کو رت کی عمارت میں جا کر رک کی تو نہنوب کی نگاہوں میں بے یقینی اور تھیر کی کیفیت نمودار ہوئی۔

”یہاں..... ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”یہاں ہم میرج پیپرز سائن کرنے آئے ہیں۔“

اس کا طینان قابل دید تھا۔ ”میرے وکیل نے ساری تیاری کی ہوئی ہے بس سکلنچر کا کام باقی ہے۔ آؤ ڈارلنگ!“ اس نے جھک کر اس

کی طرف کا دروازہ کھولا۔

”لیکن یوں اچانک.....؟“ وہ حیران تھی۔

سکندر علی بھر پور انداز میں مسکرا دیا۔

”تم تو یوں پریشان ہو رہی ہو، جیسے میں نے شب خون مارا ہو۔ یہ سب تو طے تھا بس اتنا ہوا کہ تمہیں دیکھ کر میری پروگرامنگ چینج ہو گئی۔“

اب مزید انتظار میرے لیے ممکن نہیں چلو آؤ۔“

نہنوب کو اچانک ہی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی ٹکٹے میں کسی جاری ہو۔ حالانکہ میر سکندر علی کے کہنے کے عین مطابق یہ سب تو طے تھا۔ پھر بھی اس کی دل کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر کسی کی زندگی میں شامل ہونے جا رہی تھی۔ اس مرتبہ صورتحال بالکل برعکس تھی۔

سکندر علی نے ٹھیک کہا تھا۔ سارا کام مکمل تھا انہیں کچھ ہی دیر میں میاں بیوی کی حیثیت مل گئی۔

گاڑی ایک مرتبہ پھر سیاہ مڑک پر رواں دواں ہوئی تو نہنوب بالکل خاموش تھی۔ زندگی کیسے تبدیل ہو گئی تھی۔ اور وہ اس تبدیلی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے شناسار استوں سے گزر کر اب ایک بہت طویل انجان شاہراہ پر آٹھنکی

ہو۔ ایک انجانا سا خوف اسے پریشان کر رہا تھا۔ ایک نامعلوم سی خوشی بھی کہیں کہیں سانس لیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کچے راستوں سے نکلنے کی خوشی، بڑی، شاندار اور ہموار شاہراہ پر چلنے کی خوشی، کچھ بن جانے کا غرور، وہ زنب شاہ سے زنب احسن ایاز بنی تھی تو زندگی میں بال برابر معمولی فرق پڑا تھا، آج زنب سکندر علی بن کر اس کے تمام انداز بدل گئے تھے۔ اس کو اپنے اندر ایک برقی رود وڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سنا، سکندر علی کہہ رہا تھا۔

”تم دل چھوٹا کرنا زنب کہ یہ سب کچھ اس قدر سادگی سے، اتنی آسانی سے ہو گیا۔ وہی کچھ ہوگا جو تم چاہو گی۔ میں ایسی پارٹی دوں گا کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ تم اپنے سارے ارمان پورے کرنا جو تمہارے دل میں ہیں۔ یوں سمجھو، اب یہ دنیا تمہاری مٹھی میں ہے۔“

زنب اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

”اوہ..... لکنگ پریٹی!“ وہ خوش ہوا ”یہ مسکراہٹ تو تمہارا اثاثہ ہے۔ تمہارے ہونٹ کے دائیں جانب جو ڈمپل پڑتا ہے وہ غضب ڈھاتا ہے۔“

وہ بے حد پر جوش تھا، اس کی تعریف کا انداز عجیب سا تھا جیسے وہ اسٹیج پر کھڑی کسی اداکارہ کی تعریف کر رہا ہو۔ زنب کو کچھ خاص خوشی نہ ہوئی۔

سکندر علی نے گاڑی چیلرز شاپ کے سامنے پارک کی تو زنب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اس خوبصورت، موقع کی یادگار کے لیے کوئی خوبصورت ساختہ!“ وہ مسکرایا تھا۔ ”یہ جو ساڑھی تم نے باندھی ہے، میچنگ جیولری کے بغیر اس کا تاثر ادھورا ہے چلو آؤ۔“

زنب حیران حیران سی گاڑی سے اترتی تھی، واقعی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا اس کی مٹھی میں ہو۔

سکندر علی کی فرمائش پر شاپ کے مالک نے اسٹون جیولری کا ڈھیر کا ڈھیر ان کے آگے پھیلا دیا تھا مرد کا ایک بے حد قیمتی اور بھاری سیٹ زنب نے پسند کیا اور اسے پہن کر ہر آنے سے جھانکتے اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔

ایک ہوٹل سے بد تکلف لُچ کر کے وہ نکلے تو زنب تھک چکی تھی۔

”گھر چلیں، میں تھک گئی ہوں۔“ اس نے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

”تھک گئیں؟ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئیں۔ جنہیں دنیا دیکھنی ہو وہ اتنی جلدی نہیں تھکا کرتے۔“

”آپ کا ارادہ آج ہی کے دن دنیا گھما دینے کا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”ہا ہا ہا.....“ وہ ہنسنے لگا کہ ہنس دیا تھا ”گڈ جوک! چلو اگر تم واقعی تھک گئی ہو تو گھر چلتے ہیں اچھی سی کافی پی کر تم آرام کرنا مجھے ذرا کسی سے ملنے جانا ہے۔“

”آج بھی.....؟“ زنب نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اوہ ڈارلنگ!“ سوری فار ڈیٹ..... لیکن تم جانتی ہو، یہ پروگرام تو اچانک ہی بن گیا۔ میری تو آج کافی میٹنگز ملے تھیں۔ کچھ میں کینسل کر دوں گا لیکن ایک بہت اہم اسپانٹ میٹنگ کینسل نہیں کی جاسکتی۔ آئی پراس، وہ انٹینڈر کے میں گھر آ جاؤں گا۔“

زنب باہر دیکھنے لگی۔ حقیقت یہی تھی کہ اسے میر سکندر علی کے جلد گھر آنے سے کوئی خاص دلچسپی فی الوقت محسوس نہ ہو رہی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھی۔ سوچنے سمجھنے کے لیے اسے تھوڑا سا وقت درکار تھا، صبح وہ گھر سے ٹھنڈے آؤٹنگ کے لیے اور ذہنی طور پر فریش ہونے کیلئے نکلی تھی۔ یوں اچانک شادی کے سکندر علی کے گھر جانے کے متعلق اس کے ذہن میں کوئی گمان تک نہ تھا اسے تو ساتھ بیٹھا سکندر علی بھی اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ بطور شوہر اس کا دل تسلیم ہی نہ کرتا تھا وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب گاڑی کے رکنے پر اس نے چونک کر سامنے دیا تھا۔

”ارے.....“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

”یہ تو.....“

”تمہارا گھر آگیا“ سکندر علی نے مسکرا کر جملہ مکمل کیا ”ہاں..... ہم یہیں آئے ہیں۔“

”لیکن.....“ وہ حیران تھی۔

”ڈونٹ وری ڈارلنگ..... وہ شاندار کوشی آج بھی تمہاری منتظر ہے، لیکن میں چاہتا ہوں تم پورے آزر کے ساتھ اس میں داخل ہو، اس ویڈیو ڈریس میں جو میں نے خصوصی طور پر تمہارے لیے تیار کر دیا ہے۔ ہزاروں نگاہیں تم پر ہوں، تمہیں رشک سے دیکھتی ہوں اس لیے فی الوقت میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں، بس چند دن انتظار کر لو۔“

نہب دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر آئی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو سکندر علی اس کے ہمراہ تھا۔

”کافی بناؤں؟“

”بالکل.....!“ وہ صوفے پر بیٹھ کر سرگرمی سے لگا۔

نہب کچن میں گھس گئی مگ میں کافی اور چینی ڈال کر بیٹھے بیٹھے اسے یکا یک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ احسن کے لیے کافی بنا رہی ہو، مگ میں جج کی کرش کر روک کر اس نے آنکھیں موند لیں اچانک ہی دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا، کچھ دیر تک وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ کس کے لیے کافی بنا رہی تھی پھر آہستہ آہستہ وہ ہوش و حواس میں لوٹی تھی۔

کافی کھا گئے کہ وہ کچن سے نکلی تو میر سکندر علی کسی سے فون پر محو گفتگو تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے گفتگو مختصر کر دی۔

”کافی!“ نہب نے ہاتھ بڑھایا۔

اس نے نہب کی کٹائی تھا مگر اسے قریب کرنا چاہا پھر یکا یک چونک اٹھا۔

”ڈارلنگ! آریو آئل رائٹ“

”جی.....!“ اس نے ہاتھ کی پشت سے پیشانی صاف کی۔

”نو..... نو.....“ اس نے سر ہلایا ”بالکل پہلی مورہ ہو، ہوا رہا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہیں بتاؤ، کیا بات ہوئی؟“

”بس یونہی..... چکر آگیا تھا۔“ اس نے بات بتائی۔

”کیوں؟“ اس نے تشویش سے ابرو اچکائے۔

”کوئی خاص بات، پیار ہو؟ چلو ڈاکٹر کو دکھا کر آتے ہیں؟“

”ارے نہیں۔“ وہ ہیکلی سی ہنسی ہنس دی۔ ”آپ خواجہ خواجہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، بس ذرا سی ٹھکان محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی کافی پیوں گی تو بالکل فٹ ہو جاؤں گی۔“

”ہوں.....“ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

نہب انگلی میں پڑی زمرودی انگوٹھی سے کھیلنے لگی۔ وہ عین اسی جگہ بیٹھا تھا جہاں بیٹھ کر فی دیکھنا کبھی احسن کا پسندیدہ کام تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی ایک مرتبہ پھر پسینے سے بھیگنے لگی تھی یہ کیا ہو رہا تھا اسے؟ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ احسن سے علیحدگی کو چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا یہ نہیں تھا کہ اس عرصے میں اسے احسن کی یاد بالکل نہیں آئی تھی یا سوچ کے سراب نے اسے پریشان نہیں کیا تھا۔ لیکن آج میر سکندر علی کی قربت میں اس کا ذہن جو آنکھ پھولی کھیل رہا تھا وہ نہ صرف پریشان کن تھی بلکہ اس کی سمجھ سے باہر بھی تھی۔

”میں اب چلوں گا۔“ وہ کافی کا کپ رکھ کر کھڑا ہوا تو وہ چونک گئی تھی۔

”ہنٹھیں کچھ دیے.....“ وہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔

”ایک ضروری میٹنگ ہے..... وہ رنٹم جانتی ہو، یہ وقت کتنا قیمتی ہے۔“ وہ مسکرایا تھا ”تم ریٹ کرو مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

”پھر کب آئیں گے آپ؟“

”ڈپینڈر“ وہ مسکرایا ”جب ٹائم ملے گا..... میں آ جاؤں گا..... یو ڈونٹ وری، اور ہاں! مجھے یہ آپ، جناب کے تکلفات پسند نہیں مجھے

”تم“ کہہ کر مخاطب کیا کرو اچھا لگتا ہے۔“

”کوشش کروں گی۔“

”اوکے.....“ اس نے حسب عادت اس کا رخسار چھوا تھا، ”پھر ملتے ہیں۔“

میر سکندر علی کے چلے جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا تھا۔ پھر وہ اندر چلی آئی۔ شام کا چھینٹا ہو چلا تھا۔ لباس تبدیل کر کے اس نے خود کو قدرے بہتر محسوس کیا۔ وہ ایک کپ چائے پینا چاہتی تھی۔ اسے کافی بہت زیادہ پسند نہیں تھی۔ سکندر علی کا ساتھ دینے کے خیال سے وہ پی تو لیتی تھی۔ لیکن محض اوپری دل سے چائے کی طلب پھر بھی باقی رہتی تھی۔

وہ کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ اس کے ذہن میں جیسے ابھی ہوئی سوچوں کے جالے لٹکے ہوئے تھے، دھند سی تھی جو کسی طور نہ ہٹتی تھی۔

چائے کی خوشبو اس کے ارد گرد پھیلی تو اس نے چونک کر پانی میں جوش کھائی پتی کو دیکھا۔ وہ خوشبو تھی یا حس کا احساس۔

”آہ!“ اندر ایک کراہ بھری تھی ”اے چائے کس قدر پسند تھی، میرے ہاتھ کی چائے پینا اس کا بے ضرر سا شوق تھا اب وہ کہاں، کس کے

ہاتھ کی چائے پینا ہو گا؟“

”زینو..... چائے لے آؤ یا ر.....!“

ذہن کے درجوں میں ایک بازگشت آ کر نکرائی تھی۔

”جانو..... یہ چائے بنا رہی ہو یا پائے آ بھی چکو یا ر!“

سلیب پر رکھا اس کا ہاتھ دیر دیر سے کانپنے لگا۔ یہ آواز حقیقت تھی یا سراب، اسے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اندر کمرے میں بیٹھا

اسے آوازیں لگا رہا تھا۔

”زینو..... آ بھی جاؤ..... زینو..... زینو.....“

اس کے چاروں طرف آوازیں گونجنے لگیں۔

”نہیں!“ اس نے سختی سے کانوں پر ہاتھ جمالیا۔

پھر اس نے چولہا بند کیا اور بھاگتی ہوئی کچن سے نکل آئی۔ مغرب کے وقت کا دھندلا کھڑکیوں کے شیشوں کو پار کر کے پورے گھر میں

پھیل گیا تھا۔ اسے لگا جیسے پورے گھر میں سفید سفید سائے حرکت کر رہے ہوں، زینب کو اپنی تمام عمر میں اتنا خوف کبھی محسوس نہ ہوا تھا، یوں لگتا تھا،

دل ابھی طلق کر ستے باہر آ جائے گا۔ اس نے بھاگتے ہوئے راہداری طے کی، بیرونی دروازہ کھولا اور گھر سے نکل آئی۔ بنا دوپٹے دوڑتی ہوئی رملنی

کے دروازے کے سامنے جا کر رک گئی۔

ایک تواتر سے بجتی تیل کے جواب میں دروازہ رملنی کی ملازمہ نے کھولا تھا۔

”زینب بی بی آپ!“ وہ اسے اچھبے سے دیکھنے لگی۔

”خیریت تو ہے؟“

”مجھے اندر آنے دو“ وہ یوں تھوک نکل کر بولی تھی جیسے وہ اسے گھر میں داخل ہونے سے منع کر رہی ہو۔

”ہاں ہاں..... آجائیں.....“ وہ سائید میں ہو کر بولی ”ویسے ملٹی بی بی تو گھر پر نہیں ہیں۔ گاڑی لے کر نجانے کہاں نکل ہوئی ہیں۔“
 نینب مزید کوئی بات کیے بغیر چھپاک سے اندر گھس گئی۔

”خیریت ہے نا! یوں بغیر دوپٹے، چہرے پر ہوائیاں لیے چلی آ رہی ہیں۔ کچھ بتائیں تو کیا ماجرا ہے؟“ وہ اس کے لیے پانی کا گلاس لے آئی تھی۔ اس نے ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

”اکیلی ہیں نا..... ڈر گئی ہوں گی۔“ پھر وہ خود ہی ایک نتیجہ اخذ کر کے تاسف سے بولی تھی۔ ”عورت ذات کتنی ہی بہادر بن لے..... مرد کے بغیر اس کا گزارا نہیں۔“

اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر وہ مڑ گئی۔ وہ ملٹی کی بہت پرانی ملازمت تھی۔ ساری کہانیوں کی چشم دید گواہ، اس سے کچھ چھپا ہوا نہ تھا۔

نینب کافی دیر وہاں بیٹھی اپنی حالت پر غور کرتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ پھر ملٹی کے گھر لوٹنے سے قبل ہی وہ وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ فی الحال وہ اس کا سامنا کرنے کے موڈ میں بالکل بھی نہیں تھی۔



دوسرے دن اس نے سب سے پہلے سکندر علی کو فون کیا تھا۔

”میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ جلد سے جلد انتظامات مکمل کر لیں۔“ اس نے کہا تھا۔

”اچھا.....!“ اس کی آواز مسکرائے لگی ”یعنی، دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ والا معاملہ ہے۔“

”کچھ بھی سمجھ لیں.....“ وہ پریشان لہجے میں بولی ”میں اکیلی ڈرنے لگی ہوں، رات ٹھیک طرح سے نیند بھی نہیں آتی۔“

”کوئی خاص بات؟“ وہ چوچکے بغیر نہ رکھا تھا۔

”کچھ نہیں..... بس تو ہمت جگ کرتے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اوکے..... ڈرائنگ، ایئر پوش.....“ وہ بولا تھا ”میں انتظامات کروا رہا ہوں۔ کل یا پرسوں رات کی پارٹی رکھ لیتے ہیں، ٹھیک ہے؟“

”جی.....!“ اس نے فون بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر وہ ساکت بیٹھی اپنے اندر کسی احساس، کسی تاثر کو کھوجنے کی کوشش کرتی رہی پھر مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔



سکندر علی نے اپنا کہااج کر دکھایا تھا۔ وہ تقریباً واقعی نہایت شاندار تھی۔ یوں لگتا تھا کہ فانیو اسٹار ہوٹل کے اس لان میں پورا شہر بٹا آیا تھا۔

وہ میر سکندر علی کے ہمراہ چمکتی، شاندار گاڑی سے اتری تو دو خادماں اس کا لباس تھانے کو اس کے دائیں بائیں موجود تھیں۔

سیاہ رنگ کا فرشی غرارہ اس کا عروسی لباس تھا اسے یہ لباس دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی۔

حیرت اسے اس بات پر ہوئی تھی کہ عروسی لباس کے لیے سیاہ رنگ کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اور خوشی اس لباس کے نہایت منفرد،

قیمتی اور حسین نظر آنے کی تھی۔ سچے موتیوں اور سفید دھاگے کے باریک کام سے مزین وہ سیاہ لباس کسی مغلیہ شہزادی کی حسین یادگار سے کم نظر نہ آتا

تھا۔ اسے زیب تن کر کے وہ بہت دیر تک آئینے پر سے نگاہ ہٹانے کے قابل نہ رہی تھی۔ سچے موتیوں کے زیور نے اسے واقعی شہزادیوں کی آن بان

عطا کر دی تھی۔ شہر کی سب سے ماہر اور مہنگی بیوٹیشن نے اسے تیار کیا تھا۔

سیاہ ڈزموٹ میں ملبوس میر سکندر علی کے ہمراہ چلتی جب وہ مختلف لوگوں سے مبارکبادیں وصول کر رہی تھی تو اس کا سرواٹھی کسی دیس کی ملکہ کی طرح فخر و غرور سے تانا ہوا تھا۔

ہر جانب اس کے حسن کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے، ہر طرف سے آتی آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اپنے اندر اٹھتے جوش اور دلولے سے اس کا سانس پھولنے لگا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔

”ہاں..... سب کی سب کچھ تو چاہتی تھی میں..... یہی سب کچھ، یہی شان و شوکت، یہی آن بان، یہ مانگا تھا تقدیر سے میں نے..... جو اپنی تدبیر سے پالیا ہے۔ میں زینب سکندر علی! یہاں سارا شہر جمع ہے۔ مگر کون ہے میرے مقابلے کا.....“

”میں تمہیں پہچانے لگی ہوں۔“ دفعتاً اس کے پہلو میں کھڑی ایک خاتون نے قدرے اجنبی سے کہا تھا ”تم ایک مرتبہ رملی کے ساتھ آئی تھیں میرے گھر..... یاد ہے۔“

زینب نے پریشانی سے اس بھاری تن و توش کی حامل خاتون کو دیکھا، جس کے چہرے پر خوشحالی اور بے نیازی کی چھاپ تھی۔

”آپ کی تعریف.....!“ اسے بھی وہ چہرہ شاسا لگا۔

”مجھے مسریش کہتے ہیں، ایک پارٹی میں تم رملی کے ساتھ میرے گھر آئی تھیں..... ہیں نا.....!“

”اوہ.....!“ اسے پلک جھپکتے میں یاد آ گیا تھا۔

”جی..... جی..... ہاں۔“

”تم تو شاید.....“ انہوں نے باقی کی بات کو لبوں میں ہی دبایا تھا۔

زینب کو یاد آیا..... وہ ان دنوں پریکٹ تھی۔ مسریش کو وہ کچھ زیادہ ہی یاد رہ گئی تھی۔

”رملی کو انوائٹ نہیں کیا تم لوگوں نے..... یاد وہ نہیں آئی؟“ انہوں نے تبس سے پوچھا۔

”جانتی نہیں.....“ وہ پریشان ہو چکی تھی ”سارے انوائٹیشن سکندر نے ہی دیے تھے۔ میں تو لاعلم رہی ہوں ہر بات سے ویسے اسے آنا چاہیے تھا۔ آخر کو وہ بہن ہے سکندر کی۔“

”بہن؟“ انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ ”نائی گرل! ایسے مذاق یوں بھرے مجمع میں نہیں کیا کرتے۔“

وہ مسلسل ہنس رہی تھیں، جیسے زینب نے انہیں کوئی دلچسپ لطیفہ سنایا ہو۔

”تو کیا وہ سکندر کی بہن نہیں ہے؟“ ان کی ہنسی نے اس کے ذہن پر خطرے کی دستک دی تھی۔ ان کا انداز عامیانا تھا۔

”یہ تو اپنے ڈائریکٹریٹ سے پوچھنا..... بابا میں کسی کے پرسنل کو نہیں چھیڑتی۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی تھیں۔



پھر بالآخر وہ اس عالی شان محل کی اس شاندار خواب گاہ میں چلی آئی، جس کے تصور نے کتنی ہی راتیں اس کی نیندیں اچاٹ کر رکھی تھیں۔

سکندر علی نے اپنے دوستوں کے ساتھ تھا۔ وہ تھکن کا بہانا کر کے اوپر چلی آئی، کتنی ہی دیر آئینے کے مقابل بیٹھی وہ آپ ہی اپنے حسن کو خراج پیش کرتی رہی، پھر بھاری بھر کم دوپٹہ خود سے الگ کرنے کے خیال نے اسے بے چین کیا تھا۔

اچانک ہی فون کی بیل ہوئی تھی، زینب نے چونک کر نازک سے گولڈن فون سیٹ کو دیکھا۔ نہ معلوم نیچے اس کا کوئی ایکسٹینشن بھی تھا یا نہیں۔

فون ریسپونڈ کرنے کا اس کا ارادہ نہیں تھا، لیکن بیل ایک تو اتار سے نچ رہی تھی۔ بالآخر اسے ریسورٹاٹھانا ہی پڑا۔

”ہیلو.....! اس نے دھیمے سے کہا تھا۔

”اوہ.....“ دوسری جانب سے ایک کھٹکتی نسوانی آواز آئی ”تو آپ اس خواب گاہ تک پہنچ گئیں نہ شب شاہ!“

”آپ کون.....؟“ اسے تعجب ہوا۔

”میں سونیا ہوں..... سونیا سکندر علی! پاپا کہاں ہیں؟ پلیز فون ان کو دیں مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“

”پاپا.....؟“ اسے مزید تعجب ہوا تھا ”کون؟“

”میر سکندر علی صاحب۔“ وہ تمسخر انداز میں بولی تھی ”وہ میرے پاپا اور میری مئی کے سسینڈ ہیں۔ انہوں نے آپ کو بتایا نہیں؟“

نہیب کے دماغ کے پرچے اڑ گئے تھے، دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے دیکھا سکندر علی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔



نہیب چند لمحوں کے لیے کچھ بھی کہنے یا سننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ہاتھ میں ریسور تھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے قریب آتے میر سکندر علی کو دیکھتی رہی۔ سکندر علی کو بھی اس کی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر نرمی سے ریسور لے لیا۔

”ہیلو سکندر اسکینک۔“ وہ بولا تھا۔ پھر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”اوہ جانو مائی سویٹ بے بی ہاؤ آر یو.....؟ اوہ نو، نو، خفا مت ہو، تم خفا ہو گی تو پاپا کا کیا بنے گا.....؟ یونو ایوری تھنگ مائی بے بی، ہاں کچھ غلطیاں بھی ہو گئی ہیں، ان کے لیے پاپا سوری کرتے ہیں بیٹا..... ٹھیک ہے ٹھیک ہے باقی باتیں بعد میں..... اوہ! تھینک یو بیٹا، تھینک یو۔“ اس نے ریسور رکھ دیا پھر مسکراتے ہوئے نہیب کی جانب پلٹا۔

”میری بیٹی ہے سونیا!“

نہیب کچھ بھی کہے بنا کھلی آنکھوں سے اس کا مسکراتا چہرہ دیکھتی رہی کسی عداوت کی پرچھائیں، کسی شرمندگی کی جھلک، کسی احساس جرم کا سایہ وہاں نہیں تھا۔

”بیٹی؟“ پھر اس کی لرزتی آواز نکلی۔ ”اور آپ یہ بات مجھے اب بتا رہے ہیں۔ اب۔“

”یہی رائنٹ ٹائم ہے ڈارلنگ!“ اس نے نہیب کا گل چموا۔ ”یہ بات پہلے ذرا آکر ڈسکس لگتی لیکن تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ اس میں غلط کیا ہے؟“

”اس میں کچھ غلط نہیں؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”آپ نے کبھی نہیں بتایا کہ آپ شادی شدہ ہیں، ایک جوان بیٹی کے باپ ہیں، اتنی اہم بات آپ نے مجھ سے چھپائی۔“

”تو کیا فرق پڑ گیا ڈارلنگ!“ سکندر علی اس کی بات کاٹ کر بہلانے والے انداز میں بولا۔ ”تمہیں یہ معلومات ہوتی بھی تو کیا فرق پڑتا؟ آخر تم بھی تو شادی شدہ تھیں۔ مجھے فرق نہیں پڑا حالانکہ ایک مرد کو اس بات سے زیادہ فرق پڑتا ہے۔“

”لیکن میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”ہر بات آپ کے علم میں تھی، اس لیے آپ کو احتجاج کا حق نہیں ہے لیکن مجھے ہے، مجھے حق ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟“

”ریلیکس ڈارلنگ ریلیکس!“ وہ اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”آرام سے بیٹھ کر میری بات سنو! میں نے تم سے کچھ چھپایا نہیں۔ محض اتنا ہے کہ یہ ذکر کا نامناسب نہیں سمجھا اس لیے کہ میرے خیال کے مطابق میرے شادی شدہ ہونے یا نہ ہونے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مردوں کی تو چار چار شادیاں ہوتی ہیں اور پھر تمہیں یہ احساس ہونا چاہیے تھا کہ میں فورٹی فائیو کر اس کر چکا ہوں بھلا غیر شادی شدہ

کیسے ہو سکتا ہوں۔“

زینب محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے دل کو یہ بات جان کر سخت صدمہ پہنچا تھا۔

”میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا۔ تم میرے گھر کی اور دل کی رانی بن کر رہو گی۔ یہ محل تمہارے نام ہے، یہاں کی ہر شے تمہاری ہے، راج کرو، جیسے جی چاہے رہو تمہیں اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کہیں میری کوئی بیوی بھی ہے یا نہیں ہے۔ ان کا تم سے کوئی تعلق نہ ہو گا ہمارے تمہارے بیچ کوئی تیسرا نہیں آئے گا۔“

”پھر بھی مجھے آپ سے ہمیشہ یہ شکوہ رہے گا کہ آپ نے مجھ سے اتنی اہم بات چھپائی۔ یہ ایک حقیقت ہے اور آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔“

میر سکندر علی کے لب مسکرا اٹھے۔ وہ اسے مسکراتی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

”زینب ڈارنگ!“ پھر اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایک حقیقت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ تمہارے علم میں ہوتا تب بھی تم مجھ سے شادی کرتیں، یہ بات تمہارے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی۔ ذرا غور کر دیا تم یہ سب کچھ جان کر مجھ سے شادی سے انکار کرتیں؟ ہرگز نہیں۔ تمہیں میرے پاس آنا ہی تھا۔“

زینب نے اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی۔ اسے لگا میر سکندر علی اس پر طنز کر رہا تھا۔ اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ پتھر کے بت کی مانند ہو گئی۔ ساکت اور بے حس۔

میر سکندر علی بے تحاشا مصروف شخص تھا۔ زینب کو ایک دن محض چند ہی گھنٹوں میں اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے گھر پر کا تھا اور اس عرصے میں اس کے بے شمار فون آئے تھے۔ اس نے بمشکل زینب کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا پھر تیار ہو کر آفس چلا گیا تھا۔ شام کو جلد آنے کے وعدے کے ساتھ، زینب بہت دیر تک بیٹھی اس بات پر غور کرتی رہی۔ مٹلی کے گھر آنے والا میر سکندر علی تو اسے بہت پرسکون اور فارغ محسوس ہوتا تھا۔ وہ اکثر مٹلی کے گھر آتا تھا اور کافی دیر ٹھہرا کرتا تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا سکندر علی تھا جو دنیا کا سب سے مصروف شخص دکھائی دیتا تھا۔

ایکلا پن، احساس تنہائی اس کے دل میں گھر کرنے لگا۔ یکا یک اسے احساس ہوا کہ وہ پوری دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ دکھ درد بانٹنے کو، دکھ سکھ کہنے کو کوئی نہ تھا۔

کتنی دیر بیٹھی وہ اس حسین خواب گاہ کے درو دیوار کو دیکھتی رہی۔ ایک ایک شے پر غور کرتی رہی لیکن دل کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہر شے آج دسترس میں تھی اور ہر شے سے دل بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا، وہ اٹھ کر ڈرینگ روم میں چلی آئی وارڈ رو ب کھول کر خوبصورت، قیمتی ملبوسات پر نگاہ دوڑانے لگی۔ یہ سب ملبوسات اس نے اپنی پسند سے خریدے تھے۔ ایک سے ایک بہترین لباس کا انتخاب کیا تھا۔ ہر ہر کپڑے کی قیمت ہزاروں سے باتیں کرتی تھی۔ وہ ہر لباس نکال نکال کر دیکھنے لگی لیکن کوئی ملبوس ایسا نہ تھا جسے پہننے کو اس کا جی چاہتا، بے دلی سے وارڈ رو ب بند کر کے ڈرینگ روم سے نکل آئی۔

”یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر اس نے بے بسی سے سوچا۔

”جس زندگی کو پانے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا آج اسی زندگی میں مجھے کشش محسوس نہیں ہو رہی۔ کیا کسی کی بددعا لگی ہے مجھے؟“ اسے احسن ایاز یاد آیا، دل لحد بھر کے لیے ٹھہر گیا۔ آنکھیں پھٹیلیں اور کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔ اسے یکا یک اپنی ناخوشی کی وجہ سمجھ میں آئی۔

”تو کیا، تو کیا لاشعوری طور پر میں تمہیں یاد کیے جا رہی ہوں لیکن نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں بیزار تھی تم سے، تمہاری دی ہوئی زندگی سے تمہارے ادھرے پن کے احساس سے، میں نے خود کھویا ہے تمہیں اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے خبر باد کہا ہے تمہیں تم مجھے یاد نہیں آ سکتے۔ آخر تم مجھے

کیوں یاد آؤ گے۔ دیباہی کیا تھا تم نے مجھے۔ احساس محرومی کے سوا میں تمہیں یاد نہیں کرتی۔ بالکل بھی نہیں۔“

ایک ایک اسے اپنے چہرے پر پھیلی نمی کا احساس ہوا۔ اس نے حیرانی سے اپنا چہرہ ٹٹولا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

”میں رورہی ہوں؟ کیوں کس لیے؟ کس کے لیے؟“ وہ جنس سوالات کے لاتعداد سلسلوں پر غور ہی کرتی رہ گئی تھی۔



شام تک اس کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ جذباتیت کا بہاؤ گزر چکا تھا۔ نہا کر اس نے میرون کلر کا ایک نہایت دیدہ زیب لباس زیب تن کیا۔ ہونٹوں کو ڈارک میرون لپ اسٹک سے سجایا اور بالوں کو سنوار کر نیچے چلی آئی۔

بڑے ہال میں گلی تمام لائٹس روشن تھیں۔ فانوس جھللا رہے تھے۔ زیب آخری سیڑھی پر رک گئی بے حد حسین منظر تھا۔ ایک ایک شے سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ درود یوار جھلکا رہے تھے۔ اس منظر کا حصہ بننے کی خواہش اس کے دل میں ابھری تو وہ آخری سیڑھی سے اتر کر آگے بڑھ آئی۔ اسی لمحے کسی کو نے سے نکل کر ملازم تیزی سے اس کی سمت بڑھا تھا۔

”بیگم صاحبہ! چائے لاؤں یا کافی پسند کریں گی۔“

زینب نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ اس نے صبح کا ناشتہ کیا ہوا تھا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن کھانا وہ سکندر علی کے ساتھ ہی کھانا چاہتی تھی۔

”چائے لے آؤ۔“ اس نے کہا۔ ”ساتھ میں کچھ ہلکا پھلکا کھانے کے لیے بھی لاتا۔“

”جی بہتر!“ وہ صوب انداز میں کہہ کر پلٹ گیا۔

زینب ہال کے ایک کونے میں بنے ریک میں رکھے ٹی وی کی جانب بڑھ گئی۔ صوفے میں جنس کروہ ٹی وی کے چینل بدل رہی تھی۔ جب فون کی بیل بج اٹھی۔

ٹیلی فون میٹ بالکل اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ اس نے اٹھ کر فون اٹھا لیا۔

”ہیلو۔“

”زینب؟“ دوسری جانب سے آتی رملی کی آواز پہچان گئی۔

نجانے کیوں اسے رملی کی آواز سن کر خوشی ہوئی تھی۔ جیسے اجنبی دیار میں کوئی اپنا نظر آیا ہو۔

ٹائیں ٹائیں فٹش

کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا، نکل نوخیز اختر کا مقبول ترین ناول، جسے پاک و ہند کے قارئین نے سند قبولیت بخشی۔ اردو کا پہلا مکمل مزاحیہ ناول، ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ٹائیں ٹائیں فٹش کہانی ہے ایک غریب گھر کے سادہ لوح نوجوان کی جسے حالات ایک ارب پتی لڑکی کا کرائے کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کا غدی شادی سے پہلے اور بعد میں کمال عرف کمالے کی سادہ لوحی اور محنتیں کیا کھل کھلاتی ہیں، جانے کیلئے پڑھیے۔ ٹائیں ٹائیں فٹش۔ اسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”سکندر کوفون دو۔“ وہ بغیر کسی سلام دعا کے کہہ رہی تھی۔

نہیب کا دل مرجھا گیا۔

”سکندر تو ابھی گھر نہیں آئے۔“ وہ خود پر قابو پا کر بولی۔ ”تم کیسی ہو؟ ملنے نہیں آؤ گی؟“

”سکندر آئے تو کہنا مجھ سے بات کر لے۔ اس کا موبائل بھی نہیں لگ رہا ہے۔ مجھے ضروری کام ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ نہیب ریسیور کو دیکھتی رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رملی نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

اسے سخت غصہ بھی آرہا تھا۔

”آخر اس کو ہوا کیا ہے؟ اچھی بھلی تھی میں نے جیسے اس کا کچھ چر الیا ہو بدلتہذیب عورت۔“ وہ ذریب بڑبڑا کر اپنی بھڑاس نکالنے لگی۔

”ہیلو ڈارلنگ!“ پیچھے کھڑے سکندر علی نے اچانک ہی اس کا گال چھوا تھا۔

وہ بری طرح سے چونک اٹھی۔ وہ اسی طرح دبے قدموں آکر چونکا دیا کرتا تھا۔ عجب پراسرار ریت تھی اس کے انداز میں۔

”اوہ..... آپ!“ اسے شک تھا کہ سکندر علی نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

”دکس پر غصہ کر رہی تھیں۔“ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس کے برابر آن بیٹھا۔

اس کا انداز درست تھا، وہ جبرانی مسکرائی۔

”نہیں، کسی پر نہیں۔“

”بھر بھی۔“ اس نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”رملی کا فون تھا۔“ اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔ ”کہہ رہی تھی آپ اسے فوراً کال میٹ کریں اسے کچھ ضروری کام ہے، پتہ

نہیں اس کو کیا چڑ ہو گئی ہے، مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔“

”چھوڑو اس کی فکر.....“ سکندر علی نے اسے خود سے قریب کیا۔ ”اس قدر حسین نظر آرہی ہو مانتے کی ٹکٹیں دور کرو چہرے پر مسکراہٹ لاؤ

تاکہ حسین تر نظر آؤ۔“

اسی لمحے ملازم چائے کی ٹرالی کھینچتا ہوا لایا۔ نہیب نے سکندر علی سے دور ہونا چاہا لیکن اس کے گرد اس کے بازو کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ

کسمسا کر رہ گئی۔

ملازم بے تاثر چہرے کے ساتھ ٹرالی ان کے آگے کھڑی کر کے چائے بنانے لگا۔

”چینی کتنی پیگم صاحبہ؟“ وہ نیچی نگاہوں کے ساتھ پوچھنے لگا۔

”تم جاؤ میں بنالوں گی۔“ اسے ملازم کی موجودگی سے خفت محسوس ہونے لگی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو.....“ اس کے جانے کے بعد وہ قدرے خشکی سے بولی۔ ”کیا سوچتا ہو گا وہ۔“

”اوہ ڈارلنگ فضول سوچوں میں الجھ کر خود کو ضائع مت کرو، وہ میرا سرورٹ ہے وہ اپنے دماغ سے کچھ نہیں سوچتا یوں بھی اسے عادت

ہے۔“

”کس بات کی؟“ اس نے چونک کر میر سکندر علی کا چہرہ دیکھا تھا۔

وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”چلو چائے بناؤ۔“ وہ قدرے پیچھے کو ہٹ کر بیٹھ گیا۔

نہیب اس کی ادھوری بات پر الجھتی چائے بنانے لگی۔ چائے کے ساتھ کئی طرح کے لوازمات تھے۔ ٹرالی پوری طرح بھری ہوئی تھی۔

”رملی آپ کی سگی بہن ہے؟“ چائے کی پیالی اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ یہ گروہ ذہن میں اب تک لگی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھ ہی لیا سکندر علی نے چونکے بغیر آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

”نہیں۔“ وہ بولا تھا۔

اس کی مسکراہٹ میں کچھ بات تھی۔ زینب کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں مسز شیخ کی باتیں پھر سے گونجنے لگیں وہ چند لمحے منتظر رہی کہ وہ خود ہی کوئی وضاحت کرے گا لیکن وہ محض ایک لفظ کہہ کر بالکل مطمئن تھا۔ اس سے کپ لے کر وہ مطمئن انداز میں گرم چائے کے گھونٹ بھرنے لگا تھا۔

”پھر؟“ اپنا کپ اٹھا کر وہ مزید بولی۔ ”پھر کزن ہے آپ کی؟ یا منہ بولی بہن؟ یاد اور پار کی رشتہ دار؟“

”زینب ڈارلنگ!“ اس نے کپ کو پرچ میں رکھا اور بڑے ٹھہرے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ”میں نے ابھی کہا تمہیں کہ فضول سوچوں میں الجھ کر خود کو ضائع مت کرو۔ وہ باتیں سوچا کرو جس سے تسکین ہو، فائدہ ہو، خوشی ہو درمیانے درجے کی عورتوں کی طرح ہر وقت گھریلو باتیں مت سوچتی رہا کرو۔“

زینب کو اس کے ٹھنڈے لہجے کے پیچھے چھپے چھپے اس کے سلگتے غصے کا احساس ہوا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر قبل اس کو سخت قسم کی بھوک ستا رہی تھی لیکن اب لوازمات سے سچی ٹرائی میں اسے کوئی کشش محسوس نہ ہوئی۔ ایک ٹمکلیٹ کھا کر اس نے چائے پی۔ چائے بھی قدرے اسٹرونگ تھی۔ اس کا حلق تلخ ہو گیا تھا۔

سکندر علی نے کپ ٹرائی میں رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آؤ اوپر اپنے کمرے میں چلتے ہیں، کچھ دیر بعد فریش ہو کر کہیں چلیں گے۔“

”آپ چلیں میں آتی ہوں۔“ وہ قدرے متاثر ہوئی۔

”نہیں اب کچھ بھی تمہارے بغیر نہیں۔“ اس نے زینب کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اوپر کی جانب بڑھ گیا۔



”آپ نے رملی سے کوئی ٹکٹ کیا؟“ اس نے کچھ دن بعد پوچھا تھا۔

وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ٹائی کی ٹاٹ لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ آئینے میں سے پیچھے بیڈ پر بیٹھی زینب کو دیکھنے لگا۔

”اے آپ سے کچھ ضروری کام تھا۔“ اس نے نجائے کیوں اپنے استفسار کی وضاحت کی۔

”اس کے اور میرے کام ہمارے درمیان ہی رہنے دو ڈارلنگ!“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

زینب ٹھنڈی پڑ گئی۔ اتنے دنوں میں اس کے اور میر سکندر علی کے درمیان جو رشتہ قائم ہونے لگا تھا، وہ خوف کا تھا! ایک عجیب طرح کا خوف تھا جو زینب کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کا بظاہر ٹھنڈا الجھ اور ٹھٹھے الفاظ اپنے اندر نجائے کیسا اثر رکھتے تھے۔ زینب ہم کر رہ جاتی تھی۔ اس کی پر اسرار مسکراہٹ اور ذہن تک رسائی پالینے والی نگاہ اس کے دل کی دھڑکن کو کچھ بھر کے لیے ٹھہر جانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ اس کی قربت میں وہ اپنے مساموں سے پھوٹ نکلنے والے پسینے میں خود کو بھیجا ہوا محسوس کرتی تھی۔ نجائے یہ عجیب، پراسرار شخص کون سی خصوصیات رکھتا تھا۔ وہ جانے لگا تو اس کی نظریں نیچی کیے دیکھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”اوکے ڈارلنگ! چلتا ہوں جلد لوٹنے کی کوشش تو کروں گا لیکن.....“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”ہوں منڈے! آج میری چندا پارٹنٹ میٹنگز ہیں۔ تم اکیلی بور ہونے لگو تو کہیں گھومنے چلی جانا ڈرائیور ہر وقت موجود ہے۔ شاپنگ کرنا چاہو، کسی فریڈ سے ملنا چاہو..... ہوں۔“ اس نے زنب کا گال تھپتھپایا اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ لاتعداد سوچیں تھیں جو ذہن میں دھندسی پھیلائے رکھتی تھیں۔ وہ کچھ بچنے کے قابل نہیں ہو پائی تھی۔

کافی دیر کے بعد وہ انٹھی اور کسلندی دور کرنے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔ دیر تک شاور لینے کے بعد طبیعت بہلی تو ایک سادہ سا لباس زیب تن کر کے وہ نیچے چلی آئی۔

ایک ملازمہ چیزوں کی صفائی کر رہی تھی۔ اسے آٹا دیکھ کر سلام کرنے قریب چلی آئی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس کے سلام کا جواب دے کر وہ اسے دیکھنے لگی۔

وہ ایک خوش شکل جوان لڑکی تھی۔

”میرا نام جیلہ ہے جی!“ وہ مسکرائی۔

زنب کے دماغ کو لمحہ بھر کے لیے جھٹکا سا لگا۔ جیلہ بڑے اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھی اور غالباً اگلے کسی سوال کی منتظر بھی تھی۔ جبکہ وہ نجانے کہاں جا پہنچی تھی۔

ایک دہلی پتلی، سیاہ فام عورت اس کے تصور میں چلی آئی تھی جو نظریں جھکائے ایک چھوٹے سے گھر میں ہر وقت مصروف رہا کرتی تھی۔

”جینو بی بی.....“ پھر ایک مردانہ، شوخ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ”کتنا اچھا لگتا ہے یہ نام تم پر، آج سے میں تمہیں یہی کہوں گا.....“

جینو..... جینو بی بی!“

دانت پر دانت جما کر اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھسلیاں آپ ہی آپ سختی سے بھینچ گئی تھیں۔ یہ آواز حقیقت ہے کہ گمان، سچ ہے

کہ جھوٹ، باہر سے آ رہی ہے یا میرے دل کے اندر سے احسن ایاز! کیا تم میرے اندر چھپے بیٹھے ہو؟“

اس کا جسم ہولے ہولے کاٹنے لگا تھا۔

”بی بی جی..... کیا وہابی بی جی؟“ جیلہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھی۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“

زنب نے بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پایا۔ دیر سے دیر سے آنکھیں کھولیں وہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں نا جی؟“

”آں..... ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ اس پر نقاہت طاری ہو گئی تھی۔ ”ایک گلاس پانی لاؤ۔“

جیلہ پانی لینے دوڑ گئی۔ زنب خاموش بیٹھی اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتی رہی۔ وہ پانی لے کر آئی تو زنب نے گلاس تمام کر اسے ایک نظر

دیکھا۔

”یہاں کتنے ملازمین ہیں؟ کیا کیا کرتے ہیں؟“ جیسی آواز میں اس نے پوچھا تھا۔

”میں ہوں، نذیر ہے، صابر ہے، کھانا پکانے کے لیے باورچی ہے، اسلم، کرم دین مالی ہے، بشیر ڈرائیور ہے، جیوا خان جوکیدار ہے۔“

صاحب کے فشی بھی کبھی بکھارا جاتے ہیں، ہم سب کا حساب کتاب رکھتے ہیں۔ صاحب کو تو بی فرصت ہی نہیں ہوتی۔“

”اتنے مردوں میں تم اکیلی لڑکی یہاں رہتی ہو؟“ زنب کو اچھٹا ہوا۔

”میری ماں بھی ہے ناں۔“ وہ مسکرائی۔ ”پہلے وہ کام کرتی تھی لیکن پھر اس کی بیٹائی چلی گئی اب وہ کام نہیں کرتی۔ کوارڈر میں رہتی ہیں۔“

”اور تم دن بھر یہاں اکیلی ہوتی ہو؟“ اسے حیرت ہو رہی تھی۔

”اندھی ماں کو بھلا اس کی کیا خبر ہو سکتی تھی۔ یادہ اس کی حفاظت کے لیے کیا کر سکتی تھی۔“ جیلہ اس کا سوال سن کر بے پروائی سے مسکرا دی۔
 ”ہاں تو جی کیا ہوا۔ یہ تو دستور ہے یہاں کا۔۔۔۔۔“
 ”کیا دستور؟“ وہ بدستور ناچھی ہوئی تھی۔

”یگم صاحبہ میں نے ناشتہ ٹیبل پر لگا دیا ہے۔“ باورچی کی مداخلت پر اس کا ذہن ہٹا تھا۔
 ”ناشتہ؟“ وہ سوچ میں پڑی۔ ”نہیں میں ناشتہ نہیں کروں گی۔ بس ایک کپ چائے لا دو مجھے۔“
 ”کچھ تو ساتھ لیجئے!“ وہ مودب بنا۔ ”میں نے آج حلوہ پوری بنائی ہے۔ فرائی قیرہ ہے، اسٹیشن آلیٹ ہے، مغز ہے، میں نے آپ کے لیے اسٹیشن قسم کا ناشتہ بنایا ہے۔“

نہن مسکرا دی۔ اپنی اہمیت کے احساس نے لمحہ بھر کے لیے اس کے اندر ہلچل مچائی تھی۔
 ”اچھا چلو پھر تھوڑا بہت کچھ لیتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ڈاننگ ہال میں طویل و عریض میز اور اس کے گرد چچی ہوئی کرسیاں دیکھ کر ایک بار پھر اس کے اندر احساس تنہائی نے ختم لیا تھا۔
 ٹیبل پر بھی ہوئی بے شمار اشیاء نے اس احساس کو ہمیز کیا۔
 ”کتی تنہا میں کتنی اداس!“ وہ سوچنے لگی۔ ”نجانے کیوں زندگی سے کوئی خوشی مل ہی نہیں پاتی۔“ اس کا کچھ بھی کھانے کو جی نہ چاہا۔
 ایک کپ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”جیلہ۔۔۔۔۔“ باہر آ کر اس نے کہا۔ ”ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔“ وہ تیار ہونے اور چلی آئی تھی۔ وہ ملٹی سے ملنے کے لیے جانا چاہتی تھی۔
 کمرے میں آ کر وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ نجانے اس کا وہاں جانا درست تھا یا نہیں ملٹی کا رویہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ اس سے کبھی بھی ملنا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن اس کے ذہن میں چند گہر ہیں تھیں جنہیں کھولنا وہ ضروری سمجھتی تھی۔ اسے سکندر علی کا بھی خوف تھا۔ نجانے وہ اس کا وہاں جانا پسند کرتا یا نہیں لیکن سکندر علی نے اس پر کبھی بھی قسم کی پابندی نہیں لگائی تھی۔ نہ اسے کبھی بطور خاص ملٹی سے گریز کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ وہ تو اس سلسلے میں بہت بے پروا دکھائی دیتا تھا۔ یوں بھی اسے بولڈ اور خود اعتماد عورتیں پسند تھیں۔ اپنے فیصلے خود کرنے والی۔
 سر جھٹک کر وہ اپنے لیے لباس منتخب کرنے لگی۔ وہ خوب صورت اور طرح دار نظر آنا چاہتی تھی۔ ایک بے حد امیر و کبیر آدمی کی من پسند

اور مغرور بیوی،

بلیو اور بلیک کبجی نیشن کا ایک بہت قیمتی اور نفیس کپڑے کا سوٹ اس نے منتخب کیا، لباس تبدیل کر کے جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو چند لمحوں کے لیے خود پر سے نگاہ ہٹانا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔ اس کی رنگت اس لباس میں دمک رہی تھی۔ سلیپے سے میک اپ کر کے اس نے بالوں کو جوڑے کی شکل دی سیاہ اسٹون کی بیش قیمت جیولری سے خود کو آراستہ کیا پھر خود کو تنقید نگاہ سے دیکھنے لگی۔
 پھر وہ آہستہ سے مسکرائی۔ اس میں کہیں، کوئی کمی نظر نہ آتی تھی۔ وہ ایک بے حد حسین و جیل، امیر و کبیر خاتون نظر آتی تھی۔ وہ بالکل ویسی ہی نظر آتی تھی جیسے نظر آنا اس کا شوق تھا۔ اب وہ جاگتی آنکھوں سے اپنے خواب کی تعبیر دیکھ رہی تھی۔

ایک گہری سانس بھر کر وہ آئینہ کے سامنے سے ہٹی اور اپنا پرس اٹھا کر نیچے چلی آئی۔ راستے میں کھڑی جیلہ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے پتھر کی ہوئی تھی۔ وہ اس پر ایک مغرور نگاہ ڈال کر باہر چلی گئی۔

پورج میں باوردی ڈرائیور نے اسے سلام کر کے مستعدی سے دروازہ کھولا تھا۔

”رملی بی بی کا گھر معلوم ہے تمہیں؟“ اس نے رک کر استفسار کیا۔

”نہیں میڈم!“

”ہوں، وہیں چلنا ہے۔“ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی آٹھارستوں پر چل پڑی تھی۔ زینب کی نگاہیں ان رستوں پر بکھری یادوں سے الجھنے لگیں۔ وہ رملی کے گھر جا رہی تھی۔ کبھی اس کا اپنا گھر بھی انہی رستوں پر تھا رملی کے دروازے سے پہلے ایک اور دروازہ بھی تھا۔ ایک چھوٹے سے گھر کا دروازہ۔

وہ گھر ذہن میں در آیا۔ پھر اس گھر میں بسنے والا جس کی ہمراہی میں اس نے زندگی کے چند سال بتائے تھے۔ اب وہ کہاں ہوگا؟ کس حال میں ہوگا؟ وہ اسے یوں چھوڑ کر گیا تھا جیسے سکندر اعظم نے دنیا چھوڑی تھی۔ خالی ہاتھ، خالی داماں۔ ایک بیساکھی کے سہارے وہ کہاں تک گیا ہو گا؟

”زینب! کوئی کسی کے ساتھ یوں بھی کرتا ہے؟“ اس کے اندر جانے کس کی آواز ابھری تھی۔

ایک بار پھر اس کے ہاتھ پیر پھنڈے ہو گئے۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چپکنے لگے۔ دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر نکال دیا۔ گہرے گہرے سانس اس کے اندر سے ابھرنے لگے۔

ڈرائیور نے گاڑی رملی کے گھر کے آگے روک دی تھی اور اب دروازہ کھول کر اس کے اترنے کا منتظر تھا۔

”ای بی پر اہلم میڈم؟“ جب اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو وہ جھک کر قدرے تشریف لے پوچھنے لگا۔

زینب نے ہوش و حواس بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔

”آپ ٹھیک ہیں نا میڈم؟“

اس نے تھکے تھکے انداز میں سر ہلایا اور گاڑی سے اتر آئی۔ چند لمحوں کے لیے وہ گاڑی کا سہارا لینے پر مجبور ہوئی تھی۔

”میں آپ کا ویتھ کروں میڈم؟“

”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”تم جاؤ۔ میں گھر فون کروں گی پھر لینے آجاتا۔“

”جیسے حکم!“ وہ مودبانہ انداز میں سر ہلا کر اس کے آگے بڑھنے کا انتظار کرنے لگا۔

دروازہ رملی کی ملازمہ نے کھولا تھا۔ وہ چند لمحوں حیرانی سے اس کو دیکھتی رہی۔ شاید اس کے سامنے ایک بالکل بدلی ہوئی زینب کھڑی تھی۔ جسے اسے پہچاننے میں کچھ دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ پھر ایک زینب نے ان آنکھوں کے تاثرات تبدیل ہوتے دیکھے۔ ان میں زینب کے لیے قدرے نفرت اور حقارت ابھری تھی۔

”اماں رملی ہے گھر پر؟“ وہ پریشان ہو کر بول اٹھی۔ اس نے کچھ دیر بعد اثبات میں سر ہلایا اور ایک طرف کو ہو کر اسے اندر آنے کا رستہ

دیا۔

زینب اندر چلی آئی۔ پورے گھر میں ملگجاسا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک گھمبیر سناٹا جیسے اس گھر میں کوئی نہ رہتا ہو۔ حالانکہ رملی کے گھر آ کر تو اسے ہمیشہ زندگی کا روشنی کا رنگا ہوں کا خیرہ کر دینے والی چمک کا احساس ہوا کرتا تھا۔

”کیا بات ہے اماں؟“ اس نے پلٹ کر ملازمہ سے استفسار کیا۔ ”اتنا اندھیرا کیوں کیا ہوا ہے گھر میں؟ اور یہ رملی کہاں ہے؟“

”اندھیرا تو زندگی میں ہو گیا ہے بی بی!“ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔ ”اور دل میں ہو گیا ہے۔ گھر کے اندھیرے کا کیا ہے؟ اسے تو پل

میں دور کیا جاسکتا ہے۔“

اس نے آگے بڑھ کر سوچ بچورڈ کے سارے بٹن دبا دیے۔ پورا گھر جگمگا اٹھا تھا۔

”رملی بی بی اپنے کمرے میں ہیں۔“ وہ کہہ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

نہب چند لمحے کھڑی اس کی بات پر غور کرتی رہی تھی پھر وہ رملی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پہلے اس نے دروازے پر دستک دی پھر ہینڈل گھما کر پش کیا۔ دروازہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔

”رملی!“ اس نے آواز دی پھر اندر داخل ہو گئی۔

پورے کمرے میں اندھیرا تھا، جس تھا، سگریٹ کی بوتلی۔ نہب کی نگاہیں اندھیرے سے مانوس ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔ یکا یک بستر پر لیٹی ہوئی رملی نے سائڈ لیپس روشن کر دیے تھے۔ کمرے میں ہلکی سفید روشنی پھیل گئی۔

نہب آہستگی سے چلتی لیٹی ہوئی رملی کے مقابل پہنچ گئی۔ اس نے نہب کو دیکھ کر بھی اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہب اس کے پاس جا بیٹھی پھر یکا یک اسے دھچکا لگا

وہ، رملی نہیں تھی۔ وہ تو کوئی اور عورت تھی۔ اندر کو دھنسی ہوئی حلقہ زدہ آنکھوں، سیاہ رنگت اور نیلے ہونٹوں والی کوئی بد صورت سی عورت۔ سانولی سلونی رنگت والی، جامہ زیب رملی سے اس کا کوئی تعلق نہ لگتا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور، چمکتی ہوئی رملی کہاں تھی۔ نہب کی نظریں اس مردہ سی عورت میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

”کیوں آئی ہو یہاں تم؟“ وہ یکا یک پھنکاری تھی۔ ”میں تمہاری صورت سے نفرت کرتی ہوں۔ کیا بچا ہے اب میرے پاس جو تم لینے چلی آئی ہو۔“

نہب پلکیں جھپکائے بنا اسے دیکھتی چلی گئی۔

”میں نے، میں نے کیا لیا ہے تمہارا؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور اوردہ بھی بے حد بے یقینی سے اس پر یکا یک ہی بہت کچھ منکشف ہونے لگا تھا۔

”یہ اپنے آپ سے پوچھو نہب شاہ!“ وہ جیسے زہر میں بھیجی ہوئی تھی۔ ”پھر بھی کچھ میں نہ آئے تو اپنے شوہر سے پوچھو، اپنے سوکا لڈ شوہر سے۔“ وہ یکا یک طنز یہ ہنسی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے پر نکھرے بال ہٹائے اور اٹھ کر نیچے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ ”جو آدمی پیسے کی چمک دمک دکھا کر حسین عورتوں کی قربت کچھ عرصے کے لیے حاصل کرتے ہیں وہ شوہر نہیں ہوتے، مان نہیں ہوتے، بے ایمان ہوتے ہیں لیکن یہ بات اس وقت سمجھ میں آئی تھی جب نہ مان رہتا ہے نہ ایمان۔“

بساط

کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا عظیم الحق کا پہلا ناول **بساط** جو انگریزی فکشن سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس ناول میں بدنام زمانہ امریکی تنظیم سی آئی اے کی من مانیوں، دوسرے ممالک میں سیاسی و معاشرتی بد امنی پھیلانے کے لیے قتل و غارت اور دیگر ہتھکنڈوں کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔ امریکی انتظامیہ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کس حد تک جاسکتی ہے، اس ناول کو پڑھ کر بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ **بساط** کو **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ زینب کو ایک لمحے کے لیے اس پاگل عورت سے خوف محسوس ہوا۔ وہ قدرے پیچھے کمرک گئی۔ رملی ہنسی روک کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

”بہت، بہت حسین لگ رہی ہو زینب شاہ! بہت حسین لیکن جانتی ہو مجھے تم دنیا کی سب سے بد صورت عورت نظر آ رہی ہو دنیا کی بد صورت ترین عورت، یہ لباس یہ زیورات، یہ خوشبوئیں، جن کا استعمال تم نے مجھے متاثر کرنے کے لیے کیا ہے ان چیزوں سے ایک عرصہ ہوا میں نے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے۔ تم مجھے متاثر کرتی تھیں کم قیمت لباس میں، نکھرے نکھرے بالوں میں، تمہارے ہاتھ میں پڑی وہ سونے کی چار چوڑیاں جو تمہارا سرمایہ تھیں انہیں میں بہت عقیدت سے دیکھتی تھی۔ ان چوڑیوں سے پار سائی کی کٹنگ سنائی دیتی تھی۔ ان سے تمہارے شوہر کی حجبی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ ان..... ان چوڑیوں میں تمہارا شوہر کا دل، اس کا اعتماد اس کا مان باندھا ہوا تھا جسے اپنی کلائی پر سجا کر تم مجھے اس دنیا کی سب سے حسین، سب سے معتبر عورت نظر آتی تھیں آہ!“

اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر بیڈ کی پشت سے نکادیا۔

”ہیرے کی انگلیوں سے سچے تمہارے یہ ہاتھ پتھر کے ہیں زینب! ان سے کوئی تاثر نہیں ابھرتا، کوئی جذبہ نہیں پھوٹتا تم اتنی کم قیمت اور بے مایہ ہو چکی ہو کہ مجھے نفرت کے ساتھ ساتھ تم پر ترس بھی آتا ہے۔“

زینب جیسے واقعی پتھر کا بت بن گئی تھی۔ ساکت بیٹھی وہ فرد جرم بن رہی تھی۔

”اب، اب تم جاؤ زینب! میں نے تصور میں تمہارے وجود پر سنگ باری کی ہے، تمہارے پتلے جلائے ہیں، تمہیں ہسپتال کی گھبراہٹوں میں زندہ دفن کیا ہے لیکن نجائے کیوں تمہیں ان قیمتی کپڑوں اور زیوروں میں دفن دیکھ کر مجھے تمہاری بے بسی اور بے چارگی پر ترس آ رہا ہے، تمہارا مقدر بھی تو مجھ سے مختلف نہیں ہے۔ تم میرا آئینہ ہو۔ مجھے تم سے نفرت کرنے کا حق نہیں پہلے مجھے خود سے نفرت کرنی چاہیے۔ اس لیے تم جاؤ! اس نے آنکھیں موند لیں۔ زینب کو جبر جبری آئی تھی۔

”میں، میں ایسے نہیں جاؤں گی رملی!“ وہ ٹھنڈے ٹھہرے ہوئے لمبے میں بولی تھی۔

”پہلے تمہیں مجھ کو ساری بات بتانی ہوگی۔ ہر بات جو تم آج تک مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔“ رملی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھے۔

”تمہارا سکندر سے کیا رشتہ ہے؟“ اس نے رملی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر تلخ انداز میں مسکرا دی۔

”اپنی زندگی کو عذاب تو تم بنائی چکی ہو زینب شاہ اسے عذاب ترمت بناؤ۔“

”تم بہت کچھ کہہ چکی ہو رملی! اتنا کہ اب تمہارے پاس کہنے کے لیے مزید کچھ نہیں ہے۔ مجھے اب میرے سوالوں کے جواب دو۔ بناؤ مجھے سکندر سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

”وہی جو تمہارا ہے۔“ وہ بے حد آرام سے بولی تھی۔

ایک لمحے کے لیے زینب کا سانس رک گیا تھا۔ وہ پلک جھپکائے بنا اسے دیکھتی رہی۔

”فرق بس اتنا ہے کہ تم سے اس نے نکاح پڑھوایا ہے.....“ وہ پھر ہنس دی۔ ”ہونہ مگر اسے زیادہ فرق مت سمجھنا زینب.....! ایسے کاغذ کی اہمیت ہوتی بھی نہیں ہے۔ اہمیت تو رشتے کی ہوتی ہے۔“ جذبوں کی ہوتی ہے، محبت کی ہوتی ہے اور سکندر علی نے ان چیزوں کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

”تم تم خود بھی تو قابل نفرت ہو۔“ یکا یک زینب کو اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ ”تم بھی اس لائق نہیں ہو کہ تم پر ترس کھایا جائے“

تمہارا شوہر تمہارے لیے پیسہ کمانے باہر گیا ہے۔ تمہیں اعتبار اور اعتماد کی سند دے کر اور تم نے یہاں ایک غیر آدمی سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔ اپنے شوہر کے اعتماد کی دھجیاں نکھیریں اور..... اور..... دنیا کو دھوکا دیتی رہیں کہ وہ تمہارا بھائی ہے؟ جیسی تم پر تو تھو کے کوئی کرتا ہے اور..... اور تم مجھے قابل نفرت گردانتی ہو؟ میں نے تو پھر بھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس سے شادی کی ہے جائز رشتہ استوار کیا ہے اس سے تم خود کیا ہو؟ اس کی داشتہ؟“

وہ جو کچھ منہ میں آیا، بولتی چلی گئی تھی۔ شادی کے بعد بہت سی باتوں سے اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ رملی اور سکندر علی کے درمیان رشتہ وہ نہیں ہے جو اسے بتایا گیا لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ بات اس حد تک بڑھی ہوئی ہوگی۔ سامنے بیٹھی ہوئی اس عورت سے اس کے شوہر کے ناجائز تعلقات تھے، یہ بات اس کے لیے ایک شاک تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رملی کا خون ہی پنی جاتی یا پھر اپنا سر پھوڑ لیتی۔

رملی نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا اور پھر چند لمبے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آنسو صاف کیے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ہاں! میں تمہیں قابل نفرت گردانتی ہوں۔ میری نگاہ میں تم اپنے کردار کی پتیتوں میں گر چکی ہو اور خود سے میرا مقابلہ مت کرو نہ سب! مجھ میں اور تم میں بہت فرق ہے۔“ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”میں نے سکندر علی سے محبت کی ہے۔ بہت زیادہ شدت سے چاہا ہے، اس نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں زندگی کے اندھیروں میں اپنا آپ کھو چکی تھی۔ میرا شوہر مجھے شادی کے کھوڑے ہی عرصے بعد چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔ بعد میں مجھے ایک جھوٹے تعلق کی ڈور میں تو باندھا ہوا تھا لیکن میں جانتی تھی وہ کبھی بھی لوٹ کر واپس نہیں آئے گا۔ اس کے اور میرے تعلق میں نکاح کے تین بولوں، ہر ماہ باقاعدگی سے بھیجی جانے والی رقم اور تین چار مہینوں بعد فون پر رسی سے گفتگو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھ سے شادی اس نے محض اپنی بیمار ماں کی خواہش پر کی تھی۔ وہ میری رشتے کی خالہ تھی۔ میرے ماں باپ کے گزر جانے کے بعد اس نے مجھے پالا تھا۔ مجھ پر اس عورت کے بے تحاشا احسانات ہیں۔ اپنے بیٹے کو مجھ سے زبردستی شادی پر مجبور کر کے اس نے مجھ پر ایک اور احسان کرنا چاہا تھا لیکن یہ میری زندگی کا سب سے بڑا بوجھ بن گیا۔“

وہ خاموش ہو کر تھکے تھکے سانس لینے لگی، زنبب ایک تک اسے دیکھ رہی تھی۔

”خالہ کے گزر جانے کے بعد وہ کچھ جھوٹی تسلیاں میرے پلو سے باندھ کر چلا گیا۔ میں اکیلی تنہا خوف، مایوسی اور خود رسی کا شکار بن کر رہ گئی۔ احساس تنہائی مجھے دیکھ کر چائے بن کر چائے لگا تو میر سکندر علی میری زندگی میں چلا آیا۔ میں نہیں جانتی زنبب کہ وہ میری جانب کیوں بڑھا تھا مجھ میں کیا چیز تھی جس نے اسے متاثر کیا یا شاید اسے متاثر کرنے کے لیے محض عورت ہونا ہی کافی ہے۔“ وہ ہنس دیتی تھی۔

وہ میری جانب بڑھا کہ اسے وقت گزاری کے لیے ایک جسم کی ضرورت تھی میں سیاسی دھرتی کی مانند اسے بادل کا ٹکڑا جان کر کھل اٹھی۔

میں نے اسے بے لوث چاہت دی محبت دی وہ سب کچھ دیا جو اس نے چاہا اور میں سمجھتی رہی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اپنا ناچا ہوتا ہے۔“

”میں اس کی دولت کے فریب میں نہیں آئی تھی زنبب! میں محبت کے ہاتھوں لٹی تھی۔ مجھ سے نفرت مت کرو، میں نے اپنا آپ بچا نہیں تھا ایک خوب صورت ختنے کی صورت اسے پیش کیا تھا لیکن وہ یہ بات نہیں سمجھا! وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتا۔“

پھر اس نے تاسف سے زنبب کو دیکھا۔

”یہ بات تم بھی نہیں سمجھو گی محبت کا سچا، بے لوث جذبہ میں نے تم پر بھی بے اثر ہوتے دیکھا ہے۔ اچھا ہوا جو تم دونوں نے شادی کر لی۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔ تمہیں دولت چاہیے اور اسے وقت گزاری کے لیے ایک خوب صورت جسم! خوب نیچے گی۔“

وہ ایک مرتبہ پھر ہانگوں کی طرح ہنسنے لگی۔ زنبب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔

”مجھ سے اپنا موازنہ نہ کرتی ہو؟ مجھ سے؟ ہو نہ! کیا ایک رملی غصے سے بھڑک کر بولی تھی۔“ اسے تم اس قابل کہاں ہو کہ کسی سچی محبت کرنے والے سے اپنا موازنہ نہ کرو۔ مجھے کہتی ہو کہ میں نے اپنے شوہر کے اعتماد کی دھجیاں نکھیری ہیں اور تم نے کیا کیا؟ تم نے تو اپنے محبت کرنے والے شوہر کو جیتے جی مار ڈالا۔ تم تو اتنی ظالم اور بے حس ہو کہ تاریخ میں تمہارا نام رقم ہونا چاہیے۔ مس زنبب سکندر علی!“

نہ ب کے دل کو اس نے چھوڑ ڈالا تھا۔ احسن کا خیال ایک کرنٹ بن کر اس کے رگ و پے سے گزرا تھا۔

”اب یہ سب کچھ کہنے سے کیا حاصل ہے رملی؟“ وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ ”پہلے تم نے کیوں چپ سا جی ہوئی تھی۔ پہلے یہ سب کچھ کیوں

نہ کہا مجھ سے؟“

”مجھے تم پر یقین تھا نہ نینب! اندھا یقین۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”میں تمہاری کلائی میں پڑی چوڑیوں کی کھنک سنٹی تھی تو سوچتی تھی اس آواز سے کوئی عورت جھوٹ نہیں بول سکتی اس عہد سے کوئی عورت منکر نہیں ہو سکتی یہ سچا عہد جو دو محبت کرنے والے دل مل کر باندھتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ سکندر نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تم سے کبھی بھی اپنے اور اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی..... بصورت دیگر وہ مجھ سے سارے ناخلف ختم کر لے گا۔ میں تمہارے یقین اور اس کے وعدے سے مجبور تم سے کبھی بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ تمہاری طلاق کے بعد اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ خواہ کتنی ہی شادیاں کیوں نہ کر لے۔ اس کا اور میرا تعلق ہمیشہ ہر شے سے زیادہ مستحکم رہے گا۔ اور اب جبکہ اس کے دل سے ہر خوف مٹ چکا ہے کہ میں تم دونوں کے بیچ آ سکتی ہوں اب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو چکا ہے۔ وہ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا، میں فون کرتی ہوں تو وہ فون بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے ہر نا طوڑ چکا ہے اسی لیے آج میں نے اس کے جھوٹے عہد سے آزاد ہو کر یہ سب کچھ تم سے کہہ ڈالا، جو میری روح میں ایک پھانس بن کر اٹکا ہوا تھا۔“

”مگر مگر بہت دیر ہو چکی رملی بہت دیر!“ وہ جیسے خواب کے عالم میں بولی تھی۔

”ہاں نہ نینب!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بہت دیر ہو چکی ہے۔ ہم دونوں کو لیکن لیکن..... تمہیں تو میں نے بہت بچانا چاہا، بار بار سمجھا یا لیکن تمہاری آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے تو کوئی رملی نہیں ملی تھی۔ میرا بچنا محال تھا لیکن تمہیں تو میں چاہتے ہوئے بھی دوسری رملی بننے سے نہ بچا سکی۔“

نہ ب کے سر میں یکا یک درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

”سنو نہ نینب!“ یکا یک رملی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں مرجاؤں تو سکندر علی کو میرے جنازے پر مت آنے دینا۔ کم از کم قیامت تک میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی اور تم ضرور آنا تم میرے جنازے پر ضرور آنا۔ کسی ایک شخص کے لیے تو عبرت کا نشان بنوں میں..... ہاں! ہم جیسی عورتوں کو عبرت کا نشان بنانا چاہیے۔“

نہ ب بھٹی بھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔



اسی رات تقریباً بارہ بجے رملی کی ملازمہ کا فون آیا تھا۔ رملی نے زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھا کر خود کشی کر لی تھی۔

یہ اطلاع صرف نہ ب کے لیے تھی۔ وہ بہت دیر تک ریسیور کان سے لگائے بے حس و حرکت کھڑی رہی تھی پھر سکندر علی نے اس کے ہاتھ ریسیور لیا تو وہ حواسوں میں آئی۔

”رملی..... رملی مر گئی!“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ تھی۔

”واٹ؟“ وہ لہجہ بھر کو چونکا تھا۔

”رملی مر گئی اس نے خود کشی کر لی۔“ وہ خواب کے عالم میں بول رہی تھی۔

”یہ وقت تو ہر انسان پر آتا ہے۔ تم دل پر مت لو۔ وہ تھی بھی کچھ خطی سی عورت۔“

”آپ، آپ چل رہے ہیں؟“ اس نے سکندر علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”اتنی رات کو؟ کل چلیں گے بلکہ میری تو ایک ضروری میٹنگ ہے۔ تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا۔“
 زنب کو اس پتھر کے انسان سے کراہیت ہونے لگی۔ وہ تڑپ کر اس سے دور ہو گئی۔

”اوکے اوکے ڈارلنگ! میں ڈرائیور سے کہتا ہوں۔ وہ تمہیں لے جائے گا کچھ دیر بیٹھ کر آ جانا۔“
 اسے ملنی کا پیغام دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ شاید خود بھی قیامت تک اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔



ملنی کی موت اس کے لیے ایک ایسا شاک تھی جس سے از خود سنبھلا اس کے لیے شاید ممکن نہ تھا۔ وہ دن رات ایک خواب کے عالم میں رہتی تھی۔ ملنی کا سفید کفن میں لپٹا ہوا سیاہ چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھرتا رہتا۔ زنب کو اسے اس آخری روپ میں دیکھ کر یقین نہ آیا تھا کہ یہ وہی ملنی ہے۔ سافٹو سلونی، خوش شکل ملنی، جواڑھ پہن کر اور بھی پرکشش ہو جایا کرتی تھی۔ جب وہ اس سے پہلی مرتبہ ملتی تھی تو کتنی بے فکر اور خوش باش تھی۔ زنب کو اس پر رشک آیا کرتا تھا اور وہ دل ہی دل میں کتنے ہی گھاؤ چھپائے زنب پر رشک کرتی رہتی اور بالآخر ایک نشانِ عبرت بن کر اس دنیا سے خفا ہو کر چلی گئی۔

زنب اس کی موت پر اس کی یاد میں رونا چاہتی تھی لیکن اسے رونا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے اس حسین محل کے در و دیوار کو گھورتی خاموشی سے ادھر ادھر پھرتی رہتی۔

وہ ہفتہ میر سکندر علی نے بے انتہا مصروفیت کے عالم میں گزرا تھا۔ اسے زنب کی حالت کا اندازہ نہ ہوا۔ چند ایک راتیں تو اس نے باہر بھی گزاری تھیں۔ دن میں کسی وقت کچھ دیر کے لیے ہو کر چلا جاتا تھا۔ زنب کو اس بات سے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوتی تھی کہ وہ اسے وقت دے رہا ہے یا نہیں۔ اسے میر سکندر علی سے ہی کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوتی تھی۔

بالآخر کتنے ہی دن بعد یہ جو دو ٹوٹا تھا۔ وہ اس دن گھر میں ہی تھا۔ زنب کتنی ہی دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ نیچے اتری تو اسے ڈانٹنگ ٹیبل پر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

بڑی خاموشی سے آگے بڑھ کر وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگی۔ اخبار بڑھتا ہوا سکندر علی چونکا تھا۔

”خوش آمدید!“ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ ”کیسی طبیعت ہے؟“

”جی؟“ اس نے نگاہیں اٹھائیں پھر جھکائیں۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟“

”ملازم بتا رہے ہیں کہ تمہاری طبیعت کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں ہے۔ تم کھانا بھی صحیح طرح سے نہیں کھاتیں؟ کوئی پریشانی ہے ڈارلنگ۔“

”جی نہیں!“ وہ کپ میں چائے اٹھیلنے لگی۔ ”آپ کے لیے چائے بناؤں؟“

”نہیں کانی لے چکا ہوں۔“ وہ اسے بخوردیکھنے لگا۔ ”پچھلے دنوں تمہیں وقت نہ دے سکا۔ آئی ایم ویری سوری ڈارلنگ لیکن اب چند ہی

دن میں میں اس کا ازالہ کر دوں گا۔ کچھ دنوں کے لیے میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ بہت سی دعوتیں بھی منشائی ہیں تمہیں لوگوں سے ملوانا ہے لیکن

ڈارلنگ! یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟“

”جی؟“ اس کا کپ لبوں تک لے جاتا ہاتھ رک گیا۔ ”کیا ہوا میرے حال کو؟“

”رنگت بیماروں جیسی ہو رہی ہے اور آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے ہیں اور یہ کس قدر ہلکے رنگ کا لباس پہنا ہے تم نے، مجھے عورتیں

شوخی کلرز میں اچھی لگتی ہیں تیز، بھڑکیلے رنگ پہنا کر۔ کھل اٹھتی ہو۔“

”مجھے عورتیں شوخی کلرز میں اچھی لگتی ہیں۔ مجھے عورتیں اچھی لگتی ہیں، مجھے عورتیں، عورتیں.....“ اس کا جملہ اس کے ذہن کی ہر دیوار سے

گرا کر لوٹنے لگا۔

اس نے کپ میز پر تقریباً پچا تھا۔

”جی میں جانتی ہوں۔“ وہ بولی تو اس کی آواز میں تلخی مچلی ہوئی تھی۔ ”جن عورتوں کے رنگ پھیکے پڑ جائیں وہ آپ کی نگاہ سے اتر جاتی ہیں۔“

سکندر کچھ کہتے کہتے ختم گیا تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”جیسے رلی۔“ وہ خود کو کہنے سے باز نہ رکھ سکی۔

”میں جانتا ہوں۔ تم اس کے مرنے سے پہلے اس سے ملنے لگی تھیں۔“ پھر وہ اطمینان سے بولا۔

”اس نے یقیناً تمہیں خوب خوب کہانیاں سنائی ہوں گی لیکن مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ کہانیوں اور کتابوں کی دنیا میں رہنے والے بے وقوف لوگوں کی اس دنیا میں کمی نہیں ہے۔ میں بڑا پریکٹیکل آدمی ہوں نہ ب۔! مجھے یہ تصور کہانیوں کی دنیا اٹریکٹ کرتی ہے نہ ان میں بسنے والے لوگ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ بس اتنی کہانی ہے۔ کوئی کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں مجبور نہیں کیا تھا ایک چو اُس دی تھی تم نے قبول کر لی اگر تم نہ کرتیں تو کیا میں خود کشی کر لیتا؟ کس قدر مضحکہ خیز بات لگتی ہے۔“

”اس کی زندگی تباہ کر دی، یہ مضحکہ خیز بات ہے؟“ وہ بے حد ساف سے بولی تھی۔

”زندگی! میں نے تباہ کی؟“ اسے ہنسی آگئی۔ ”کون کس کی زندگی تباہ کر سکتا ہے؟ اس قدر تیز رفتار دور ہے لوگوں کے پاس سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ہاں! کوئی خود اپنی زندگی تباہ کرنا چاہے تو دوسری بات ہے۔ جیسے رلی نے کیا۔ کیا ضرورت تھی اس ڈھونگ کی؟ مجھے کیا فرق پڑ گیا۔ وہ خود دنیا سے چلی گئی۔“

نہب کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ بچا۔ وہ انفس کے شدید تاثر میں گھر کا خاموش بیٹھی رہ گئی۔ سنگدلی کی یہ کیفیت اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

”شام کو ایک دعوت ہے۔“ یکا یک وہ لہجہ بدل کر خوشگوار آواز میں بولا۔ ”ایک بہت بڑی پارٹی۔ شہر کے تمام اہم لوگ مدعو ہوں گے۔ تمہیں بہت بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔ اس پارٹی کی سب سے نمایاں شخصیت۔ تمہارے لباس کے انتخاب میں میں تمہاری مدد کروں گا۔ بیوٹیشن سے ٹائم سیٹ ہے۔ تمہیں پانچ بجے پارلر جانا ہے۔“

نہب نے غائب دماغی سے اس کی بات سنی پھر مزید غائب دماغی سے اسکی جانب دیکھا۔

”جی کہاں جانا ہے؟“

اس نے بہت سکون اور رمانیت سے اپنی بات دہرائی تھی۔

”لیکن، لیکن میرا موڈ نہیں ہے۔ میں کہیں جانا نہیں چاہتی!“ وہ قدرے بے بسی آمیز جھنجھلاہٹ سے بولی تھی۔

”نو ڈارلنگ! انو!“ یکا یک اس کے انداز میں وہی سرد مہری اور پراسراریت در آئی، جس سے اسے خوف محسوس ہوتا تھا۔

”ہم پارٹی میں جائیں گے ضرور!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اوپر کمرے میں ہوں۔ ناشتہ کر کے اوپر چلی آؤ۔ وہاں ہم تمہارا شام کا ڈریس

سلیکٹ کریں گے اوکے؟“

نہب سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔



رات کو اس نے میر سکندر علی کا منتخب کردہ ڈارک گرے کٹرکامیکی غنائنوں تک لمبا لباس پہنا تھا۔ گلے میں ڈائمنڈ کائیکلس اور کانوں میں ڈائمنڈ ہی کے آویزے تھے۔ بیوشن کے ماہر ہاتھوں نے اسے اس طرح سنوارا تھا کہ وہ خود اپنے آپ کو نہ پہچان پائی تھی۔

”ونڈرفل“ سکندر علی نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”کیا شے لگ رہی ہو تم! میرا انتخاب بالکل درست تھا۔“

زینب سمجھ نہ پائی کہ اس نے زینب کے انتخاب کی بات کی تھی یا اس کے لباس کی وہ تقریب اس قدر بڑی اور شاندار تھی کہ زینب وہاں پہنچ کر کچھ دیر کے لیے کنفیوژ ہو گئی تھی۔ اس قدر افراد اس قدر روشنیاں اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔

سکندر علی اس کا بازو تھا اے اے مختلف افراد سے ملواتا رہا۔ وہ رسماً مسکراتی رہی۔

ایک بات اس نے بطور خاص نوٹ کی کہ وہ اسے زیادہ تر مرد افراد سے متعارف کروا رہا تھا۔ حالانکہ اس کے حلقہ احباب میں عورتیں کس تعداد میں تھیں یہ بات اسے اپنی شادی کی تقریب میں معلوم ہو چکی تھی۔

میر سکندر علی کسی شخص سے باتوں میں مصروف ہوا تو وہ لیسن جوس کا گلاس تھام کر ایک نسبتاً پرسکون گوشے میں چلی آئی۔

رات بے پناہ حسین تھی۔ آسمان پر پورا چاند تھا اور فضا میں پھولوں کی کھلی ملی مہک رات داڑھی تھی۔ ایسی راتیں احسن کو بے حد پسند تھیں۔ وہ اس سے ساری ساری رات جاگ کر باتیں کرنے کی فرمائش کرتا تھا۔ وہ عاجز ہو جاتی تھی۔

آنکھیں موند کر اس نے اپنے دل کے ادھر سے ٹانگوں سے رستے خون کو محسوس کیا۔

”تم سے کتنی دور ہو چکی ہوں احسن اور ہرگز رات لمحہ مجھے تمہاری یادوں سے قریب تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ تمہاری قربت میں کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں تم سے اتنی، اتنی۔“

اس نے آنکھیں کھولیں اور انگلی کو پورے سے پکوں پرانے آنسو صاف کیے۔ اس سے کچھ فاصلے پر رکھی کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ زینب کو اس کے سیاہ بال اور اس کی سفید شرٹ کا کالر نظر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے اس کا سانس رک گیا۔

”احسن، احسن..... کیا یہ احسن ہے؟“

اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس شخص تک پہنچی تھی۔

”احسن.....“ اس نے اس شخص کا کاندھا پکڑ لیا۔

”جی.....“ وہ مڑ کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”تیس میڈم؟“

وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ وہ تو کوئی اور تھا۔ اس کے حسن کی ضوشتانیوں سے مرعوب ہو کر وہ ایک ننگ اسے دیکھ رہا تھا جیسے اپنی قسمت پر اسے آپ یقین نہ آ رہا ہو۔

”سوری۔“ وہ شکستہ دلی سے ایک طرف کو ہٹ گئی۔

”اور، اور اگر وہ احسن ایاز ہوتا تو بھی تم کیا کرتیں زینب؟ تمہارا اب اس سے کیا ناٹھ ہے جو تم اسے یوں پکار سکو، سچ محفل میں اسے مخاطب ہی کر سکو وہ تو اگر کہیں ملا بھی تو تمہارا ہاتھ جھٹک کر ایک طرف کو بڑھ جائے گا۔“

”زینب ان سے ملو!“ میر سکندر علی کی آواز اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ ”ان سے ملو یہ داؤدی ہیں ہماری جان سے عزیز دوست!“

داؤدی صاحب نے بڑی بے تکلفی سے نہ صرف اس سے مصافحہ کیا تھا بلکہ جھک کر اس کے گال سے اپنا گال بھی چھوا۔ زینب اس حرکت پر سن ہو کر رہ گئی۔ کسی غیر مرد کی اس طرح کی بے تکلفی نا قابل برداشت تھی۔ اس نے دیکھا، میر سکندر علی مسکرا رہا تھا۔

”بھئی مان گئے۔ جو سنا کہ تم تھا۔“ داؤدی صاحب مسکرا رہے تھے۔ ”بڑی تعریفیں سنی تھیں مسز سکندر علی کی لیکن یقین نہ آتا تھا کہ اس قدر بھی کیا حور شاہل ہوں گی لیکن بھئی مان گئے۔ جو سنا کہ تم تھا۔“

سکندر علی ان دونوں کو چھوڑ کر کسی تیسرے شخص کی جانب بڑھ گیا۔ نہ بک کا کوفت کے مارے برا حال تھا۔ داؤدی صاحب کی چمک دیتی نظر میں اور حرص سے نچتے ہوئے زیادہ دیر تک سامنا نہ کر سکی۔ اس سے لٹھ مار قہم کی معذرت کر کے وہ ایک طرف کو بڑھ گئی تھی تقریب رات گئے تک جاری رہی۔ وہ تقریباً تین بجے گھر لوٹے تھے۔

”کبھی رہی پارٹی؟“ سکندر علی ناکی کر گرہ کھولتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”شانداز تھی نا؟ ایسی تقریب تم نے اپنی لائف میں شاز شاز ہی دیکھی ہوگی۔“

”ایسی تقریب میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”میں نے تمہیں داؤدی سے ملوایا تھا تم نے اسے کبھی نہیں دی۔“

اودھ سوری سکندر اودھ شخص برداشت سے باہر ہے۔ وہ یکا یک ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا۔

”مجھے اس شخص سے بہت سے کام ہیں میرے کئی تالوں کی چابی ہے وہ۔ اس کے اعزاز میں ایک پارٹی بھی دینی ہے ہمیں اور اس مرتبہ تم اسے نظر انداز نہیں کرو گی۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ؟“

”اتنی معصوم مت بنو زینب ڈارنگ!“ وہ اس کے قریب چلا آیا ”ایک حسین، طرح دار عورت ہوتی سی بات نہیں سمجھ سکتیں؟ اس کو اپنی زلف کا اسیر کر لو، میرے تالے خود بخود کھلتے چلے جائیں گے۔“

”سکندر!“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔



کسی ڈراؤ نے خواب سے ڈر کر وہ جاگتی تھی۔ کچھ دیر تک وہ بستر پر لیٹی اندھیروں کو کھتی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے سائیڈ لیپس روشن کیے۔ اس کے سر ہانے رکھا ناٹم پیس بارہ، بجا رہا تھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے اور بیڑ پر دوں نے کمرے کو آدھی رات کا ساما حول بخشا ہوا تھا۔

اس نے جسم میں ہوتے ہلکے ہلکے درد اور ٹکان کو محسوس کیا پھر بے دلی سے واپس لیٹ گئی۔ اٹھنے کو جی نہیں کرتا تھا۔ کچھ دیر تک لیٹی وہ پلکیں جھپک جھپک کر چھت کو کھتی رہی۔ ذہن پر غنودگی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اسے یاد آیا! اسلپنگ پلوکھا کر سوئی تھی۔ اس کا ذہن اور جسم ابھی تک اسی نشے کے زیر اثر تھے۔ شاید ابھی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ کروٹ بدل کر اس نے سونے کی کوشش کی لیکن پھر اسے گزشتہ رات کی باتیں یاد آنے لگیں۔

وہ تقریب، جس میں اس نے سکندر علی کے بعد اصرار شرکت کی تھی۔ اس کے حریص نگاہوں والے مرد، داؤدی صاحب اور پھر واپسی پر سکندر علی کی باتیں! سب کچھ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ جی چاہا کہ ایک مرتبہ پھر تین چار گولیاں کھا کر پڑ کر سو جائے لیکن وہ کب تک سو سکتی تھی؟ بالآخر اسے جاگنا ہی تھا۔ زندگی کا سامنا کرنا تھا اور زندگی کے یہ انداز اس کے اپنے منتخب کردہ تھے۔ اس نے بے حد خوشی سے اس راہ کو چنا تھا۔

”اور اب تمہیں یہ راہ بھی کانٹوں سے بھری دکھائی دیتی ہے؟“ کسی نے اس کے اندر سے پوچھا۔ ”تم چاہتی کیا ہو زینب شاہ؟ تمہارا اندر سدا بے گل اور خالی ہی رہتا ہے۔ تم اس قدر کھوکھلی کیوں ہو؟ یہ شانداز انداز زندگی، یہ عالی شان محل، نوکر چاکر، گاڑیوں کی لمبی قطار، نوٹوں سے بھری الماریاں یہی تمہاری خواہش کل تھی۔ اس سے آگے تمہاری سوچ نہ جاتی تھی۔ اب اس مقام پر آ پہنچی ہو تو سوچوں کے دھارے بھر کسی اور سمت کو بہے

جارہ ہیں۔ اب تمہیں کیا چاہیے؟ کیا؟ کیا؟“

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک بار پھر اسے ہر سوچ سے رہائی پالینے کی، ہوش و حواس کی دنیا سے دور ہو جانے کی شدید خواہش نے آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پھر سے گولیوں سے بھری شیشی اٹھالی۔ وہ اسے کھولنا ہی چاہتی تھی کہ کوئی اس کے اندر قبضہ مار کر نہ پڑا۔
 ”تم واقعی امیر ہو گئی ہو زینب خاتون! یہ ذہنی الجھنیں، یہ نیند کی گولیاں اور یہ بے حد حساب تھکن!“ وہ شیشی کو گھورتی رہی۔
 ”تو کیا ایک دن مجھے بھی رملی کی طرح یہ ساری گولیاں ایک ساتھ نگلنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ یہ جنگ، یہ اعصاب شکن جنگ ہی تو برپا ہوتی ہوگی جو انسان کو اتنا بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہوگی۔“ میں کس طرح سے یہ جنگ لڑوں۔ میرے ہاتھ خالی ہیں اور میرا ساتھ دینے والا کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں!“

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ پھر کتنی ہی دیر بعد وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔
 نہا کر وہ باہر نکلی تو اسے بھوک اور چائے کے ایک گرم گرم کپ کی بے تحاشا خواہش کا احساس ہوا۔ وہ بالوں میں برش پھیر کر نیچے چلی آئی۔
 جیلہ اسے ایک کونے کی جھاڑ پونچھ کرتی نظر آ گئی۔

”جیلہ! اسلم سے کہو، چائے لے آئے۔“ وہ ڈانٹنگ ہال میں چلی آئی۔

پھر اسے جھکا سا لگا تھا۔ سکندر علی وہاں موجود تھا۔ اخبار سامنے پھیلائے وہ مصروف سے انداز میں چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ زینب کا جی چاہا، وہاں سے پلٹ جائے لیکن حقیقت یہ تھی کہ پلٹنے کے لیے اب اس کے پاس کوئی رستہ باقی نہ تھا۔
 ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ آگے بڑھ گئی۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھنے لگی تو میر سکندر علی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔
 ”اوہ گڈ نوٹ ڈارلنگ!“ وہ مسکراتا تھا۔
 وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”گلنگ ہے تمہاری رات کی تھکن ابھی تک نہیں اتری۔“ وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔ ”تمہاری آنکھوں کے نیچے حلقے ہو رہے ہیں۔ کچھ دیر اور سو لیتیں۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بے وجہی اخبار اگے کر لیا۔

”کہاں ٹھیک ہو۔ بالکل تھکی ہوئی مرجھائی ہوئی لگ رہی ہو۔ ایسا کر دو کوئی فریش جوس لے لو اور پیل یا اورنج۔۔۔۔۔“
 ”نہیں میں چائے پیوں گی۔“ اس نے ٹرائی لاتے اسلم کو دیکھ کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ میر سکندر علی خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے زینب کے سوڈا کا اندازہ ہو گیا تھا۔

اسلم نے چائے بنا کر کپ اس کے آگے رکھا۔

”ناشتے میں کیا لیں گی میڈم؟“

”کچھ نہیں، صرف چائے، کچھ دیر بعد میں کھانا کھاؤں گی۔“

”آپ کے لیے کچھ اسٹیشن بناؤں؟ صاحب کے لیے میں نے فرائیز رائس اور چکن بروسٹ تیار کیا ہے۔“

”میرے لیے کوئی سبزی بناؤ۔“ وہ اکتا کر بولی۔

”جی بہتر!“ وہ مودب انداز میں سر جھکا کر نکل گیا تھا۔

”کیا بات ہے ڈارلنگ! تم شاید کچھ اچھا نفل نہیں کر رہی ہو۔ تھک گئی ہو یا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“ سکندر علی دونوں ہاتھ سمیٹ کر اپنے

آگے میز پر لٹکاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

وہ چائے کا گھونٹ بھر رہی تھی۔ گھونٹ بھر کر اس نے کپ پرچ میں رکھ دیا اور خاموش بیٹھی رہی۔ سکندر علی کی بات کا جواب دینا اس نے زیادہ ضروری خیال نہ کیا تھا۔

”نہن!“ اس کے لہجے میں ہلکا سا تنکم در آیا۔ ”کیا بات ہے؟ بتاؤ مجھے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ کیا بات ہوئی ہے۔“ وہ تضحی سے بولی۔ ”بس میرے سر میں کچھ درد سا ہے۔“

”درد کی وجہ ہی جانا چاہتا ہوں۔ وہ کون سی بات ہے جو سوچ سوچ کر تم نے سر میں درد کر لیا ہے۔ یوں جہاں بھر سے بیزار اور ناراض دکھائی دے رہی ہو۔ اب تم نہن سکندر علی ہو۔ تمہیں خود اپنے رویوں کو چیک کرنا آنا چاہیے۔ وقت اور موقع محل کے حساب سے رویے تشکیل دینا سیکھو۔ تم کوئی معمولی عورت نہیں ہو۔“

”آپ مجھے معمولی عورت ہی سمجھیں تو اچھا نہ ہوگا؟“ اس نے طنز بھری التجا کی۔ ”مجھے غیر معمولی بننا نہیں آتا۔“

”تو سیکھو..... سیکھو نہن خاتون۔ تمہارا آؤٹ لک غیر معمولی ہے۔ یہی آؤٹ لک تمہیں یہاں تک لانے کا باعث ہے لیکن یہاں رہنے کے ضروری ہے کہ تمہارا اندر بھی غیر معمولی ہو۔ تمہیں ہر طرح سے اکسٹرا آؤٹ لک دینا ہے۔“

”کسے؟“ وہ حل بھن گئی۔

”ہر کسی کو۔ تم میری بیوی ہو..... میرا دست راست اور اچھی بیویاں اپنے شوہروں کی دست راست ہی ہوا کرتی ہیں۔ انہیں سپورٹ کرتی ہیں۔ ہر طرح سے ان کی سہیل کرتی ہیں۔ اس میں کیا برائی ہے؟“

”آپ مجھے بیوی بنا کر لائے تھے یا کامیابیوں کے آسان تک پہنچنے کی میزبانی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”اور اگر ایسا کچھ تھا تو آپ پر لازم تھا کہ مجھے ہر طرح کی کنڈیشنز سے آگاہ کر دیتے۔ میں نے آپ کو کچھ اور سمجھا تھا۔“

میر سکندر علی کے چہرے پر ایک مرتبہ بھردی سرد پر اسرار سمجھ میں نہ آنے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے وہی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے دیکھتا رہا۔

”ڈرائنگ! تم بہت فینس ہو رہی ہو۔“ وہ بے حد نرم لہجے میں بولا تھا۔ ”شاید تم ٹھیک طرح سے میری بات سمجھ نہیں پا رہی ہو۔ چلو ہم اوپر کمرے میں چلتے ہیں۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

نہن بے حد بیزار سے ست قدموں سے آگے بڑھتی تھی۔ کمرے میں آ کر میر سکندر علی نے اسے سی آن کیا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ نہن اپنی جگہ کھڑی لاطعلقی سے دیوار کو گھور رہی تھی۔

”نہن! ادھر آؤ ڈرائنگ۔“ وہ سا رسا لگنے لگا۔ ”ہم کچھ ضروری باتیں کریں گے۔ تم بے حد بدگمان ہو رہی ہو۔“

وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی اس تک پہنچتی تھی۔ وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

”یہاں میرے قریب آؤ۔“

”میں یہیں ٹھیک ہوں پلیز۔“

”دیکھو نہن!“ وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں گم ہوا تھا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ میری پہلی شادی کو پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ ان پندرہ برسوں میں میں نے دو شادیاں اور بھی کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔“

نہن اس بات پر بری طرح سے چوکی تھی۔ میر سکندر علی نے اس کے چوکنے کا کوئی نوٹس لیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

”دراصل نہن! ان پندرہ برسوں میں، میں مضطرب اور غیر مطمئن رہا تھا۔ ایک عورت کا جو خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ جس طرح کی عورت کا میں خواہش مند تھا وہ مجھے نمل لگی۔ ایسی عورت جو مکور کر ڈالنے کا فن جانتی ہو۔ مقابل کو ہوش و حواس کی پہلی نگاہ میں اپنی مضبوط گرفت میں

لے لے اور پھر اپنی مرضی سے آزاد کرے، ایسی عورت مجھے نمل کی۔ یہ میری اپنی خواہش تھی پھر یہ خواہش میری ضرورت بھی بنتی چلی گئی۔ دراصل یہ جو برنس ہوتا ہے نازنہ! اس میں بڑے داؤ پیچ ہوتے ہیں۔ شطرنج کا کھیل ہوتا ہے یہ۔ کب کہاں، کون سا مہرہ آگے بڑھانا ہے کب کہاں کسے شہ دینی ہے، یہ سب کچھ اس کھیل میں آنا ضروری ہے جسے یہ گیم نہیں آتا وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت کھوتا چلا جاتا ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک ساحر عورت کی قربت میری خواہش تو تھی ہی، یہ میری ضرورت بھی بن گئی۔ ایسی عورت جو میرے برنس کو بڑھانے میں بھی میرا ہاتھ بنا سکے۔ جو میرے بند تالوں کی چابی بنی بھی نہ سکے۔ جو صرف میرا بیڈروم شیئر نہ کرتی ہو۔ میری لائف کا ہر پارٹ شیئر کرے۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”میری تلاش ایک پیاس بنی چلی گئی۔ میری پہلی بیوی میرے خاندان کی ہے۔ وہ نہ میری پسندیدگی سے نہ محبت، نہ چوائس۔ وہ محض ایک مجبوری تھی۔ ایک رسم جسے ادا کرنا ضروری تھا اسی لیے ہمارا تعلق بھی بہت رسی سا ہے۔ میرے تین بچے ہیں میں ان سے ملنے وہاں جاتا ہوں تو اس سے بھی ملتا ہوں۔ کبھی اتفاق ہوا تو اس کو تمہیں ملوا بھی دوں گا۔ وہ بہت بے ضرر سی عورت ہے جو اپنی لمٹس بخوبی پہچانتی ہے۔ اس سے مل کر تم کبھی مجھ سے یہ شکایت نہ کرو گی کہ میں نے تم سے اپنی پہلی شادی کو خفیہ کیوں رکھا۔“

وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

”اس کے بعد میں نے دو شادیاں کیں۔ وہ دونوں بہت خوب صورت تھیں۔ میرے اشارے پر ہر کام کرنے پر تیار بھی رہتی تھیں لیکن ان دونوں میں ہی ایک بہت بڑی خامی تھی۔ وہ بالکل بے تاثر تھیں۔ مثنیٰ عورتیں، ان میں جذبات اور احساسات کی کمی تھی۔ ایسی عورتوں سے مرد کا جی بہت جلدی بھر جاتا ہے۔ وہ نہ مجھے زیادہ لہجہ نہیں نہ کسی اور کو ایک خوب صورت مجسمہ کسی کو کس قدر متاثر کر سکتا ہے؟ ہاں پھر مجھے تم ملیں۔ تمہیں دیکھ کر میں نے جانا کہ بس میری تلاش تمام ہوئی یہی ہے وہ ساحر عورت جو میرے ہر سوال کا جواب بن سکتی ہے۔ نازنہ! تم نہ صرف بے حد حسین ہو بلکہ تمہاری آنکھوں میں جو حسین گہرائی ہے۔ تمہاری آواز میں جو گداز ہے وہ کسی پتھر کے بت میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ تم تاثرات سے بھی مالا مال ہو۔ جانتی ہو نازنہ! صبح سے داؤدی کے تین فون آچکے ہیں اور یہ وہ شخص ہے جسے فون کر کر کے میں تھک گیا تھا۔ جو کبھی دستیاب ہی نہ ہوتا ہے۔ کیا یہ ایک بہت بڑی کامیابی نہیں؟ یہ تمہاری کامیابی ہے۔ میری کامیابی ہے، ہماری مشترکہ کامیابی ہے۔ ہم لائف پارٹنر ہیں۔ ہمیں ہر موقع پر ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیے۔ ہمیں ایک دوسرے کی پہچان ہونا چاہیے۔ اس داؤدی سے تمہاری ایک دو ملاقاتیں اور ہو گئی اور میرا برسوں کا انکا ہوا کام یوں چنگی بجاتے ہو جائے گا۔ بس اپنے برنس میں تمہارا اتنا شیئر بچتا ہوں۔ تو اس میں کیا برائی ہے؟ اگر کوئی برائی ہے تو مجھے بتاؤ! عورتیں تو چھوٹے سے چھوٹے سے لے کر بڑے سے بڑے پیمانے تک اپنے شوہروں کے ایسے کام کرتی ہی رہی ہیں تم اتنی چھوٹی سی بات کو لے کر بیٹھ گئی ہو۔ خود کو بیمار کر لیا ہے۔ کس قدر اسٹوپڈ سی بات ہے۔ خود کو نکھارو نازنہ! اپنی صلاحیتوں کا نقل مت کرو۔ اتنی چھوٹی ذہنیت کا مظاہرہ مت کرو۔ تم کیا بن سکتی ہو تمہیں خود کو علم نہیں ہے۔ سمجھ رہی ہو میری بات؟“

اس نے بس یونی ہر سلا دیا تھا۔

”ایک دو دن میں ایک پارٹی ارنج کر رہا ہوں۔ نو ڈاؤٹ کہ اس میں داؤدی بھی ہوگا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ یہ پارٹی ہوگی ہی اس کے لیے، تمہیں اس بندے کو ذلیل کرنا ہے۔“

نازنہ نے کات دار نظروں سے اس کی جانب دیکھا لیکن وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”زیادہ کچھ نہیں، بس چند پکٹی چیری باتیں کر کے میرے کام کا ذکر نکال لیتا۔ وہ تمہیں انکار کر دے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اور اس کے بدلے میں اگر اس نے مجھ سے کوئی فرمائش کی پھر،“ اس کا تلخ انداز ہو رہا تھا۔

میر سکندر علی مسکرا دیا۔

”جی تو کہہ رہا ہوں میں۔ حسین تو تم ہو ہی، ذہین بھی بن جاؤ تو دو آتشہ شراب کی مانند ہو جاؤ گی۔ کس بندے کو کس طرح ڈیل کرنا ہے۔ کسے کہاں تک لے کر جانا ہے، کتنی لفٹ کرانی ہے، یہ سب گر تھیں آنے چاہئیں دیکھنا چاہو تو دیکھنا نہ بن ہم کہاں سے کہاں جا پہنچیں گے۔“

اچانک ہی فون کی بیل نے ان دونوں کو چونکا دیا تھا۔ سکندر علی نے ریسیور اٹھایا تھا۔

”ہاں آفندی! سکندر بات کر رہا ہوں۔“

وہ فون پر مصروف ہو گیا۔ زینب خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل آئی تھی۔ سکندر علی کی ہر ہر بات کا مطلب اس نے بخوبی سمجھا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں اپنا حصہ اور اپنا کردار بخوبی سمجھ گئی تھی۔ وہ شطرنج کا کھلاڑی تھا اور اپنے لیے کام کے مہروں کا انتخاب کرتا رہتا تھا۔ بچے ہوئے مہرے وہ ایک طرف لڑھکا دیا کرتا تھا۔ رہا بیوی کا سوال تو اس کی خاندانی بیوی پندرہ سال سے اس کی رفین سفر تھی۔ تین بچے تھے۔ یہ خانہ پر تھا۔ یہاں کوئی کمی نہ تھا۔ کسی شطرنج کی بساط پر تھی جہاں فی الحال وہ میر سکندر علی کا وزیر تھی۔ اگر وہ بھی پٹ جاتی تو اسے بھی پہلے مہروں کی مانند ایک طرف کر دیا جاتا۔

وہ لان کی طرف اترتی میز چھوٹ پر آ بیٹھی۔

”تم نے لکھا تھا احسن کہ خدا مجھے وہ سب کچھ دے جو تمہاری ہمارا ہی میں مجھے نہ مل سکا۔ دیکھو، آج مجھے وہ سب کچھ مل رہا ہے وہ سب کچھ۔ تمہاری بد دعا پوری ہوئی۔“

ایک بار پھر اس کی ہتھیلیاں نم ہو گئی تھیں۔ ایک بار پھر دل دھڑکنے لگا تھا۔ احسن ایاز کا خیال رگ و پے میں سنساہٹ بن کر دوڑ رہا تھا۔



ایک بار پھر وہ تمام رات سو نہ سکی تھی۔ پہلے اس نے سیلنگ پلو کھانی چاہیں پھر خوفزدہ ہو کر اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ اس نشے کی عادی ہونا نہ چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں اس شیشی کو دیکھتے ہی رملی کا چہرہ گھومنے لگتا تھا۔

رملی کا سفید کفن میں لپٹا ہوا سیاہ چہرہ اس کے نیلے ہونٹ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی زہریلے ناگ نے ڈسا ہو اور رچ ہی تو تھا۔ اس کی موت زہریلے ناگ کے ڈسنے سے ہی واقع ہوئی تھی۔ زینب کو اپنی گردن کے گرد اسی رنگ کے پکنے، سیاہ و جود کا حلقہ محسوس ہوتا تھا۔ اسے رملی کی ہی عبرت ناک موت سے خوف آتا تھا۔

اس نے وہ شیشی کھڑکی سے باہر پھینک دی تھی۔ وہ اذیت ناک راتیں جاگ کر گزار سکتی تھی لیکن رملی کی ہی موت کا تصور بے حد بھیانک تھا۔

سویرے وہ جلدی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساری رات کروٹیں بدل بدل کر اس کی سرور دیکھنے لگی تھی۔ سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نہا کر نیچے چلی آئی۔ سکندر علی دیر ہوئی جا چکا تھا۔ وہ چائے کا کپ پیٹے ہوئے اپنا دن گزارنے کے متعلق سوچنے لگی۔ زندگی نے جو بھی رخ اختیار کیا تھا۔ اگر وہ رملی جیسی موت مرنا نہیں چاہتی تھی تو پھر اسے زندگی کو اس طرح سے جینا تھا۔

بے دلی سے اس نے تھوڑا بہت ناشتہ کیا اور ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ کر کمرے میں چلی آئی۔ تیار ہو کر اس نے اپنا پرس ہرے اور نیلے نوٹوں سے بھرا اور نیچے آگئی۔ وہ شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ کچھ خریدنے کے لیے اس کے ذہن میں کوئی پلان نہ تھا۔ نہ اسے یہ علم تھا کہ اسے کس شے کی ضرورت تھی۔ پھر بھی وہ اب خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔

کتنی ہی دیر وہ بے مقصد دکانوں پر پھرتی رہی لیکن کوئی ایک شے بھی خریدنے پر وہ خود کو آمادہ نہ کر سکی۔ اسے کیا چاہیے تھا؟ شادی سے قبل

اس نے سکندر علی کے ساتھ بے ٹکان شاپنگ کی تھی۔ اس کی الماریاں سنے ان چھوٹے کپڑوں سے اٹی پڑی تھیں۔ جبوری اس کے پاس ڈھیروں کے حساب سے تھی۔ کاسٹیکس کا ڈھیر بنا استعمال کیے ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں بھرا پڑا تھا۔ اسے کیا چاہیے تھا؟ وہ گھنٹہ بھر دکانوں میں پھرنے کے باوجود نہ جان سکی۔ اسے ہر شے نظروں سے اتری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ کسی چیز کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

شاپنگ مال کی میزھیاں اترتے ہوئے اس نے ایک بھکارن اور اس کے گرد جمع بچوں کے ڈھیر کو دیکھا جو روٹی کے ٹکڑوں پر جھگڑا کر رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ان کے پاس رکی تھی۔ اپنا پرس کھول کر اس نے مٹھی بھر نوٹ نکال کر اس بھکارن کی گود میں ڈال دیے۔

اس کا دل ڈرا سی خوشی، تھوڑی سی مسکراہٹ کے لیے ترس رہا تھا۔ وہ گاڑی کے قریب آ کر رکی تو ڈرائیور نے اس کے لیے احترام سے دروازہ کھولا۔ زینب بیٹھنا چاہتی تھی کہ یکا یک اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سانس بے ترتیب ہونے لگیں۔ ایک آدمی اس سے کافی فاصلے پر جا رہا تھا۔ اس کے پیر میں کچھ خرابی تھی۔ جو وہ اسٹک کے سہارے چل رہا تھا۔ پیچھے سے وہ بالکل احسن لگ رہا تھا۔

لحے بھر میں وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر اس کے پیچھے دوڑی تھی۔

”احسن..... احسن! رک جاؤ میری بات سنو!“

وہ اس کے پیچھے دوڑتی گئی۔ اس کا پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایک سینڈل پیر سے نکل گیا تب وہ اس کے قریب پہنچی۔

”احسن!“ وہ اس کا بازو دھام کر پھلتی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی تھی۔ پھر کرنٹ کھا کر وہ پیچھے ہٹی۔ وہ بلاشبہ کوئی اور تھا۔

”جی..... جی؟“ وہ حیرانی سے اس خوش لباس مگر مخبوط الحواس نظر آتی عورت کو دیکھنے لگا۔

”معاف..... معاف کیجئے گا۔“ وہ پیچھے مڑ گئی۔

اس نے رستے میں رک کر اپنا سینڈل پہنا۔ پرس اٹھایا، تب تک ڈرائیور گاڑی پارکنگ سے نکال کر لا چکا تھا۔ اس نے گاڑی زینب کے قریب لا کر کھڑی کی۔ اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ خود بھی بے حد حیران نظر آ رہا تھا لیکن کچھ بھی پوچھنے سے اس نے گریز کیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی تو اسے احساس ہوا۔ اس کے پیر میں کچھ چھب گیا تھا۔ ٹیس سی اٹھ رہی تھی اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ احساس بے بسی، احساس زباں بڑی شدت سے اس کے اندر گھر کر رہے تھے۔

”میڈم! کہاں چلوں؟“ ڈرائیور شاید بڑی دیر سے پوچھ رہا تھا۔

وہ چونک اٹھی کہاں؟ اب کہاں جائے؟ کہاں دوپٹے کورے؟ کہاں دل کا بوجھ ہلکا کرے؟ اس کے ذہن میں شہر کے سارے رستے بننے اور مڑنے لگے۔

”رملی بی بی کے گھر چلو۔“ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ہیرے کے آنسو

ہیرے کے آنسو ایک نوجوان کی کہانی ہے، جس کے ساتھ اس کے اپنوں نے ہی ظلم کیا تھا۔ ایک دن اچانک اس کی زندگی میں ایک موڑ آ گیا۔ ایک شخص نے اس کے والد کی کوسلی کی کانوں کو قیمتی قرار دیتے ہوئے ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ وہاں ہیرے موجود ہیں۔ جھوٹ فریب لالچ اور دھوکہ دہی کے تانے بانے سے نئی جرم و سزا کے موضوع پر ایک دلچسپ کہانی۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرساں ندیم اختر کا کارنامہ۔ **ہیرے کے آنسو** کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

”رملی بی بی؟“ ڈرائیور کو اچھبا ہوا تھا۔ ”لیکن میڈم۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن زنب نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں جانتی ہوں۔ سب علم ہے مجھے۔ تم وہیں لے چلو!“

”بہتر!“

گاڑی ان ہی رستوں پر دوڑنے لگی۔ زنب نے آنکھیں بند کر کے اپنا سریٹ کی پشت سے نکادی۔ اس کے ذہن میں اپنا اور رملی کا گھر گھومنے لگا تھا۔ وہاں کی یادیں بگولوں کی مانند اس کے وجود سے صحرائے نکرانے لگیں۔

”زینو، زینو۔“ ایک مانوس لب و لہجہ کانوں میں رس گھولنے لگا۔ ”کیا کر رہی ہو یار۔“

”زین! اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں کتنا بور ہو رہی تھی۔“ رملی کی چپکتی ہوئی آواز آئی۔

”جینو بی بی، کتنا اچھا لگتا ہے یہ نام تم پر۔ آج سے میں بھی تمہیں جینو کہوں گا۔“

گاڑی رکی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے احساس ہوا۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیکے ہوئے تھے۔ اس نے پرس نکال کر گالوں پر پھیرا اور گاڑی سے اتر آئی۔

”میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ ڈرائیور سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔

اسے علم تھا کہ ان گھروں میں اب کون بستا تھا؟ بستا بھی تھا یا وہ اب تک خالی اور دیران تھے؟ وہ تو بس ان درود یوار کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش من میں لیے وہاں چلی آئی تھی۔ دروازے پر رک کر اس نے کال بیل کا بٹن پش کیا۔ چند لمحوں میں ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک نوجوان، خوش شکل لڑکی نے سر باہر نکالا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔

”جی؟“ وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں؟“ وہ ایک لمحہ کے لیے جھمکی۔ ”میں اندر آ سکتی ہوں؟“

”جی ضرور!“ وہ ایک طرف کو ہٹ گئی۔ ”تشریف لائیں۔“

زنب اندر داخل ہوئی تو اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پورے گھر میں پھرنے لگی۔

اس کا کمرہ، لاؤنج، کچن کوئی بھی جگہ نگاہوں کو مانوس نہیں لگتی تھی۔ ان لوگوں نے بہت تخیل انداز میں گھریٹ کیا تھا۔ یہ وہ گھر نہیں تھا جس کی تلاش میں وہ چلی آئی تھی۔ وہ گھر اب دنیا کے نقشے پر کہیں بھی نہیں تھا۔ نہ کبھی اب اپنے گھر کا دوبارہ وجود میں آنا ممکن تھا۔ وہ دریا میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھ کر سسکنے لگی۔ کوئی اس کے اندر زور زور سے ہنسنے لگا تھا۔

”رورہ! ہو زنب شاہ؟ اب روتی ہو؟ اپنی آنکھوں کو خشک کر لو۔ تمہیں اب رونے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہارا مقدر رورہ ہے۔“

وہ لڑکی بے حد پریشانی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ لپک کر گئی اور اسکو آتش سے بھرا جگ اور گلاس لے آئی۔

”آپ..... آپ..... یہ پی لیں۔ طبیعت سنہبل جائے گی۔“

زنب نے ایک نگاہ اس کی مہربان، نرم نقوش سے جی صورت پر ڈالی۔ پھر اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ گھونٹ گھونٹ کر کے وہ ٹھنڈا شربت اپنے اندر اتارنے لگی۔ طبیعت واقع سنہلنے لگی تھی۔

”آپ کو کسی کی تلاش ہے کیا؟“ وہ لڑکی متحس نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”تلاش؟“ وہ بڑبڑائی۔ ”میں سایوں کا پیچھا کر رہی ہوں اس تلاش کو کیا نام دوں۔“ پھر اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ سادہ سے لباس

میں بھی اس کی شگفتگی بہت نمایاں تھی۔ بنا کسی میک اپ کے سادہ سے چہرے میں ایک خاص جاذبیت تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے تاب خفا چمک تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”فائزہ!“ وہ مسکرائی۔

”اور ہاں کون کون رہتا ہے؟“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”میں اور میرے شوہر!“ اس کے لبوں پر مدہم مسکان ناچنے لگی۔ ”ہماری شادی کو ابھی سال بھر ہوا ہے تو ان کا ٹرانسفر یہاں ہو گیا۔ پہلے ہم ان کی خالہ کے گھر تھے۔ ابھی مہینہ بھر پہلے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔“

”اکیلی ہوتی ہو سارا دن؟“ وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگی۔

”جی لیکن کاموں میں مصروف رہتی ہوں۔ دن گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ شام کو وہ آ جاتے ہیں۔“ اس کے لبوں پر پھر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”پھر ہم گھومنے نکل جاتے ہیں۔“

زینب کے دل سے ایک آہ نکلی۔ اس کے پورے جسم میں درد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہی جنت تھی جہاں کبھی وہ آباد تھی اس نے اپنی جنت کو اپنے ہاتھوں آگ لگا کر تھپی۔

”تم، تم لڑتی تو نہیں ہوا پنے شوہر سے؟“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

”جی؟“ وہ لمحہ بھر کو حیران ہوئی۔ ”نہیں تو، ہماری تو کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔“

زینب کا جی چاہا وہ اپنا سب کچھ دے کر بھی اس خوش قسمت لڑکی سے اپنی قسمت بدل لے۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑے، اس کے پیردوں پر اپنا سر رکھ دے، اس کا دامن تھام کر التجا کرے کہ خدا کا واسطہ مجھ سے اپنا نصیب بدل لو۔

اس کے آنسو ایک مرتبہ پھر اس کے گالوں پر رواں ہو گئے۔

”آپ بہت دکھی لگتی ہیں۔“ فائزہ تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔ ”اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ یہاں آپ کے کوئی ریلیو رہتے تھے۔“

آپ کی کس تلاش میں یہاں آئی ہیں؟ اس گھر سے کیا تعلق ہے آپ کا؟“

نرم لہجے میں اس نے بے شمار باتیں پوچھ ڈالیں۔ وہ بڑی زندہ دل سی، چپکے والی لڑکی لگتی تھی۔

”میرا کسی شخص سے، کسی گھر سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ غلاؤں میں ٹکھنے لگی۔ ”مجھ سا بد نصیب اس پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”تجربہ؟“ وہ اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی صحیح الدماغی پر اسے شک ہو۔

”کیوں؟ اس میں تجب کی کیا بات ہے؟“ وہ دکھ سے مسکرائی۔

”آپ تو..... آپ تو بہت خوش قسمت لگتی ہیں۔ اتنی خوبصورت ہیں آپ، اس قدر رویل ڈریسڈ۔ باہر آپ کی شاندار گاڑی کھڑی ہے۔“

میں تو آپ کو دیکھتے ہی مرعوب ہو گئی تھی اور آپ خود کو بد نصیب کہہ رہی ہیں۔“

”آئندہ کبھی کسی سے مرعوب مت ہونا۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑی ہو گئی۔ ”نہ کبھی کسی پر رشک کرنا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ تم

دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہو۔“

وہ باہر نکل آئی تھی۔ وہ رملی کے گھر بھی جانا چاہتی تھی لیکن اب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اب وہ گھر رملی کا نہیں تھا۔ وہاں سے وہ

یونہی خالی ہاتھ لوٹی جیسے اس گھر سے لوٹی تھی۔ کسی پرانی یاد کی برابر مہک لیے بغیر!



سکندر علی دودن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے زینب کو فون پر بتا دیا تھا کہ وہ بے حد مصروف ہے۔ اسے یوں بھی اب اس کا انتظار نہیں تھا۔

رملی کی موت سے اس کے اندر بھی ایک موت واقع ہوئی تھی۔ اس کی تمام اسگوں، خواہشوں اور جذبوں کی موت۔ وہ اپنا خالی دل لیے ادھر سے ادھر پھرتی رہتی۔ اس شام وہ لان میں بیٹھی بے دلی سے چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی جب چوکیدار نے گیٹ وا کر کے کسی گاڑی کو اندر آنے کا رستہ دیا۔

ایک چمکتی ہوئی، بڑی سی گاڑی پورٹیکو میں رکی تھی۔ بارڈر ڈرائیور نے اتر کر دروازے کھولے۔ زینب بڑی توجہ سے اس طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک عورت اور دو لڑکیوں کو اترتے ہوئے دیکھا۔ وہ ملازم سے شاید اسی کی بابت دریافت کر رہی تھیں۔

وہ کچھ پریشانی کے سے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ لوگ ملازم کی معیت میں اسی کی طرف آ رہی تھیں۔

”میڈم یہ.....“ ملازم نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

اس عورت نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”تم جاؤ۔ ہم اپنا تعارف کرالیں گے۔“

”جی بہتر بیگم صاحبہ!“ وہ پلٹ گیا۔

زینب جیرانی سے ان تینوں کو دیکھنے لگی۔ وہ تقریباً چالیس برس کی ایک فربہ اندام عورت تھی۔ اس نے ایک بیش قیمت ساڑھی زینب تن کی ہوئی تھی۔ گردن میں موٹی سی چین اور کانوں میں جڑاؤ بندے تھے۔ ہاتھوں کی سب انگلیاں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیوں سے مزین تھیں۔

دونوں لڑکیوں نے مغربی انداز کے لباس زینب تن کیے ہوئے تھے۔ ان کے کلمے ہوئے بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ چھوٹی لڑکی ہو بہو سکندر علی کی کاپی تھی۔

”بیٹھے!“ اس نے کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”پہچان گئی ہو؟“ وہ عورت تسخر سے مسکرائی تھی۔

”جی۔“ وہ رسانیٹ سے بولی۔

”ہم نے سوچا کہ اسے دیکھ آئیں جس کے چہرے ساری دنیا میں ہیں۔“ وہ کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولی۔ ”لڑکیوں کو بھی بڑا شوق تھا تمہیں دیکھنے کا۔ وہاں حویلی میں جو بھی آتا ہے تمہارے حسن کے قصیدے پڑھتا ہے۔ ہاں، ٹھیک ہے حسین ہو۔“

اس نے زینب کو نظروں ہی نظروں میں تول کر گویا حسین ہونے کی سند دی تھی۔

”لیکن تم نے سنا ہو گا حسن چارڈنوں کا ساتھی ہے۔“ وہ پھر تسخر سے مسکرائی۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟“ اس کی پریشانی پر ٹھکنیں ابھریں۔

”سمجھ جاؤ گی، سمجھ جاؤ گی۔ چارڈن گزریں گے تو سب سمجھ جاؤ گی۔ خیر، مجھے شرمہ کہتے ہیں۔ میں میر سکندر علی کی جائز، قانونی، خاندانی بیوی ہوں۔ اس کے اصل گھر کی اصل مالکین۔ یہ میری بڑی بیٹی ہے رانیہ اور یہ چھوٹی سونیا۔ ایک بیٹا بھی ہے حیدر علی خان، وہ ہاسٹل میں رہتا ہے۔“

اس کا لہجہ، اسکی آواز، اس کا لفظ لفظ نحوٹ سے بھرا ہوا تھا۔ زینب اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

وہ گہرے سانولے رنگ اور بھدے نقش کی مالک تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کا غور تھا۔

”تم سے پہلے بھی سکندر روڈ یادیاں کر چکا ہے۔“ اس نے اپنی دانست میں گویا اسے نئی اطلاع دی تھی۔

”جی میں جانتی ہوں۔“ وہ سکون سے بولی۔

”مجھے اس بات سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔“ وہ پھر مسکرائی تھی۔ ”مردوں کو ادھر ادھر منہ مارتے رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ دو چار دن میں دل بھرتا ہے تو پھر اپنے ٹھکانے پر آ جاتے ہیں۔ خیر، دیکھتے ہیں یہ نیا شغل کتنے دن جاری رہتا ہے۔“

زینب خاموشی سے بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ اسے نہ تو اس کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا نہ ان لوگوں سے کسی قسم کی جلیسی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بالکل خالی دماغ لیے بیٹھی تھی۔

”اپنے بچوں کا وہ دیوانہ ہے۔ سونیا میں تو سمجھو، اس کی جان ہے۔ میں ان بچوں کی ماں ہوں۔ تم سمجھ سکتی ہو گی کہ میرا اس کی زندگی میں کیا مقام ہے۔ یہ تو بس وہ حسن کاریا ہے اس لیے کبھی کبھار.....“

”حسن کاریا ہو کر بھی اس نے آپ سے شادی کی؟“ وہ بڑے پرسکون انداز میں بولی تھی۔

شمسہ بیگم کا چہرہ لمحوں میں سیاہ ہو گیا۔

”مجھ سے شادی اس نے اپنی خواہش سے کی۔ یہ دولت، جس کی چمک دکھا کر وہ تم جیسی عورتوں کو حاصل کرتا ہے یہ ساری دولت میری ہے۔ روپیہ پیسہ میرا ہے۔ میں اپنے ساتھ اپنے بابا کی ڈھیر دن چاندی ادا لے کر آئی تھی جس کے بل بوتے پر آج وہ نہ صرف خود عیش کر رہا ہے بلکہ تم جیسیوں کو بھی کر دار رہا ہے۔“

”چھوڑیں ناں می بس اب چلتے ہیں۔“ رانیہ اکتا کر بولی تھی۔

”اپنے حسن پر بہت ناز ہے تمہیں۔“ شمسہ بیگم پھر چکی تھیں۔ ”ذرا ایک بچہ تو پیدا کر کے دکھاؤ تو میں جانوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنی اولاد دودھ دینے کی عورتوں کی کوکھ سے پیدا نہیں کروائے گا۔“ نذیب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”آپ لوگ جاسکتی ہیں۔“ وہ پھر بھی خود پر قابو پا کر سکون سے بولی۔

”ہا ہا ہا!“ شمسہ بیگم سٹرخانہ بنی خنسی دیں۔ ”چاردن کی چاندنی کچھ دن بعد ہم پھر اسی گھر میں کسی اور حسین چہرے کو دیکھنے آئیں گے۔ وہ بھی شاید یہی کہے، کر عیش بی بی! جتنے کر سکتی ہو۔ چلوڑو!“

وہ تینوں کھڑی ہو کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئیں۔ باوردی ڈرائیور نے دروازے وا کیے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور گاڑی برق رفتاری سے باہر نکل گئی۔

نذیب اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی اس طرف دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں شمسہ بیگم کے الفاظ کے پتھر برس رہے تھے۔



میر سکندر علی چاردن بعد آیا تھا۔ اس نے نذیب سے بے تحاشا معذرت کی۔ اپنی مصروفیت کی وجوہات بتائیں۔ اسے بہت مس کرنے کا اظہار کیا۔ وہ پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔

”چلو، آج کا سارا دن تمہارے نام۔“ وہ اس کے شانوں پر ہلکا سا باؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ہم پورا دن ساتھ گزاریں گے۔ شام کو فریٹس ہو کر گھومنے چلیں گے۔ تم اپنے لیے جو چاہو خریدنا۔ پھر ہم تمہاری پسندیدہ جگہ سے ڈنچہ بھی کریں گے ٹھیک ہے؟“

اس نے دھیرے سے اس کے رخسار کو چھوا۔ اس نے محض اثبات میں سر ہلادیا۔

”میں جانتا ہوں ڈرائنگ تم خفا ہو۔“ وہ اس کو ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ”پورا دن اکیلی رہ کر تم پور تو ہوتی ہو گی۔ تمہارا سر کل بھی تو اتالی بیٹڈ ہے۔ نہ ہونے کے برابر۔ خیر تم فکرت کرو۔ میں نے اس کا بھی حل سوچا ہے۔ میں تمہارے لیے ایک بوتیک خرید رہا ہوں۔“

”میرے لیے؟“ اس نے قدر سے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ہاں تمہارے لیے۔ تمہاری اس بے زاری سستی اور بوریٹ کا علاج۔ تم اسے چلاؤ گی۔ اس سے تمہارا ذہن بھی شارپ ہوگا۔ بزنس کے اسرار و رموز تمہاری سمجھ میں آنے لگیں گے۔“

وہ بے حد خوش نظر آتا تھا۔ نذیب بھی خاموش ہو کر اس کی تجویز پر غور کرنے لگی۔ یقیناً وہ خود کو مصروف رکھ کر اذیت ناک سوچوں سے بچ سکتی تھی۔

”اچھا خاصا چل ہوا بزنس ہے۔ تمہیں زیادہ کام نہیں ہوگا۔ بس لک آفر کرتا۔ کوئی پرابلم ہو تو میں شیر کر دوں گا۔ کیسا آئیڈیا ہے؟“

”ہوں ٹھیک ہے۔“ اس نے پرسوج انداز میں سر ہلایا۔

کمرے میں داخل ہو کر سکندر علی نے اے سی آن کیا پھر کھڑے کھڑے اپنا سگارسلاگ لگا۔

”ہاں، ایک بات میں بتانا بھول رہا ہوں۔“

نہنہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کے بہت عام سے لہجے میں کوئی خاص بات چھپی تھی۔

”کل یہاں، اپنے گھر میں پارٹی ہے۔ سارا انتظام مکمل ہے۔ ہم آج تمہارے لیے کوئی بہترین سالباں بھی خریدیں گے۔ تمہیں جان محفل نظر آتا ہے۔“

نہنہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ تو اس کی خوشی کا اصل سبب یہ تھا!

”داؤدی تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ تمہیں اس کو خاص طریقے سے ڈیل کرنا ہے۔ ہمارا کام چنگیوں میں ہو جائے گا۔“

وہ اپنے سگار کی جانب متوجہ تھا۔

”ہاں ہاں کہو!“ وہ پوری طرح متوجہ ہوا۔ ”میں تو خود چاہتا ہوں۔ تم کچھ کہو، کوئی فرمائش کرو۔“

”مجھے اولاد چاہیے!“

”کیا؟“ وہ آنکھوں کو بالکل سیکڑ کر نہایت حیرانی سے بولا تھا۔ ”یہ کیا کہا تم نے؟“

”کیا یہ بہت انوکھی ہزالی بات ہے؟“ وہ ابرو چڑھا کر پوچھنے لگی۔ ”آپ کی جائز قانونی بیوی ہوں۔ اولاد کی تناسیر احق ہے۔“

”دیکھو ڈرائنگ!“ وہ بیٹھے لہجے میں بولا۔ ”ابھی یہ تناسی پنڈنگ میں رہنے دو۔ ابھی ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔“

”کام تو ہوتے رہیں گے۔ ساری عمر پڑی ہے!“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن میں بچہ چاہتی ہوں۔ کمال ہے، میرے لیے مصروفیت

کی تلاش میں آپ بونیک تو کھول سکتے ہیں۔ مجھے میرا جائز حق نہیں دے سکتے۔ میرے لیے ایک بچہ ہی سب سے بڑی مصروفیت ہوگا!“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اس مسئلے پر بھی کریں گے بات!“ وہ اسے بہلانے لگا۔ ”فی الحال تو ہم کچھ اور پلان کر رہے تھے۔“

”میں جانتی ہوں، آپ کے تین بچے ہیں۔ آپ کو مزید کی تناسی نہیں لیکن سکندر! یہ آپ سے میری پہلی اور آخری فرمائش ہے۔ بلکہ تقاضا

ہے۔ آپ کو میری بات ماننی ہوگی!“

سکندر علی گہری سانس بھر کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ اٹل فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔

”دیکھو ڈرائنگ۔“ وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”میں انکار نہیں کر رہا ہوں۔ تم شوق سے بچے پیدا کرنا لیکن فی الحال فوری طور

پر ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تمہارے لیے بچا نہیں ہے۔ ابھی اہم ہے تمہارا حسن تمہارا لگہر، تمہاری فٹنس۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہیں بہت سے

کاموں میں میرا ساتھ دینا ہے۔ چند سال صبر کر لو پھر بچے پیدا کرتی رہنا۔“

آخر میں اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ در آئی تھی۔

”نجانے یہ فضول خیال کس نے تمہارے ذہن میں ڈال دیا ہے۔ بہر حال، کم ٹودی پوائنٹ! میں تمہیں داؤدی کے متعلق بتا رہا تھا اسے

کس طرح سے ٹریپ کرنا ہے۔ اسکی کس کس کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ سب ذہن نشین کر لو.....“

وہ اسے مزید ہدایات دینے لگا لیکن نہنہ کا دھیان اس کی جانب نہ تھا۔ اسے ایک بھیانک رات یاد آ رہی تھی جب اس نے درد کی ٹیسوں

سے لڑتے لڑتے خود اپنے بچے کا خون کر دیا تھا۔ اسے اسپتال کا کمرہ اور احسان ایاز کی کبھی ہوئی آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ اسے وہ کھلونے یاد آ رہے تھے

جو وہ بہت چاؤ سے اپنے ہونے والے بچے کے لیے لایا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ بھرا پئی کیفیت غیر ہوتی محسوس کی۔ اس مرتبہ وہ اس کیفیت کا مقابلہ نہ کر سکی تھی۔ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر وہ بستر پر گر پڑی۔

”زینب! واٹ ہسپتال؟“ سکندر علی چونک کر اس کی طرف بڑھا تھا۔



دعوت بے حد شاندار طریقے پر منتظم کی گئی تھی۔ پوری کوشش بقیہ نور بنی ہوئی تھی۔ انتظام دونوں لانوں میں کیا گیا تھا۔

زمین کو تیار کرنے کے لیے بیوٹیشن دو پہر سے ہی آگئی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک اس کی ایک ایک چیز کو دلہن کی طرح نکھارا تھا۔

اس کا لباس شہر کے مہنگے ترین بونیک سے خریدا گیا تھا۔ مکمل طور پر سفید لباس کے ساتھ سچے موتیوں کی جیولری تھی۔ زہنب نے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا۔

نہیں بے تاثر نظروں کے ساتھ ایسے عکس کو گھورتی رہی۔ وہ جب بھی آنیہ دیکھتی تھی، اسے رملی کی باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ اس نے کہا

تھا۔

”بہت حسین لگ رہی ہو زنب شاہ! بہت حسین۔ لیکن جانتی ہو مجھے تم دنیا کی سب سے بد صورت عورت نظر آ رہی ہو۔ یہ لباس، یہ زیورات، یہ خوشبوئیں جن کا استعمال تم نے مجھے متاثر کرنے کے لیے کیا ہے، ان چیزوں سے عرصہ ہوا میں نے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے۔ تم مجھے متاثر کرتی تھیں کم قیمت لباس میں، بکھرے بکھرے بالوں میں، تمہارے ہاتھ میں پڑی سونے کی وہ چار چوڑیاں جو تمہارا سرمایہ تھیں، انہیں میں بہت عقیدت سے دیکھتی تھی۔“

اس نے کہا تھا۔

”تم اتنی بے قیمت اور بے مایہ ہو چکی ہو زینب! کہ مجھے نفرت کے ساتھ ساتھ تم پر ترس بھی آتا ہے۔“

اس نے واقعی ٹھیک کہا تھا! بیش قیمت لباس اور نہایت مہنگے زیورات پہن کر بھی وہ اس وقت خود کو اس قدر کم قیمت اور بے مایہ تصور کر رہی

تھی کہ اسے اپنے آپ پر ترس آرہا تھا۔

”میں کیوں بچی ہوں؟ کس کے لیے سنوری ہوں؟ میں عورت ہوں یا طوائف ہوں۔ میرا سکندر علی! تم نے مجھے ایک سچا ہوا کوٹھا دکھا کر خرید

“لَا

ہاہا..... ہاہا کوئی اس کے اندر قہقہے لگا رہا تھا۔

دعوت کافی دیر سے شروع ہوئی تھی۔ رات بھینگنے لگی تھی۔ وہ پتھر کے بت کی مانند بے تاثر چہرہ لیے میر سکندر علی کے دوستوں سے ملتی پھر رہی

مختص۔

”نہیں! ڈارلنگ کہاں ہوتی؟“ سکندر علی، داؤدی کو لیے اس کے قریب چلا آیا۔ ”یہ اپنے داؤدی صاحب آئے ہیں۔ ان کا خیال رکھو!“

داؤدی صاحب نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے بلا جھجک اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ انہوں نے جھک کر اس کا گال چھوا۔ وہ مسکراتی

رہی۔

میر سکندر علی کچھ دیر بعد ہی انہیں چھوڑ کر کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ وہ انہیں مصنوعی پتھروں سے بنائی گئی آبشار کی طرف لے آئی۔ چھوٹے

سے خوب صورت تالاب میں بطخیں ساخت بیٹھی تھیں۔ وہ ادھر بیڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”سکندر بڑا لکی آدمی ہے!“ داؤدی صاحب حریص نگاہوں سے اس کا حائرہ لیتے ہوئے بولے۔ ”جب مارتا ہے اونچا ہاتھ مارتا ہے۔“

”یہ لیجئے!“ اس نے قریب سے گزرتے دیکر روک کر شراب سے بھرا گلاس اٹھا کر انہیں تنہایا۔
 ”ہوں تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟“

”میں سر راہ رہا تھا، آپ کی اس بے مثال خوب صورتی کو۔“ انہوں نے گھونٹ بھر کر شراب کا سرور اپنے اندر اتارتا ہوا محسوس کیا۔ ”ایسا حسن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ زینب! تمہاری نظروں میں ایک عجیب سی گہرائی ہے۔ ایک نشہ ہے۔۔۔۔۔ سکندر بہت کی ہے۔ کیا شاندار دن رات گزرتے ہوں گے۔“

انہوں نے جیسے آہ بھری تھی۔ وہ مسکراتی رہی۔

”سکندر تو بہت مصروف رہتے ہیں۔ میں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔“

”اچھا!“ انہوں نے آنکھیں پھیلائیں۔ ”کل رات کیا کر رہی ہو؟“

”فارغ ہوں بالکل۔ کوئی پروگرام؟“ وہ دل ربائی سے مسکراتی تھی۔

”چاہو تو ڈنر میرے ساتھ کرو۔“

”شیور۔ مائی پلیور!“ وہ ہولے سے ہنس دی۔

داؤدی صاحب قریب المرگ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ انہیں اصل موضوع کی جانب لے آئی تھی۔

”ہمارا ایک کام کب سے آپ کی توجہ کا منتظر ہے سر!“ وہ بولی تھی۔ ”ہمیں شکایت ہے آپ سے۔ آپ ہمیں قابل توجہ نہیں جانتے!“

”اوہ کیا کہہ رہی ہو ڈیر!“ انہوں نے مصنوعی انداز میں سر کھچایا۔ ”شاید تم سکندر کے کام کی بات کر رہی ہو۔ بہر حال! تمہارا کہا ٹالا نہیں جا

سکتا۔ کام ہو جائے گا!“

”کب تک۔“ وہ ناز سے انہیں دیکھنے لگی۔

”جس قدر جلد ہو سکا۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ بہر حال اس طرف سے بے فکر رہو۔ میں نے کہہ دیا ہے تو سمجھو کام ہو گیا! یہ سکندر بڑا

شارپ بندہ ہے۔“ وہ ہنسنے لگے تھے۔ زینب نے ایک بار پھر بھرا ہوا گلاس انہیں تنہایا تھا۔



”ویل ڈن مائی ڈارلنگ ویل ڈن!“ وہ بے تحاشا خوش تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی ہوئی زینب کے گرد اپنے بازو حائل کرتے ہوئے

بولا۔

زینب نے آہستگی سے اس کے ہاتھ خود سے علیحدہ کیے۔ وہ اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی۔

”کمال کر دیا۔ یہ داؤدی بڑی اونچی چیز ہے۔ اسے شیشے میں اتارنا اس قدر آسان نہیں ہے۔ لیکن تم نے تو منٹوں میں اسے زیر کر لیا۔

میں کہتا ہوں نا۔ تم کوئی معمولی عورت نہیں ہو۔ خود کو پہچانو!“

زینب نے چہرہ صاف کیا پھر اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

وہ کافی دیر کے بعد باہر نکلی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ اب تک جاگ رہا تھا۔ اس کا منتظر تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے سیلیے بال سلجھانے لگی۔

”کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟“

”نہیں۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

”جلدی آ جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں!“

”لیکن میں سونا چاہتی ہوں۔ مجھے سخت نیند آرہی ہے!“ وہ قطعی لہجے میں کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔



وہ ایک بار پھر پرس نوٹوں سے بھر کر شاپنگ کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ اس نے بلائکان شاپنگ کی ہر، ہر دکان سے ہزاروں کی خریداری کی، کپڑے، جوتے، میک اپ کی اشیاء، جیلری وہ ہر سامنے آنے والی شے خریدتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ اس کا پرس بالکل خالی ہو گیا۔ ڈرائیور اس کا سامان گاڑی میں رکھ رہا تھا جب کسی نے اس کا کندھا تھاما۔

”نہب! نہب شاہ!“

نہب مانوس لب و لہجے پر چونک کر مڑی تھی۔ چند لمحوں کے لیے اسے سامنے کھڑی ہستی کو پہچانے میں دشواری محسوس ہوئی پھر وہ چیخ اٹھی۔

”فارحہ! تم فارحہ ہونا!“

وہ دونوں بغل گیر ہو گئیں۔

”تم کتنا بدل گئی ہو نہب؟“ وہ علیحدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہیں پہچانا ہی نہیں تھا۔ پتا ہے، میں کتنی دیر سے یہی سوچ رہی تھی کہ تمہیں میں نے کہاں دیکھا ہے! تم تو یا کوئی شے بن گئی ہو۔“

وہ نہب کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”اور تم؟“ اس نے بغور فارحہ کو دیکھا۔ ”تمہیں کیا ہوا؟“

وہ اپنی عمر سے دس سال بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا جسم بے حد فریبہ ہو گیا تھا اور رنگت بالکل مدہم پڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے۔ بالوں کا اسٹائل بھی اس نے بدل ڈالا تھا۔

فارحہ شرمندگی سے ہنس دی۔

”کیا پوچھتی ہو یار، یہ باتیں سنانے کے لیے تو عمر درکار ہے۔“

”چلو میرے ساتھ!“ نہب نے اسے پیش کش کی۔ ”بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

”لیکن۔“ وہ تذبذب کا شکار ہوئی۔

”گھر فون کر دینا! چلو فارحہ۔“

اسے واقعی ایک عرصہ کے بعد خوشی کی ہلکی سی رفق کا احساس ہوا تھا۔

”اچھا چلو!“ وہ واقعی تیار ہو گئی۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

”گھر چلو ڈرائیور۔“ نہب نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

”تمہارا لائف اسٹائل تو بالکل بدل گیا ہے نہب۔“ فارحہ حیران نظر آتی تھی۔ ”بڑی ترقی کی ہے احسن بھائی نے۔ تمہاری اپنی گاڑی ہے

یہ؟“

”ہاں!“ ایک گہری سانس اس کے لبوں سے نکلی تھی۔

”قسمت کی بات ہے۔“ فارحہ نے بھی گہری سانس بھری تھی۔ ”کس قدر بے وقوف تھی میں اور کتنے بیوقوفانہ تھے میرے خیالات۔“

گاڑی جب نہب کی کٹھی کے پور ٹیکو میں جا کر رکی تو فارحہ کی حیرانی قابل دید تھی۔ آنکھیں پھیل گئیں وہ ہر ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ نہب کے بیڈروم تک آتے آتے اس کا مبر جواب دے گیا۔

”خدا کے لیے نہب مجھے مزید حیران مت کرو۔ مجھے بتاؤ ”کیا کوئی الدین کا چراغ تمہارے ہاتھ آگیا ہے؟“
نہب تلخی سے مسکرائی تھی۔

”نہیں..... الدین کا چراغ میرے ہاتھ نہیں آیا۔ میں خود ایک جن کی قید میں آگئی ہوں۔ وہ مجھے میری جنت سے نکال کر کوہ قاف میں لے آیا ہے!“

فارحہ پکلیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں احسن ایاز کی بیوی نہیں ہوں فارحہ!“ اس کے حلق میں گولے پھنسنے لگے تھے۔ ”میں میر سکندر علی کی دانتہ ہوں۔“
وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”تم شاید مجھ پر رشک کر رہی تھیں۔ مجھ پر رشک مت کر فارحہ! میں تو نشانِ عبرت ہوں۔“

فارحہ ساکت بیٹھی، بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان اسے اپنی داستان سناتی رہی۔

”وہ مجھے چھوڑ کر گیا تو مجھے احساس ہوا، وہ میرے لیے کیا تھا۔ میں وہ بد نصیب ہوں فارحہ! جو محبوب کے جدا ہونے کے بعد اس کی محبت میں مبتلا ہوئی ہوں۔ شاید یہ میری سزا ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے میری سزا ہے کہ میں ہرگز رتنے لمحے کے ساتھ اس کے عشق میں مبتلا ہوتی چلی جا رہی ہوں۔ میں ہر محفل میں دیوانوں کی طرح اسے تلاشتی ہوں، سڑک پر گزرتے ہر شخص پر مجھے اس کا گمان ہوتا ہے۔“
وہ اپنا سر پینٹنے لگی۔

”میں کیا کروں، میں کیا کروں۔ وہ مجھے کیوں چھوڑ گیا فارحہ؟ وہ تو مجھ سے اندھی محبت کرتا تھا۔ میں تو اس کی سانسو کی ضمانت تھی۔ میرے بنا وہ کیسے جیتا ہوگا؟ کیسے؟“

فارحہ نے اس کا سراپے کا ندھے سے لگا لیا۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔

”اُف“ میں نے اس سے خود کہا کہ وہ مجھے طلاق دے دے فارحہ! میں نے اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مجھے آزاد کر دے۔ سوچو فارحہ! میں نے خود کہا۔ اس کے دل پر کیا جیتی ہوگی؟ وہ کہاں گیا ہوگا؟“

وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی۔ اتنے عرصے کے بعد اس کو کھٹار سس کا موقع ملا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے غم سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ پتھر میں سے یکا یک ٹھٹھیں مارتا پانی نکل آیا تھا۔

بہت دیر کے بعد وہ خود پر قابو پا سکی تھی۔

”کچھ دیر آرام کر لو۔“ فارحہ نے اسے مشورہ دیا۔

”نہیں میری قسمت میں اب آرام یا سکون کے لمحے نہیں ہیں۔“ پھر اس نے فارحہ کی جانب دیکھا۔

”تم اپنی سزاؤں تم کب پاکستان لوٹیں۔ کسی گزر رہی ہے؟“ وہ اپنا دھیان بنانا چاہتی تھی۔

”پاکستان لوٹنے تو مجھے چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ میں ہمیشہ کے لیے آگئی ہوں!“

”اور فیصل بھائی؟“

”وہ وہ ہیں۔ اپنی پہلی بیوی کے پاس!“

”کیا؟“ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ ”پہلی بیوی؟“

”ہاں زنب! وہ ادا سی سے مسکادی۔“ میرا حال تم سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ سہرے خوابوں کا باب تو شادی کے کچھ عرصے بعد ہی بند ہو گیا تھا۔ بس، اب یہ ہے کہ زندگی اپنی ہے، اپنے انداز سے جی رہی ہوں۔“

”علحدہ ہو گئی ہو؟“ وہ تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔

”یوں ہی سمجھو!“ وہ سر جھکا کر بولی۔ ”میں اب کبھی فیصل کے پاس نہیں جاؤں گی۔ وہاں ان کی قانونی بیوی موجود ہے۔ میں مجرموں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ اس لیے ہم دونوں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے پاکستان میں رہنا چاہیے۔ وہ مجھے خرچا بھیجتے رہتے ہیں۔“

زنب کے ذہن میں ملٹی گھوم گئی۔ اسے بھر پوری آگئی۔

”ہم جیسی عورتوں کا یہی انجام ہوتا ہے زنب! جن کی آنکھوں پر ان کے رنگین خوابوں کی پٹی بندھی ہوتی ہے۔ میرے لیے بے شمار رشتے موجود تھے لیکن مجھے انتظار تھا کسی ایسے رشتے کا جو مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دے۔ ہر لڑکی میری قسمت پر رشک کرے۔ مجھے یہ ایک پسند نہیں تھا۔ میں یہاں کے سٹم کو کوئی تھی۔ یہاں کے لوگوں پر تنقید کرتی تھی۔ فیصل سے شادی کے بعد تو مجھے یہاں کے لوگ کیڑے مکوڑے لگتے تھے۔“

وہ ہنس دی۔

”دیکھ لو۔ آج میں ان ہی کیڑوں کے درمیان رہی ہوں۔ سچ ہے، انسان کو اپنے اصل کی پہچان نہیں کھونی چاہیے۔“

”فیصل بھائی اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ تمہیں تو انہوں نے بڑی محبتوں سے اپنایا تھا۔“

اس نے فارحہ کا ہاتھ ہلکے سے دبا کر ہمدردی سے پوچھا تھا۔ وہ طنز سے ہنس دی۔

”وہ ابھی بھی یہی کہتے ہیں۔ میں ان کی محبت ہوں اور وہ ان کی ضرورت، اور انسان محبت کے بغیر رہ سکتا ہے، ضرورت کے بغیر نہیں۔ وہ وہاں ان کے مستقبل کی تابناکی کی ضمانت ہے۔ کسی بڑے لارڈ کی بیٹی ہے۔ ان کے پیسے کی ماں ہے۔ اسی لیے انہوں نے مجھے وہاں بلوا تو لیا لیکن بیوی کا درجہ نہیں دیا۔ میں کب تک مجرموں کی طرح چھپ چھپ کر زندگی گزارتی۔ ایک دن اس باہمی سمجھوتے کے تحت واپس چلی آئی کہ وہ مجھے ہر ماہ باقاعدہ سے خرچا بھی بھیجیں گے اور سال میں ایک مرتبہ ملنے بھی آئیں گے۔ محبت کے لیے اتنی خیرات کافی ہے!“

وہ دونوں بہت دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔ پھر فارحہ نے اس کی جانب دیکھا۔

”لیکن اگر تم اس زندگی سے خوش نہیں ہو تو اس شخص سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں۔ کب تک یہ ڈھونگ سے بھری زندگی گزارو گی۔“

”طلاق؟ لیکن اس سے طلاق لے کر میں کہاں جاؤں گی؟ اب میرے لیے کون سا آشیانہ بچا ہے؟“

”سنو زنب!“ فارحہ نے ہمدردی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم یوں گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گی۔ یہ زندگی گزارنا تمہارے جیسی

عورت کے بس کی بات نہیں۔ تم سے ایک غلطی ہوئی ہے۔ اسے بار بار مت دہراؤ۔“

”میں کیا کروں فارحہ۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”میرے پرکٹ پکے ہیں اور میں سونے کے اس بنجرے میں مقید رہنے پر مجبور ہوں۔“

”تم احسن بھائی کو اتنا چاہتی ہو، وہ بھی تمہیں اب تک یاد کرتے ہوں گے مجھے یقین ہے۔ اگر ایک بار تم انہیں ڈھونڈ نکالو۔ ان سے معافی

مانگو تو وہ تمہیں کھلے دل سے معاف کر دیں گے۔ محبت کرنے والوں کے دل ایسے ہی کشادہ ہوتے ہیں۔“

زنب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ جا رہی تھی۔

”اگر تمہیں پھر سے اپنائیں تو تمہاری زندگی دوبارہ گھڑا بن جائے گی۔ یوں بھی میرے سکندر علی سے طلاق لے کر تم جائز طریقے سے ان کی

زندگی میں شامل ہو سکتی ہو۔“

”کیا..... کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے فارحہ؟ لیکن اب وہ مجھے کہاں ملیں گے؟“

”ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ وہ تو یہیں اسی شہر میں کہیں ہوں گے، شاید اپنی منہ بولی بہن کے یہاں ہوں۔ میری مانو تو ایک مرتبہ ان سے مل لو!“

نہب کے دماغ میں آنندھیاں چلنے لگیں۔ ہاتھ پیروں میں سنسانٹ ہونے لگی۔

”ہائے! کتنا خوش کن احساس ہے، جیسے ”جیسے ایک بھیا نک سنے کے بعد آنکھ کھل جائے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو۔“

”احسن، احسن کیا تم مجھے پھر سے مل سکتے ہو۔ میں تمہارے پیروں کی خاک بن کر زندگی گزاروں گی!“

اس کا تشف تیز تیز چل رہا تھا۔

”کہاں گھوٹی ہو؟“ فارحہ نے ہمدردی سے اس کا شانہ بلایا تو وہ چونک اٹھی۔

”اس خیالی دنیا میں..... جس کا نقشہ ابھی تم نے کھینچا تھا۔ ایسا کیسے ممکن ہے فارحہ؟“ پھر وہ بے بسی اور ناامیدی سے بولی۔ ”یہ سب کچھ

سوچنا تو بے حد آسان ہے لیکن..... ایسا ہونا ناممکن ہے!“

”ناممکن کیوں؟ اسلام میں حلالہ کی رعایت اسی لیے تو ہے نا کہ اگر دو فریقین باہمی رضامندی سے دوبارہ ایک ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں۔

احسن بھائی تم سے بے حد محبت کرتے تھے اور سچی محبت اسی کا نام ہے کہ آدمی دوسرے کی غلطی معاف کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ مجھے یقین ہے نہب ہے نہب! وہ

بھی تمہیں بھلا نہ پائے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں آج بھی تمہارا راستہ دیکھتی ہوں گی۔“

”میں اور احسن اگر ایسا چاہیں بھی فارحہ تو اس قید سے رہائی پانا بھلا کب ممکن ہے؟“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں میرا سکندر علی کا

ٹرمپ کارڈ ہوں۔ وہ مجھے کبھی طلاق دینے پر آمادہ نہ ہوگا۔“

”بھئی میں نے تو ایک حل تمہارے سامنے پیش کر دیا ہے۔“ فارحہ گہرا سانس بھر کر بولی۔ ”اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم خوش امید کی دامن

تھام کر اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کرتی ہو یا پھر ناامیدی اور ممکنات اور ناممکنات کے الجھاؤ میں گھر کر ہمیشہ کے لیے اس میں غرق ہو جاتی ہو۔ تم یہ

کیوں نہیں سوچتیں کہ یہ شخص تمہیں استعمال کر رہا ہے۔ جب اس کے مقاصد پورے ہو جائیں گے اور تمہارے وجود میں اس کے لیے کوئی کشش باقی

نہ رہے گی اس وقت یہ خود تمہیں دودھ میں پڑی کھمی کی طرح سے نکال کر اپنی دنیا سے باہر پھینک دے گا۔ پھر اس وقت تم کیا کرو گی، کہاں جاؤ گی؟

ابھی تو تمہارے پاس پھر بھی ایک آپشن ہے لیکن اس وقت در در کی ٹھوکریں کھانے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہوگا۔ یا تو لوگوں کے برتن مانجھو گی یا پھر

گناہوں بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ عقل سے کام لو نہب!“

وہ خالی خالی نظروں سے فارحہ کو تنکے لگی۔ اس قدر ہولناک زندگی کا تو اس کے نزدیک کوئی تصور ہی نہ تھا۔ یہ عجیب و غریب نقشہ تو کبھی

نظروں کے سامنے سے گزرا ہی نہ تھا۔

”فارحہ!“ اس نے فارحہ کے ہاتھ تھام لیے۔ ”میں نے کیا کر دیا فارحہ؟ یہ میں نے اپنے ساتھ کیا کر لیا ہے؟ کوئی اس طرح بھی اپنی

خوشیوں کو آگ لگا تا ہے؟“

”ہر کسی کے لیے پچھتاوے کی کوئی نہ کوئی آگ ہے نہب!“ فارحہ سانس بھر کر بولی۔ ”سب اپنی اپنی آگ میں جھلس رہے ہیں بس قسمیں

مختلف ہیں۔“

”اگر، اگر احسن نے مجھے معاف نہ کیا فارحہ..... تو؟ تو؟“

فارحہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس سوال کا بھلا کیا جواب دے سکتی تھی۔



یہ نگیاں، یہ کچے چھوڑے ہوئے گو بہت زیادہ عرصہ گزرا تھا لیکن زینب کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں بعد کسی شناسا دنیا میں آئی ہو۔ گزرا ہوا وقت خواب کی مانند اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی خواب پر پڑھری ہوئی تھیں۔ میر سکند علی کی بڑی شاندار گاڑی کا اس تنگ گلی میں سے گزرنے ناممکن نہ تھا اس لیے وہ گلی کے دہانے پر ہی اتر گئی تھی۔

”تم انتظار کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ اس نے جھک کر ڈرائیور سے کہا۔

”جی بیگم صاحب!“ اس نے سر ہلایا۔

زینب آہستہ رومی سے چلنے لگی۔ اس کا دل خدشات کے طوفان میں گھرا، کسی شاخ پر اٹکے آخری پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ذہن میں سوالات کی بھرمار تھی اس طرح کہ اس کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بس چلتی جا رہی تھی۔

یہاں آنے کے لیے وہ بے حد سادگی سے تیار ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے رنگ کا کٹن کا سوٹ پہنا تھا اور زیور کے نام پر ناک کی لوگ اور گلے میں پڑی زنجیر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ امارت کے لیے شرمندگی سے بھر اداہ طوق تھی جسے وہ گلے سے اتار کر گھر میں ہی رکھ آئی تھی۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے لحوہ برک کر ٹیل بجانے کا سوچا پھر یہ خیال ترک کر کے وہ اندر داخل ہو گئی۔ دستک دینے کی صورت میں اگر اسے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ ملتی تو وہ کیا کرتی۔

فرخندہ آپا کا گھر بالکل اسی حالت میں تھا جس حالت میں وہ چھوڑ گئی تھی۔ ایک طرف اوپر کو جاتی میڑھیاں دیکھ کر اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔

”اگر، اگر وہ پھر سے یہیں آ گیا ہو، اگر وہ پھر سے یہیں رہتا ہو اگر وہ اوپر ہو۔“ ایک لمحے کے لیے اس کا سامنا کرنے کا خیال ایسا تھا کہ اسے اپنے دل کی دھڑکنیں بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ دیوانہ وار میڑھیاں چڑھنے لگی۔ ایک سانس میں تمام میڑھیاں عبور کر کے وہ دروازے کے سامنے پہنچی تھی لیکن کندی میں لگے ہوئے تالے کو دیکھ کر وہ یکا یک ہی ٹھنڈی پڑ گئی۔

بڑی آہستگی سے مذکورہ اترنے ہی لگی تھی کہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ آخری میڑھی سے تھوڑا پرے فرخندہ آپا کھڑی تھیں۔

اب تک وہ اس کی پشت دیکھتی رہی تھیں اس لیے ان کی نگاہوں میں حیرت تھی لیکن اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان کے تاثرات خطرناک حد تک بگڑ گئے۔

”تم؟“ وہ غضب ناک ہو گئیں۔ ”یہاں کیا لینے آئی ہو؟ اب یہاں کیا ہے تمہارا؟“

”فرخندہ آپا، میں میں.....“ وہ ہٹلا کر رہ گئی۔

”میں کہتی ہوں فوراً سے پیسٹر یہاں سے نکل جاؤ۔ میں اس گھر میں تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی برداشت کرنا نہیں چاہتی۔“ ان کی آواز دھیمی تھی۔

”فرخندہ آپا!“ وہ گڑگڑا کر بولی۔ ”خدا ارامیری بات تو سن لیں!“

”میں ایک لفظ سننا نہیں چاہتی۔ میرے بھائی کی زندگی تباہ کر کے بھی تمہیں سکون نہیں ملا؟ تم پھر چلی آئی ہو؟“

”میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں آپا۔“ وہ میڑھیاں اتر کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

فرخندہ آپا بدک کر دو قدم پرے ہو گئیں

”آپا! میں صرف ایک مرتبہ احسن سے ملنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک مرتبہ۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر رو پڑی۔

”خدا ارامجھ پر یہ احسان کر دیں، اس کے علاوہ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔“

”مر گیا احسن!“ وہ دانت پیس کر بولی تھیں۔

”کیا؟“ اسے جیسے شاک لگا۔ صدے سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو ہو گئیں۔

”میرے منہ میں خاک!“ پھر وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بڑبڑائی تھی۔ ”تمہاری وجہ سے نجانے کیا اول فول بک رہی ہوں میں۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلی جاؤ۔“

”نہیں، نہیں میں احسن سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

لحمہ بھر پہلے کہے گئے ان کے جملے نے اس کی وہ کیفیت کر دی تھی کہ اس کا سارا جسم فالج زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل بری طرح کانپ رہا تھا۔

”میں صرف ایک مرتبہ اس سے ملنا چاہتی ہوں، اس خواہش کے علاوہ میری زندگی میں اور کچھ بھی نہیں۔ میں صرف ایک مرتبہ اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ مجھ پر تھوک دے، مجھے ٹھوکر مار کر گزر جائے، جو چاہے کرے..... مگر میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ خدا را آپا! ہر گناہ کا رکو اتنا تو حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی ہی مانگ لے۔ پھر سامنے والا اسے معاف کرے نہ کرے یہ اس کی مرضی۔“

”دیکھو زنب۔“ وہ قدرے نرم پڑ گئیں۔ ”تم غلط جگہ پر آئی ہو اور اپنا اور میرا دونوں کا وقت ضائع کر رہی ہو۔ احسن یہاں نہیں ہے اور کہاں ہے، میں بھی نہیں جانتی۔“

”آپ کو کچھ تو پتہ ہوگا کچھ تو خبر ہوگی۔“ وہ امید سے بولی۔ ”ساری دنیا میں آپ اس کی واحد رشتہ دار ہیں۔ اس کا یقیناً آپ سے رابطہ ہو گا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوگا آپ کو۔“

”وہ یہ شہر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”کہاں، کہاں، کون سے شہر؟ آپ مجھے اس کا پتہ دے دیں۔ میں دنیا کے آخری کونے تک چلی جاؤں گی پلیز آپا۔“

دونوں ہاتھ جوڑے وہ کسی بھکارن کی طرح بول رہی تھی۔

”مجھے علم نہیں ہے زنب! اس کا مجھ سے کوئی رابطہ نہیں۔ میں نہیں جانتی وہ کہاں کس شہر میں ہے۔“

”آپ، آپ، جھوٹ بول رہی ہیں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”اس قدر کٹھور مت نیے آپا! آپ نہیں جانتی میں کس آ

گ میں جھلس رہی ہوں۔“

”ہم دونوں اپنی اپنی کہہ سن چکے۔ اب تم جاؤ زنب! میری نماز کا وقت نکل رہا ہے۔“

اس نے آنسوؤں سے لبریز نظروں سے ان کے دھندلاتے سراپے کو دیکھا پھر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر کو بڑھ گئی۔

باہر نکل کر وہ لحمہ بھر کو فٹکی تھی۔ سامنے والے گھر کی گیلری پر صوفیہ کھڑی تھی۔ اس کی نظریں زنب سے ٹکرائیں تو لحمہ بھر کے لیے ان میں

استعجاب ابھرا پھر وہ تیزی سے مڑ کر اندر غائب ہو گئی۔

اس نے کبھی کہا تھا۔ ”آپ جب بھی آئیں، مجھے یہیں پائیں گی۔“

”ٹھیک کہتی تھیں تم۔ تم ہی سچی تھیں۔“ وہ بڑبڑا کر آگے کو بڑھ گئی۔

”آپا!“ ساتھ والے کمرے سے آواز ابھری تھی۔

وہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ پھر آہستہ روی سے چلتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

”احسن!“ وہ محض اتنا ہی کہہ پائیں۔

”میں نے آپ سے کہا تھا نا آپا! کہا تھا نا کہ وہ ایک دن پلٹ کر ضرور آئے گی۔“ اس کے لہجے میں اتنا گہرا غم تھا کہ ان کا دل کانپ گیا۔

”دیکھا آپ نے وہ کتنی جلدی پلٹ آئی۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ آنکھیں بند کیے جس گلی میں جا رہی ہے، اس کے دوسری جانب کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ گلی بند میں داخل ہو رہی ہے.....“

”میں نے جو کچھ بھی کیا تمہارے لیے یہی بہتر تھا بیٹے۔“

وہ ہولے سے ہنس دیا۔

”میں نے کچھ کہا آپا! یہ وعدہ تو میں نے خود آپ سے لیا تھا کہ اگر کبھی وہ آئی تو آپ اسے میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گی۔ خود اس سے وعدہ کیا ہے میں نے کہ میں اسے زندگی میں کبھی بھی، کہیں بھی نہیں ملوں گا۔ اسی لیے میں یہاں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے اتنی دور کہ اسے میرے سائے کی خبر بھی نہ ملے۔“

”ہاں بیٹا! میں بھی تمہیں نہیں روکوں گی۔ جانا چاہتے ہو تو بے شک جاؤ لیکن مجھ سے کیا وعدہ بنا کر۔“

جواب میں دوسری جانب گہری خاموشی چھا گئی تھی۔



وہ لان میں بیٹھی ہوئی تھی جب گاڑی کا ہارن بجا۔ باوردی چوکیدار نے بڑی سرعت سے گیٹ کھولا تھا۔

میر سکندر علی کی چمکتی ہوئی گاڑی بڑی شان سے پورچ میں جا رہی۔

اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ لان میں ہی چلا آیا تھا۔

”ہیلو ڈارلنگ! کیسی ہو؟“ اس نے پیار سے اس کا گال چھوا پھر سستانے والے انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا، کیا ہو رہا تھا؟“

”کیا ہو سکتا ہے؟“ وہ قدرے تلخی ہوئی۔

میر سکندر علی نے اس کی جانب دیکھ کر مسکرا دیا۔

”لہجے میں اتنی تلخی مت گھولا کر ڈارلنگ! تلخی مجھے صرف کافی کی اچھی لگتی ہے۔“ اس نے دور کھڑی ملازم کو اشارہ کر کے بلایا۔

”بہترین قسم کی کافی لاؤ۔ ذرا جلدی میں سخت تھکاؤ محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ پورے چاردن کے بعد گھر آیا تھا۔

”تمہارے یونیک کا کام بس مکمل ہونے والا ہے، پھر تمہیں یہ فراغت اتنی بری نہیں لگا کرے گی۔ اگلے ماہ کی کسی تاریخ سے ہم اس کا

باقاعدہ اور شاندار قسم کا افتتاح کریں گے۔“

زینب خاموش بیٹھی رہی۔

”تم بہت خاموش ہوتی جا رہی ہو۔ خوش نظر نہیں آتیں؟ کیا نہیں ہے تمہارے پاس؟ کوئی فرمائش ہے تو بولو؟“

وہ چپ چاپ کیاریوں میں بہار دکھاتے پھولوں کو دیکھتی رہی۔ اس کے پاس ان تمام سوالات کے جواب تھے لیکن وہ جواب یقیناً اس کی

سماعت پر گراں گزرتے۔ اس لیے وہ خاموش بیٹھی رہی۔

”زینب خاتون!“ اچانک ہی وہ بے حد عجیب لہجے میں بولا تھا۔ ”جو ہو چکا ہے اسے دل سے قبول کرلو۔ یہ بساط دوبارہ پلٹنے کے لیے نہیں

بچائی گئی۔“

زینب چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”تم کس کس سے ملتی ہو۔ کہاں کہاں جاتی ہو سب کاموں کی مجھے خبر رہتی ہے۔ مجھے اتنا بے خبر مت جانو۔“

زینب کارواں رواں کھڑا ہو گیا۔ وہ آنکھوں میں بڑی عجیب چمک لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف سرسرا نے لگا۔

”اپنے بارے میں نہایت پر یقین ہوں اس لیے میں نے تمہیں آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ تم بھی ایک بات کا یقین کر لو کہ اڑان بس یہیں تک تھی۔ اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔ میں تمہیں کبھی طلاق نہیں دوں گا تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔ میرا ساتھ دینا ہے۔ میں احسن ایاز نہیں میرا سکندر علی ہوں۔“ اس کے لبوں پر بڑی پراسرار سکراہٹ کھلنے لگی تھی۔ زینب ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ بس ٹکڑا کر اس کی سمت دیکھتی رہی۔

”اچھا ڈارلنگ!“ وہ یکا یک لہجہ اور انداز بدل کر یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے ابھی ان کے درمیان کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ ”میں ذرا چیخ کر کے آتا ہوں۔ بس پانچ منٹ لوں گا۔ کافی ہم دونوں یہیں لان میں بیٹیں گے۔ ٹھیک؟“ وہ اس کا گال تھپتھا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ شاک کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس کے الفاظ ابھی تک اس کے ارد گرد پکڑے ہوئے تھے۔

”میں تمہیں کبھی طلاق نہیں دوں گا، میں احسن ایاز نہیں میرا سکندر علی ہوں۔“

”میں احسن ایاز نہیں میرا سکندر علی ہوں۔“

”احسن ایاز!“

اس کے اندر سے ایک آہ ابھری تھی اور تمام بندوں کو توڑتی اس کی آنکھوں کے رستے چمک پڑی تھی۔

”تم، تم احسن ایاز کیسے ہو سکتے ہو؟ کوئی بھی احسن ایاز کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو..... وہ تو کچھ اور ہی تھا کوئی اور ہی تھا۔“

اس کی آنکھوں سے لبو قطرہ قطرہ رستار ہا۔ اس کا دل قطرہ قطرہ چمکاتا رہا۔



رات تک اس کے دل کا بوجھ بے تحاشا بڑھ چکا تھا۔ اتنا کہ اسے اپنے سینے میں بائیں طرف درد محسوس ہونے لگا۔ پھر یہ درد بڑھ کر شانے اور پھر کہنی تک جا پہنچا۔ وہ بے حال ہونے لگی تو نہ چاہتے ہوئے بھی سکندر علی کو جگانا پڑا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

”پہلے کبھی اس طرح کا درد محسوس ہوا ہے؟“ وہ فکر مند سے پوچھنے لگا۔

”نہیں، بس آج ہی، نجانے کیوں دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

”یہ تو انجانا نہیں لگتا ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”خیر حوصلہ کرو، میں ڈرائیور سے کہتا ہوں گا ڈی نکالے ہم ہسپتال جا رہے ہیں۔“

ہسپتال پہنچ کر اس کے شکم کی تصدیق ہو گئی تھی۔ مختلف قسم کے ٹیشنوں کا مشورہ دیتا ہوا ڈاکٹر پر یقین تھا کہ یہ انجانا نہیں ہی تھا۔

”کسی قسم کی کوئی ٹینشن؟ کوئی مسئلہ؟“ ڈاکٹر اس سے مخاطب تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اثبات میں سر ہلانے سے کچھ حاصل نہ تھا۔

”آپ یہ ٹیسٹ وغیرہ کروائیں۔ رپورٹس آنے پر ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔ فی الحال میں نے جو ٹیکس دی ہیں ان سے آرام آ جائے گا۔“



”تو تم دل کی مریضہ بن گئی ہو۔“ رپورٹس آنے پر وہ قدرے جھنجھلایا ہوا تھا۔ ”نجانے تمہیں کیا تکلیف ہے۔ وہ سب کچھ تمہارے پاس ہے جس کی تمنا تم نے کی۔ جس کے لیے تم اپنی پچھلی زندگی سے دستبردار ہوئیں۔ اب یہ سب کچھ حاصل کر کے بھی تم خوش نہیں ہو؟ تم کیا چاہتی ہو؟“

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ نجانے کیوں اس کا اندر خوش تھا۔ وہ دل کی مریضہ بن کر بڑا اطمینان محسوس کر رہی تھی۔

”میں نے تمہیں کتنا سمجھایا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مت الجھو۔ بڑی بڑی خوشیوں کو محسوس کرو۔ تم چاہو تو ایک دنیا کو خرید سکتی ہو.....“

لیکن تم مدل کلاس عورتوں کی طرح.....“ وہ جھنجھلاہٹ میں جملہ بھی مکمل نہ کر سکا۔

”یہ دل کاردر یونہی تو نہیں پال لیا تم نے۔ کوئی تو الجھن ہے جو تمہیں تنگ کرتی رہتی ہے۔“ وہ اسے بولنے پر آمادہ کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ لب بچنے بیٹھی رہی۔ وہ کچھ بھی بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اس فراڈ شخص سے نفرت تھی۔ اسے پریشان ہوتا دیکھ کر، جھنجھلاتا دیکھ کر اس کا دل خوش ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے سرگارسگیا پھر قدرے ٹھنڈا ہو گیا۔

”اچھا یوں کرتے ہیں گھونسنے کا پروگرام بنالیتے ہیں۔ آج کل ملک سے باہر جانا تو ممکن نہیں یہیں کسی پر فضا مقام پر چلتے ہیں۔ میں نے دو مہینے بعد ورنڈور پر ٹکلیں گے۔ کیا خیال ہے؟“

”جیسے آپ کی خوشی۔“ وہ طنز ابولی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ ایک کٹھ پتلی ہے اور اس کی ساری ڈوریاں سکندر علی کے ہاتھ میں ہیں۔

”کچھ دن بعد اسلام آباد میں ایک میٹنگ ہے تم میرے ساتھ چلو۔ وہاں سے ہم مری، بھور بن وغیرہ ہو آئیں گے۔ تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔ تم بہت ٹینس ہو ڈارنگ!“ وہ یکا یک ہی بے حد میٹھا ہو گیا۔

”ہاں، شاید میرا بھی قصور ہے۔ میں نے تمہیں شادی کے بعد وہ توجہ جس دی جسکی تم مستحق ہو۔ لیکن میں آج کل بے حد مصروف ہوں، تمہیں اپنے شوہر کی مجبوریوں کو سمجھنا چاہیے۔ انہیں شیر کرنا چاہیے بیوی کا رول بہت امپارٹنٹ ہوتا ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم بے حد جین ہو میں نے تمہارا انتخاب یونہی نہیں کیا لیکن تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو۔ اس حساسیت سے تمہیں اور مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے۔“



دنیا میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس سے وہ کچھ کہتی اور وہ اسے دلاسا دیتا۔ جس کے سامنے وہ اپنی غلطیوں، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی اور وہ اسے نئی، آنے والی زندگی کی امید دلاتا۔ اس کے گناہوں کے معاف ہو جانے کا یقین دلاتا۔ وہ خود کو اس قدر تہی داماں اور خالی محسوس کر رہی تھی۔ کہ اب اسے لگتا تھا ان ذہریلی سوچوں سے نجات کا محض ایک ذریعہ ہے۔ وہی چھوٹی سی شیشی جو رملی کی نجات کا باعث بنی تھی پھر اسی رملی کا سیاہ نیلگوں لب والا چہرہ دیکھتی تو اسے رملی کی باتیں یاد آتیں۔ تیار ہونا چاہتی تو داؤ دی اور اس جیسے نجانے کتنوں کی حریص نگاہیں اپنے وجود سے لپٹی ہوئی محسوس ہوتی۔

اسے لگتا تھا زندگی میں کرنے کے لیے اس کے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ حال دل سنانے کے لیے کوئی ایک ہمدرد اور غمگسار بھی نہیں۔

تب اسے آمنہ یاد آئی۔ آمنہ، اس کی سگی۔ اس کی بچپن کی سہیلی جس سے وہ اپنا دکھ، ہر خوشی کہتی تھی۔

”کتنی قیمتی باتیں کرتی تھی آمنہ تم۔“ ”سرد آہ بھر کر اس نے سوچا۔“ ”میرا ذہن اور میرا دل، وہ کھٹکول تھے جن میں محض معمولی سکون کی کھٹک ہی گونجتی ہے۔ قیمتی پتھر نہیں رکھے جاتے۔ میں نے تمہارے اس خزانے کی حفاظت نہیں کی۔ دیکھو..... آج میں کس قدر تہی داماں ہوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد وہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ رہی تھی۔ ہر چند کہ آمنہ کا سامنا کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ وہ سوچتی تھی تو شرم سے پانی ہونے لگتی تھی لیکن اس سے ملنے کی خواہش اس قدر شدید تھی کہ وہ ہر بات کو بھلا کر اس سے ملنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

آمنہ کا گھر بھی ایسی جگہ میں تھا جہاں اس کی گاڑی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر پیدل چلیں گی مگر تک پہنچی تھی۔

دروازے پر دستک دے کر وہ سوچتی ہوئی نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی جب ایک نو عمر لڑکے نے باہر سر نکال کر اسے چونکا دیا۔

”جی کس سے ملنا ہے باجی!“

”اُس..... وہ یہاں آئندہ رہتی ہے تاہم اُن سے ملنا ہے۔“

”آئندہ؟“ اس نے حیرانی سے دہرایا۔ ”نہیں جی یہاں تو آسیہ آ رہتی ہیں۔ میں ان کا چچا زاد بھائی ہوں۔“

”آسیہ!“ وہ پریشان ہو گئی۔

تب تک ایک ادھیڑ عمر کی عورت دروازے پر آچکی تھی۔

”جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟“

”یہاں آئندہ میرا مطلب ہے انوار علی صاحب رہتے تھے؟“

”ہاں رہتے تھے۔“ اس نے اطمینان سے سر ہلایا۔ ”ان کو یہ مکان چھوڑے کافی دن ہوئے ہم نے ان سے خرید لیا تھا۔“

”پھر اب وہ کہاں رہتے ہیں؟“ وہ پریشان ہوئی۔

کیا اس بھری دنیا میں آئندہ بھی کہیں کھو گئی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”میرے پاس ان کا یہ لکھا ہوا ہے۔ میں آپ کو دے دیتی ہوں۔“

”اوہ بڑی مہربانی۔“ اس کی آنکھیں میگی گئیں۔

کچھ دیر بعد وہ اس عورت کے دیے ہوئے پتے کے مطابق جا رہی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی جب مطلوبہ مکان کے سامنے روکی تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ وہ ایک عمدہ طرز پر بنا ہوا ڈبل اسٹوری مکان

تھا۔ مکان کی حالت بہترین تھی۔ اس پر حال ہی میں رنگ دروغن کرایا ہوا لگتا تھا۔

اس نے تیل بجائی۔ دروازہ انوار علی کی بیٹی نے کھولا تھا۔ زیب اسے پہچان گئی۔

”بیٹا آپ کی امی گھر پر ہیں؟“

”جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کون ہے کنزلی؟“ چند لمحوں میں ہی آئندہ دروازے پر تھی۔

”زیب تم؟“ خوشی سے آئندہ کی چیخ نکلی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ دونوں بغل گیر ہو چکی تھیں۔

”سچ زیب مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہی ہو تم کہاں چلی گئی تھیں، میں تمہارے گھر گئی تھی لیکن..... ارے..... تم رورہی ہو؟“ آئندہ کو

حیرت ہوئی۔

”چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ شاید گرمی سے گھبرا گئی ہو۔“ وہ اسے اندر لے آئی۔

”تم بیٹھو میں کچھ ٹھنڈا لے کر آتی ہوں؟“ وہ اسے آن کر کے کمرے سے نکلی تھی۔

زیب نے آنسو صاف کیے اور کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے بے تحاشا حیرت ہوئی تھی۔ آئندہ کے لائف اسٹائل میں زبردست فرق آچکا تھا۔ وہ

غالباً آئندہ کا بیڈروم تھا۔ اس کی سجاوٹ بڑی عمدہ طرز پر کی گئی تھی۔ فرنیچر بالکل نیا اور خاصا مہنگا معلوم ہوتا تھا۔ کمرے میں ضرورت کی ہر شے موجود

تھی۔ ہر شے بے حد صاف ستھری اور مکینوں کے علاؤقہ کی نمائندگی کرتی تھیں۔

”یہ لو ٹھنڈا ٹھنڈا شربت پیو۔“ چند لمحوں میں آئندہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ ”پھر ہم اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔“

زیب نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ دہلی پتلی، سانولی سی آئندہ ایک خوب صورت، تندرست عورت کے سراپے میں ڈھل گئی تھی۔ اس کا

جسم بھر گیا تھا اور رنگت بے حد صاف ہو گئی تھی۔ اس نے ہلکے رنگ کے پرنٹ کا ایک خوب صورت لباس پہنا ہوا تھا اور ہونٹوں پر ہلکے رنگ کے لب

اسک لگائی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ کی کلائی میں سونے کے جڑواں نگین تھے۔

”بہت بدل گئی ہو آمنہ!“ وہ بے ساختہ بول گئی۔ ”اتنی خوب صورت ہو گئی ہو۔“

وہ اپنی ازلی سادگی سے مسکرا دی۔

”اچھا۔ مجھے تو تم ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت لگ ہی ہو لیکن تم کمزور ہو گئی ہو زینو۔“

زینب نظریں چرا گئی۔

”تمہارا گھر بھی بہت اچھا ہے۔“ وہ بات بدل کر بولی۔ ”بہت اچھا سیٹ کیا ہے۔ اپنا خریدا ہے؟“

”ہاں زینب!“ آمنہ نے اطمینان کی گہری سانس بھری۔ ”اللہ نے بڑا کرم کیا ہم لوگوں پر بڑا احسان ہے اس کا انوار کی نوکری کا تو تمہیں

پتا تھا گزرا تو اس میں بھی ہو جاتا تھا مگر بڑا کھینچ تان کر۔ پھر ایک دوست نے برنس میں پیسہ ملانے کے لیے کہا۔ ان کے پاس تو جمع شدہ کچھ نہیں تھا۔

اماں نے ہم لوگوں پر احسان کیا، انہوں نے اپنا مکان بچ کر سارا پیسہ ہمیں دے دیا۔ میں نے اپنا زیور بیچ دیا۔ یوں ہم نے برنس میں روپیہ لگا دیا۔ خدا

کا کرم ہوا برنس بہت اچھا چل نکلا۔ ہماری توقعات سے زیادہ آمدنی ہوئی۔ یوں وہ پرانا گھر بیچ کر ہم یہاں چلے آئے۔ مہینہ ہوا، اماں کا انتقال ہو

گیا۔ بے چاری بہت بیمار رہنے لگی تھیں۔ وہ کہتی تھیں آخری وقت میں میں نے ان کی جیسی خدمت کی ہے۔ اللہ مجھے اس کا اجر ضرور دے گا۔ شاید

مجھے ان کی دعا لگی ہے۔ اللہ نے ہر نعمت سے نوازا دیا ہے۔“

”ہاں آمنہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ تمہارے جیسے لوگوں پر اللہ کا انعام ہوتا ہے۔“ اس نے سانس بھری۔

”مجھ میں بھلا ایسی کیا بات ہے۔“ وہ سادگی سے مسکرا دی۔

”اتنے مبر والی، اتنے حوصلے والی، ہر حال میں خوش رہنے اور خوش نظر آنے والی، کاش! آمنہ! کاش، میں بھی تم جیسی بن سکتی۔“ اس کی

آواز بھرا گئی۔

”تم خود اتنی اچھی ہو زینب۔“ آمنہ نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”تمہیں مجھ جیسا بننے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہر لحاظ سے تم مجھ سے

زیادہ اچھی اور مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہو۔ احسن بھائی کی بے حد و حساب محبت ہے، اس کا تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہوا؟“

زینب سے مزید ضبط کرنا محال ہو گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آمنہ کے لیے یہ نہایت حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ منہ کھولے، ہونٹیں بنی کچھ

دیر اسے دیکھتی رہی۔

اقبالا

اقبالا..... تاریک اور پراسرار پر اعظم افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں آباد ایک غیر مہذب قبیلہ..... جو اقبال نامی دیوی کے

پجاری تھے۔ بحری جہاز کی تباہی کے بعد مہذب دنیا کے چند افراد اس قبیلے کے جنگل میں جا پھنسے۔ شوالا..... جنگلی قبیلے کا ایک

سردار جسے دیوی اقبال نے تمام حشرات الاراض کا مختار بنا دیا تھا۔ کالاری..... جنگلی قبیلے کا دوسرا سردار جس کی تمام درندوں پر حکمرانی

تھی۔ کیا مہذب انسانوں کی اس جنگلی خونخوار قبیلے سے واپسی ممکن ہو سکتی؟ انور صدیقی کے جادوں بیاں قلم کی یہ طویل اور دلچسپ

داستان آپ جلد ہی کتاب گھر کے ایکس ایڈونچر ناول سیکس میں پڑھ سکیں گے۔

”نہیں!“ پھر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں بمشکل کہا۔ ”سب..... سب خیریت ہے نا۔ ایسے کیوں رو رہی ہو تم؟ احسن بھائی تو ٹھیک ہیں نا؟“

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے آمنہ! کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ سب تباہ ہو گیا، سب برباد ہو گیا۔ وہ گھر، وہ محبت، وہ خوشی، میں ہر شے سے محروم ہو گئی۔“

اس کا جی چاہ رہا تھا دباؤں مار مار کر روئے۔ آمنہ پتھر کے بت کی طرح ساکن بیٹھی اس کا چہرہ تنک رہی تھی۔ پھر اس نے آہوں، سسکیوں اور دہلی دہلی چیخوں کے درمیان ساری کہانی اسے کہہ سنائی۔ اپنا ہر گناہ، خطا پوری ایمانداری اور دیانت سے تسلیم کی۔

”میں پاگل ہو گئی تھی آمنہ! مجھے کچھ نہ آتا تھا دولت کی چمک نے جیسے میرے اعصاب پر حملہ کر کے مفلوج کر ڈالا تھا۔ سکون کی جھلک نے مجھے ساعت سے محروم کر دیا تھا۔ میں اندھی، بہری ہو گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں اپنا نشین اجاڑ ڈالا۔ اب میرے پاس وہ سب کچھ ہے جو میں نے چاہا، لیکن میرا دل، میرا چین میرا سکون، اطمینان یہ سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔ اس نے تو پچھرتے سے بھی مجھے دعا دی تھی لیکن اس کی دعا میرے لیے بد دعا بن گئی۔ میرا اپنا وجود میری جرم کی سزا ہے۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔ آمنہ سے تاسف کی شدت کے سبب کچھ کہنا محال ہو رہا تھا۔ وہ بس خاموش بیٹھی، جیسے کسی شدید صدمہ کی کیفیت میں گھر کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

پھر اس نے ہلکتی ہوئی نہنہ کا سراپے شانے سے لگایا۔

”جو کچھ ہو گیا، اس کی تلافی ممکن نہیں نہنہ! لیکن یہ بات بھی اچھی ہے کہ تمہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا اور تم نے دل سے اپنی خطائیں تسلیم کیں۔ اب تمہارے لیے ٹھنسی یہی ایک رستہ ہے کہ اپنی اگلی زندگی کو پرسکون بنانے کی کوشش کرو۔ جو شخص تمہارا شوہر بن چکا ہے اس کے ساتھ دینی ہم آہنگی پیدا کر کے زندگی کو خوشگوار بناؤ۔ پچھلی باتوں کو فراموش کر ڈالو۔ بس، یہی ایک رستہ ہے نہنہ!“ وہ آنسو پونچھ کر تنگی سے مسکرا دی۔

”میں نے شادی نہیں کی آمنہ! خود کو کوچ ڈالا ہے۔ وہ میرا شوہر نہیں میرا سوداگر ہے۔ اس نے جو پیسہ مجھ پر لگایا ہے وہ میرے ذریعے ہی اس کی وصولیابی کا طریقہ جانتا ہے۔ اس نے میرا انتخاب بے حد سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ خود یہی کہتا ہے نبانے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو کیا ہوا تھا۔“

آخر میں وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی تھی۔

”پھر.....“ آمنہ فکر مند سی اسے دیکھنے لگی۔ ”تم نے کیا سوچا ہے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں؟ کیا یونہی اس شخص کے ہاتھوں استعمال ہوتی رہو گی؟ اگر وہ واقعی غلط آدمی ہے تو وہ تمہیں مزید غلط طریقوں سے استعمال کرنے کا سوچے گا۔“

”میں زور کھالوں گی آمنہ!“ وہ جذباتیت سے بولی۔ پھر یکایک وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں رملی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ اس اذیت ناک موت کا انتخاب کچھ آسان کام نہ تھا۔

”فارحہ کہتی ہے.....“ کچھ دیر کے بعد وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگی۔ ”مجھے میرا سکندر علی سے طلاق لے لینی چاہیے۔ پھر میں دوبارہ احسن سے شادی کر سکتی ہوں۔“

آمنہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”لیکن احسن بھائی..... کیا وہ راضی ہو جائیں گے؟“

اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر جھکا لیا۔

”وہ ایک مرتبہ مجھے ملیں تو میں ان کے قدموں میں سر رکھ کر اتار دوں آمنہ! کہ میرے سارے گناہ، میری تمام خطائیں میرے آنسوؤں میں بہ جائیں۔ وہ بس اتنا کہہ دیں کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا ہے پھر اس کے بعد خواہ وہ مجھے ٹھوکر مار کر گزر جائیں، مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی بس

بس یہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے آمنہ! لیکن میں انہیں کہاں ڈھونڈوں؟“

”وہ بھلا کہاں جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ تم بتا رہی ہو، انہوں نے جن حالات میں تمہیں چھوڑا ہے، ان حالات میں کہیں بہت دور جانا ان کے لیے کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ وہ اپنی آپا کے پاس ہی گئے ہوں گے۔“

”وہ وہاں نہیں ہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”فرخندہ آپا کا کہنا ہے کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں اور کہاں گئے ہیں ان کو بھی علم نہیں۔“

”ہو سکتا ہے انہوں نے تم سے غلط بیانی کی ہو۔“ آمنہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”وہ یقیناً احسن بھائی کے متعلق جانتی ہوں گی۔“

”اگر ایسا ہے بھی تو میں کیا کر سکتی ہوں آمنہ!“ وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئی۔

”اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو میں کچھ کوشش کروں؟“

زینب چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھے۔

”میں انوار سے کہتی ہوں وہ جا کر احسن بھائی کے متعلق استفسار کریں۔ ان کا کوئی پرانا دوست بن کر۔ ہو سکتا ہے فرخندہ آپا احسن کا پتا دینے پر آمادہ ہو جائیں۔“

زینب کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

”آمنہ!“ اس نے آمنہ کے ہاتھ تھام لیے۔ ”خدا کے لیے آمنہ اگر ایسا ممکن ہو جائے تو میں تمہارا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گی پلیز آمنہ! مجھے ایک مرتبہ ان سے ملنا ہے بس ایک مرتبہ پھر اس کے بعد خواہ کچھ ہو؟“

”میں کوشش کرتی ہوں لیکن زینب اگر تم واقعی صدق دل سے احسن بھائی سے معافی مانگنا چاہتی ہو اور دوبارہ ان کی زندگی میں شامل ہونے کی خواہش مند بھی ہو تو پہلے تمہیں میر سکندر علی سے بات کرنی ہوگی۔ کیا وہ تمہیں طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے گا؟ راضی بخوشی؟“

زینب کی خوشی سے چمکتی نگاہیں ماند پڑ گئیں۔ اس کا سر نفی میں ہلنے لگا۔

”میں تمہیں کبھی طلاق نہیں دوں گا تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہے، میرا ساتھ ہی دینا ہے۔ میں احسن ایاز نہیں میر سکندر علی ہوں۔“

اس کے کانوں میں الفاظ گونجنے۔ ایک مرتبہ پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف سرسرا نے لگا۔

”پھر؟ احسن بھائی کو ڈھونڈنے سے کیا ملے گا تمہیں؟“ آمنہ افسوس سے بولی۔

”نہیں، نہیں۔“ اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ہر حال میں احسن سے ملنا چاہتی ہوں..... میں، میں ہر حال میں میر سکندر علی

کی قید سے آزادی چاہتی ہوں۔“

”پھر میر سکندر علی سے بات کرو۔ کھل کر۔“ آمنہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ”اسے کہو کہ دنیا میں رنگین چڑیوں کی کمی نہیں ہے۔ اسے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے بہت سی دوسری مل جائیں گی جو بخوشی یہ سب کچھ کرنے پر تیار ہوں گی۔ اس سے کہو کہ وہ تمہیں آزاد کر دے ورنہ تم کوئی غلط قدم اٹھا لوگی۔ اس سے ڈرنے کے بجائے اسے ڈرانے کی کوشش کرو زینب! ایسے لوگ اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں۔“ وہ ہولے ہولے اسے

سمجھا رہی تھی۔

زینب کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں کھوتی جا رہی تھیں۔



”مجھے آپ سے ایک بے حد ضروری بات کرنی ہے۔“ انگلی شام کو وہ اس سے کہہ رہی تھی۔ ”گلتا ہے بات کچھ خاص ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”تمہارے لہجے میں بڑا خاص پن ہے ڈارلنگ!“

”جی ہاں، میرے لیے تو فی الحال اس بات سے زیادہ خاص اور کوئی بات نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ اپنا کپ اس نے پرچ میں رکھ کر ڈرائی پر نکا دیا۔

”اس رنگ میں تم بے حد خوب صورت لگ رہی ہو۔“ اس نے یکا ایک بات کا رخ پلٹ دیا۔ ”بہت شان کر رہی ہو۔“
 زینب جزبہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے شیشوں کی کڑھائی سے مزین، کاشن کا سی گرین کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کچھ دیر قبل اس نے شان لیا تھا۔
 کھلے بال اس کے نازک وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ سیک اپ سے قطعی مبرا تھا لیکن وہ جانتی تھی۔ اس لباس میں وہ واقعی بے حد حسین نظر آتی تھی۔ یہ لباس شہر کے چمکے ترین بوٹیک سے اس نے شادی کے وقت بڑے چاؤ سے خریدا تھا۔

”اودہ تم بے حد حسین لگ رہی ہو زینب خاتون! شام کی اس روشنی میں تمہاری شہتی آنکھیں ہیرے کی کئی کی مانند دک رہی ہیں۔“
 وہ غالباً شرارت کے موڈ میں تھا۔ زینب پہلو بدل کر رہ گئی۔

”یہی بتانا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ جھنجھلا گئی تھی۔

نجانے کب سے لفظوں کو جواز جواز کر اس نے وہ بات کہنے کی ہمت خود میں جمع کی تھی اور وہ بار بار اسے ادھر ادھر بھنکار رہا تھا۔
 ”نہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”میں کچھ اور بتانا چاہتا ہوں۔ کل ہم اسلام آباد جا رہے ہیں۔ ہم یعنی میں اور تم۔ ساڑھے تین بجے کی فلائٹ ہے۔
 تین چار دن وہاں سکون اور اطمینان سے گزاریں گے تم فریش ہو جاؤ گی میں بھی کچھ عرصے سے مسلسل کام کر کے تھک گیا ہوں۔ کچھ ریست چاہتا ہوں۔ وہاں میں تمہیں بھرپور وقت دوں گا۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“

وہ اپنی پلاننگ بتا رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ جو بات وہ کہنا چاہتی تھی شاید اس کے لیے اب یہ وقت مناسب نہ تھا۔ وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔

”تم اپنی تیاری رکھنا۔ لبوسات بہترین قسم کے ہونے چاہیں۔ وہاں ہمیں کئی دعوتوں میں شرکت کرنی ہوگی۔“

”آپ تو اپنی بزنس میٹنگ میں جا رہے ہیں نا.....“ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھی۔ ”پھر بھلا میں ساتھ جا کر کیا کروں گی۔“

”اودہ ڈارلنگ یو ڈونٹ وری۔ صرف ایک صبح مجھے میٹنگ کے لیے درکار ہے۔ باقی سارا وقت تمہارے لیے وقف ہوگا۔ تم گھومنا پھرنا،
 شاپنگ کرنا جو چاہو خریدنا۔“



اگلے دن شام کو وہ اسلام آباد کے بہترین ہوٹل کے سویٹ میں موجود تھے۔
 ”شمار لے کر فریش ہو جاؤ ڈارلنگ..... ہم کچھ دیر بعد نکلیں گے۔ تمہیں ایک اہم شخصیت سے ملوانا ہے۔“ وہ اپنا سوٹ کیس کھولے،
 مصروف سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

نجانے کیوں اسے عجیب سے احساس نے آلیا۔ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔
 ”کیسی شخصیت؟“

”ہمارے لیے بے حد اہم۔“ اب وہ اپنا ساگرساگ رہا تھا۔ ”ذوالفقار جنجوعہ بہت اہم عہدے پر فائز ہے اس سے تمہیں بے حد سوچ سمجھ کر
 ملنا ہوگا۔“

”مجھے؟“ اس کا تنفس تیز ہو گیا۔

سکندر علی کا سائیکم یکا ایک اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ اسے یہاں کیوں لایا تھا۔ وہ اس قدر پر جوش اور خوش کیوں نظر آتا تھا۔ وہ اس پر
 اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا۔ ساری بات لمحہ بھر میں اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

غصے سے اس کی منہیاں بھیج گئیں۔ اس نے دانت پر دانت جمالیے اس کا جی چاہا، وہ کمرے میں موجود ہر چیز اٹھا کر سکندر علی کے سر پر دے مارے۔ اسے غلیظ ترین گالیاں دے۔ چیخ چیخ کر پورے ہوٹل کو اپنے سر پر اٹھالے۔

”تم سن رہی ہوتا۔“ وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تمہیں اس شخص پر خاص توجہ کرنی ہے۔ اسے ہر حال میں اپنی ذات، اپنے وجود کا احساس دلانا ہے۔ یوں بھی وہ خاصا دل چیمیک واقع ہوا ہے۔ اسے رام کرنے میں تمہیں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ ایک آدھ شام اسکے ساتھ گزار لو گی تو میرا بہت کام ہو جائے گا۔“

”سمجھ بھی رہی ہو؟“

”بہت اچھی طرح سکندر صاحب!“ وہ دیوار کو گھورتی رہی۔

”مگد“ تم سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو ڈار لنگ! تم جانتی نہیں ہمیں اس کام سے کتنا فائدہ ہوگا۔“ وہ خوش ہو گیا۔

”آپ محض اپنے فائدے کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ لفظ چبا چبا کر بولی۔ ”میرے فائدے کی بات بھول رہے ہیں۔“

وہ چونک اٹھا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟“

نہیں اپنی جگہ سے انگی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے سامنے پہنچ گئی۔

”مجھے یقین ہے سکندر صاحب! جس قدر آپ نے مجھ پر خرچ کیا ہے، اس سے دگنا سکنا منافع آپ اپنی پچھلی ذیل سے حاصل کر چکے اب

اس ذیل سے جو کچھ آپ کو ملے گا اس کے عوض مجھے آپ سے کچھ چاہیے۔“

”کیا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگا۔

”آزادی! مجھے طلاق چاہیے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی۔

”واٹ؟“ وہ اچھٹے سے اسے دیکھنے لگا۔ ”تم بھول رہی ہو۔ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ اس بات کو بھول جاؤ نہ نہیں کہ اب ہم کبھی الگ

ہوں گے۔“

”تو پھر آپ بھی بھول جائیے کہ آپ کو ذوالفقار جنوے نامی کسی شخص سے کچھ کام نکلوانے ہیں اور اس کے بعد آئندہ بھی کبھی میں کوئی ایسا

کام نہیں کروں گی۔ کسی قیمت پر نہیں میں آپ کا سدھایا ہوا کوئی جانور بننے پر تیار نہیں جس کا تماشا دکھا کر آپ لوگوں سے رقم بٹوریں۔“

اس کا لہجہ قطعی تھا۔ چند لمحوں کے لیے سکندر علی کے چہرے کی تمام رنگیں تن گئیں۔ آنکھیں لال انگارہ بن گئیں۔ کچھ دیر تک وہ اسے گھورتا

رہا پھر یکایک اس نے خود میں تبدیلی پیدا کی اور تار دل ہو گیا۔

”دیکھو نہ ب!“ اس نے نہن ب کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ پرے کر لیا۔

”میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اب بے حد رسائیت سے بولا تھا۔ ”یہ کوئی خراب کام نہیں ہے۔ ہائی سوسائٹی میں عورتیں اسی طرح

اپنے شوہروں کو سپورٹ کرتی ہیں۔“

”بھائو میں جائے آپ کی سوسائٹی اور بھائو میں جائیں ایسے شوہر جو اپنی بیویوں کو طوائف بننے پر مجبور کریں۔ یاد رکھیں سکندر! میں بظاہر

کتنی ہی دیوار پر بزدل نظر آؤں لیکن نگاہ کی زندگی مجھے منظور نہیں۔ اس سے چمکا را حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میں رملی کی طرح

زہر کھا کر جان دے دوں گی مگر.....“

”ریلیکس..... ریلیکس ڈار لنگ..... ریلیکس۔“ وہ ایک مرتبہ پھر وہی میر سکندر علی بن چکا تھا جو زم لہجے سے اپنا ہر کام نکالنے کا گرجا تھا

لیکن نہن ب اب اس کے تمام داؤ بیچ جان چکی تھی۔

”اس قدر جذباتیت کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”تمہیں یہ کام پسند نہیں ہے۔ تم یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتیں ٹھیک ہے۔ آئندہ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن اس مرتبہ میرا ساتھ دو۔ آخر ہم اتنی دور سے.....“

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”یہی کام کرنے آئے ہیں۔“ زینب اس کا ادھر اور اُتھر مکمل کر کے طے سے ہنس دی۔ ”بہت خوب سکندر صاحب، بہت خوب۔ آپ واقعی شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی ہوں گے لیکن اس مرتبہ میں کسی مہرے کی طرح استعمال ہونے کے لیے تیار نہیں۔ میں یہ کام اسی شرط پر کروں گی کہ اس کے بعد آپ مجھے آزاد کر دیں گے۔ مجھ پر جو کچھ آپ نے لگایا وہ آپ منافع کے ساتھ کما کچھ آپ کسی نئی چیز یا کو تلاش کریں۔ اس دنیا میں حریص مردوں کو کی نہیں ہے تو حسین چہرے بھی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ آپ کے مطلب کی بہت سی عورتیں آپ کو دستیاب ہوں گی جو راضی، بخوشی آپ کی پسند کی یوی بننے پر تیار ہوں گی۔“

سکندر علی چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”مجھے منظور ہے۔ اگر تمہاری زلفوں کا اسیر ہو کر ذوالفقار جنوعد میرا کام کر دیتا ہے تو پھر میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔“

زینب نے گہری سانس بھری تھی۔



اندرا آتی فرخندہ آپا کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سفری بیگ تھا۔ ان کے لب آہستہ آہستہ بل رہے تھے۔ پاس آکر انہوں نے اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی پر پھونک ماری۔

”خدا تمہارا حامی وہ ناصربو۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔“ انہوں نے محبت سے اس کے سر پر بوسہ دیا تھا۔

”آپ کی محبت ہے آپا! جس نے جیتا رکھا ہے۔“ اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”ورنہ کیا ہے میرے پاس۔“

”ناامید نہیں ہوتے یٹا! زندگی چند سالوں کا نام نہیں ہے جو گزر گئے تو زندگی تمام ہوئی۔ خدا تمہیں میری عمر بھی لگائے ابھی تو تم نے بہت جینا ہے۔ بہت سی محبتیں دیکھنی ہیں۔ بہت سی خوشیاں دیکھنی ہیں۔“ وہ تلخی سے مسکرایا۔

”کب تک لوٹو گے؟“

”بس چند دنوں میں۔“ وہ بولا۔ ”انٹرویو دے کر اگلے دن کی ٹرین پکڑوں گا۔“

”اسلام آباد میں، میں نے تمہیں جو پتہ دیا ہے وہ میرے ماموں زاد بھائی کا ہے۔ انٹرویو تو تمہارا کسی بڑے ہوٹل میں ہوگا نا؟ لیکن ٹھہرنا تمہیں میرے بھائی کے گھر ہی ہے ہوٹلوں کی خاک مت چھانتے پھرنا۔ گھر کا آرام کسی جگہ نہیں ملتا۔ میں ان لوگوں کو فون کر دوں گی تم اطمینان سے جانا۔ بڑے محبت والے لوگ ہیں۔“

اس نے محض اثبات میں سر ہلایا۔

”میں خدا کے حضور گر گزرا کر دعا کروں گی کہ یہ نوکری تمہیں مل جائے۔ بس پھر اس کے بعد میں تمہاری شادی کروں گی یا دہے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب تم وہی کرو گے جو میں تم سے کہوں گی۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا! لیکن میرا یقین کیجئے میں فی الوقت ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار نہیں۔ مجھے سنبھلنے کا موقع تو دیں۔ فی الوقت میں کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا پھر کسی کے ساتھ یہ ظلم کیوں ہو۔“

”صوفیہ کے متعلق تو تم اچھی طرح جانتے ہو! ہر حال میں ساتھ دینے والی، ہر صورت نباہ کرنے والی جب وہ تمہاری شادی کے بعد خاموشی سے اتنے سال بیراگی بن کر گزار سکتی ہے تو تمہارے ساتھ رہنا تو اس کی سب سے بڑی خوشی ٹھہری۔ وہ تم سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کرے گی۔“

”ابھی اس کے جذبات کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے آپ!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن شادی کے بعد اس کی ناخوشی اور اداسی کا ذمہ دار میں ٹھہروں گا۔ خواہ وہ مجھ سے شکوہ کرے یا نہ کرے میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے چاہتی ہے لیکن کسی کو چاہنا اور بات ہے اور شادی کے بعد اسی محبوب کی بے رخی اور بے توجہی برداشت کرنا دوسری بات۔ وہ ہرٹ ہوگی ہر صورت۔“

”کیا اب تمہارا یہ مسلسل انکار اسے ہرٹ نہیں کرے گا؟“

”پلیز آپ!“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ اس موضوع کو پھر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ میں ذہنی طور پر ڈسٹرب رہا تو انٹرویو بھی صحیح طرح سے نہیں دے پاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا!“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی تھیں۔ ”جیسے تمہاری خوشی۔“

”دکڑی کی ٹانگ اور پتھر جیسے جذبات والا شوہر کیا کسی لڑکی کو کوئی خوشی دے سکتا ہے۔“ وہ تلخی سے ہنستا تھا۔ ”لڑکیاں تو نجانے کیا کچھ چاہتی ہیں۔“ اس کی آواز مدہم ہو گئی تھی۔

”ہر لڑکی کا.....“ آپا کچھ کہتے کہتے یلکنت خاموش ہو گئیں۔

”اچھا آپا خدا حافظ!“ وہ بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”خدا کی امان میں سو نہ!“ ان کے لب پہ تھے۔



ہوٹل کے وسیع و عریض، سرسبز لان میں وہ ذوالفقار جنجوعہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

جارجٹ کے جھلکے پیاز کی رنگ کے لباس میں اس کی اپنی رنگت سنہری ہو رہی تھی۔ لائے بال اس نے اچھی طرح سنوار کر کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ کانوں میں ہیرے کے آویزے دک رہے تھے۔ اس نے ہلکا مگر بہترین تاثر دینے والا میک اپ کیا ہوا تھا۔

”آپ بھینا مٹا کر کرنے کا فن جانتی ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”آپ جیسی خواتین کے قصے تو تاریخ میں ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟“ وہ مبہم انداز میں مسکرائی۔

حالانکہ وہ اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہی تھی۔

”تاریخ میں ایسی حسین عورتوں کے تذکرے ہیں جو حکومتوں کے تختے الٹ دیتی تھیں.....“ وہ ہولے سے ہنسا۔

وہ درمیانی عمر کا ایک وجیہ شخص تھا۔ اس کے انداز بڑے شائستہ تھے۔ یہ زینب کی اس سے تیسری ملاقات تھی اور وہ اس کا مدعا بھی سمجھ چکا تھا لیکن اب تک اس نے کوئی ناشائستہ بات یا نازیبا حرکت نہ کی تھی۔

زینب اس کی بات پر دلکشی سے مسکرا کر رہ گئی۔

”پھر کیا خیال ہے آپ کا؟ ہمارا کام ہو جائے گا؟“ وہ بڑے ناز سے پوچھنے لگی۔

اسے پورا یقین تھا۔ ذوالفقار جنجوعہ پوری طرح سے اس کا امیر ہو چکا تھا۔ وہ اسے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

”آپ کا کام ہو جائے گا حسین خاتون! لیکن ہمارا بھی تو کچھ بھلا ہونا چاہیے۔ آپ کو خبر ہے یہ کروڑوں کا معاملہ ہے۔“

وہ سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”محض ایک رات۔ آپ کی نرم زلفوں تلے۔“ وہ دلکشی سے مسکرایا۔

زینب کا سانس لمحہ بھر کے لیے رک گیا تھا۔ وہ جانتی تھی، ایسی کسی بھی ڈیل کے دوران یہ لمحہ بھی آ سکتا ہے لیکن یہ بات جاننا اور بات تھی۔ یہ

مطالبہ سننا اور اس کا جواب دینا اور بات وہ سن ہو کر بیٹھی رہ گئی۔

”کیسے کیا خیال ہے؟“

”آپ، آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ اسے پسینہ آنے لگا۔ ”میں ایک عزت دار، شادی شدہ عورت ہوں۔“

ذوالفقار کے لبوں پر بڑی شریر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ زنبب کٹ کر رہ گئی۔

”آپ یونہی عزت دار اور شادی شدہ رہیں گی۔“ وہ شرارتی انداز میں بولا۔ ”کل صبح میں بڑی عزت سے بصد احترام آپ کو آپ کے شوہر کو ہینڈ اور کدوں گا اور آپ اتنا پریشان نظر آرہی ہیں جیسے یہ کوئی بہت انکھی بات ہے۔ جو مطالبہ آپ کر رہی ہیں یہ تو اس کا بہت معمولی سا عوضا نہ ہے اور عزیز من اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں آپ کو تو کافی تجربہ ہوگا؟“ وہ دوسری سگریٹ سلگانے لگا۔

زنبب کو اندازہ ہوا۔ وہ جس قدر شائستہ باہر سے نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی کرہیہ اور بد صورت تھا۔ بے حد عیاری سے وہ اسے ایک ایسے دورا ہے پر لے آیا تھا جس کے ایک طرف کنواں تھا اور دوسری جانب کھائی۔

اسے انکار کرنے کا رسک وہ کسی صورت نہیں لے سکتی تھی۔ میر سکندر علی کے ساتھ اس کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے وہ ہر صورت یہ کام کرنے کی پابند تھی۔ اس کی رہائی کا پروانہ اسی شخص کے ہاتھ میں تھا جس کے مطالبے نے اس کے سر پر آسمان لا گیا تھا۔

”کیا سوچنے لگیں آپ؟“ وہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”ہم نے تو آپ کے حکم پر اسی لئے سر تسلیم خم کر لیا تھا اور آپ ہماری ذرا سی خوشی کے لیے اتنا سوچ رہی ہیں۔“

زنبب کے ذہن میں آنندھیاں چل رہی تھیں۔ اس کا وجد گولوں کی زد میں تھا۔ آگ کا ایک سمندر تھا جس کے دوسری جانب اس کی آزادی تھی۔

”اور اگر میں اسے انکار کر دیتی ہوں تو سکندر علی کبھی آزاد نہیں کرے گا اور پھر کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں مجھے ایسے ہی کسی مطالبے پر سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ اگر زہر کا پیالہ پینا ہے تو کل کا انتظار کیوں کروں..... آج کیوں نہ جان سے گزر جاؤں۔“ اس کے اندر شور مچا جاو رہا تھا بیٹھنے لگا۔

”کچھ کہیے عزیز من!“ وہ سراپا سوال بنا بیٹھا تھا۔

”مجھے، مجھے منظور ہے۔“ اس نے تھوک لگایا تھا۔



شہر کے بہترین ہوٹل کے تھریڈ فلور پر اس کا انٹرویو تھا۔ اس کے اپنے خیال کے مطابق اس کا انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا۔ انٹرویو بورڈ کے تمام اراکین کے سوالات کے جوابات اس نے بڑے تسلی بخش، بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دیے تھے۔ اس نے باہر آ کر سگریٹ سلگایا اور ہال کی جانب چل دیا۔ وہ کچھ دیر اطمینان سے بیٹھ کر ایک کپ اچھی سی چائے پینا چاہتا تھا۔ پھر اسے اپنے میزبانوں کی طرف جانا تھا۔

حالانکہ اب اس کا اس دنیا میں کسی سے بھی ملنے کوئی نہ چاہتا تھا لیکن آپا کی محبت کے ہاتھوں وہ مجبور ہو جایا کرتا تھا۔ شاید محبت کے ہاتھوں ہار جانا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ چائے کا آرڈر دے کر وہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ یہ غلطی وہ اکثر کرتا تھا، چشم تصور میں ایک لخت کچھ چراغ جھلملائے اور ان چراغوں کی لوؤں کی اوٹ سے اس کا مسکراتا چہرہ نظر آنے لگا۔ اس سے ہر ناٹوٹ چکا تھا لیکن تصور کا ناٹا شاید کسی، کسی سے نہیں ٹوٹا۔ وہ ہر دوسرے بل اس کے تصور کی دنیا میں وارد ہو جایا کرتی تھی۔ ایک زخم تھا جو دیکھنے لگتا تھا۔ ایک درد تھا جو اٹھنے لگتا تھا۔ اس کی یاد میں کوئی خوشی نہ تھی۔ غم ہی غم تھا۔

ویٹرنے چائے کی مشٹری اس کے سامنے لا کر رکھی تو برتنوں کی کھٹک نے اسے چونکا دیا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

اسٹیج پر بیجے آرکسٹرا کی نرم، دھیمی دھن اس کی اذیت میں اضافہ کرنے لگی۔ ایسی دھنیں کیوں بنائی جاتی ہیں، کیوں بجائی جاتی ہیں جو دل

کے درد کو ہمیز کر دیں۔ زخموں کے کھر غڑ کھر پنے لگیں۔ کچھ ایسا یاد دلانے لگیں جو انسان بھولنا چاہتا ہو۔

وہ اپنی پیشانی مسل رہا تھا جب اس نے ہال کا دروازہ کھلتے اور ایک جوڑے کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے دماغ میں ایک جھمکا کا سا ہوا۔

”تصور کا فریب..... نظر کا دھوکا.....“ اس نے ہمیشہ کی طرح سوچا تھا۔

ایسے فریبوں کا وہ اکثر شکار ہو جایا کرتا تھا۔ ایسے دھوکے اسے ہوتے رہتے تھے۔ لیکن..... لیکن شاید اس بار یہ فریب نہ تھا۔ شاید اس بار حقیقت اپنی پوری تکیوں کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پیشانی پر رکھے ہوئے ہاتھ سے اپنا چہرہ تقریباً ڈھانپ لیا۔ وہ دونوں لمحہ بہ لمحہ قریب آرہے تھے۔

ہاں! اس مرتبہ حقیقت اپنی پوری تکیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ نہنہ تھی۔ نہنہ سکندر علی! لیکن جو مراد اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اس کے وجود کو خود سے لگائے اس کے ہمراہ تھا وہ میر سکندر علی نہیں تھا۔ لبوں پر خوبصورت مسکان سجائے وہ وجیہہ شخص اسے یوں خود سے لگائے ہوئے تھا جیسے وہ اسی کی ملکیت تھی۔

ہلکے گلابی لباس میں ملبوس نہنہ کسی گڑیا کی مانند خوبصورت مگر خطرناک حد تک بے جان نظر آ رہی تھی۔ اسی کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ وہ بیروں کو اس طرح گھسیٹ کر چل رہی تھی۔ جیسے اس میں انہیں اٹھانے کی سکت نہ ہو۔ وہ دونوں اس کے دائیں جانب والی میز پر آ بیٹھے تھے۔

”کیا متواؤں آپ کے لیے؟“ ذوالفقار جنجوعہ نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تھوڑا سا زہر“ اس کے ذہن میں اس سوال کے جواب میں پہلی سوچ ابھری تھی۔ ”مجھے بس چنگی بھرز ہر چاہیے..... جو اتنا سر بلع الاثر ہو جو لمحہ بھر میں میری سوچوں کی ہر پردہ کو منقطع کر دے۔ میرے دل کی ہر دھڑکن کو جائد کر دے۔ پل بھر میں میری روح کو اس گندے لباس سے چھٹکارا دلا دے کہ اب میں جینا نہیں چاہتی..... یہ دنیا مجھے تیزاب سے بھرا ہوا برتن لگ رہی ہے۔ میرا وجود گلی، سڑ رہا ہے۔“ بڑی خاموشی سے ایک آنسو اس کی پلک پر اٹھ رہا۔

”ارے.....“ وہ ہنسا تھا۔ ”رات اتنی بری تو نہ گزری تھی۔ رو کر مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔ میں نے تو آپ کا بڑا خیال رکھا ہے..... جتنا کسی کا بچ کر گڑیا کا رکھا جاتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ بھڑکی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لیکن کا بچ بھر بھی ٹوٹ گیا ہے اور سارے ٹکڑے میری روح میں پیوست ہو گئے ہیں کسی نہ نکلنے کے لیے!“

”اوہ.....“ وہ مسکرانے لگا۔ ”الفاظ کی بازی گری سے بھی واقف ہیں۔ آپ واقعی شاندار خاتون ہیں نہنہ..... ہم تو آپ کے معترف ہو گئے ہیں بلکہ اسیر کیسے، دل چاہتا ہے آپ کی ہر بات اپنے نام کھوائی جائے۔ کیا خیال ہے؟ میر سکندر علی سے کوئی ذیل کی جائے؟“ اس کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔

”ٹھیک ہی تو ہے۔ ایسے الفاظ ہی میرا مقدر بننے چاہئیں جو مجھے احساس دلائیں کہ میں کیا ہوں؟“

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟ آپ کی افسردگی میرے بے حد خوشگوار موڈ پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ پلیز اسائل..... یہ تھوڑا سا وقت مجھے اور انجوائے کرنے دیں۔ نجانے پھر میر صاحب کو ہم سے کب کام پڑتا ہے۔“ وہ شرارتی انداز میں بولا۔

اسی لمحے بائیں جانب والی میز پر بیٹھا ہوا آدمی اٹھا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کی جانب چل دیا۔ راستے میں ان کی میز تھی۔ وہ لمحہ بھر کو رکھا۔ نہنہ کی آنسوؤں سے لبریز نظریں انہیں اور اس کی نظروں سے الجھیں۔

اس کا دل دھڑکنا بھول گیا سانس اپنی جگہ قہم گئی۔ نگاہیں وہیں جم گئیں۔ پھر احسن اگلے ہی لمحے آگے بڑھ گیا تھا۔

اس کے جسم میں جان نہ تھی جو وہ اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگتی۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی ورنہ وہ اسے پکارتی۔ بس وہ بھٹی بھٹی

نگاہوں سے اسے وہاں سے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ اسے کیسے پکارتی، کیسے روکتی؟ اس کے پہلو میں ایک غیر مرد موجود تھا۔ اس کے چہرے پر گزری ہوئی رات کا لمحہ کچھ گھبراہٹ تھا۔

اس کی آنکھوں میں اپنی جاں بلب ناموس کا نو حرقم تھا۔ وہ اسے کیسے روکتی۔

آہ! سامنا ہوا بھی تو کب، کیسے موڑ پر آکر! اس کے اندر آندھیاں اٹھ رہی تھیں، مگر باہر سے اس کا وجود ساکت تھا۔

بھریکا ایک اس کے لبوں سے کچھ بے معنی آوازیں برآمد ہوئیں اور وہ ایک جانب لڑھک گئی۔ اس کے ساتھ بیٹھے ذوالفقار جنوہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ وہ مدد کے لیے ویٹر کو پکارنے لگا۔



اپنی وسیع و عریض، عالیشان خواب گاہ میں وہ اپنے آرام دہ مسٹر پریم دراز تھی۔ ابھی ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر کے باہر نکلا تھا۔ گزشتہ ہفتہ بھر سے اس کی خدمت پر مامور نرس کو بھی جھٹی دے دی گئی تھی۔ اس کی کنڈیشن اب اطمینان بخش تھی۔

آرام کر سی پر بیٹھ کر سگار پیتے ہوئے سکندر علی کی آنکھوں میں گہری سوچ کی چھاپ تھی۔ کبھی کبھار وہ ایک نگاہ زینب کے سہ ہونے چہرے پر ڈال لیا کرتا تھا۔ وہ نیکی سے ٹپک لگا کر آنکھیں موندے ہوئے تھی۔

”ڈاکٹر ز کہتے ہیں..... یہ ایک معمولی، نوعیت کا انیک تھا۔“ وہ چند لمحوں کے بعد بولا۔ ”اس کے لیے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں..... ہاں آئندہ کے لیے احتیاط کی ضرورت ہے۔ دوائیاں نام پر لینا اور کسی بھی بات کی ٹینشن نہ لینا بے حد ضروری ہے۔ میرا خیال ہے..... اس الو کے پٹھے نے تمہیں ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ تم بے حد نازک بھی تو ہو۔“

اس نے آنکھیں کھول دی تھیں لیکن کچھ بھی کہے بغیر وہ بھٹس اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”میرا خیال ہے..... میں نے تمہیں غلط طریقے سے استعمال کیا ہے۔“ اس نے اپنے چہرے پر ندامت کا تاثر اٹانے کی کوشش کی۔ ”آئی ایم ویری سوری زینب! میں آئندہ کے لیے محتاط ہو چکا ہوں۔ اب میں تمہیں ہمیشہ خود تک محدود رکھوں گا۔ ہمارے بیچ کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔ تم اس ٹینشن سے باہر نکلو۔“

”ہمارے بیچ..... اب کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ یک لخت بولی تھی۔

اندرونی تھکن اور فقاہت کے باوجود اس کی آواز بلند اور پاٹ دار تھی۔ سکندر علی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”آپ شاید وہ معاہدہ بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں سکندر صاحب! لیکن ایک ہارٹ انیک سے میری یادداشت اتنی متاثر نہیں ہوئی..... میرے لیے وہ رات، رات نہیں تھی۔ وہ ایک آگ کا کنواں تھا جس میں چھلانگ لگانے سے پہلے میں نے سو بار سوچا تھا لیکن بد قسمتی سے میرے پاس اس کنویں میں چھلانگ لگانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کیونکہ میں نے خود کو اس معاہدے کی پابند جانا تھا۔ میں اس کنویں سے اپنی رہائی کا پروانہ لے کر ایک جلعے ہوئے، سڑے ہوئے وجود کے ساتھ باہر نکلی ہوں۔ میں آپ کے لفظوں کے جال میں بھٹس کر رہی بات بھول نہیں سکتی کہ اب آپ، اصولی طور پر مجھے رہا کرنے کے پابند ہیں۔“

”آہاں..... ہاں ہاں ٹھیک ہے!“ وہ قدرے گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ ”میں اپنی زبان سے پھر نہیں رہا ہوں۔ ویسے میں دلی طور پر اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ تم اگر جاہلو تو.....“

”میں محض آزادی چاہتی ہوں ہر قیمت پر۔“ اس کا لہجہ جتنی تھا۔ ”بلکہ قیمت میں ادا کر چکی ہوں۔“

میر سکندر علی آنکھوں میں گہری سوچ لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔



”احسن..... احسن..... بیٹا!“ فرخندہ آپا خوشگوار انداز میں مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔

اسنے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کو قریب رکھی ہوئی الٹیں لڑے میں مسل دیا اور انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں کے نرم گوشے صاف کرنے لگا۔

”یہ لو..... لیٹر آیا ہے اسلام آباد سے۔ ذرا جلدی سے کھلو اسے اور خوشخبری سناؤ۔“ وہ سیدھا ہوا بیٹھا۔

لیٹر اسی کمپنی کی جانب سے تھا جس میں نوکری مل جانے کی اسے قوی امید تھی۔

اس نے لفافہ چاک کیا۔ فرخندہ آپا بڑی بے تابی سے قریب آ بیٹھی تھی۔

سفید کاغذ پر چند سطریں رقم تھیں۔ اس کے لبوں پر تھکی تھکی سی مسکان آ گئی۔

”نوکری مل گئی ہے آپا۔“

”اوہ میرے خدا..... تیرا شکر ہے۔“ فرخندہ آپا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ”خدا میرے بچے کو قدم قدم نئی کامیابی سے سرفراز

فرمائے۔ آمین!“

پھر انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

”میں نہ کہتی تھی تم سے..... جتنی تکلیفیں مقدر میں ہوتی ہیں، وہ اپنے آگے آتی خوشیوں کا پیغام بھی لاتی ہیں۔ تم کہتے تھے نا..... یہ بڑی

اچھی نوکری ہے؟“

”ہاں آپا..... اچھی ہے۔ عزت والی جگہ ہے۔ تنخواہ بہت پرکشش ہے۔ دیگر مراعات بھی ہیں۔ نوکری تو بہت اچھی ہے۔“

وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

”تو مسکراؤ نا میرے بچے! خوشی کا کچھ اظہار کرو۔ ہر وقت اداسی کی اسی سیاہ چادر میں لپٹے رہتے ہو۔ احسن! خدا کو بھی یہ بات ناپسند ہے

کہ انسان ہر وقت کسی حادثے کے سوگ میں خود کو مبتلا رکھے۔ خوشیوں کا اظہار خود پر حرام کر ڈالے۔“

”نہیں آپا! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اداس نہیں ہوں۔ اس نے مسکراتا چاٹا ہونگنا کام رہا۔

”اب تم کچھ بھی کہو۔ خواہ کتنا ہی انکار کرو۔ میں آج ہی صوفیہ کے گھر جاؤں گی اور اس کی ماں سے بات کر دوں گی۔ وہ بے چاری بھی بیٹی

کے غم میں بیمار رہتی ہے اور بیٹی ہے کہ تمہارے نام زندگی لکھ کر ہر خوشی سے ہاتھ اٹھا کر بیٹھ گئی ہے۔“

ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

”آپا.....! کیوں میرا امتحان لیتی ہیں۔ میں کیسے کہوں آپ سے..... میرے دل میں اس لڑکی کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اسے کچھ

نہیں دے پاؤں گا۔“

”یہ باتیں قبل از وقت ہیں۔ جس کے لیے تمہارے دل میں بہت کچھ تھا، اس نے تمہیں کیا دیا یا تمہاری دی ہوئی کس چیز کو قابل احترام

جانا۔ دلوں کے جذبے بدلتے رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے صوفیہ کے جذبوں پر۔ وہ بہت جلد تمہیں اپنا اسیر کر لیں گے۔ تم اسے موقع دو۔“

جواب دہ خاموش رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی جانب سے کسی جواب کی توقع رہی پھر اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

”جس کے لیے تمہارے دل میں بہت کچھ تھا.....“

اس کے اندر فرخندہ آپا کے الفاظ گونجنے اور تصور کے افق پر پھر اس کا چہرہ نمودار ہو گیا اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں، ان آنکھوں سے

چھلکا دل کا درد، غم کا قصہ سناتی نگاہیں وہ کہنے کی سی کیفیت اور..... اس کے پہلو میں بیٹھا، مسکراتا ہوا شخص سمجھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ دل یقین اور

بے یقینی کی کیفیت میں گھرا ہوا تھا۔

”کیا اس کے لیے دل میں ابھی بھی کچھ ہے؟ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کا خیال دل سے کسی آنکھوں کی طرح لپٹا ہوا ہے.....

کیوں؟“



جیلہ کی ہمراہی میں آمنہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ نہنب کو اسے دیکھ کر ناقابل بیان خوشی ہوئی، وہ بستر سے اٹھ کر اس کے گلے جا لگی۔
 ”نہنب یہ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا؟“ آمنہ اسے علیحدہ کر کے تشویش سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”تم نہنب ہی ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا۔“

وہ ہولے سے ہنس کر سامنے گلے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ آمنہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سوچوں کی ناقابل بیان تپش نے اس کے وجود کو جیسے جھلکا کر رکھ دیا تھا۔ سانولی پڑتی رنگت، گہرے حلقوں اور سیاہ لبوں نے اس کی تمام خوبصورتی کو ڈھانپ لیا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ اس پر اس کے گلے لباس اور اچھے بالوں نے رہی تھی کسری بھی پوری کر دی تھی۔

”کیا ہوا ہے نہنب تمہیں؟“ آمنہ بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ ”تم بیمار ہو کیا؟“
 ”میری روح بیمار ہو گئی ہے آمنہ!“ وہ اداسی سے بولی۔ ”مجھے دیک لگ گئی ہے۔ میں کھوکھلی ہوئی جا رہی ہوں۔“
 ”اتنی دل برداشتہ مت ہو میری بہن..... میں تو کب سے تمہیں ایک خوش خبری سنانے کے لیے بے چین تھی، آج تمہارا سندید ملا تو بھاگی چلی آئی ہوں۔“

”خوش خبری؟“ وہ اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں..... احسن بھائی یہیں ہیں۔ اسی شہر میں، فرخندہ آپا کے گھر رہتے ہیں۔ انوار خود معلوم کر کے آئے ہیں۔“
 نہنب بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم سچ کہہ رہی ہو؟ لیکن احسن کو تو میں نے اسلام آباد میں دیکھا تھا؟“
 ”ہاں..... پچھلے دنوں وہ کوئی انٹرویو دینے کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ انوار بھی ان ہی دنوں فرخندہ آپا کے گھر گئے تھے۔ کیا تمہاری ان سے ملاقات ہو چکی ہے؟“

”ملاقات؟“ اس کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی تھی۔
 ”سکندر علی سے تمہاری بات ہوئی؟ وہ کیا کہتے ہیں؟“ آمنہ پوچھنے لگی۔
 نہنب کا سر تکی میں ہلنے لگا۔

”میں جانتی ہوں..... وہ کسی صورت اس پنجرے کا دروازہ کھولنے پر راضی نہ ہوگا لیکن میں بھی طے کر چکی ہوں! آمنہ! ہر صورت ہر قیمت میں آزاد ہو کر رہوں گی۔ میں نے اس سونے کے پنجرے سے باہر نکلنے کے لیے بہت بڑی قیمت چکانی ہے..... اگر مجھے اس سے بڑی کوئی قیمت ادا کرنی پڑی تو وہ بھی کروں گی۔“

”جو کرنا ہے سوچ سمجھ کر اور جلد کر لو۔ نجانے کیا بات ہے نہنب..... یہ سب کچھ سوچتی ہوں تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم جلد سے جلد اس شخص سے جان چھڑا کر پھر سے اپنی جنت میں لوٹ جاؤ۔ خدا کرے احسن بھائی تمہیں قبول کر لیں تو تمہارے وجود میں پھر سے گلاب کھل اٹھیں۔“

”میرے جسم پر جو رنگ آلود سونیاں گزری ہیں آمنہ..... انہیں کون نکالے گا؟“
 وہ دیوار پر لگا ہیں مرکز کر کے سوچ رہی تھی۔



چند دن اور گزر گئے تھے۔ میر سکندر علی کی جانب سے خاموشی چھائی تھی۔ وہ روزانہ اس کا انتظار کرتی تھی..... نہایت بے چینی اور بے تابی سے لیکن وہ نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اب اس کی بے چینی اور بے تابی میں غصے اور جھنجھلاہٹ کی آمیزش بدھتی جا رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں..... میں جانتی ہوں..... میں تمہارے لیے کیا ہوں۔“ اس روز اسے اچانک نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ میر سکندر علی کی قد آدم تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”میں تمہارے لیے ہر روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہوں اور تم اتنے بے وقوف نہیں ہو جو اس مرغی کو ذبح کرنے کا سوچو۔ تم چاہو گے کہ میں یونہی تمہاری قید میں مقید، سونے کے انڈے دیتی رہوں لیکن تم جانتے نہیں کہ تمہاری اس قید نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ میں تمہیں وہ سبق سکھاؤں گی کہ تم ساری عمر یاد رکھو گے۔ اس حسن کی وجہ سے یہ قید ہے نا؟ سارا جھگڑا اس چہرے کا ہے نا میر سکندر علی؟ اس چہرے کا..... اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔“

اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔ پھر یکایک ہی وہ مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”جیل..... اسلم!“ وہ میز صوف کی جانب مڑتی ہوئی ریٹنگ کے قریب آ کر چلائی تھی۔ جیلہ دوڑی چلی آئی۔

”جی..... جی بیگم صاحبہ؟“ وہ گھبرا گئی تھی کہ آج سے قبل اسے کبھی اس طرح نہ پکارا گیا تھا۔ ”ڈرائیور سے کہو گا ڈی نکالے مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔“

”جی..... جی کہتی ہوں بی بی جی۔“ اس نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔

وہ دوبارہ کمرے میں چلی آئی۔ لباس تبدیل کر کے اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور نیچے چلی آئی۔

”تمہارے صاحب آجائیں یا ان کا فون آئے تو کہنا، میں شاپنگ کے لیے گئی ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آؤں گی۔“

وہ مرکزی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی تھی۔

”جی بیگم صاحبہ!“

ڈرائیور کو لیے وہ کچھ دیر یونہی بے مقصد پھرتی رہی تھی۔ پھر اس نے ایک شاپنگ مال کا نام لیا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل کچھ تانے بانے بننے میں مصروف تھا۔ دل میں ایک آگ بھڑک رہی تھی۔

ڈرائیور نے پارکنگ ایریا میں گاڑی لے جا کر پارک کر دی تو وہ اسے انتظار کرنے کا کہہ کر باہر نکل آئی۔

شاپنگ مال کے ایک دروازے سے داخل ہو کر وہ ایک بنگلی دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔ وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر وہ ایک مصروف

بازاری علاقے میں چلی آئی۔ یہاں اسے ایک دوکان کا علم تھا جہاں اس کی مطلوبہ شے مل سکتی تھی۔ کافی زیادہ رقم دے کر اس نے اپنی مطلوبہ شے

حاصل کر لی۔ اسے ہینڈ بیگ میں رکھ کر وہ مطمئن انداز میں ٹیکسی میں آ بیٹھی۔

اب وہ واپس شاپنگ مال کی جانب جا رہی تھی۔



پرایا آسمان

پرایا آسمان رشتوں میں گندھی ہوئی کہانی ہے جو اس قدر قریبی ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر ہم ادھورے اور نامکمل ہوتے

ہیں مگر اس کے باوجود جب انہی رشتوں کو دولت کے پیانے پر تو لے لگتے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں، لیکن

یہ سچ ہے کہ جہاں رشتوں کے بندھن اور محبت کا معیار پیسہ بن جائے وہاں خون کے رشتے کہیں دفن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کتاب گھر کے

ناول سیکشن میں محمد اعظم خاں کا یہ ناول بہت جلد آ رہا ہے۔

پورے پندرہ دن بعد وہ لوٹا تھا۔

اسے دیکھ کر زینب کے پورے بدن میں شدید غصے اور نفرت کی ایک لہر اٹھ اٹھی تھی۔

”ہیلو ڈارلنگ!“ بریف کیس ایک جانب رکھ کر وہ اس بے قراری سے اسکی جانب بڑھا جیسے وہ اسکے لیے اتنے دن سے تڑپ رہا ہو۔ زینب نے ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کرالیا اور قدرے دور چلی گئی۔

”ایک تو تم خنا بہت جلدی ہو جاتی ہو۔“ اس کی ہنسی میں قدرے خفت شامل تھی۔

”کہاں تھے آپ؟“ وہ اسے شعلہ بارنگا ہوں سے دیکھنے لگی۔ ”کیا آپ جانتے ہیں آپ نے مجھے انتظار کی سولی پر ٹانگ رکھا تھا؟“

”اوہ..... اوہ.....“ وہ ہاتھ مسل کر رہنے لگا۔ ”یقین کر ڈارلنگ! میں خود تم سے ملنے کے لیے بے حد بے قرار تھا لیکن مصروفیات کچھ ایسی

تھیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی نہ آسکا..... خیر اب ہم ساری شکایات کا ازالہ کر لیں گے۔“

”مجھے آپ سے ملنے کی کوئی بے قراری نہیں تھی۔“ وہ دانت پیس کر غرائی۔ ”میں محض اس قید خانے سے رہائی چاہتی ہوں جلد سے

جلد.....“

میر سکندر علی کے والہانہ انداز ایک نکت غائب ہو گئی۔ اس کی ہنسیوں تن گئیں۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر وہ اس کے قریب چلا آیا۔

”یہ فتور تمہارے دماغ سے نکل نہیں؟“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

زینب کا دل لمحہ بھر کے لیے کانپا، اسکی نگاہوں میں عجیب سی سرد مہری در آئی تھی جو اس کے بدن کو شہنشاہ کے بدن کے رکھ دیتی تھی۔

پھر اس کے کانوں میں آمنہ کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے کہا تھا ایسے لوگ اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں۔

”یہ فتور نہیں..... ایک قطعی فیصلہ ہے۔“ اس کی آواز جھمی پڑ گئی۔ ”آپ مجھے زبردستی اپنا قیدی بنا کر رکھیں گے تو یہ ہم دونوں کے لیے اچھا

نہ ہوگا۔“

”میں اپنے مفادات تم سے بہتر طریقے سے جانتا ہوں.....“ وہ پھنکارا۔ ”اور ایک بات اچھی طرح سے سن اور سمجھ لو۔ اگر اس عالیشان

محل کو تم اپنا قید خانہ سمجھتی ہو تو پھر اس قید خانے کو اپنا نصیب سمجھ لو اور ایک بات اور..... تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں تم سے کہوں گا..... اس میں تمہاری

خوشی اور بھلائی پوشیدہ ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارے ساتھ حتی الامکان نرم برتاؤ کروں..... مگر تم نے مجھے مجبور کر دیا۔“

”کہہ آپ اپنے چہرے پر لگا یہ نقاب اتار پھینکیں۔“ وہ ہر خند لہجے میں بولی۔

”جو بھی سمجھو!“ وہ یکا یک پرسکون نظر آنے لگا۔ ”بہتر یہی ہے کہ دماغ کے اس فتور سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کر لو۔ ایوری تھنگ از

کلیئر ٹاؤ۔“

زینب کے دل و دماغ میں الاؤ بھڑکنے لگے تھے۔ اس کا وجود جیسے جہنم کی آگ میں جھلنے لگا وہ اپنی جگہ پر کھڑی تیز تیز سانس لینے لگی،

جبکہ وہ سب کچھ کہہ کر مطمئن انداز میں کوٹ اتار کر ہنگ کر رہا تھا۔

”کل ہمارے یہاں ایک پارٹی ہے۔ یونی ایک گیٹ نو گید رہے۔ کسی خاص مقصد کے تحت ارتج نہیں کی گئی لیکن بہر حال تمہیں بہت

اچھے طریقے سے تیار ہونا ہے۔ بہت اچھے طریقے سے لوگوں سے ملنا ہے۔ کوئی اچھا ڈریس منتخب کر دیا جا ہو تو شام کو ہم شاپنگ کے لیے چلے چلیں

گے۔“

وہ اب بے حد پرسکون انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں ذرا ہاتھ لے کر فریٹش ہو جاؤں پھر ہم مزید بات کرتے ہیں۔“

”ہاں..... ہاں میں جانتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ تم یہی بات کرو گے۔ تم جیسے اخلاقی پستی کی حدوں میں گرے ہوئے انسان سے

میں نے اگر قول و فعل کی پابندی کی توقع رکھی تو یہ میری غلطی تھی۔ اس غلطی کا اور اپنی ہر غلطی کا کفارہ میں ہی ادا کروں گی۔ تم مجھے قید کر کے رکھنا چاہتے

ہوتا؟ دیکھتی ہوں کس طرح سے قید کرتے ہو مجھے..... یہ حسین چہرہ ہی اس قید کی وجہ ہے تو آج یہ وجہ ختم ہو جائے گی۔ مجھے چارہ بنا کر دوسروں کے آگے پیش کرتے ہو..... آج کے بعد تمہیں اس خیال سے ہی شرمندگی ہوگی، بس، اب یا میں نذر ہوں گی یا یہ قید نذر ہے گی..... تمہیں اب مجھ سے کوئی فیض حاصل نہ ہوگا۔ اتنا طے ہے میرا سکندر علی!“

اس نے ایک عالم وحشت میں الماری کھول کر ایک بوتل نکالی تھی۔
 ”اپنی ہر غلطی کا کفارہ میں ادا کروں گی..... ہر غلطی کا.....“ وہ اس کا کارک کھولتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ ”میرے دماغ کا فتور، میری ہر غلطی کی بنیاد..... یہ چہرہ ہی ہے نا..... آج میں اسے مٹا کر خاک کر دوں گی۔“
 اس نے بوتل اپنے سر پر اٹھایا شروع کی..... دوسرے ہی لمحے اس کی بھیانک چیخوں نے کمرے کے دروازے پر ہلا کر رکھ دیے۔ بوتل پھینک کر وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی پھر اگلے ہی لمحے وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آ رہی تھی۔
 ہاتھ روم سے ٹاول باندھے ہوئے میرا سکندر علی گھبرا ہوا برآمد ہوا تھا۔ پھر نوب کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ تقریباً! بھاگتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تھا اور چیخ چیخ کر ہر ملازم کو آواز دینے لگا تھا۔



کوئی نا معلوم شخص اسے نیم مردہ حال میں ہسپتال کے دروازے پر چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ ”بچنے کی امید تو بالکل نہیں ہے۔ بہر حال ہم کوشش کر دیکھتے ہیں۔“
 ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کرتے ہوئے کہا تھا۔



نجانے کتنے دن موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ زیست کی جانب لوٹ آئی تھی۔ کسی نہایت مضبوط اور اٹل تمنانے اسے موت کے رستے سے واپس بلا لیا تھا۔
 ”کیا نام ہے آپ کا؟“
 ڈیوٹی پر موجود ایک لیڈی ڈاکٹر نے نہایت سترم آواز میں اس سے پوچھا تھا۔
 وہ ایک کراہ کے سوا کچھ جواب نہ دے سکی۔ اس کا راس وجود جیسے کسی تیل کے کھولنے کڑھائی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”آپ ہوش میں ہیں..... کیا آپ اپنا نام بتا سکتی ہیں؟“
 اسے وہی سترم آواز دو بارہ آئی لیکن وہ کراہوں اور سسکیوں کے سوا حلق سے کوئی دوسری آواز نہ نکال سکی۔
 ڈاکٹر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور قدرے فاصلے پر چلی گئی۔
 ”نجانے اس غریب کے ساتھ کس نے درندگی کا یہ مظاہرہ کیا ہے۔“
 ”اس کی قسمت اچھی تھی ڈاکٹر صاحب! جو یہ بچ گئی۔ یہ تو بالکل مردہ حالت میں ملتی تھی۔ اسے جو چھوڑ کر گیا ہے شاید اس نے بھی اسے مردہ ہی سمجھا تھا۔“ ڈیوٹی نرس بولی تھی۔

”یہ غریب مر رہی جاتی تو اس کے لیے اچھا تھا۔“ ڈاکٹر دکھ سے بولی تھی۔ ”اس کا سر، چہرہ، گردن بالکل جھلس گئے ہیں۔ آئینہ دیکھے گی تو خود سے گھن آئے گی اسے نقش بالکل ختم ہو گئے ہیں سر کی کھال جل گئی ہے۔ مجھے حیرت ہے۔ یہ بچ کیسے گئی؟ بہت طاقتور تیزاب ڈالا گیا ہے اس کے

اوپر۔ نجانے کون درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کا یہ حال کیا ہے۔“
 ”اس دنیا میں درندوں کی کمی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!“ نرس نے تاسف سے سر ہلایا۔
 ڈاکٹر اپنا راولڈ مکمل کرنے چلی گئی تھی۔



اس کا سر اور چہرہ پیٹوں سے جکڑا ہوا تھا۔ بستر پر وہ چکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ ڈیوٹی نرس اس کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔
 ”اب آپ کی حالت بہتر ہے۔۔۔۔۔“ وہ کہہ رہی تھی۔
 ”اب آپ بات وغیرہ بھی کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔ نیم بے ہوشی کے درمیان آپ نے کئی مرتبہ پانی وغیرہ مانگا ہے لیکن ہوش میں آکر آپ کچھ نہیں بولتے۔۔۔۔۔ یہ پولیس کیس ہے، ابھی آپ کا بیان ریکارڈ ہونا ہے لیکن آپ کچھ بولتی ہی نہیں۔“ وہ خاموش اور ساکت بیٹھی رہی۔
 ”اپنا نام اور پتا وغیرہ بتائیں تاکہ ہم آپ کے گھر والوں سے کاٹیکٹ کر سکیں۔ ہمیں بتائیں، کس نے آپ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟ یہ پولیس کیس ہے، پولیس والے دوسرے آپ کا بیان لینے آچکے ہیں لیکن آپ کی حالت اس قابل نہ تھی کہ آپ کا بیان لیا جاتا لیکن اب تو آپ کی حالت بہتر ہے آپ بیان دے سکتی ہیں۔“
 ”مجھے۔۔۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔۔۔۔۔ کچھ یاد نہیں ہے۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ نرس اس کے قریب چلی آئی۔
 ”کچھ یاد کریں۔۔۔۔۔ اپنا نام۔۔۔۔۔ اپنا گھر۔۔۔۔۔“
 ”مجھے کچھ یاد نہیں ہے سسر۔۔۔۔۔ میں کوئی بیان نہیں دینا چاہتی۔۔۔۔۔“ وہ سکنے لگی تھی۔
 ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ وہ اس کا شانہ تھپکنے لگی۔ ”پریشان مت ہوں، بالکل ایزی رہیں کوئی آپ سے بیان لینے نہیں آئے گا۔ روئیں مت، پلیز!“



”آؤ۔۔۔۔۔ اندر آ جاؤ!“ فریدہ نے اپنے کوارٹر کا دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ”بے فکر رہو، یہاں میرے سوا کوئی نہیں رہتا۔“
 وہ اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔
 ”اب چادر اتار دو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے اور اپنے لیے کھانا لاتی ہوں۔“ وہ اپنا دوپٹہ تہہ کر کے رکھتے ہوئے بولی۔
 اس کے جانے کے بعد وہ آہستگی سے کمرے کے بچوں بیچ پڑی چار پائی کے کونے پر ٹنگ گئی۔ اس نے کمرے میں جس کے باوجود پانی چادر نہیں اتاری تھی۔ بڑی سی چادر سے صرف اس کی ایک آنکھ نظر آ رہی تھی۔ باقی سارا وجود سیاہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔
 وہ کچھ دیر تک کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ غربت اس گھر کے کونے کونے سے عیاں تھی۔ ایک کمرے اور ایک برآمدے والے اس گھر کا پہلی نظر میں ہی پورا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔
 ایک چار پائی اور کونے میں رکھی ایک خستہ حال میز کے سوا کوئی تیسری شے کمرے میں نہ تھی۔ دیوار میں بنی سینٹ کی الماری پر ایک پرانا سا پردہ ڈالا گیا تھا۔

میز پر ایک استری، کچھ کتابیں اور ایک پرانا سا ریڈیو پڑا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواروں کی سفیدی اکڑ چکی تھی اور فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ باہر برآمدے میں ایک جھلجھلی چار پائی پڑی تھی اور ایک کونے میں پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ برآمدے کے ساتھ تھوڑی سی جگہ میں کچن اور ٹوائلٹ وغیرہ بمشکل تعمیر کیے گئے تھے۔
 یہ نرس فریدہ کا کوارٹر تھا۔ وہ نہ نب کو اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ ہمدرد اور ٹھنڈے مزاج کی اس عورت نے اسپتال میں قدم قدم پر اس کا بڑا

ساتھ دیا تھا۔

فریدہ ٹرے میں کھانا رکھ کر لائی تو وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”ارے.....“ اسے حیرت ہوئی۔ ”تم اب تک یونہی بیٹھی ہو۔ یہ چادر اتار دو بہن..... یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ٹھہرو، میں پنکھا چلاتی ہوں۔“

وہ کھانا چارپائی پر رکھ کر سوئچ بورڈ کے قریب گئی۔ زینب نے پلیٹ میں بڑی پتلی اور پتلی دال پر ایک نگاہ ڈالی۔ ساتھ کٹوری میں آم کا اچار تھا۔ دسترخوان میں دوٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اسٹیل کے چھوٹے سے جگ میں بھرے پانی میں برف کا ڈالتیر رہا تھا۔

نجانے کیوں کھانے کی ٹرے دیکھ کر اس کے دل میں برسوں بعد پیٹ بھر کر کھانا کھانے کی امنگ جاگی۔ اسے اس زور کی بھوک محسوس ہوئی جیسی برسوں پہلے اسکول سے لوٹ کر محسوس ہوا کرتی تھی۔ شاید کھانے کی اس ٹرے نے اس کے ذہن میں ماضی کے درپے وا کر دیے تھے۔

اس نے چادر اتار کر ایک طرف رکھی اور کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ ہر چند کہ دال بالکل بے ذائقہ تھی اور اچار بھی برسوں پرانا معلوم ہوتا تھا پھر بھی اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

”اب تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔“ فریدہ برتن سمیٹتی ہوئے بولی۔ ”میں برآمدے میں لیٹ جاتی ہوں۔“

”نہیں، ادھر ہی آ جاؤ!“ زینب بولی۔ ”باہر گرمی ہوگی۔“

”اچھا..... میں اپنا ستر نیچے ڈال لیتی ہوں۔“

وہ برتن دھوئے چلی گئی تو زینب لیٹ کر چھت پر بے دلی سے گھومتے پچھتے کودیکھنے لگی۔ اس کی ہوانہ ہونے کے برابر تھی۔

تھوڑی سی دیر میں فریدہ بھی آگئی اور اپنی دردی بچھا کر اس کی چارپائی کے قریب ہی لیٹ گئی۔

”فریدہ!“ کچھ دیر بعد زینب بولی تھی۔ ”میں تمہاری شکرگزار ہوں، تم نے میری بے حد مدد کی ہے۔“

فریدہ دھیرے سے ہنس دی۔

”بہن! میں بھلا کس قابل ہوں؟ پیسہ بڑی شے ہے۔ تمہاری دو چوڑیاں اور انگلی پیچ کر جو رقم ملی تھی، اس نے سب کے منہ بند کیے رکھے

اور پولیس کا جھنجھٹ ختم ہوا۔ میرا اس میں کیا کمال؟“

”پھر بھی..... میری خاطر تمہیں اتنی رحمت کرنی پڑی.....“

”انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“ فریدہ مختصر اہول کر خاموش ہو گئی۔

دونوں کے بیچ میں خاموشی کا وقفہ آیا تھا۔ پھر فریدہ نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

”لیکن میرے خیال میں تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ تمہیں پولیس کو بیان دینا چاہیے تھا۔ وہ شخص تمہیں یوں بے دردی سے اسپتال کے سامنے

پھینک کر چلا گیا جیسے کسی کتے یا بلی کو مرنے کے بعد کہیں بھی پھینک دیا جاتا ہے۔ آخر کچھ بھی سہی، تم اس کی بیوی تو تھیں نا..... اس نے کس سفاکی سے

تمہیں مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔“

زینب آہستگی سے ہنس دی۔

”میری اہمیت اس کے نزدیک بس اتنی ہی تھی فریدہ! ساری قیمت اسی چہرے کی تھی جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے جلا ڈالا ہے اس کے

بعد مجھ اور کسی کتے یا بلی کے مردہ جسم میں کوئی فرق نہ رہا..... اور پولیس سے کچھ کہہ کر مجھے کیا مل جاتا؟ کیا کچھ ایسا ہے جو میں اب حاصل کرنا چاہوں؟

اب تو مجھے اس کا غنڈہ بھی ضرورت نہیں..... آج اگر میں جا کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور کہوں کہ میں ہوں زینب سکندر علی! تمہاری بیوی۔

مجھے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دو تو وہ پہلی فرصت میں مجھ پر تین لفظ بھیج کر مجھے گھر سے نکال دے گا۔“

”پھر..... اب تم کیا کر دو گی۔ کہاں جاؤ گی؟“

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی اور بہت دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

”بس فریہ! صرف ایک خواہش مجھے اپنے سامنے نظر آتی ہے..... وہ کہیں ملے اور میں اس کے قدموں میں سر رکھ کر اس سے معافی مانگوں۔ اپنی زندگی برباد کرنے کی، اس کی زندگی برباد کرنے کی..... ایک جنت اجاڑنے کی معافی..... اس کے بعد کیا ہوگا میں نہیں جانتی۔“ وہ دونوں پھر خاموش ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے اسے گواہی دے کر لڑتی ہوئی آواز سے توڑا تھا۔

”فریہ..... کیا وہ مجھے پہچان پائے گا؟ میں..... میں..... کیسی نظر آتی ہوں؟“

فریہ اس سوال کا کچھ جواب نہ دے پائی۔ زنبب کی دہلی دہلی سسکیاں ماحول میں ارتعاش پیدا کرنے لگی تھیں۔



فریہ کے جانے کے بعد وہ گھر میں اکیلے تھی۔

فریہ نے اسے بے حد اصرار سے روکا تھا لیکن وہ رکنا نہ چاہتی تھی۔ کوئی طاقت تھی جو اسے کسی انجانی منزل تک لے جانے پر اصرار کر رہی تھی۔

اس نے اپنی چادر نکالی اور اوڑھ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ پھر یکایک وہ رک گئی تھی۔ ایک خیال اس کے دل و دماغ میں سنناٹ پیدا کرنے لگا تھا۔

اس حادثے کے بعد سے اب تک اس نے آئینہ نہ دیکھا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی مگر اسے اسپتال میں کسی نے آئینہ فراہم نہ کیا تھا۔ یہاں آ کر بھی اس نے ادھر ادھر آئینے کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تھی لیکن شاید یہ فریہ کی شعوری کوشش تھی جو اسے کہیں بھی مطلوبہ شے دکھائی نہ دی تھی۔ تاہم، صبح اس نے فریہ کو تیار ہوتے وقت وہ آئینہ میز کی دراز سے نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ زنبب کو سوتا جان کر بے فکری سے تیار ہو کر آئینہ وہیں رکھ کر اسپتال چلی گئی تھی۔

وہ اندر کمرے میں چلی آئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا کیا حال ہو چکا ہے، پھر بھی نبھانے کیوں اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک مرتبہ آئینہ دیکھے۔ اپنا انجام وہ اپنے سامنے، اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔

کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے دراز کھولی اور اندر رکھا آئینہ نکال لیا۔ پھر اپنی تمام ہمتوں کو جمع کرتے ہوئے اس نے اسے اپنے چہرے کے مقابل کیا تھا۔

”آ..... آ..... آ.....“ ایک نکتہ تمام ہمتیں دم توڑ گئی تھیں۔

اس کے لبوں سے پہلے آہیں، پھر سسکیاں اور پھر چیخیں نکلنے لگیں۔ اس نے بہت سوچا تھا۔ ذہن میں ہزار ہا طریقوں سے اپنا چہرہ سوچا تھا لیکن یہ حقیقت جو نگاہ کے سامنے تھی، یہ ہر تصور سے زیادہ بھیک اور اذیت ناک تھی۔

اس کے چہرے پر کچھ بھی نہ تھا! نہ آنکھ، نہ ناک، بس جلی ہوئی کھال تھی اور نشانات جو نقوش کی نشاندہی کرتے تھے۔ جلی ہوئی گردن اس قدر بھیک لگتی تھی کہ اسے دیکھ کر دل باہر نکلتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ چیخ چیخ کر روتی رہی۔ دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔

”ہاں..... یہی سزا ہے..... یہی سزا ہوتی تھی۔ احسن ایاز! دیکھو تو تمہاری زنبب نے خود کو کتنی کڑی سزا دی ہے۔ کیا اب بھی معاف نہ کرو گے؟ کیا اب بھی معاف نہ کرو گے.....“



فرخندہ آہ پانے حیرت سے اپنے سامنے کھڑی اس عورت کو دیکھا تھا جس نے سیاہ چادر میں اپنا وجود چھپا رکھا تھا۔

”کیا بات ہے بی بی؟ کون ہو تم؟“ وہ اسے کوئی مانگنے والی سمجھی تھی۔

”میں..... اندر آ سکتی ہوں۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

وہ بہت دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔

”تو تم ہو.....“ پھر وہ گہری سانس بھر کر بولیں۔ ”پھر آگئی ہو؟ اب کیا لینے آئی ہو؟“

”آپا..... مجھے ایک مرتبہ احسن سے ملنے کی اجازت دے دیں۔“ اس کی کپکپاتی ہوئی آواز میں ہزار ہا التجاؤں کی گونجی صدا تھی۔ فرخندہ آپا کا دل لمحہ بھر کے لیے جیسے کسی نے اپنی نٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

”نہیں! میں نے کہا تھا نا..... احسن یہاں نہیں ہے۔“

”آپا.....“ چادر کے اندر اس کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ ”میں آپ سے کچھ چھیننے نہیں آئی ہوں میں کچھ جھین بھی نہیں سکتی..... میں..... میں صرف ایک نگاہ کی طلب گار ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے..... خدا را مجھ پر یہ احسان کر دیں۔“

”مجھے تم پر ترس آ رہا ہے نہ؟“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”لیکن میں مجبور ہوں۔ احسن نے مجھے قسم دی ہے کہ میں.....“

”قیامت کے روز میں آپ کا ہر گناہ اپنے سر لے لوں گی۔“ اس نے روتے ہوئے ان کی بات کاٹ دی۔ ”کیا اس کے بعد بھی آپ انکار کریں گی آپا؟ مجھے اندر آنے دیں۔“

فرخندہ آپا کا دل بچ بچ گیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”میں نے تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھا ہے نہ؟..... بہت محبت کی ہے تم سے..... لیکن تم مجھے سمجھ نہ سکیں..... تم کسی کو بھی نہ سمجھ سکیں..... اپنی جنت کو بھی جنت نہ سمجھیں اور اس وقت میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی بیٹی! میں تمہیں اندر آنے سے نہیں روکتی لیکن اندر تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ احسن یہاں سے جا چکا ہے۔“

”کہاں..... کہاں؟“ اس کے اندر کچھ ٹوٹنے لگا تھا۔

”چند دن قبل اس کا نکاح تھا۔ صوفیہ کے ساتھ۔ وہ لوگ میرے گھر سے ہوٹل شفٹ ہو گئے تھے۔ آج انہیں اسلام آباد جانا تھا۔ وہاں احسن کی نوکری لگ گئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ روانہ ہو گئے ہوں گے..... لیکن بیٹی! میری مانو تو اب اس سے ملنے کا خیال ترک کر دو۔ اب بھلا اس سے مل کر تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس ملاقات میں نہ تمہاری بھلائی ہے نہ اس کی۔“

وہ دروازے کا پتھارے سا کھڑکی تھی۔ احسن کا نکاح ہو گیا تھا۔ یہ خیال دل کی تمام رگوں کو کاٹتا چلا گیا تھا۔

”اور یہ تکلیف تو اس نے بھی سہی تھی نہ؟“ آج تمہیں احساس ہوا کہ یہ تکلیف کیا بلا ہے۔“

وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹ گئی تھی۔



ریلوے اسٹیشن پر بے حد مہم گہمی تھی۔ ٹرین کے روانہ ہونے میں محض چند منٹ باقی تھے۔ وہ اپنا سامان برتھ پر رکھ کر اس کے برابر آ بیٹھا۔

”پہلے کبھی ٹرین میں سفر کیا ہے!“

صوفیہ نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”آج پہلا سفر ہے اور بہت خوبصورت اور انوکھا ہوگا یہ سفر!“ خوشی کی جھلک اہٹ اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

اور نجانے کیوں ہمیشہ کی طرح اس کی مسکراہٹ نے صوفیہ کے دل کو دکھی کر دیا۔ وہ اسی طرح سے مسکراتا تھا۔ اداس آنکھوں اور بے تاثر

چہرے کے ساتھ۔ اس کی مسکراہٹ صوفیہ کے دل کو دکھی کر دیا کرتی تھی۔ جیسے وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر جبراً مسکراتا ہو۔

”پیارے محسوس ہوتی ہے۔“ وہ اپنے خیال کی زد سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ وہ چونک اٹھا تھا۔

”او..... سوری صوفیہ! مجھے دھیان نہ رہا۔ مجھے جوس یا کولڈ ڈرنگس وغیرہ لینی چاہیے تھیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔“
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”رہنے دیجیے۔“ وہ جلدی سے بول پڑی۔ ”ٹرین چلنے والی ہے۔ آگے کسی اسٹیشن سے پانی لے لیں گے۔“
”ہم غلطی کی۔ ہمیں پانی کا انتظام کرنا چاہیے تھا۔ اچھا ٹھہرو۔ میں منرل واٹر لے کر آتا ہوں۔“ وہ آگے بڑھ گیا تھا۔
صوفیہ بے چینی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

وہ پانی کی بوتل لے کر مڑا تھا جب ٹرین نے دل دی۔ وہ جلد سے جلد بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب ہی ایک ہاتھ نے اس کا پیر تھام لیا۔
احسن نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ چادر میں لپٹی وہ عورت زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صرف اس کا وہ سفید ہاتھ چادر سے باہر تھا جس سے
اس نے احسن کا پیر تھام ہوا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اس ہاتھ پر ڈالی پھر بیٹھتا چلا گیا۔

”نہیب!“ اس کی لرزتی، کپکپاتی ہوئی آواز نکلتی تھی۔

چادر میں سے ایک سکی ابھری تھی۔

احسن کا تنس تیز ہو گیا۔

”اب رستہ کیوں روکتی ہو؟“ اس کا لہجہ شکایت سے لبریز تھا۔

”مجھے..... مجھے..... معاف کر دو احسن!“ وہ دروہی تھی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

ٹرین آہستہ آہستہ سرکے لگی تھی۔ اس لمحے ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اس کا چہرہ کھل گیا۔

”نہیب!“ وہ سکتے کے عالم میں رہ گیا تھا۔ ”نہیب..... زینو!“

”بس ایک بار کہو کہ مجھے معاف کیا..... بس ایک بار.....“ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”ہاں ہاں معاف کیا آج نہیں آج سے بہت پہلے معاف کر چکا ہوں۔“ وہ رورہا تھا۔ ”تم مجھے سمجھ کیوں نہیں پاتیں زینو۔“

”بس!“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”اور کچھ نہیں چاہیے..... کچھ بھی نہیں۔ اب جاؤ..... جاؤ احسن! وہ تہا راراستہ دیکھتی ہوگی۔“

”تمہیں یوں چھوڑ کر؟ اس حال میں.....“

”جاؤ احسن..... اس محبت کی قسم ہے تمہیں..... جو آج بھی ہم دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہے..... آہ! میں بہت
خوش ہوں۔ زندگی سے اب مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ ایک لمحہ بھی نہیں..... بس! اب تم جاؤ احسن!“

اس نے اپنا سر گھٹنوں پر نکال لیا تھا۔

گاڑی کی رفتار تیزی پکڑ چکی تھی۔ جب وہ صوفیہ کو آتا دکھائی دیا۔

اس کی جان میں جان آئی تھی۔

”اتنی دیر لگا دی آپ نے؟“

”ہاں..... شاید میں نے دیر کر دی!“ شکستہ سا اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

”وہ..... وہ عورت کون تھی؟“ اس نے وہ منظر دیکھا تھا۔

”وہ..... وہ“ گم صم تھا۔

”کوئی مانگنے والی تھی؟“ صوفیہ نے خود ہی اندازہ لگایا۔

”میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔“ وہ رو پڑا تھا۔



”ارے دیکھو بھائی..... یہ عورت کون ہے!“ ایک قلی نے اس کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا تھا۔ اس کا بے جان لاشہ اسٹیشن پر بے یار و مددگار پڑا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر کا بندوبست کیا جاسکا تھا۔

”اسے مرے ہوئے تو غالباً گھنٹہ ہو گیا ہے..... دل کی مریضہ تھی شاید..... ہارٹ ایک معلوم ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر نے کارروائی منٹوں میں پوری کر ڈالی۔

”کوئی بھکارن معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال اسے اسپتال روانہ کر دو۔ ضروری کارروائی کے بعد رفاہی ادارے والے اس کی تدفین کر دیں گے۔“

اس کے وجود کو اس کی سیاہ چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔

pdf by M Jawad Ali attari511@hotmail

+971-50-2737867

تمت

pdf by M Jawad Ali attari511@hotmail

+971-50-2737867

خوفناک جنگل

دلیر مجرم کی بے پناہ پذیرائی کے بعد پیش خدمت ہے ابن صفی کی جاسوسی دنیا سیریز کا دوسرا ناول..... خوفناک جنگل۔ ایک پراسرار اور خوفناک جنگل جہاں عجیب و غریب واقعات ہوتے تھے اور لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں کی کارگزاری ہے۔ حمید اور فریدی کس طرح اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں، معلوم کرنے کے لیے پڑھیے **خوفناک جنگل**۔

یتی

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح باخبر نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے انکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی ہم جوئی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی مہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آتی تھی۔ ایک **یتی** (برفانی انسان) کی انہیں تلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب، کتاب گھر کے ایکشن ایڈونچر ناول سیکشن میں جلد آ رہا ہے۔